اقبال
نادر معلومات
مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
(اقبال)
ترتیب و تحقیق
پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

ترتیب و تحقیق

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
(پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

نام کتاب	اقبال: نادر معلومات
مصنف	پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
ناشر	پروفیسر اکبر حیدری کشمیری
سنہ اشاعت	جنوری ۲۰۰۶ء
تعداد اشاعت	پانچ سو
کمپوزنگ	فصاحت حسین مبلغ
قیمت	-/۴۰۰ روپے
مطبع:-	پرنس آرٹ پرنٹرس، کوچہ چیلان دریا گنج۔ نئی دہلی۔

فون:- 011-20024475
011-41564193

نگراں

ڈاکٹر ظفر حیدری

ملنے کا پتہ:-

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

ہمدانیہ کالونی، بمنہ، سری نگر 190018 — ۱۲۱، نیا گاؤں (ایسٹ)

فون نمبر:- 0194-2491187 — لکھنؤ:- 226001

موبائل:- 9419420906 — موبائل:- 9415409964

HaSnain Sialvi

فہرست

نمبر شمار	مضامین		صفحہ
۱۔	حرفِ چند	مرتب	1
۲۔	مقدمہ	مرتب	6
۳۔	قطعۂ تاریخ		87
۴۔	نواب ذوالفقار علی خاں کی اقبال پر پہلی تصنیف (A VOICE FROM THE EAST)		۱
۵۔	اقبال اور خان بہادر مرزا سلطان احمد		۷۷
۶۔	محمد عبداللہ قریشی۔ ایک ماہر اقبالیات		۱۰۳
۷۔	ڈاکٹر اقبال اور خواجہ غلام السیدین		۱۳۸
۸۔	اقبال شناس۔ طارق لاہوری		۱۹۱
۹۔	اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد حیدر آبادی		۲۲۸
۱۰۔	اقبال اور عطیہ بیگم فیضی		۲۶۱
۱۱۔	اقبال کا ایک شاگرد (پنڈت چاند نرائن چانؔد)		۲۹۹
۱۲۔	یادگار دربار ۱۹۱۱ء میں اقبال کا تذکرہ		۳۱۳
۱۳۔	اقبال۔ ایرانی ادباء اور آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں		۳۳۸

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد (نیویارک، امریکہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ چند

جولائی ۲۰۰۲ء کا واقعہ ہے جب راقم حروف جناب اطہر رضوی صاحب سکریٹری غالب اکادمی ٹورنٹو (کینڈا) کی دعوت پر بین الاقوامی میر انیس سیمنار کے لئے ٹورنٹو گیا۔ مختلف ممالک کے جتنے بھی مہمان سیمنار کے لئے آئے تھے ان میں اکثر و بیشتر ڈاکٹر تقی عابدی (ماہر طب) کے دولت خانے میں قیام پذیر تھے۔ ان میں نیویارک کے ڈاکٹر عبد الرحمٰن عبدؔ ایم ڈی اسپیشلسٹ بھی شامل تھے۔ میں بھی وہیں ٹھہرا تھا۔ دوسرے دن وہ نہایت خندہ پیشانی اور فاضلانہ اخلاق سے میرے پاس تشریف فرما ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں بھی کشمیری ہوں اور میرا وطن میر پور آزاد کشمیر ہے۔

اسی دن یعنی ۲۷ جولائی کو ٹورنٹو یونیورسٹی کے وسیع ہال میں ماہر انیسیات و دبیریات ڈاکٹر تقی عابدی کے مخزونہ رثائی ادب کی کتابوں اور مراثی انیسؔ و دبیرؔ کے نادر مخطوطات کی نمائش ہوئی۔ دوسری نشست میں میر انیسؔ سیمنار شروع ہونے سے پہلے عابدی صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب "تجزیہ یادگار انیسؔ" کی رونمائی بڑے اہتمام سے کی گئی۔ پھر سیمنار میں مضامین پڑھے گئے۔ عبد صاحب نے بھی تقریر کی۔ دوسرے دن (۲۸ جولائی) سہ پہر کو مشاعرے کا آغاز ہوا۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدؔ میرے پاس بیٹھے تھے۔ ٹورنٹو میں گرمیوں میں نو بجے شام کو سورج ڈوبتا ہے۔ عبد کو اپنے معبود کی یاد آگئی اور مجھ سے کہنے لگے کہ نماز مغرب کا وقت آگیا ہے اور میں نماز ادا کر کے آتا ہوں۔ ان کی یہ ادا مجھے بے حد پسند آئی۔ اور میرے منہ سے دعا نکلی کہ اللہ آپ کی نماز کو قبول کرے۔ اس موقعے پر میں محو حیرت ہو گیا اور مجھے انہی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا جو ان کی عبودیت اور عمل صالح کا آئینہ دار ہے۔

خدا گواہ کہ ہو آدمی کمال کے عبدؔ بتوں کے شہر میں تم کو خدا کی سوجھی ہے

انہی پاکیزہ خیالات کو علامہ اقبال نے اس طرح ادا کیا ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے

ادھر مشاعرہ جاری تھا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عبدؔ صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جب موصوف کی باری آئی اور ناظم مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ان کا نام لیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور پھر سامعین انہیں ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ ان کے ہر شعر پر داد و آفرین کے نعرے ایسے بلند ہو

رہے تھے کہ گویا مشاعرہ کی پتنگیں اڑ رہی تھیں۔ اختتامِ نظم کے بعد لوگوں نے کھڑے ہو کر انہیں تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ایک اور نظم ''ان پچیس سالوں میں'' کی فرمائش کی۔ انہوں نے نظم شروع کی اور آناً فاناً مشاعرے پر چھا گئے۔ ہر طرف ''مکرر مکرر'' کی صداؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور پورا مجمع جھوم جھوم کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں اچنبھے میں آ گیا کہ مغربی دنیا میں عبد صاحب کی شاعری نے اپنا سکّہ بٹھا دیا ہے اور ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت نے ان کے سر پر شہرتِ عام اور بقائے دوام کا تاج رکھا ہے۔ میرے لئے یہ بھی حیران کن بات ہے کہ گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے انہیں شعر گوئی کا وقت کہاں سے ملتا ہے۔ سچ کہا گیا ہے۔

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا ۔۔۔ عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا

عبد صاحب کی نظم بہت طویل تھی۔ ایک بند مجھے بھی یاد رہا۔ سلاستِ زباں اور روانیِ بیاں قابلِ غور ہیں:

کوئی تو مشرق وسطیٰ کو اپنا گھر بنا بیٹھا ۔۔۔ کوئی اس شہر سے نکلا تو امریکہ میں جا بیٹھا

کوئی یورپ کی گوری قوم سے دفتر سجا بیٹھا ۔۔۔ کسی کے روز و شب کٹتے ہیں افریقہ کے گاؤں میں

ہزاروں انقلاب آئے ہیں ان پچیس سالوں میں

سامعین نے انہیں بار بار پڑھنے کی فرمائش کی اور وہ مسکرا کر انہیں محظوظ کرتے گئے۔ عبد کے بعد مشاعرہ کی گرمی کچھ کم ہونے لگی اور بہت سے لوگ اپنے گھروں کو چل پڑے۔ رات بھی کافی گزر چکی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی دو کتابوں اور قوالی کے دو کیسٹوں سے مجھے نوازا۔ دونوں کیسٹوں میں ان کی بلند پایہ نعتیں موجود ہیں۔ کتابیں یہ ہیں (۱) عرفانِ عبد (نعتوں کا مجموعہ) (۲) صنم کدہ ہے جہاں (شعری مجموعہ)۔ دل چاہتا تھا کہ دونوں کتابوں پر سیر حاصل تبصرہ کروں۔ مگر قلم روک دیا، کیونکہ جناب ادا جعفری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور شبنم رومانی نے اپنے عالمانہ اور مخلصانہ تبصروں میں ہر پہلو سے غور کیا۔ انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، جس کو میں آگے بڑھاتا۔ حق تو یہ ہے کہ ان تحریروں نے دونوں کتابوں میں چار چاند لگا دئے۔

ڈاکٹر عبد الرحمن عبد علامہ اقبال کے تفکرات و روشن خیالات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اور علامہ کے تتبع میں محمدؐ و آلِ محمدؐ کے مقدس اذکار سے اپنی تخلیقات کی زینت بڑھاتے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

پیغامِ الٰہی کی تصویر مجسم وہ ۔۔۔ برہانِ محمدؐ ہیں قرآنِ محمدؐ ہیں

اس عالمِ ہستی کا عنوان محمد ہیں ۔۔۔ مخلوق پہ خالق کا احسانِ محمد ہیں

''عرفان عبدؔ'' میں ایک طویل نظم ہے جو سورۂ الم نشرح آیت ۴ ''ورفعنا لک ذکرک'' کی شرح ہے۔ یعنی اللہ نے محمدؐ کو اس لئے خلق کیا کہ اس کی خدائی اور وحدانیت اور اس کا دین پہچانا جائے۔ اگر محمدؐ نہ ہوتے تو کائنات نہ ہوتی اور اس کا نام کوئی نہ لیتا۔ اس کے عوض خدا نے وعدہ فرمایا کہ ہم نے تمہارے ذکر و اذکار کو بلند و بالا کر دیا ہے۔ مقطع ملاحظہ ہو۔

تو فقط ایک زمانے میں نہیں ہے محدود   ہے مراذکر جہاں تو بھی وہیں ہے موجود
اتباع تیری ہوئی حاصل مقصود و وجود   تم پہ ہیں خالق و مخلوق کے تاحشر درود

عبدؔ کے دل میں تیرا پیار بھی ہم نے ڈالا
کر دیا ہم نے ترا ذکر بلند و بالا

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عبدؔ علامہ سر محمد اقبال کی طرح تفضیلی یعنی محمدؐ و آل محمدؐ کے راسخ العقیدت مندوں میں سے ہیں۔ اور حضرت امیر علیہ السلام کو علم و شجاعت، نصرت اسلام اور عبادت الٰہی میں یکتا و تنہا اور افضل ترین تسلیم کرتے ہیں۔ عرفان عبدؔ میں مولائے کائنات علی مرتضیٰ ''شیر خدا'' کی مدح میں ایک شہ پارۂ نظم ہے۔ ذیل کے بند فصاحت و بلاغت اور طلاقت زبان کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔

قوت بازوئے مصطفیٰ ہی تو ہیں
یا علیؑ آپ شیر خدا ہی تو ہیں

مصطفیٰؐ نے جنہیں علم کا در کہا   سارے عالم نے فاتح خیبر کہا
فاطمہؑ نے جنہیں سر کی چادر کہا   میرے آقا علی مرتضیٰ ہی تو ہیں
یا علیؑ آپ شیر خدا ہی تو ہیں

دین حق پہ کرم بے شمار آپ کے   ضرب کاری تھے دشمن پہ وار آپ کے
کام کرتی رہی ذوالفقار آپ کے   بوتراب آپ حق کی عطا ہی تو ہیں
یا علیؑ آپ شیر خدا ہی تو ہیں

عبدؔ جب تک میرے جسم میں جان ہے   اہل بیت محمدؐ پہ قربان ہے
میں ہوں ان کا یہی میری پہچان ہے   پنجتن میرے دل کی ضیاء ہی تو ہیں
یا علیؑ آپ شیر خدا ہی تو ہیں

علامہ اقبال بھی محمدؐ و آل محمدؐ کو تمام مخلوقات میں افضل ترین اور کامل ترین انسان قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے بارے میں کہتے ہیں۔

اے سرِّ نبوتِ محمدؐ اے وصف تو مدحتِ محمدؐ
ہر ذرہ در نکہت چو منصور در جوش ترانہ اناالطور
از ہوشم شدم مگر بہ ہوشم گوئی کہ نصیری خموشم
از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

یا ان اشعار کی طرف توجہ فرمایئے۔

مسلم اول شہہ مرداں علی عشق را سرمایۂ ایماں علی
از ولائے دودمانش زندہ ام در جہاں مثل گہر تابندہ ام
مرسل حق کرد نامش بوتراب حق یداللہ خواند در ام الکتاب
ہر کہ دانائے رموز زندگیست سرِّ اسمائے علی داند کی کیست
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب باز گرداند ز مغرب آفتاب
ذات او دروازۂ شہرِ علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم

یہاں عؔبد کا علامہ اقبال سے کسی قسم کا موازنہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ عبد کا دل بھی آل محمد کی محبت سے اقبال کی طرح لبریز ہے اور متذکرہ بالا اشعار میں انہوں نے اقبال کا ہی اتباع کیا ہے۔

میں دیارِ مغرب میں عؔبد کی عبدیت ان کی شاعرانہ آفاقیت اور ان کے شفافانہ طرزِ عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی کتابوں کی زینت آرائی کے لئے موصوف کو مختصر پیغام ارسال کرنے کے لئے درخواست کی۔ انہوں نے اسے شرف قبولیت سے نوازا۔ ان کا پیغام درج ذیل ہے۔

''حضرت علامہ سر محمد اقبال علیہ الرحمہ کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کا فلسفہ و پیغام ہمارے لئے ایک گرانقدر سرمایہ ہے۔ ان کے نادرات کی جمع آوری ہمارا فریضہ ہے۔ اور آپ کے زیرنظر یہ کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اقبال کا کلام آج کل اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ اپنی تخلیق کے وقت یعنی تقریباً سو برس پہلے تھا۔ اگلی نسلوں تک اس پیغام کو پہنچانے سے نہ صرف ان نسلوں کا بھلا ہوگا،

بلکہ ہمارے ادبی ورثا کا تحفظ بھی ہوگا۔"

ڈاکٹر عبد صاحب نے اپنے پیغام کے ساتھ اشعار ذیل بھی روانہ کئے ہیں۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نگاہ دورس کس قدر سنجیدہ اور بالغ ہے۔ شوکت الفاظ کا انتخاب قابل لحاظ ہے۔

خود آگاہ، فقیر خوش بیانے خوشا اے خسرو شیریں بیانے
نہ ڈوبے گا تری شہرت کا سورج رہیں گے دیر تک تیرے زمانے
خودی، شاہیں، فقر و مرد مومن بڑے دلچسپ ہیں تیرے فسانے
ترے افکار الافانی حقائق ترے اشعار حکمت کے خزانے
کریں نہ عبد کیوں توقیر تیری
تجھے اقبال بخشا ہے خدا نے ﴿ڈاکٹر عبدالرحمن عبد﴾

راقم اپنے حاصل زندگی کے ان ادبی کتابوں (اقبال! نادر معلومات اور اقبالیات کے نئے گوشے) کو نہایت حسن عقیدت اور مسرتوں کے ساتھ بین الاقوامی شہرت کے حامل ڈاکٹر عبدالرحمن عبد صدر نیویارک اردو انجمن اور "چیرمین اقبال گلوبل فورم" امریکہ کے نام نامی سے منسوب کرکے اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے۔ عبد میں اللہ کی ربوبیت کی شان عبودیت، سخن دل نوازی اور افکار و خیالات میں سوز و گداز کے اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔

نگاہ بلند، سخن دلنوازی، جاں پرسوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے
اقبال

اکبر حیدری کشمیری (سری نگر)
۱۳رجب المرجب ۱۴۲۶ہجری
(۱۹اگست ۲۰۰۵ء)

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری (مصنف)

HaSnain Sialvi

مقدمہ

راقم الحروف کی مندرجہ ذیل تحقیقی کتابیں علامہ اقبال پر چند برسوں میں شائع ہو چکی ہیں:۔

۱۔ اقبال کی صحتِ زبان۔ ۱۹۹۸ء

۲۔ کلام اقبال (نادرونایاب رسالوں کے آئینے میں)
مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر۔ ۲۰۰۱ء

۳۔ اقبال اور علامہ شیخ زنجانی ۲۰۰۲ء

چوتھی کتاب ''معرکۂ اسرارخودی'' ادارہ یادگار غالب کراچی میں زیرطبع ہے۔
یہ بھی کتابیں اہل نظر نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی ہیں اور ان پر تفصیلی تبصرے بھی کئے ہیں۔ چند مبصروں کے تبصرے ان ہی کے الفاظ میں طائرانہ نظر سے پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اقبالؔ کی صحت زبان۔ پروفیسر نیر مسعود رضوی

''جہاں تک تحقیق کی دنیا میں نئی نئی معلومات کی فراہمی اور نادر ماخذوں کی بازیابی کا تعلق ہے، معاصرین محققوں میں ڈاکٹر اکبر حیدری کی برابری کوئی نہیں کرسکتا۔ وہ ایک مدت سے ہمہ وقتی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں اور بڑی تعداد میں بہت اہم کتابیں اور مضامین شائع کر چکے ہیں۔ ایک بار پٹنے میں میرے سامنے مرحوم قاضی عبدالودود کے سے جید محقق نے ان کی تلاش و محنت اور تحقیقی دریافت کی تعریف کی تھی (اسی موقعے پر قاضی صاحب نے ان سے کلیات میر کی تدوین کی فرمائش بھی کی تھی)۔ مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی سمیت بیشتر محقق ڈاکٹر اکبر حیدری کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حیدری کی کتاب ''اقبالؔ کی صحت زبان'' بھی پرانے رسالوں سے ان کی تحقیقی علاقہ مندی کا ایک عمدہ مظہر ہے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۱ء تک برصغیر کے رسالوں میں اقبال کی زباندانی کے موضوع پر جو اعتراضی اور دفاعی تحریریں شائع ہوتی رہیں انہیں مرتب کر کے ضروری متعلقہ معلومات کے ساتھ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اردو کے ایک ادبی کارنامے کی مستند روداد بن گئی ہے۔

کلام اقبال کے تنقیدی جائزوں پر مشتمل اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور کارآمد بھی۔ اس میں سب سے اہم مضمون خود اقبال کا ہے۔ رسالہ ''اردوئے معلی'' علی گڑھ کے دو شماروں میں ''تنقید ہمدرد'' کے فرضی نام سے دو مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' اور ''اردو کے نادان دوست'' شائع ہوئے تھے۔ جن میں چودھری خوشی محمد ناظر اور اقبال کے کلام پر اعتراض کیے گئے تھے۔ اقبال کا مضمون ''اردو زبان پنجاب میں'' (مخزن لاہور) ان ہی اعتراضوں کا جواب ہے۔ اقبال کا پر شکوہ اور متین لہجہ اس مضمون کو کتاب کی دوسری تحریروں سے ممتاز کرتا ہے۔ مضمون کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:۔

''اگرچہ تنقید ہمدرد صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کئے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کروں گا۔

اس بات کا ذکر کہ معترض نے اپنی شناخت چھپائی ہے، اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

''ایک صاحب ''تنقید ہمدرد'' جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی اور نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے معترض کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ حکیم عبدالکریم برہمؔ تھے۔''

کتاب کا مقدمہ اقبالیات کے سلسلے میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر حیدری نے متعلق رسالوں، ان کے مدیروں، مضمون نگاروں وغیرہ پر بہت تحقیق کے ساتھ لکھنے کے علاوہ مضامین کے عکس بھی کتاب میں شامل کئے ہیں اور اقبال کے خلاف پنجاب کے سید برکت علی شاہ ''گوشہ نشین'' کی کتاب ''اقبال کا شاعرانہ زوال'' سے بھی ادبی دنیا کو واقف کرایا ہے۔

''اقبال کی صحت زبان'' پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم صحافتی ادب میں ادبی معلومات کے کیسے کیسے خزانے پنہاں ہیں۔ لیکن ان خزانوں کو تلاش اور دریافت کرنا اس محنتِ شاقہ کا تقاضا کرتا ہے جس کا ایک ثمرہ ڈاکٹر اکبر حیدری کی یہ کتاب ہے''(اقبالیات لاہور۔ جولائی ۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (ماہر اقبالیات) اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں:۔

''ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے قدیم اخبارات و رسائل سے اس سلسلے (اقبال کے بعض فنی اسقام) کے چوبیس مضامین تلاش کر کے ''اقبال کی صحت زبان'' کے عنوان

سے مرتب کردیے ہیں۔ ابتدا میں ان کے قلم سے اس موضوع پر ایک سیر حاصل مقدمہ ہے۔ زیرِ نظر مضامین کی تلاش و ترتیب بلاشبہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ اقبال کی شاعری کے فنی جائزے اور قدر و قیمت کے تعین کے سلسلے میں ان تاریخی مضامین کی بڑی اہمیت ہے۔۔۔۔۔'' (نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

برصغیر کے ممتاز دانشور اور اقبال کے سوانح نگار ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے گرامی نامہ مورخہ ۳۰ دسمبر ۲۰۰۳ء میں لکھتے ہیں:۔

''آپ کی ارسال کردہ کتاب ''اقبال کی صحت زبان'' موصول ہوگئی۔ میری طرف سے بہت بہت شکریہ قبول فرمایئے۔ مجھے جب بھی آپ کی ارسال کردہ کتب ملتی ہیں تو میں انہیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کا خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۳ء بھی علامہ اقبال کے خط اور نظم ''ہمارا دیس'' کے عکس سمیت مل گیا۔ میں نے آپ کی تحقیق ''اقبال کی صحت زبان'' پڑھ لی ہے۔ آپ نے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا جو خاصا دلچسپ ہے''۔

۲۔ کلام اقبال (نادر و نایاب......)

برصغیر کے عظیم محقق و نقاد خواجہ مشفق اپنے خط مورخہ ۱۵ مئی ۲۰۰۱ء میں لکھتے ہیں:۔

''کتاب موصول ہوگئی۔ آپ یہ پوشیدہ ادبی خزانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر نکالتے ہیں۔ کتنی دیدہ ریزی اور جانفشانی سے کتب خانوں کو کھنگال کر یہ گوہر نایاب (اقبال کے غیر مدون اشعار) اکٹھے کئے ہیں۔ اس صبر آزما کام بلکہ بہت بڑے ادبی کارنامے کی اشاعت پر آپ کی جتنی تعریفیں کی جائیں بجا ہیں''۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کتاب کے بارے میں اپنے خط مورخہ ۱۹ مئی ۲۰۰۳ء میں لکھتے ہیں:۔

''آپ کی ارسال کردہ تصنیف ''کلام اقبال......'' مجھے موصول ہوگئی۔ آپ نے اپنی طرف سے بڑی محنت کر کے بعض اخباروں اور رسالوں سے علامہ کا کلام نکال کر کتابی شکل میں ڈھالا ہے۔ اقبال شناسوں کے لئے یہ کتاب تحقیقی طور پر کارآمد ثابت ہوگی''۔

ناقدین ادب نے اس کتاب کو اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ اس میں ان رسالوں اور قدیم اخباروں کے حوالے دیے گئے ہیں جو نایاب ہیں۔ اخباروں میں ''اودھ پنچ'' اور

''احسان'' لاہور میں کلام اقبال وافر تعداد میں شائع ہوتا تھا۔ جب ۱۹۸۸ء میں کتاب زیر ترتیب تھی اور ممتاز ادیب اور صحافی محمد عبداللہ قریشی نے اس موضوع پر میرا ایک مضمون ''ہماری زبان'' دہلی میں پڑھا تو بہت متاثر ہوئے تھے۔ موصوف نے مجھے خط لکھا کہ جب کتاب چھپ جائے گی تو میں اس سے استفادہ کر کے اضافی اشعار ''باقیات اقبال'' کے دوسرے ایڈیشن میں شائع کروں گا۔ خط دیگر خطوط کے ساتھ ''محمد عبداللہ قریشی -- ایک ماہر اقبالیات'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صابر کلوروی صدر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی جنھوں نے اقبال پر کئی گرانقدر کتابیں تصنیف کی ہیں، اپنے پی ایچ ڈی مقالے ''کلیات باقیات شعر اقبال'' (مطبوعہ اقبال اکیڈمی پاکستان ۲۰۰۴ء) کے دیباچے میں میری کتاب کو بنیادی ماخذوں میں تسلیم کیا ہے۔

۳۔ **اقبال اور علامہ شیخ زنجانی** - اس کتاب کی پذیرائی پاکستان میں اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ جس نے بھی کتاب کے بارے میں سنا، اس نے اس کی دستیابی کے لئے بڑی کوشش کی۔ یہاں تک کہ جناب مشفق خواجہ نے کئی لوگوں کو پوری کتاب کے عکس سے نوازا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنے خط مورخہ ۸ نومبر ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں:-

> ''آپ کی ارسال کردہ تصنیف ''اقبال اور علامہ شیخ زنجانی'' موصول ہوگئی۔ میری طرف سے بہت بہت شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ نے اس کتاب میں علامہ اقبال کی شخصیت سے متعلق بعض نئی باتوں کا انکشاف کیا ہے۔۔۔''

جناب مشفق خواجہ اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ جنوری ۲۰۰۳ء میں لکھتے ہیں:-

> ''آپ کی تازہ تصنیف ''اقبال اور علامہ شیخ زنجانی'' مل گئی تھی۔ دوسرا نسخہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے لئے تھا۔ یہ انہیں پیش کر دیا ہے۔ یہ آپ نے بہت زبردست کام کیا ہے۔ شیخ زنجانی کے فرمودات پر مشتمل رسالہ آپ نے خوب تلاش کیا۔ حیرت ہے کہ ماہرین اقبال کی ایک پوری فوج ظفر موج سرگرم کار ہے، مگر کسی کی نظر اس رسالے کی طرف نہ گئی۔ مزید حیرت اس پر ہے کہ لاہور میں بھی جہاں یہ رسالہ چھپا تھا، اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اقبال کے افکار کے حوالے سے یہ رسالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
>
> آپ نے اپنی جن تصانیف کے لئے لکھا ہے، ان میں سے فی الحال ''معرکۂ اسرار خودی'' کا مسودہ ارسال فرمائیے۔ یہ چھپ جائے تو پھر ایک ایک کر کے باقی کتابیں

بھی منگوالوں گا''۔

۴۔ **معرکۂ اسرارِ خودی۔** مشفق خواجہ ۱۹ اپریل ۲۰۰۴ء کے خط میں مطلع کرتے ہیں:۔

''مارچ کے آخر میں آپ کی کتاب ''معرکۂ اسرارِ خودی'' کا مسودہ ملا۔ میں نے سب کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کیا اور ۲ اپریل کو یہ کتاب کمپوزنگ کے لئے دے دی۔ آپ نے یہ زبردست کام انجام دیا ہے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ یہ کام نہیں کارنامہ ہے۔ آپ نے بے مثال محنت کی ہے اور ایسے ایسے جواہر ریزوں کو ڈھونڈ نکالا ہے، جو ماہرین اقبال کے خواب وخیال میں بھی موجود نہ تھے۔ انشاءاللہ کتاب آپ کے حسب ہدایت شائع ہوگی اور کوشش یہ ہوگی کہ جلد سے جلد شائع ہو جائے۔

ادارۂ یادگارِ غالب سے آپ کی جو دو کتابیں شائع ہوئی تھیں، انہیں یہاں بہت پسند کیا گیا''۔

یہ بات میرے لئے خوشی کا باعث ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو جب معلوم ہوا کہ میں نے ''معرکۂ اسرارِ خودی'' کا مسودہ خواجہ صاحب موصوف کو اشاعت کے لئے بھیجا تو انہیں بڑی مسرت ہوئی۔ آپ نے ایک گراں قدر خط میں مجھے لکھا کہ:

''یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ نے اس موضوع پر کتاب لکھ دی ہے۔ اگر اس کتاب کو آپ میرے اور عبداللہ قریشی کے نام معنون کرتے ہیں تو اس پر مجھے کیوں کر اعتراض ہوسکتا ہے۔ آپ کی فرمائش کے مطابق تصویر بھی ارسال خدمت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کی کتاب میں اس موضوع پر بے شمار مضامین شامل ہیں، یقیناً ایسا ہوگا۔ کیونکہ اس موضوع پر بے شمار مضامین اس زمانے میں شائع ہوئے تھے۔ آپ کی کتاب واقعی دلچسپ ہوگی۔ آپ کی دوسری کتاب (اقبال کا تصورِ نیابت الٰہی) کا موضوع بڑا دلچسپ ہے۔ اللہ کرے وہ بھی تکمیل تک پہنچے۔ بہر حال ''معرکۂ اسرارِ خودی'' اور ''اقبال اور تصورِ نیابت الٰہی'' دیکھنے کا انتظار ہے''۔

راقم حروف نے کئی سال پہلے ایک اور کتاب ''نوادرِ اقبالیات'' کی تصنیف کا ڈول ڈالا تھا۔ اس میں متعدد مضامین ترتیب دئے گئے تھے۔ فہرست مضامین ڈاکٹر جاوید اقبال کی خدمت عالی میں ملاحظہ کے لئے بھیجی گئی تھی۔ اس کے بارے میں جناب والا نے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے:۔

''جو مضامین آپ نے جمع کئے ہیں، ان میں سے بعض غور طلب ہیں۔ مثلاً ''علم الاقتصاد'' کے نقش اول کے سال کے متعلق تحقیق کی ضرورت تھی۔ اگر نقش اول کتب خانہ شبلی میں موجود ہے تو ممکن ہے اشاعت کے سال اول کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ نے لکھا ہے کہ عطیہ فیضی سر اکبر حیدری کی سگی بہن تھیں۔ یہ میرے لئے نئی بات ہے۔ اقبال اور مرزا سلطان احمد بھی ایسا مضمون ہوگا جس کا بہتوں کو علم نہ ہوگا۔ نواب ذوالفقار علی خان کی کتاب "A Voice from the East" نایاب ہے۔ بہر حال میں تو اب اس مجموعہ اور تحقیقی کرشمے کو دیکھنے اور پڑھنے کا منتظر ہوں۔''

صاحب موصوف ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء کے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

''عطیہ بیگم فیضی کے بارے میں آپ کی تحقیق غالباً درست ہوگی۔ اگر آپ نے عطیہ اور زہرا فیضی کے مضامین ڈھونڈ نکالے ہیں جو ''الناظر'' لکھنو کے شمارہ اگست (۱۹۰۹ء) اور ستمبر میں شائع ہوئے تھے تو ان کی اشاعت ہونی چاہیے۔ اسی طرح اس رسالے کے جنوری کے شمارے میں اسرار خودی میں اقبال کے موقف کی حمایت میں لکھے ہوئے تبصرے کی اشاعت ضروری ہے۔ امید ہے کہ آپ کی کتاب معرکہ اسرار خودی عنقریب چھپ جائے گی۔ اسی طرح مرزا سلطان احمد کی کتاب ''النظر'' جو میری نظر سے نہیں گزری۔ انشاء اللہ آپ کی کتابیں جب شائع ہونگی تو انہیں دیکھنے کا موقع مجھے ملے گا''۔

راقم حروف نے ''نوادر اقبالیات'' کی بجائے کتاب کا نام ''اقبال ! نادر معلومات'' پہلے رکھا تھا، اور اسی نام سے لوگوں نے قطعات تاریخ بھی کہے تھے۔ جب مسودہ کمپوز کروانا چاہتا تھا تو کمپوزر نے کہا کہ کتاب بڑی ضخیم اور ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اسی شش و پنج میں کئی دن تک رہا۔ آخر یہ طے پایا گیا کہ کچھ مضامین خارج کئے جائیں اور کچھ کا مواد کم کر دیا جائے۔ چنانچہ دس مضامین حذف کرنے پڑے اور بعض کو از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ اس ردو بدل کے بعد بھی جب ضخامت میں زیادہ کمی نظر نہیں آئی، تو پھر لامحالہ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اور اس طرح دو کتابیں تیار ہوگئیں جو آپ کے سامنے ہیں، اور ان کے نام یہ ہیں:۔

(الف) اقبال ! نادر معلومات (ب) اقبالیات کے نئے گوشے۔

دونوں کتابوں کی کمپوزنگ کا کام لکھنو میں مارچ میں تمام ہوا تھا۔ جب پریس والے کو دی گئیں تو اس نے کہا کہ دونوں کی لمبائی کا سائز سوا انچ زیادہ ہو گیا ہے۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو کتابوں کا سائز بڑا کر دیا جائے یا کمپوزر سے کہا جائے کہ وہ ہر صفحے کی سطریں کم کر کے آگے کے صفحے بڑھا دے۔ آخر کار وہی ہوا کہ ہر صفحے کی ستائیس سطروں میں کچھ سطریں کم کر کے یہ ہفت خوان پُر خار وادی میں طے کرنے پڑے۔

گرمی کی وجہ سے لکھنو میں مقدمہ نہ لکھ سکا۔ اب جوسری نگر میں ناسازگار موسم میں لکھنے کا ارادہ کیا تو یکایک ارادہ ٹوٹ گیا۔ اس موقعے پر جناب امیر علیہ السلام کی حدیث یاد آئی۔ "عرفت ربی بفسخ العزائم" (میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ سے پہچانا)۔ قصہ کوتاہ ایک ماہ تک صاحب فراش رہنا پڑا۔ رنج اس بات کا ہوا کہ جس طرح کا مقدمہ میں لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ اب یہ ارادہ کیا کہ دونوں کتابوں کے چند مضامین کی کچھ خصوصیات مشتے نمونہ از خروارے درج کی جائیں اور پھر علامہ اقبال کے بارے میں ان بے شمار واقعات میں سے چند ایک کی نشاندہی کی جائے جو پرانے نایاب رسالوں اور اخباروں سے مختلف کتب خانوں میں راقم نے بطور یادداشت قلمبند کئے تھے۔ اس قسم کے واقعات اقبالیات میں مفقود ہیں اور ماہرین اقبال کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے ہیں۔ دونوں کتابوں میں ایک ہی مقدمہ شامل کیا گیا ہے۔

(الف) اقبال! نادر معلومات:-

(۲) کتاب کی بسم اللہ اقبال کے دیرینہ دوست نواب سر ذوالفقار علی خان سے ہوتی ہے۔ ان کی بے مثال کتاب "A Voice From the East" کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) کا عکس تحقیقی مضمون کے ساتھ حاضر ہے۔ دو نایاب تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ مولونا گرامی نے خوب کہا ہے۔

معنی نکتۂ خفی و جلی
جوہر فردِ ذوالفقار علی

(۳) معلوم نہیں کہ ماہرین اقبال نے مرزا سلطان احمد فرزند ارجمند مرزا غلام احمد قادیانی کو کن وجوہات کی بنا پر نظر انداز کیا ہے۔ صاحب موصوف علامہ اقبال کے مخلص دوستوں میں تھے۔ وہ پکے مسلمان اور رسول اللہ کے نہایت عقیدت مند تھے۔ انہوں نے میری نظر میں اقبالیات میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ مرزا صاحب نے اقبال پر کئی مضامین لکھے جو مخزن اور "اقبال" جالندھر

میں شائع ہوئے تھے۔ جب ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی کی اشاعت پر خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے خلاف محاذ قائم کیا تو مرزا صاحب پہلے اقبالی سپاہ تھے جنہوں نے اقبال کے دفاع میں ایک کتاب لکھنا شروع کی جو پہلی مرتبہ ''مرغوب ایجنسی'' لاہور نے ۱۹۱۹ء میں ''النظر'' کے نام سے شائع کی تھی۔ کتاب بڑی جانفشانی کے ساتھ مرتب کی گئی اور محل ومناسبت سے قرآنی آیات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اسرار خودی کی حمایت میں ایسی مدلل، وزوردار اور بے نظیر کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ نہ تو علامہ نے اور نہ کسی ماہر اقبال نے بھولے سے بھی اس کتاب کا نام لیا ہے۔ کتابوں میں اسلم جیراجپوری کے مضمون ''اسرار خودی'' مطبوعہ ''الناظر'' لکھنو بابت مئی ۱۹۱۹ء کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب اقبال کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو انہوں نے موصوف کو ۷ امئی ۱۹۱۹ء کے خط کی ابتدا میں یہ تعریفی جملہ لکھا:-

''آپ کا تبصرہ ''اسرار خودی'' پر ''الناظر'' میں دیکھا ہے، جس کے لئے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں''۔

اس مضمون کے مقابلے میں مرزا سلطان احمد کی معرکہ آرا کتاب کا ذکر نہ کرنا اقبال اور ماہرین اقبال کے لئے ایک سوالیہ نشان رہ جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ''النظر'' کا مکمل نسخہ مجھے لاہور ہی میں ملا جہاں ماہرین اقبال کی فوج کثیر ہمہ وقت خیمہ زن ہے۔

۴۔ **اقبال اور عطیہ بیگم فیضی**۔ اس موضوع پر اقبال کے انتقال کے بعد جتنا لٹریچر میرے مطالعہ میں رہا ہے وہ نہ صرف ناقص بلکہ افسوسناک بھی ہے۔ اکثر لوگوں نے عطیہ بیگم کو ایک معمولی خاتون سمجھا ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ موصوفہ مشہور سیاسی لیڈر اور بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بدرالدین طیب جی (م۔۱۹۰۶ء) کی بھانجی اور اقبال کے معروف دوست سر اکبر حیدری کی چھوٹی سگی بہن تھیں۔ عطیہ بیگم کی والدہ صاحب تصانیف تھیں۔ ان میں ان کا دیوان بھی شامل ہے۔ یہ کتابیں ان کی منجھلی صاحبزادی زہرا بیگم فیضی (متوفی ۱۹۴۰ء) نے چھپوائی تھیں۔ رقیہ نازلی بیگم نواب صاحب جنجیرہ کی بیگم صاحبہ اور عطیہ بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے مضامین ''الناظر'' لکھنو کے ماہنامہ میں چھپتے تھے۔ ''زمانہ'' میں مرقوم ہے کہ:

''طیب جی کا بھرا خاندان یعنی چار بیٹے، چار داماد، پانچ بھانجے اور تین بھانجیاں ہیں۔ ایک بھانجی (زہرا بیگم فیضی) نواب مرشد آباد کو بیاہی گئی ہیں۔ دوسری بھانجی (نازلی رقیہ بیگم) سر سیدی احمد خان نواب جنجیرہ کو دی گئی ہیں۔ تیسری بھانجی مشہور

مس عطیہ بیگم ہیں جنہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ بمبئی میں زنانہ صنعت کی نمائش کی آرائش و درستی میں بیش قدر مدد کی تھی اور جنہوں نے کانفرنس کے جلسہ علی گڑھ میں اس نمائش کی درستی اور زیب و زینت کو ایک سے دو چند کر دیا تھا۔ اور جنہوں نے تعلیم نسواں کی توسیع اور اس کے لئے وصول چندہ میں مسٹر شیخ عبداللہ سکرٹری شعبہ تعلیم نسواں کو حد سے زیادہ مدد دی ہے اور جواب باامداد گورنمنٹ آف انڈیا لندن کو تعلیم پانے گئی ہیں'' (صفحہ ۳۲۴ بابت نومبر ۱۹۰۶ء)

غرضیکہ یہ خاندان سراپا علوم جدیدہ، روشن خیالی، فیاضی اور رواداری میں مسلمانوں میں ترقی پذیر اور علم و فضل کی بدولت ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کے مترادف تھا۔

(۵) **عطیہ بیگم** نے اپنی کتاب ''اقبال'' میں ۱۹۰۷ء کے واقعات میں یہ بھی لکھا ہے کہ قیام انگلستان کے دوران ''مس سروجنی داس'' زرق برق لباس میں ایک محفل میں آئیں اور اقبال سے متکبرانہ انداز میں کہا کہ میں صرف آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ میری رائے میں یہ مسز سروجنی نائیڈو نہیں تھیں۔ یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۷ء یا اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں لندن میں تھیں۔ مس سروجنی ۱۸۹۵ء میں لندن گئیں۔ اس زمانے میں وہ سروجنی چٹوپادیائے کہلاتی تھیں۔ ستمبر ۱۸۹۸ء میں وہ لندن سے حیدرآباد آئیں اور ان کی شادی اسی مہینے میں ہوئی۔ وہ ہمیشہ سیدھی سادی زندگی بسر کرتی تھیں۔ زرق برق لباس اور زیورات وہ نہیں پہنتی تھیں۔ میرے پاس ان کی کئی تصویریں ہیں۔ سب سے پرانی تصویر ۱۹۰۰ء کی ہے جو ''ادیب'' الہ آباد میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر سروجنی کے دستخط اور تاریخ بھی ثبت ہیں۔ شادی کے بعد وہ سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ اور پھر نیشنل کانگریس کی کارکن رہیں۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ جس سروجنی چٹوپادیائے نے لندن کے چپے چپے پر اپنی انگریزی شاعری کا سکہ بٹھا دیا ہو اور وہاں کے بڑے بڑے اساتذہ سے اپنی انگریزی زباندانی کا لوہا منوایا ہو، وہ کیونکر شادی کے نو سال کے بعد (جبکہ ان کے یہاں لڑکا بھی پیدا ہوا تھا جو بعد میں خواجہ حسن نظامی کی محافل قوالی کی بدولت مسلمان ہو گیا تھا) زرق برق لباس میں ملبوس، بیش بہا زیورات میں لدی ہوئی، عشق لڑانے، عطیہ بیگم اور محفل کے دوسرے لوگوں کو نظر انداز کر کے اقبال کے پاس جائیں اور ان سے متکبرانہ انداز میں کہیں کہ میں صرف آپ کے پاس آئی ہوں؟ یہاں میرے خیال میں عطیہ اور اقبال کو سروجنی داس اور سروجنی نائیڈو لکھنے میں سہو ہو گیا ہے۔ ۱۹۰۷ء-۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی موسی ندی میں قیامت خیز طغیانی آئی تھی۔ کتابوں اور اخباروں میں لکھا ہے کہ اس تباہی اور بربادی کی نظیر پچھلی تاریخ

میں ملنا ناممکن ہے۔ اس طوفان سے حیدر آباد کی کایا پلٹ ہوگئی۔ بیسیوں محلوں، لاکھوں مکانات اور ہزاروں نفوس انسانی کا اتلاف اور اس کے ساتھ کروڑوں روپیہ کا مالی نقصان ہو گیا تھا (زمانہ کانپور (صفحہ ۱۳۵، دسمبر ۱۹۰۸ء) مسز نائیڈو گھر گھر جا کر سیلاب زدگان کی مدد کرتی رہیں۔

میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ مسز نائیڈو اقبال کی زبردست مداحوں اور قدر دانوں میں تھیں۔ اقبال سے کئی دفعہ ہندوستان اور لندن میں مل چکی تھیں۔ غالباً آپس میں خط و کتابت بھی تھی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے اس واقعہ سے متعلق میں عطیہ فیضی سے متفق نہیں ہوں۔ مس سروجنی داس کوئی اور خاتون ہونگی۔

(۶) ''اقبال اور یادگار دربار ۱۹۱۱ء''۔

کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں بمقام دہلی جارج پنجم کے جشن تاجپوشی کی تقاریب نہایت اہتمام و احتشام کے ساتھ منائی گئیں۔ بادشاہ اور ملکہ ان میں خود موجود تھیں۔ دنیا کے اطراف و اکناف اور ہندوستان سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ دہلی میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ سینکڑوں راجگان، رئیسانِ اعظم، باکمال اہل فنون، علما، ادبا اور شعرا جشن میں موجود تھے۔ دین محمد ایڈیٹر میونسپل گزٹ لاہور و مالک ''یادگار آفس'' نے اس موقعہ پر ''یادگار دربار ۱۹۱۱ء'' کی تین ضخیم جلدیں مرتب کیں جو ۱۹۱۶ء میں لاہور سے چھپیں۔ کتاب اتنی کمیاب ہے کہ اقبالیات کی کتابوں میں اس کا حوالہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ تیسری جلد کا حجم ۸×۲۲ کے ۸۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اور اقبال کا تذکرہ اسی میں موجود ہے۔

اقبال دہلی دربار میں موجود تھے اور کتاب ۱۹۱۱ء میں ترتیب دی گئی اور پانچ سال کے عرصے کے بعد معرض وجود میں آئی۔ تینوں جلدیں نہایت مفید ہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں بطور ریفرنس موجود ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں دہلی کا دارالخلافہ پنجاب کے حدود اربعہ میں شامل تھا اور پنجاب کے لفٹننٹ گورنر ہز آنر لوئی ڈین بہادر تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے حکم سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا جس کے صدر ڈاکٹر اقبال بنائے گئے تھے۔ مشاعرے کے لئے ہندوستان بھر کے شعرا کی تہنیتی نظمیں (قصیدے) منگوائی گئی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف نے برجموہن، دتاتریہ کیفی کی نظم کو اول پوزیشن پر قرار دیا تھا۔ تذکرے میں اقبال کے بارے میں نئی باتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو پہلی مرتبہ سامنے آرہی ہیں۔ تاجپوشی کے سلسلے میں اردو رسالوں کے خصوصی شمارے تصویروں کے ساتھ شائع ہوئے۔ سب سے اعلیٰ ترین نمبر ''ادیب'' الہ آباد کا تھا۔

(۷) اقبال کے ایک ہندو شاگرد: پنڈت چاند نرائن تخلص چاند سر تیج بہادر سپرو کے داماد اور مشہور ادیب و شاعر پنڈت شیو نرائن شمیم کے پوتے تھے۔ شمیم اقبال کے شاگرد، ان کے بیٹے

کنور نرائن رینہ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم کی حیثیت سے اقبالؔ کے شاگرد تھے۔ غالباً یہ ۱۹۰۱ سے ۱۹۰۳ء کا زمانہ تھا۔ سپرو صاحب کی وساطت سے چاند بھی اقبالؔ کے شاگرد تھے۔ اس طرح چاند سراپا اقبالؔ کے شاگرد تھے۔ یعنی بیٹا، باپ اور دادا تینوں اقبال کے شاگرد تھے۔ مضمون میں اقبال کی یہ غیر مطبوعہ غزل اور متعدد شعر درج ہیں۔

عجیب چیز ہے یہ بادۂ محبت بھی   ہزار تلخ ہو پر بے مزا نہیں ہوتا

ہزاروں دوست ہیں پر اسطرح سے رہتا ہوں   جہاں سے جیسے کوئی آشنا نہیں ہوتا

عجیب چیز ہے مغرب کی زندگی جس سے   دماغ ہوتا ہے دل آشنا نہیں ہوتا

نماز پڑھتا ہوں اور بے نماز ہوں اقبالؔ
یہ قرض وہ ہے کہ مجھ سے ادا نہیں ہوتا

(۸) اقبالؔ ...... آیت اللہ خامنہ ئی کی نظر میں: حضرت آیت اللہ خامنہ اسلامی جمہوریہ ایران کے مذہبی پیشوا ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۶ میں طہران میں علامہ اقبال بین الاقوامی کانفرنس میں علامہ پر ایک مبسوط مقالہ پڑھا، جس میں برصغیر کے ممتاز دانشور ڈاکٹر جاوید اقبال بھی موجود تھے۔ اہل ایران کو ہمیشہ اقبال سے دلچسپی رہی ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ آج سے تقریباً اسی سال قبل ایران کے ایک عالم آقائے محترم سید محمد علی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن نے ''اقبال و شعر فارسی'' پر ایک مقالہ پڑھا۔ پورا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ آقائے محترم ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''غالبؔ کے بعد چشم ہندوستان اقبال کی وجہ سے پرنور ہے۔ کسی قدیم استاد نے اساتذہ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے اس کو اس طرح ختم کیا ہے۔

ز خسروؔ چو نوبت بہ جامیؔ رسید   بہ جامیؔ سخن را تمامی رسید

غالبؔ مرحوم نے اس پر اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔

ز جامیؔ و عرفیؔ و طالبؔ رسید   ز عرفیؔ و طالبؔ بہ غالبؔ رسید

اب میں اس پر ان دو شعروں کا اضافہ کرتا ہوں۔

چو غالب ز ہندوستان رخت بست   بجائے وے اقبالؔ دانا نشست

یقین داں سخن دانائی باستاں   بماند بہ ہندوستان جاودان

جب اقبال کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کا وطن صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام دنیا ہے تو انہوں نے فارسی میں شاعری شروع کی تا کہ ہندوستان کے

علاوہ دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے کان تک ان کی آواز پہنچ سکے۔ چنانچہ اسرار خودی کے دیباچے میں خود کہتے ہیں۔

"گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت — خامۂ من شاخ نخل طور گشت

پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام"

(ب) اقبالیات کے نئے گوشے:

کتاب میں چودہ مضامین ہیں۔ یہ بھی مضامین نایاب رسالوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعارف نہایت مختصر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ **خدنگ نظر لکھنو:** یہ ماہنامہ ستمبر ۱۸۹۷ء میں لکھنو میں جاری ہوا اور سات سال کی عمر میں جوان مرگی کا شکار ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور ادیب، شاعر، صحافی، شریف النفس، با اخلاق مگر مفلس اور مصائب زدہ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی تھے۔ رسالے کو یہ شرف حاصل تھا کہ اس میں اقبال پر اولین تنقیدی مضمون نئے انداز میں غیر مطبوعہ کلام اور ایک خوبصورت تصویر کے ساتھ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ مضمون نگار شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن لاہور تھے۔ نظر مضمون سے پہلے تمہیدی نوٹ میں رقمطراز ہیں:۔

> "ذیل میں مسٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کی شاعرانہ لائف درج ہے، جو ہمارے نامور ہم عصر شیخ عبدالقادر بی۔ اے ایڈیٹر مخزن کے تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ مسٹر موصوف کی لائف لکھنے کے لئے شیخ صاحب سے زیادہ تمام پنجاب میں دوسرا اہل قلم موزوں نہ تھا جو سخن سنجی میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے معزز ہم عصر کو بار بار مجبور کیا کہ وہ اپنے قابل فخر دوست کے وہ شاعرانہ حالات قلمبند فرمائیں جو وقتاً فوقتاً ان کی نکتہ سنج نظر سے گزرتے ہیں۔ اس لائف کے متعلق ہمیں اتنا جتا دینا ہے کہ یہ پرانے اصول تذکرہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ لیکن جدید فن گرافی کا کوئی پہلو فروگذاشت نہیں ہونے پایا ہے"۔ ایڈیٹر۔

مضمون کے آخر میں شیخ صاحب نے بعض مفید اور اہم باتوں سے نقاب ہٹا دی جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ یعنی لوگوں نے اقبال کی مشکل پسندی پر اعتراض کیا جو اقبال کے لئے حوصلہ شکنی کے مترادف تھا۔ اور انہوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا قصد کیا تھا۔ دوستوں نے سمجھایا کہ ایسا کرنے سے

قوم وملت کو نقصان پہنچے گا۔ اسی زمانے میں ملک کے طول وعرض سے اقبال کے حق میں حوصلہ افزائی کی تعریفیں آنے لگیں۔ علامہ شبلی نے درج ذیل الفاظ میں سراہا تھا۔

''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہونگی تو لوگ آپ کو ڈھونڈیں گے''۔

آخر کار اقبال نے قوم وملت کے حساس افراد کو احساس خودی کے پاکیزہ جذبے سے اتنا بار آور کیا کہ اس کا بیش بہا ثمرہ پاکستان کی صورت میں نمودار ہوا۔

۲۔ **علم الاقتصاد:۔** اقبال کے ماہرین کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اقبال کی یہ پہلی تصنیف ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مخزن کی ایک اطلاع کے مطابق کتاب کا ایک حصہ اپریل ۱۹۰۴ء میں ''آبادی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ پوری کتاب دسمبر کے آخر میں چھپی اور جنوری ۱۹۰۵ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ بقول شیخ عبدالقادر ۱۹۰۲ء میں اقبال کی ''نثر میں مضمون سیاست مدن پر ایک بیش بہا اور جامع تصنیف زیر تصنیف ہے''۔ کتاب کا مسودہ اقبال نے تین سال کے عرصے میں مکمل کیا تھا۔ پھر علامہ شبلی کو نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے باوجود کتاب میں بعض تسامحات رہ گئے ہیں۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن مجھے کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنو میں ملا۔ غالباً یہ وہی نسخہ ہے جو اقبال نے شبلی کو بھیجا تھا۔ نسخہ مکمل اور اچھی حالت میں چھوٹی تقطیع پر ہے۔ البتہ سرورق جس پر اقبال کے دستخط تھے معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اڑا دیا ہے۔ مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اقبال کے معترض (تنقید ہمدرد) حکیم برہم ایڈیٹر سہ روزہ ''ریاض الاخبار'' گورکھپو کا مفید تبصرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ **اقبال اور صوفی:۔** صوفی خالص ادبی ماہنامہ رسالہ تھا جو پنجاب کے ملک محمد الدین آوان کی ادارت میں جنوری ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے شمارے نہایت کم یاب ہیں۔ مجھے مختلف کتب خانوں میں اس کے اکثر شمارے بوسیدہ اور خستہ حالت میں معمولی خاکی اخباری کاغذ میں دستیاب ہوئے۔ صوفی کے ''شذرات'' (ایڈیٹوریل) لکھنے والوں میں مشہور مزاح نگار اور گلابی اردو کے موجد ملا رموزی بھی شامل تھے۔ ایڈیٹر صاحب کو جہاں بھی اقبال کا مطبوعہ کلام ملتا تھا وہ اسے دوبارہ صوفی کی زینت بناتے تھے۔ موصوف اقبال سے بہت مرعوب تھے۔ وجہ یہ ہے کہ صوفی نے اقبال کی نظم ''والدۂ مرحومہ کی یاد میں'' پہلی مرتبہ اقبال کی اجازت کے بغیر چھ سال بعد اگست ۱۹۲۰ء میں شائع کی۔ اس پر اقبال چراغ پا ہو گئے اور صوفی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی ٹھان لی۔ اقبال کی رنجیدگی کی وجہ سے وہ کلام اقبال نہایت احتیاط سے چھاپتے تھے۔ اقبال صوفی کے متعلق فوق کو ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''محمد دین (ایڈ ر صوفی) آپ سے بہتر نہیں ۔ وہ آدمی معاملہ فہم اور کاردان ہے''۔

صوفی کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی طرف سے اقبال کے جلسوں کی رپورٹنگ ذمہ دار نمائیدے کرتے تھے ۔ جب آل انڈیا مسلم کانفرنس کا تاریخ ساز اجلاس ۲۱ مارچ کو لاہور میں منعقد ہوا تو صوفی میں اقبال کا خطبہ ''اپنا فرض ادا کرو یا مرجاؤ'' کے عنوان سے وہی چھپا جو اقبال نے پڑھا تھا۔ صوفی نے یہ مضمون اپریل ۱۹۳۲ء میں حرف بہ حرف چھاپا تھا۔ اس کے بعد خطبے کو ادارہ صوفی نے کتابچہ کی صورت میں کافی تعداد میں چھاپا اور مفت تقسیم کیا۔

ڈاکٹر صابر کلوروی اپنی فاضلانہ کتاب (کلیات باقیات شعر اقبال صفحہ ۵۰۵) میں ''مدینے کے کبوتر کی یاد'' والی نظم کو جو صوفی میں چھپی تھی یہ کہکر الحاقی قرار دیتے ہیں کہ وہ ظفر علی خان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ کسی کی نظم کسی کے مجموعہ میں الحاق نہیں کہی جاسکتی ہے جب تک کہ اس کے لئے ہمعصر شہادتیں موجود نہ ہوں۔ اگر نظم اقبال کی تصنیف نہ ہوتی تو وہ اس کی تردید کرتے۔ صوفی کلام اقبال چھاپنے میں بہت محتاط رہتا تھا۔ اور ذمہ داری نبھاتا تھا۔ اقبال کے دوست اور مشہور شاعر وصحافی جناب سالک صاحب اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں ''مدینے کے کبوتر'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:-

> ''۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینہ منورہ کا ایک کبوتر پالا تھا۔ اس کے دانے دُنکے کی فکر بہ نفس نفیس کیا کرتے تھے۔ نومبر کی بیس کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہوگیا۔ اس واقعہ سے اقبال بہت متاثر ہوئے۔ اور ایک نظم لکھی۔ پہلا شعر یہ تھا۔
>
> رحمت ہو تری جان پہ اے مرغ نامہ بر
>
> آیا تھا اڑکے ذروۂ بام حرم سے تو

اس کے بعد سالک صاحب حاشیے میں لکھتے ہیں:-

> ''پوری نظم'' ستارۂ صبح میں ۲۴ نومبر کو'' چھپی تھی''۔

''ستارۂ صبح'' ظفر علی خان کا اخبار تھا۔ اقبال کا کلام ستارۂ صبح کے علاوہ پیسہ اخبار لاہور وغیرہ میں بھی چھپتا تھا۔

۴۔ **اقبال اور آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس**۔ یہ کانفرنس لکھنؤ کی بارہ دری سنگی واقع قیصر باغ میں ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر 1912ء کو ہوئی تھی۔ راجہ صاحب محمود آباد اس کے میزبان تھے۔ ماہرین اقبال نے کانفرنس کے ایک لغو اور گمراہ کن واقعہ کو ایسا اچھالا جو نہایت افسوسناک ہے۔ اگر اس میں ذرہ برابر حقیقت ہوتی تو کانفرنس میں اقبال کے حق میں جو شعلہ فشاں تقریر سید سجاد حیدر یلدرم نے

کی اس پر لکھنو کے لوگ اور دوسرے ارکان سراپا احتجاج بن جاتے۔ یہ مضمون چند سال قبل لاہور کے مشہور ''صحیفہ'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اور آج تک اس کی تردید کرنے کی جسارت کسی نے نہیں کی۔ یلدرم کی تقریر کے چند جملے سماعت فرمایئے:-

> ''کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ڈاکٹر اقبال لکھنؤ آئے تو کوئی اس کا استقبال تک نہ کرے۔ بلکہ اس کے آنے تک کی خبر نہ ہو۔ اگر خبر ہو بھی تو بحیثیت یک بیرسٹر کے۔ یہ اقبال اس برتاؤ کا مستحق تھا؟ کیا اس دلدادۂ ادب اور ادیب کی یہی قدر ہو سکتی تھی''؟

بعض لوگوں کا یہ کہنا بھی غلط اور بے بنیاد ہے کہ جب اقبال لکھنو میں تھے تو ایک دن وہ مشہور مرثیہ گو جناب پیارے صاحب رشید کے گھر گئے اور وہاں بغیر کسی فرمائش کے اپنا اردو کلام سنایا، اور طالب داد ہوئے۔ اس پر رشید صاحب نے کہا کہ آپ نے کس زبان میں کلام سنایا، اردو یا فارسی میں؟ معلوم نہیں کہ ایسی لغویات سے لوگوں کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال قومی ترانہ، شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ بلند پایہ نظموں کے مصنف ہو چکے تھے اور دنیائے اردو ان کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کر چکی تھی۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو کم از کم آغا اشہری نے پیارے صاحب رشید کے سوانح حیات ''حضرت رشید'' میں اس کا ذکر ضرور کیا ہوتا۔ اشہری نے یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں مرتب کر کے شائع کی۔ 'حضرت رشید'' کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۹۲۲ء کے اعداد نکلتے ہیں۔ مزید برآں میں نے رشید صاحب کے مایہ ناز شاگرد حضرت شدید لکھنوی اور ذمہ دار حضرات سید مسعود حسن رضوی، جعفر علی خان اثر، سید علی عباس حسینی وغیرہ سے اس بارے مین دریافت کیا، انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ معاصرین رسائل و اخبارات کو بھی دیکھا۔ وہ بھی خاموش ہیں۔ میری رائے میں اس قسم کے افسانے اقبال کے انتقال کے بعد ان کی عظمت وشہرت کو گزند پہنچانے کے لئے تراشے گئے جن کا کوئی حاصل نہیں۔

۵۔ **اقبال اور معارف:-** ''معارف'' اعظم گڑھ اقبال کا پسندیدہ رسالہ تھا۔ اس میں موصوف کی متعدد نظمیں اور ''اسرار خودی'' پر مستشرقین کے کئی انگریزی مضامین کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ معارف میں غالباً سب سے پہلے اقبال کی تصنیف ''رموز بیخودی'' پر تفصیلی تبصرہ اپریل ۱۹۱۸ کے شمارے میں سید سلیمان ندوی کا شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ''خضر راہ'' پر بھی پہلی مرتبہ ندوی صاحب کا تبصرہ چھپا تھا۔ راقم نے اسرار خودی اور رموز بیخودی سے متعلق تمام اہم اور نایاب مضامین معارف کے حوالے سے ''معرکۂ اسرار خودی'' میں شامل کئے ہیں۔ جناب اکرام الحق کا مضمون ''فلسفہ'' اقبال''

معارف کے حوالے سے پہلی بار منظر عام پر آرہا ہے۔ معارف جنوری ۱۹۲۳ (صفحہ ۸) میں درج ہے کہ:-

''سال نو کے عجائبات خطاب میں ڈاکٹر اقبال کا سر اقبال بن جانا ہے۔ اگر حکومت نے ہمارے قومی شاعر کی یہ علمی قدردانی کی ہے تو یہ فال نیک مبارک ہو۔ اور اسی کے ساتھ اس امر کا تازہ ثبوت ہے کہ ہماری ملکی زبان کے خدمت گزاروں کی قدردانی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک ان کے خیالات رومن خط میں ان کے پیش نظر نہ ہوں۔ ڈاکٹر اقبال بیس برس سے مختلف مشرقی زبانوں میں اپنے افکار نادر جذبات عالیہ کا اظہار کر کے قلم سے ان کے بعض ''رموز و اسرار'' شاعرانہ انگلستان کی بزم سخن میں جا کر فاش ہوں گے''۔

۶۔ **اقبال اور علی گڑھ میگزین:-** علی گڑھ محمڈن کالج نے یونیورسٹی بننے سے پہلے کئی ادبی رسالوں کو جنم دیا تھا۔ ان سب کے بارے میں مضمون ہذا میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے رجسٹرار اور شعبۂ اردو کے صدر سید سجاد حیدر مقرر ہوئے تو علی گڑھ میگزین'' ۱۹۲۱-۱۹۲۲ء میں وجود میں آیا۔ میگزین کے مختلف شماروں میں اقبال کی نظمیں اور ان کے بارے میں مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ راقم نے اقبال کے سلسلے میں ۱۹۳۸ء تک کے سبھی شمارے دیکھے ہیں۔ اقبال ابھی زندہ ہی تھے کہ علی گڑھ میگزین کا ''اقبال نمبر'' مرتب کر دیا گیا۔ یہ فروری ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ اقبال نمبر کی شیرازہ بندی ہو رہی تھی اور شعبۂ اردو اقبال کی خدمت میں اسے پیش کرنے ہی والا تھا کہ اقبال کی سنائی سنائی گئی۔ اقبال کے انتقال کی وجہ سے میگزین کے ابتدائی چند صفحے بڑھا دیے گئے۔ میگزین کے جتنے بھی شمارے میرے مطالعہ میں رہے ہیں ان کا ذکر مضمون میں کیا گیا ہے۔

۷۔ **اقبال اور نیرنگ خیال لاہور-** یہ مشہور زمانہ رسالہ فن طب کے ماہر اور ممتاز ادیب حکیم محمد یوسف حسن کی ادارت میں جولائی ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ جب اس کا پہلا شمارہ اقبال کی نظر سے گزرا تو انہوں نے ۷ اگست کو حکیم صاحب کے نام ذیل کا خط بھیجا تھا:-

''نیرنگ خیال جو حال میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

ایڈیٹر دونوں جوان ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔

جناب عبدالرحمن چغتائی کی تصویر تحفۂ لیلی بہت خوب ہے۔ پڑھکر مسرت ہوئی۔
دیکھئے اب ''تحفۂ قیس'' کب نکلتا ہے''۔

نیرنگ خیال میں اقبال کا غیر مطبوعہ کلام بھی شائع ہوتا تھا اس کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ اس کے اکثر شمارے باتصویر اور باکمال مصور چغتائی صاحب کے آرٹ سے مزین ہوتے تھے۔ یہ تصویریں بہترین آرٹ پیپر پر شائع ہوتی تھیں۔ مارچ واپریل ۱۹۲۵ء (صفحہ ۱۰۳) میں حکیم صاحب ''تصاویر'' کے تحت لکھتے ہیں:۔

''شبیہہ علامہ سر محمد اقبال مشرق کیا دنیا کے بہترین شاعر کا فوٹو ہے۔ یہ اس وقت کھنچا گیا تھا جب حکیم آئن سٹین کا نظریہ اضافیات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ بڑا بلاک کیوں کہ صاف نہیں تھا، اس لئے دوسرا بلاک بھی شامل کر دیا گیا، تا کہ حسرت دیدار نہ رہ جائے''۔

یہ فوٹو نایاب اور ۱۹۲۵ء سے کئی سال قبل ماہر فوٹوگرافر سے کھنچوایا گیا تھا۔

نیرنگ خیال کے جتنے بھی شمارے اقبال کی زندگی میں شائع ہوتے تھے میں نے کم وبیش بھی کا مطالعہ دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ کچھ شمارے ایسے بھی ہیں جن کے مضمون نگار اقبال کے جلسوں میں موجود رہتے تھے۔ ان میں ایک ماہر اقبال مولوی محمد عبداللہ (لاہور) کا نام لیا جاسکتا ہے جو علامہ کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے تھے۔ وہ ایک چشم دید واقعہ متذکرہ بالا نیرنگ خیال (صفحہ ۱۹) میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

''حال ہی میں سر اقبال نے باوجود ذمہ دار ہستیوں کے سکوت کے عالم اسلامی میں شریعت اسلام کی بے حرمتی کا مشاہدہ کرتے ہوئے جو حقوق تزویج، طلاق، وقف، حدود وغیرہ میں رونما ہو رہی ہے بہت متاثر ہو کر اور شاعرانہ شخصیت کو چھوڑ کر ایک مقنن اسلام کی حیثیت سے شریعت اسلام کا احترام کرتے ہوئے جہاد بالسان اس خارزار وادی میں کیا جو فی زمانہ جہاد بالسیف سے افضل کہا جاسکتا ہے۔ یعنی آپ نے ''اجتہاد فی الاسلام'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون اسلامی قوانین کو ملحوظ رکھتے ہوئے بطور استشارہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسے ایک صحیفہ عمل کہنا بے جا نہ ہوگا اُسے آپ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حبیبیہ ہال میں پڑھا۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ مذہب اسلام یہ ہے کہ اختلافات فرق اسلام کی قیود کو بالائے

طاق رکھ کر دائرۂ اسلام میں رہ کر محض معاملات میں استنباط کیا جائے اور جنھوں نے آپ کے مضمون سے یہ سمجھا ہے کہ اسلام کو ضروریات کے تابع کیا جائے یا اجتہادات ائمہ دین متقدمین کو منسوخ کر دیا جائے وہ غلطی پر ہیں، حاشا اللہ ان کا تو اس میں وسوسہ تک بھی نہیں گزرا۔

آپ نے ایک مسلمان قانونی مجلس کا انعقاد کیا ہے جس کا اہم ترین فرض یہ ہوگا کہ اس امر کی اہمیت جتائے کہ محض مسلمان حکام علم مقدمات میں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ صادر کریں''۔

اقبال نمبر- ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء- نیرنگ خیال کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اقبال نمبر باتصویر نہایت حسن اہتمام سے شائع کیا۔ ایڈیٹر صاحب ''شذرات'' میں لکھتے ہیں:-

''ہندوستان میں اقبال کو جاننے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہوگی۔ لیکن اقبال کو سمجھنے والوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ نہ ہوگی۔ اور یہ حال دنیا کے ہر بڑے شاعر کا ہوتا ہے۔ لیکن اقبال نمبر کی اشاعت کے بعد توقع ہے کہ ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ جو ان مضامین کو غور و فکر سے پڑھے گا۔ اقبال کے پیغام کو سمجھنے لگے گا تو ان میں اس امر کی تحریک پیدا ہوگی کہ وہ اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ کو سبقاً سبقاً پڑھیں''۔

مشہور انشاپرداز، صحافی اور نقوش لاہور کے ایڈیٹر جناب محمد طفیل صاحب بجا فرماتے ہیں کہ:-

''اقبال پر سینکڑوں رسالے اور ہزاروں کتابیں موجود ہیں، مگر یہ نمبر ہزاروں ہی میں ممتاز سیکڑوں ہی پر بھاری۔ اور یہ بھی کہ جب تک اقبال زندہ ہے اس پر کام کرنے والے زندہ ہیں۔ یہ نمبر بھی زندہ ہے اور حکیم صاحب بھی زندہ''۔

نیرنگ خیال کے اہم لکھنے والوں میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں۔

منشی محمد الدین فوق، راغب حسین کلکتہ، چراغ حسن حسرتؔ، قاضی عبدالغفار، مالک رام، اسلم جیرجپوری، سید محمد رشید فاضل، چودھری محمد حسین، ممتاز حسن، غلام مصطفیٰ تبسم، مولوی محمد عبداللہ، یوسف سلیم چشتی، سید فرید جعفری۔

جب اقبال نمبر شائع ہوا تو متعدد اخباروں اور رسالوں میں اس پر تبصرہ چھپے تھے۔ اردو کے مشہور رسالہ ''زمانہ'' کانپور بابت اکتوبر ۱۹۳۲ (صفحہ ۲۴) کے ایڈیٹر ''علمی خبریں اور نوٹ'' کے تحت لکھتے ہیں:-

''لاہور کے الوالعزم نیرنگ خیال نے حال میں ڈاکٹر اقبال کے نام ساڑھے چار سو صفحات کا ایک ضخیم اقبال نمبر شائع کیا ہے اس میں علامہ ممدوح کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر بہت قابل قدر مضامین ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ حجم اور مضامین وتصاویر وغیرہ بھی لحاظ سے یہ خاص نمبر نیرنگ خیال تمام سابقہ نمبروں سے سبقت لے گیا ہے جس پر ہم اپنے ہمعصر کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں''۔

۸۔ اقبال اور کلیم دہلی۔ ''کلیم'' ماہانہ ادبی رسالہ تھا جس کے ایڈیٹر جوش ملیح آبادی تھے۔ جوش نے اخراج دکن کے بعد ۱۹۳۴ء میں اپنے تخلص کے ساتھ ''جوش مرحوم'' اس لئے لکھنا شروع کیا تھا کہ ان کی عیش وطرب کی زندگی تنگدستی سے ہمکنار ہونے لگی تھی۔ مسز نائیڈو اور چند مخلص دوستوں کے تعاون سے ''کلیم'' پہلی جنوری ۱۹۳۶ء کو جاری کیا گیا۔ کلیم کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ اس کے تمام شمارے کسی کتب خانے میں یکجا نہیں ملتے ہیں۔ مضمون میں جوش کی شاعرانہ عظمت یا ان کی شخصیت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی، بلکہ پورا زور ''کلیم'' پر دیا گیا ہے۔

''کلیم'' میں علامہ اقبال پر جتنے مضامین شائع ہوئے تھے وہ پہلی مرتبہ شامل کتاب کئے گئے ہیں۔ یہ امر بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جوش علامہ کو عظیم شاعر مفکر تسلیم کرتے تھے اور علامہ بھی جوش کے ممدوح اور قدردان تھے۔ جب اقبال کا انتقال ہوا تو جوش نے ''کلیم'' میں اقبال کی شخصیت اور شاعری پر بے مثال اداریہ لکھا۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں اور بے ساختہ کہا ۔

واپس آ، اقبال تجھ بن دہر تنگ و تار ہے
تیرے بدلے جوش مرنے کے لئے تیار ہے

جوش زندگی کے آخری حصے میں تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا
مرے افکار پر کی سنگباری اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا
ارے! نادان نقادوں کے ہاتھوں مری نظموں کو سولی پر چڑھایا

تعصب کا ثمرہ یہ ملا کہ قادرالکلام شاعر وشار، شاعر انقلاب، شاعر مصور جذبات اور شاعر فطرت اپنی زندگی میں ناکام اور حسرت زدہ رہ گئے تھے۔ مرنے سے قبل ایک طویل خط مجھے لکھا، جس میں اپنی بیماری اور مالی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا۔ ان کے پاؤں میں ورم تھا اور سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی اور علاج ومعالجہ کے محتاج تھے۔ خط کا آخری جملہ یہ تھا:-

''میں تو اب سکڑ گیا ہوں۔ سمجھیے کہ مرحوم ہو چکا ہوں''۔

یہ زمانے کی بدبختی اور کجروی ہے کہ اس نے جوش کو نہیں پہچانا اور صاحبانِ اقتدار کے ہاتھوں سے انہیں مرنے کے بعد بھی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جب اسپتال میں تارِ نفس ٹوٹ گیا اور جوش کا سازِ زندگی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تو کہا گیا کہ میت کو گھر تک پہنچانے کے لئے ایمبولینس میں پٹرول نہیں۔ دنیا کا دستور ہے کہ جب کوئی صاحبِ علم و فن مرتا ہے تو لوگ تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے ہیں اور سرکار کی طرف سے پس ماندگان کو تعزیت دی جاتی ہے۔ جوش کے جنازے میں کوئی سرکاری افسر بھی نہ تھا۔ بہر حال اگر چند لوگوں نے کس مپرسی کی حالت میں سپردِ خاک بھی کیا تو کیا ہوا۔ بقول اقبال ۔

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

جوش کے انتقال پر حفیظ جالندھری نے کہا تھا کہ ''جوش کو مرنے سے پہلے مر جانا چاہئے تھا''۔ اس پر فیض احمد فیض نے برہمی کا اظہار کیا تھا (نوائے وقت مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء)

۹۔ اقبال اور ایمان۔ ''ایمان'' امرتسر کا ایک پندرہ روزہ اخبار تھا جو عبدالحمید کی ادارت میں ۱۹۳۱ء میں جاری ہوا تھا۔ اس میں اقبال کے بارے میں چند نئی باتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک اشاعت میں لکھا گیا ہے کہ:۔

''دنیا پوچھ رہی ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان کس طرح اقبال کے درجے پر فائز ہو گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اقبال کا دل حضرت محمدؐ کے عشق میں گداز تھا اور اقبال کا اصل مشن شاعری نہ تھا، بلکہ عشق و ایمان تھا۔ اور اب یہی عشق و ایمان دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں اس کی کامیابی کے ضامن ہونگے''۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں مرقوم ہے کہ:۔

''علامہ اقبال عہدِ نبوی میں سیاسی اور اجتماعی حالت پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ صاحب موصوف کی درخواست پر چند علمائے ازہر کو مقرر کیا گیا ہے۔ کہ وہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کریں۔ معلومات فراہم ہونے پر شیخ ازہر کی نظرِ ثانی کے بعد علامہ موصوف کو بھیجیں گے''۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں صفحہ ۲ کالم نمبر ۱ میں ''یوم اقبال'' کے مضمون میں لکھا ہے کہ:۔

''........غلامی کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان نے اپنے ایک

بڑے اور لائق احترام رہنما کی بزرگی کا اعتراف کیا ہے۔ ورنہ آج سے پہلے اور آج بھی جو کچھ ہم لوگ کر رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان صاحب ''ٹوڈی'' ہیں۔ مولانا شوکت علی صاحب ''بے مغز'' ہیں۔ مولانا حسرت صاحب (موہانی) ''دیوانے'' ہیں۔ مولانا محمد علی صاحب ''اچھے'' نہ تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کیا تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ''گمراہ'' ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ ہے کہ جس قدر مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کی مٹی پلید کی ہے اور مسلمانوں کو مسلمانوں نے گرایا ہے اور اپنے بھائیوں کی اپنی قوم کو اور اپنے اہل کمال کی بے قدری کی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اس ناقدردانی اور ناقدر شناسی میں ہمارا مقابلہ نہیں کر سکی۔ نہ کر سکتی ہے اور شاید نہ آئندہ بھی کر سکے۔

ڈاکٹر سر اقبال مدظلہ العالی کس قدر خوش قسمت انسان ہیں کہ بیسویں صدی کے مسلمانان ہندوستان ان کی زندگی میں ان کی قدر و منزلت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اللہ اکبر! یہ واقعہ ایک معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک واقعی معجزہ ہے''۔

(ج) **ذیل** میں اب ہم اقبال کے بارے میں ان پرانے نایاب رسالوں اور اخباروں میں سے چند ایک واقعات نمونے کے طور پر درج کرتے ہیں جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ کتاب الگ سے زیر ترتیب ہے۔

(۱) **اقبال** (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء) کا ادبی سفر باقاعدہ طور پر مخزن (اپریل ۱۹۰۱ء) کے پہلے شمارے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نظم کا عنوان ''کوہستان ہمالہ'' ہے۔ ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کے یہ تعریفی جملے قابل ذکر ہیں:-

> ''شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جو علوم مغربی و مشرقی دونوں میں صاحب کمال ہیں انگریزی خیالات کی شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعراے انگلستان ورڈسورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں''۔

ایڈیٹر کے اس تمہیدی نوٹ کا ذکر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔ نظم دوسری مرتبہ ''انتخاب مخزن'' جلد اول مطبوعہ مخزن پریس دہلی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ مخزن میں ۱۲ بند پر مشتمل ہے۔ بانگ درا میں یہ چار

بند یعنی مخزن کے ۸، ۹، ۱۰، ۱۲ حذف کردیے گئے۔ مخزن میں بند ۹ کے پہلے بند ۱۰ کے دوسرے مصرعوں کے نوٹ اقبال نے اس طرح درج کئے ہیں۔

اصول حق ۔ بدھ مذہب کی طرف اشارہ ہے

کوہ المپس ۔ یونان میں ایک پہاڑ ہے جس پر قدیم یونانی خیالات کے مطابق دیوتاؤں کے دربار ہوتے تھے۔

مخزن کا پہلا بند یوں ہے ۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشور ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں
تیری ہستی پر نہیں باد تغیر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

بانگ درا میں بند کا پانچواں اور چھٹا مصرعہ یوں بدل دئے گئے ہیں ۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

بانگ درا میں نظم کا نام ''ہمالہ'' رکھا گیا۔ مزید تفصیلات کے لئے میری کتاب (کلام اقبال......) دیکھی جاسکتی ہے۔ مخزن کے ابتدائی شماروں سے ہی اقبال کا شاعرانہ کردار چمکنے لگا۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان شہرت کا نقارہ بجنے لگا تھا۔ مخزن کے علاوہ رفتہ رفتہ اردو کے دوسرے رسالوں میں بھی کلام اقبال کی پذیرائی ہوتی رہی۔ چنانچہ اردو کے مرکز لکھنو کے ''خدنگ نظر'' میں جنوری ۱۹۰۲ء میں پورے اہتمام کے ساتھ مع تصویر نظر آنے لگے۔ اسی زمانے میں حسرت موہانی کے ماہنامہ رسالہ ''اردوے معلی'' علی گڑھ جلد نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء، (صفحہ ۴۶) میں اقبال کی نظم ''پیام صبح'' کے عنوان سے ۱۲ شعر میں شائع ہوئی۔ پروفیسر گیان چند جین (ابتدائی کلام اقبال .....صفحہ ۲۳۱، ۱۱۴) اور دوسرے لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ نظم سب سے پہلے ''فتنہ وعطرفتنہ'' گورکھپور میں چھپی تھی۔

نظم کے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے۔

ع ۔ طلسم ظلمت شب سورۂ والنور سے توڑا ۔

لکھنو کے اودھ پنچ نے ''سورۂ والنور'' پر اعتراض کیا کہ قرآن مجید میں سورۂ والنور کہیں نہیں لکھا ہے۔ اودھ پنچ لکھنو دنیائے اردو کا مشہور ترین ظریفانہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ یہ کم وبیش ہر ممتاز شاعر، ادیب، صحافی،

31
LIFE IS PLEASURE

ہمارا دیس

ہندوستانی زبانون مین اور خصوصاً اردو مین حب الوطنی اور جوش ملی کے متعلق ایسی نظمین شاذ و نادر لکھی گئی ہونگی جنمین اس ملک کے خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبہ حب وطنی کا اظہار ہو۔ انگلستان مین ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان زد ہوتے ہین۔ اور وہان کے باشندون کے دلون پر انکا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانہ مین غرض ہمیشہ ان گیتون کی بدولت انکے دلون مین اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے۔ اور انکی عظمت برقرار قائم رکھنے کا خیال ہوا کرتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہین کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انھون نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے ملک بھر مین ہر دلعزیز و مفید ثابت نہو۔ ہمارا ہر ایک چھوٹے بڑون خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونے کی مستحق ہے۔

سارے جہان سے اچھا ہندوستان ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلین ہین اسکی یہ گلستان ہمارا

غربت مین ہون اگر ہم رہتا ہے دل وطن مین ۔۔۔ سمجھو وہین ہمین بھی دل ہو جہان ہمارا

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا ۔۔۔ ہندی ہین ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسمان کا ۔۔۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسبان ہمارا

گودی مین کھیلتی ہین جسکے ہزارون ندیان ۔۔۔ گلشن ہے جسکے دم سے رشک جنان ہمارا

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھکو ۔۔۔ اترا ترے کنارے جب کاروان ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہان سے ۔۔۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہین ہماری ۔۔۔ صدیون سے آسمان ہے نامہربان ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہین جہان مین
معلوم ہے ہمین کو درد نہان ہمارا

اقبال

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا ۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں ۔ گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا

اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو ۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔ صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

۱۰ اگست ۱۹۰۴ء — اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے "ترانۂ ہند" کا اصلی مسودہ جو مرحوم نے سنہ ۱۹۰۴ء میں اپنے دست مبارک سے لکھکر رسالہ کو مرحمت فرمایا تھا

لغت نویس، طبیب، عالم دین اور سرکاری مشینری وغیرہ پر ظرافت کے پیرایہ میں ہدف تنقید بنانے میں لطف اندوز ہوتا تھا۔ اقبال اسے لکھنو کا بیمار اخبار کہتے تھے۔ یہ بیمار نہیں بلکہ نہایت صحت مند اور نبض شناس اخبار تھا۔ پنچ کا زمانہ وہ تھا جب سوسائٹی میں برائیوں کا گھن لگا ہوا تھا اور اخبار ایسے سماج کے لوگوں پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ پنچ کے اہل کار معمولی نہیں۔ بلکہ ہر فن مولا تھے۔ اکثر و بیشتر لوگ اودھ پنچ کے سال اجراء سے واقف نہیں ہیں۔ ماہر اقبال محمد عبداللہ قریشی، بشیر احمد ڈار، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کا یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ اخبار ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا تھا۔ دراصل اودھ پنچ کا پہلا شمارہ (آٹھ صفحوں کا) منشی سجاد حسین کاکوروی (م۔۱۹۱۵ء) کی ادارت میں ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو جاری ہوا تھا۔ یہ سال تاریخ اس کی پیشانی پر موجود رہتا تھا ''آزاد ظریف ہے اودھ پنچ'' (۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء)۔ منشی صاحب کے بعد اخبار کی عنان ادارت حکیم شیخ محمد ممتاز عثمانی (م۔۱۹۳۶ء) نے سنبھالی تھی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے شیخ محمد ظہیر حیدر عثمانی ایڈیٹر رہے۔ کچھ دنوں کے لئے سید مقبول حسین ظریف لکھنوی بھی ادارے سے منسلک رہے تھے۔ راقم نے اولین شمارے سے ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء تک بکثرت شمارے دیکھے ہیں۔ اخبار کلام اقبال پر کبھی بے جا اور کبھی بجا طور پر تنقید کرنے کا عادی بن چکا تھا۔ یہ تنقیدیں فرضی ناموں سے چھپتی تھیں۔ ۱۹۳۲ء کے بعد ایک فرضی نام ''منطق آرا بیگم'' کا تھا۔

(۲) اودھ پنچ میں اقبال کی متعدد نظمیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں ''باقیات اقبال'' میں بغیر کسی حوالے کے شامل کی گئی ہیں۔ غالباً کلام اقبال پنچ میں ۱۷ اپریل ۱۹۰۴ء سے چھپنا شروع ہوا تھا۔ اس شمارے میں ''غزل اقبال'' ۱۱ شعر میں درج ہے۔ یہ غزل پہلی مرتبہ پنچ کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے۔ ادارے کی طرف سے ذیل کا نوٹ بہ عنوان ''پنجاب کے ایم-اے شاعر'' (ح م د) کے فرضی نام سے اس طرح چھپا ہے:-

''میں نے پنجاب کے مایہ ناز شاعر شیخ محمد اقبال صاحب کی ایک نعتیہ غزل وقطعات تاریخ دیکھی۔ شیخ صاحب کے اکثر اشعار زیب اخبارات ہوتے ہیں۔ پہلے میں پوری غزل لکھتا ہوں۔ بعدہٗ اپنے شبہات لکھوں گا''۔

۱۔ دلدادۂ ہوائے فصل بہار ہوں میں	ہمہ اشتیاق ہوں میں ہمہ انتظار ہوں میں
۲۔ کچھ اس ادا سے اڑکر میں سوئے دام آیا	صیاد کہہ رہا ہے تیرا شکار ہوں میں
۳۔ نازک مزاجیاں کو میرے جنوں کی دیکھو	زنجیر جوئے موج باد بہار ہوں میں
۴۔ کیا کام لے رہا ہے اے خضر زندگی سے	جاں در ہوائے ذوق خواب مزار ہوں میں

۵۔ گل گیر کے ستم کا کھٹکا نہیں ہے مجھکو — اے بزم زندگانی! شمع مزار ہوں میں
۶۔ واماندگی کرشمہ اپنا اسے نہ سمجھے — لذت چشِ خراشِ ہر نوکِ خار ہوں میں
۷۔ اے اشکِ چشمِ پرخوں یہ ربط چھٹ نہ جائے — میری بہار تو ہے، تیری بہار ہوں میں
۸۔ زاد و عمل نہیں ہے، محشر کا سامنا ہے — ہاں! اے لبِ شفاعت! امیدوار ہوں میں
۹۔ زاہد نہیں جو مجھ کو جنت کی آرزو ہو — اے خاکِ پاکِ یثرب! تیرا غبار ہوں میں
۱۰۔ صدقے ہوں جس پہ گلشن نکلا وہ پھول تجھ سے — اے گلستانِ یثرب! تیرے نثار ہوں میں
۱۱۔ اقبال عشق کی یہ ساری کرامتیں ہیں
صدقے ہوں سو تبسم، جب اشکبار ہوں میں

''تیسرے شعر کے مصرعہ اول میں ''نازک مزاجیاں'' کی جگہ اگر ''مزاجیوں'' باندھا جاتا تو کیا غیر فصیح ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کاتب سے غلط چھپ گیا ہے۔ بجائے ''کو'' ''تو'' کا لفظ لکھنا تھا۔ اور دوسرے مصرعے میں بھی ''موج جوئے'' الٹ پلٹ گئی ہے۔ پہلے لفظ ''موج'' ہونا چاہئے۔ پھر بھی مطلب اچھا نہیں نکلتا۔ چوتھا شعر، شیخ صاحب اپنی زندگی سے کیا کام لے رہے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام جو بموجب احکام الٰہی بہت سے کاموں پر مامور ہیں ان کے حضور میں آپ نے کیا اچھا کام پیش کیا ہے''۔

(۳) **پنجاب** کے ایک کہنہ مشق فارسی اردو کے شاعر بدرالدین قیصری نے کلام اقبال سے متاثر ہو کر ایک مسدس (۶ بند) لکھا جو ''اقبال'' کے عنوان سے مخزن لاہور جلد ۷ نمبر ۲ (صفحہ ۵۶) بابت مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مسدس کا یہ بند غور طلب ہے۔ ''بلبل پنجاب'' اقبال کا لقب ہے۔

بلبل پنجاب ہے تو، پنجاب ہے گلشن ترا — پُر ہے تو گلہائے مضمون سے سدا دامن ترا
جس کا دانہ دانہ خرمن ہو وہ ہے خرمن ترا — دوسروں کے سو تصنع ایک سادہ پن ترا
نقش تصویرِ مضامیں کے لئے مانی ہے تو
خطۂ ہندوستان میں غالبؔ ثانی ہے تو

قیصری صاحب نظم کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

''یہ نظم میں نے اپنے ارادے سے نہیں لکھی، بلکہ اقبالؔ کی زبردست سخنوری نے جبراً لکھوائی ہے۔ گویا یہ اخراج ہے جو ان کی شاعری سے لیا ہے۔ ہر چند حضرت اقبالؔ

سلمہٗ اللہ تعالیٰ بطور شاعری کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، مگر میرے خیال میں ان کی شاعری کا پایہ ان کی شہرت سے بلند تر ہے''۔

(۴) مشہور رسالہ ''زمانہ'' کانپور جلد ۳ نمبر ا بابت جولائی ۱۹۰۴ء (صفحہ ۱۴۰) کے عنوان ''ایک نظر باز گشت'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے دیا نرائن نگم ایڈیٹر صاحب موصوف کو اطلاع دی تھی کہ وہ زمانہ میں قلمی تعاون کے لئے تیار ہیں۔ زمانہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی نظم ''ہمارا دیس'' (ترانہ ہندی) سب سے پہلے ایڈیٹر کے تعریفی کلمات کے ساتھ ''زمانہ'' بابت ستمبر ۱۹۰۴ء میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ نگم صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

''ہندوستانی زبانوں میں اور خصوصاً اردو میں حب الوطنی اور جوش ملکی کے متعلق ایسی نظمیں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہوں گی جن میں اس ملک کے خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبۂ حب الوطنی کا لحاظ ہو۔ انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان ہوتے ہیں۔ اور وہاں کے باشندوں کے دلوں پر ان کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانے میں غرض ہمیشہ ان گیتوں کی بدولت ان کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے۔ اور اس کی عظمت اور شان قائم رکھنے کا خیال جمارہتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال کی یہ نظم جو انہوں نے ہمارے پیارے اور پرانے دیس پر لکھی ہے۔ ملک بھر میں ہر دلعزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونے کی مستحق ہے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ نظم رواروی میں کہی تھی۔ اس لئے اس میں کچھ تسامحات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بھی کیا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال نے شعر کے مصرعۂ اول پر جب نظر ثانی کی تو انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ نہ صرف غیر موزون ہے بلکہ معنی کے اعتبار سے اس میں کوئی خوبی اور جدت نہیں ہے۔ نظم پریس میں جا چکی تھی اور پلیٹ پر بھی جم گئی تھی۔ اتنے میں اقبال کا خط آیا کہ مصرعہ یوں لکھا جائے۔ چنانچہ معکوس نویس نے بائیں طرف کے حاشیے پر ن (نسخہ) کے طور پر مصرعہ یوں لکھا۔

ع - مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اصلاح کے بعد شعر گویا ضرب المثل ہوگیا ہے۔ ہر دلعزیزی کا عالم یہ ہے کہ پورا شعر لوگوں کی نوک زبان ہے اور سو سال گزر جانے کے بعد بھی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال گرمیوں میں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے پاس ایبٹ آباد ضلع ہزارہ گئے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی بیمار ہوگئے اور اسی حالت میں زمانہ کے ایڈیٹر کو نظم ''ہمارا دیس'' کا تصحیح شدہ نسخہ ذیل کے خط کے ساتھ بھیجا تھا:-

''از ایبٹ آباد، ضلع ہزارہ

جناب من- میں کئی دنوں سے یہاں ہوں۔ لیکن افسوس کہ یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ ابھی پورا افاقہ نہیں ہوا۔ اشعار ارسال خدمت کرتا ہوں۔

دوسرا صفحہ ملاحظہ ہو- محمد اقبال

معرفت شیخ عطا محمد سب ڈویژنل افسر ملٹری ورکس۔ ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء''

خط ایڈیٹر صاحب نے اپنے کمرے میں اشعار کے ساتھ ایک فریم میں حرز جاں کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ جب موصوف کے جشن صد سالہ تقریبات ۱۹۸۲ء میں لکھنؤ میں شروع ہوئیں تو اس موقعہ پر مرحوم کے چھوٹے بیٹے برج نرائن نگم ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ''زمانہ'' کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا۔ مجھے مضمون (اقبال اور زمانہ کانپور) کی اشاعت کے عوض اقبال کے خط اور ''ہمارا دیس'' کا عکس عنایت کیا۔ یہ دونوں نایاب چیزیں میں نے پہلی مرتبہ تفصیلی مضمون کے ساتھ ۱۹۸۵ء میں قومی آواز لکھنؤ کے ضمیمے میں شائع کرائی تھیں۔ نگم صاحب موصوف نے مجھ سے کہا تھا کہ اقبال اور ان کے والد بزرگوار کے درمیان ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۷ء تک خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ افسوس کہ وہ خطوط اور اقبال کی ارسال کردہ تصانیف تلف ہوگئیں اور فریم والا خط اس لئے محفوظ رہا کہ کمرے میں دیوار پر لٹکا رکھا تھا۔

ایڈیٹر زمانہ نے اقبال کی نظم ''ہمارا دیس'' زمانہ میں دوبارہ شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے اقبال نے اس پر مزید نظر ثانی کر کے شیخ عبدالقادر کے پاس بھیجی تھی۔ شیخ صاحب نے اسے مخزن جلد ۸ نمبر ۱ (صفحہ ۴۹) بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء میں ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔

''جذبات دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو وہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ جو وطن

سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔" (عبدالقادر)

پروفیسر گیان چند جین کو ہم نے "ہمارا دیس" کے بارے میں تمام تفصیلات بھیجی تھیں۔ اس کا انہوں نے کتاب میں اعتراف بھی کیا۔ اس کے باوجود وہ اپنی کتاب (ابتدائی کلام اقبال صفحہ ۲۵۵) میں لکھتے ہیں:۔

"مخزن میں صفحہ ۵۰ پر اس سے متعلق کوئی نوٹ رہا ہو"

پھر صفحہ ۲۵۹ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"میرے پاس مخزن کے صفحہ ۵۰ کا عکس نہیں۔ معلوم ہوتا ہے نظم کے متن کے بعد کسی نے "دلگداز" کے اعتراضات کا سختی سے جواب دیا ہے"

اگر جین صاحب مخزن کے اس شمارے کی تلاش کرتے تو انہیں ضرور مل جاتا۔ کیونکہ وہ کتاب کی ترتیب کے وقت حیدر آباد میں ہی تھے۔ یہ شمارہ مجھے وہیں دستیاب ہوا تھا۔ جین صاحب اور ان کے مقلدوں کو اصل ماخذ کی عدم دستیابی نے غلط فہمی سے ہمکنار کیا۔ اس شمارے میں علامہ شبلی، جان ملکم، سید نذیر حسین، اقبال (قومی زندگی) اور فرضی نام "تحقیق" کا (اصلاح حسرت) کے نثری مضامین ہیں۔ منظومات میں صفحہ ۴۶ سے ۴۹ تک "تحفۂ گلاب" حافظ سید فضل حق عظیم آبادی کی طویل نظم ہے۔ اس کا آخری شعر صفحہ ۴۹ کی ابتداء میں اس طرح ہے۔

اس پھول بھیجنے میں یہ مصلحت ہے ساقی
مرجھا بھی جائے تو کچھ بُو رہے گی باقی

اس کے بعد ہی بقیہ پورے صفحے میں اقبال کی نظم "ہمارا دیس" ہے۔ مقطع قابلِ ذکر ہے۔

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

صفحہ ۵۰ میں سید سجاد حیدر یلدرم (بغداد) کی پوری نظم "کشمیر و حسن کشمیر" ہے۔ اس کے بعد دوسروں کی نظمیں ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مخزن بابت اگست ۱۹۰۴ء میں شیخ عبدالقادر (صفحہ ۱) میر نذیر حسین (ناکام محبت ۷) مظفر ایم۔ اے (لاہور کی ایک شاخ ۱۳) ظفر علی خان (طہران ۲۶) اور (قومی زندگی) اقبال کے مضامین شائع ہوئے۔ حسرت موہانی نے اردوئے معلی بابت ستمبر ۱۹۰۴ء (۳۵-۴۱) میں ان مضامین کی زبان پر تنقید لکھی۔ حسرت کے جواب میں مخزن جلد ۸ نمبر ۱ بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء (۳۳-۴۵) میں "اصلاح حسرت" کے عنوان سے ایک طویل مضمون چھپا۔ مضمون نگار

نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا، بلکہ نام کے بدلے ''تحقیق'' رکھا۔ پورے مضمون میں رسالہ ''دلگداز'' کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا ہے۔ ''تحقیق'' نے حسرت پر ذاتی حملے کئے۔ صفحہ ۴۵ میں حسرت کے ذیل کے مقطع کو تختۂ مشق بنا دیا۔ لکھتے ہیں:۔

نہ جائے کوئی میری وضع رسوا پر کہ اے حسرت
کمال شاعری نے مجھ کو یکتائے زماں پایا

''واللہ! اس شعر نے تو لغویت کا خاتمہ ہی کر دیا ہے۔ پایا ضرور پایا۔ کس نے پایا کمال شاعری نے کس کو پایا؟ حسرت کو کیسا پایا۔ یکتائے زماں..... ہیں۔ ورنہ ہم کیا سمجھیں۔ کس چیز میں یکتا؟ لغویت میں؟ حماقت میں؟ لیاقت میں؟ جہالت میں؟ صداقت میں؟ آخر کس امر میں؟ بس یہی اس شعر کی لغویت کا ثبوت ہے کہ خدا جانے کس چیز میں یکتا پایا؟ مگر پایا یکتا۔ گویا ممکن ہے کہ یہ شعر آپ کی خدمت میں ہو۔ ممکن ہے مدح میں ہو۔ اس ابہام کے صدقے۔ اس شعر کو کس قدر لامعنی بنا دیا''۔

''جب مخزن میں پنجابی (میر نیرنگ) اور اقبال نے موہانی صاحب کو للکار بتائی تو آپ نے کچھ اس قسم کے معذرت آمیز فقرے لکھے تھے کہ ہم (ایڈیٹر مخزن) مخزن کو میدان کارزار بنانا نہیں چاہتے اور تو اور تو تو میں میں کے شغل کو پسند نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ صاحب! یہ درست فرمایا۔ مگر جب ایک شخص کی جانب سے چھیڑ چھاڑ کی ابتدا ہو اور وہ آپ پر حملہ کرے اور بار بار حملہ کرے اور حملہ بھی صریحاً حاسدانہ، گستاخانہ۔ اسے آپ ایک دفعہ درگذر کر سکتے ہیں۔ بار بار درگزر کرنا عوام کالانعام میں کچھ اور ہی معنی رکھے گا کہ گویا آپ نے شکست مان لی''۔

جب مخزن کا یہ شمارہ حسرت نے دیکھا تو انہوں نے اس کے جواب میں ''تنقید مخزن'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اردوئے معلی بابت نومبر ۱۹۰۴ء (صفحہ ۳۸-۳۹) میں شائع ہوا۔ اب انہوں نے خدا جانے اقبال کے بارے میں نرم گوشہ کیوں اختیار کیا اور آخرکار کہنا پڑا!۔

''حضرت اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں بھی کرتے۔ کیونکہ ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اسی پرچے میں ان کے لکچر موسوم بہ ''قومی زندگی'' میں

بہت سے اغلاط موجود ہیں''۔

ادھر ۱۹۰۴ء میں ہی دکن میں اقبال کے دوست ظفر علی خان کے ماہنامہ رسالہ ''دکن ریویو'' نے دھوم مچائی تھی۔ اس رسالے کی بدولت ہی پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا ہے کہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد وزیر اعظم حیدر آباد کے درمیان کیسے تعارف ہوا تھا۔ تفصیلات مضمون میں درج ہیں۔

(۵) قیصری کے ''بلبل پنجاب'' کی تائید اردو کے قادر الکلام شاعر درگا سہائے سرور جہاں آبادی (م۔۱۹۱۰ء) سے بھی ہوتی ہے۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں حصول تعلیم کے لئے لندن گئے تو وہاں اپنے کاموں میں اتنا مصروف رہے کہ شعر گوئی کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ اقبال کی خاموشی کو دیکھ کر سرور کو تشویش ہوئی۔ دیکھئے موصوف اقبال کو ''بلبل پنجاب'' کے لقب سے کس طرح یاد کرتے ہیں۔

بہار آئی شگفتہ ہوئے گل پنجاب
چہک چہک! کدھر تو ہے بلبل پنجاب

ترانہ لب شیریں نوا کے دن آئے — غزل سرا ہو کہ تیری صدا کے دن آئے
ترانہ سنج ہو، او بلبل ریاض سخن — کہاں ہے تو کہ چمن میں فضا کے دن آئے

ترے بغیر ہیں مرغان نغمہ زن خاموش
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش

جب یہ سدا بہار نظم اقبال کی نظر سے گزری تو ان کی خاموشی ٹوٹ گئی اور اس کے جواب میں ۱۲ شعر کی ایک خوبصورت غزل کیمبرج سے مخزن کو بھیجی جو جلد ۱۲ نمبر ۳ بابت دسمبر ۱۹۰۶ء (صفحہ ۶۴) میں اقبال کے ذیل کے خط کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس طرح اقبال کی یہ تحریر ہم تک پہلی مرتبہ پہنچی ہے:۔

''گو مصروفیت کا ابھی وہی عالم ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ حضرت سرور جنہوں نے میری خاموشی کو توڑنا چاہا کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان کی نظم کے شکریہ میں سردست یہ غزل بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ عنقریب کچھ اور بھی بھیجوں گا۔ اقبال''۔

مطلع اور مقطع درج کئے جاتے ہیں۔

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

(۶) منشی نولکشور (م۔۱۸۹۵ء) کا مشہور زمانہ اودھ اخبار نومبر ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا تھا۔ اس میں غالبؔ، منشی ہر گوپال تفتہؔ، انیسؔ اور دبیرؔ وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کی ۱۴ دسمبر ۱۹۰۷ کی اشاعت میں ذیل کی خبر شائع ہوئی تھی:-

''شیخ محمد اقبال کی نسبت لاہور میں تار برقی سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کیمبرج نے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کا درجہ عطا کیا اور یونیورسٹی لندن میں مسٹر آرنلڈ کے مقام پر عربی کا قائم مقام پروفیسر ہو گیا''۔

اسی اخبار کے اگلے شمارہ مورخہ ۲۰ دسمبر کو ''شیخ محمد اقبال'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

(۷) سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف محمڈن کالج ہی کے قائم کرنے کے لئے اکتفا کیا، بلکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اسی غرض سے ۱۸۸۶ء میں قائم کی گئی تھی۔ اقبال بھی اس میں دلچسپی سے شرکت کرتے تھے۔ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنو کے شعبۂ ''متفرقات'' میں زیر نمبر 1774/52580 آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کی مفصل رپوٹ -- ''متعلق بہ اجلاس بست دوم بمقام امرتسر منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ء'' موجود ہے جو میرے مطالعے میں رہی ہے۔ کانفرنس کے اجلاس اول کی صدارت آنریبل سر خواجہ سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے کی تھی۔ کانفرنس میں پورے ہندوستان سے تین ہزار سے زاید مندوبین جمع تھے۔ جو لوگ ڈائس پر موجود تھے ان میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں:-

آنریبل جسٹس شاہدین، نواب وقار الملک بہادر، آنریبل شیخ صادق علی وزیر ریاست خیر پور، شمس العلماء مولوی سید امام (پٹنہ) علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید شاہ سلیمان پھلواری، سید علی امام، مسٹر محمد احسان الحق بیرسٹرایٹ لا، شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا، نواب نصیر حسین خیال، مسٹر محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا، مسٹر مظہر الحق بیرسٹرایٹ لا، ڈاکٹر ضیاء الدین۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پی، ایچ، ڈی۔ محبوب عالم۔

کانفرنس میں باتفاق آرا ریزولیشن نمبر ۲۴ (صفحہ ۹) اقبال کی شاندار کامیابیوں کے بارے میں درج ذیل الفاظ میں منظور کیا گیا:-

''یہ کانفرنس ڈاکٹر محمد اقبال پی، ایچ، ڈی کو ان کامیابیوں پر جو ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے قیام میں حاصل کی ہیں اور جن کے سبب سے وہ مسلمانوں میں اپنی مثال آپ ہیں دلی مبارکباد دیتے ہیں''۔

کانفرنس کے ایک اور اجلاس کی صدارت خان بہادر شیخ غلام صادق رئیس و آنریری مجسٹریٹ امرتسر اور پریسیڈنٹ رسپشن کمیٹی نے کی۔ ان کی تقریر کا آخری حصہ یہ ہے:-

''تمہارے اندر اپنے ملک کی محبت موجود ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے کم ترقی یافتہ ہم وطنوں کے علم کی مشعل روشن کرو۔ اور انہیں اپنی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کی کوشش کرو۔ حضرات ان الفاظ کے ساتھ نوجوانوں کو پنجابی کی حمایت کے لئے ابھارا گیا کہ ہم بھی جس طرح سے ممکن ہو اردو زبان کی حمایت کے لئے کمربستہ ہوں۔ اب ہم سب پنجابیوں کو لازم ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں پنجابی بولنا ترک کردیں اور اس کے بجائے اردو بولیں۔ اس طرح اردو کا ڈیفنس ہوگا اور اس مسئلہ پر ہماری قومی زندگی منحصر ہے''۔

خان بہادر شیخ غلام صادق کی تقریر کے بعد مسٹر سید علی امام نے بزبان انگریزی ریزولیوشن کی تائید فرمائی اور ان کے بعد محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار اور ڈاکٹر محمد اقبال پی، ایچ، ڈی نے مزید تائید میں تقریریں کیں۔ جن کے بعد نہایت جوش وخروش کے ساتھ ریزولیشن ۹ باتفاق رائے پاس کیا گیا۔ یہ ریزولیوشن پنجاب میں اردو بولنے اور اس کے فروغ کے لئے مخصوص تھا۔

اس ریزولیوشن کا موثر نتیجہ یہ ہوا کہ زبان اردو کی ترقی کے لئے پنجاب کے لوگوں میں زبردست جوش وخروش پیدا ہوا اور اردو کی حمایت میں جلسے اور مجلسیں ہونے لگیں۔ میرے سامنے دہلی کا ادبی ماہنامہ ''زبان'' ہے۔ اس کے ایڈیٹر جنیشور داس جین تخلص مائل دہلوی نے ''زبان'' جلد ۳ نمبر ۴ بابت اپریل ۱۹۰۹ء (صفحہ ۲۷) میں افسر الشعراء، آغا شاعر قزلباش دہلوی (م۔ ۱۹۴۰ء) کے ۲۲ بند والے معرکہ آرا مسدس کو 'ایک نظم' اردو کی حمایت میں پیسہ اخبار' لاہور کے حوالے سے درج کیا ہے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے بڑے صبر وسکون کے ساتھ لوگوں کے بہت بڑے اجتماع میں فرمائی تھی۔ مائل دہلوی نظم کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

''۱۲ اپریل گذشتہ کے پیسہ اخبار سے معلوم ہوا کہ لاہور کے محمڈن کالج میں انجمن حمایت اسلام کی طرف سے اردو کی حمایت میں ایک جلسہ بصدارت جناب شیخ محمد اقبال پی، ایچ، ڈی، منعقد ہوا۔ جس میں مسطورہ ذیل نظم خود افسر الشعراء، نے پڑھی۔ اور اس جلسے میں شہر کے تمام علماء اور بڑے بڑے رکن شریک تھے۔ اتفاقاً جس وقت حضرت نظم پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو رات ہوگئی تھی۔ لیمپ وغیرہ روشن

ہونے میں کسی قدر دیر ہوئی۔ مگر سامعین کے شوق کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے ای۔ اے۔ سی دیا سلائیاں روشن کر کے آپ کو برابر پڑھتے رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ حقیقت میں نظم اسی قابل ہے۔ ۱۴ اپریل کے اخبار میں چھپ بھی چکی ہے۔ مگر ناظرین ''زبان'' کی دلچسپی کے لئے ہم اسے دوبارہ شائع کرتے ہیں''۔

نظم کا مقطع پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایک فقیر نرالی صدا لگاتا ہے — نصیحت آخری شاعر سناتا جاتا ہے

زبان ایک بناؤ جو ایک بنتا ہے — نہیں ہیں ہندو مسلماں سب ایک نقشا ہے

زباں سے انس ہے اردو کو کل کھلائے گی

جہاں سے جائے گی پنجاب سے نہ جائے گی

یہی بات چند سال پہلے حالی نے اقبال کی حمایت میں اس وقت فرمائی تھی جب پیسہ اخبار روزانہ ہوا تھا۔ حالی نے منشی محبوب عالم کو بقول اخبار ''وکیل'' امرتسر مطبوعہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء (صفحہ ۸) بعنوان ''حالی کا تار'' ذیل کے الفاظ میں شائع ہوا تھا:۔

(۸) ''**جو لوگ** پنجابی اردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی، یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بجائے لاہور اردو کا گھر ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے''۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ اصل میں حالی نے یہ تار اقبال کے حق میں دیا تھا۔ جب اقبال کی زبان پر حسرت موہانی وغیرہ نے تابڑ توڑ حملے کئے تھے تو اس کا ذکر ''تنقید ہمدرد'' (حکیم برہم) نے اپنے مضمون ''اصلاح زبان پنجاب'' مطبوعہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ بابت فروری ۱۹۰۴ء (صفحہ ۳۸۔۴۱) میں کیا ہے۔ برہم کا یہ جملہ قابل غور ہے:۔

''حالی نے اپنے مشہور تار کے ذریعہ سے اور سنا ہے کہ مولوی شبلی نے بھی حضرت اقبال کی غلط تاویلوں کو صحیح قرار دیا''

۱۹۰۹ء کے آخر میں ہی لاہور میں ''بزم اردو'' قائم ہوئی اور اقبال اس کے سرگرم کارکن تھے۔ وکیل امرتسر مطبوعہ ۱۲ جنوری ۱۹۱۰ء (صفحہ ۸) کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی:۔

''بزم اردو کا ایک غیر معمولی جلسہ مولوی غلام قادر (گرامی) شاعر حضور نظام کے اعزاز میں ہونے والا تھا اور علاوہ دیگر مضامین نظم و نثر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی بیرسٹرایٹ لا بھی تقریر کرنے والے تھے''۔

اسی اخبار میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ممبر بنائے گئے تھے۔

(۹) داغ دہلوی کے استاد بھائی راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی کا انتقال ۱۹ مارچ ۱۹۱۱ء کو حیدرآباد میں ہوا۔ان کے انتقال کے موقعہ پر رسالہ ''اصلاح سخن'' کے ایڈیٹر وجاہت حسین وجاہت نے لکھا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر اقبال کی زیر صدارت ''بزم اردو'' کا تعزیتی جلسہ ۲۳ اپریل کو لاہور میں منعقد ہوا۔جس میں میر بشارت علی جالب دہلوی، ظفر علی خان، ہدایت اللہ شید امرتسری، برج نرائن ارمان دہلوی، محمد الدین فوق، وجاہت جھنجھانوی اور خواجہ دل محمد وغیرہ نے ماتمی اشعار کہہ کر ظہیر دہلوی کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ظفر علی خان نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:۔

''بزم اردو کا یہ جلسہ اس صدمے کو جو مولانا ظہیر کی وفات سے اردو شاعری کو پہنچا ہے مجموعی طور سے محسوس کرتا ہے اور باتفاق رائے قرار دیتا ہے کہ مرحوم کے پس ماندگان سے رنج والم کا اظہار کیا جائے''۔

آخر میں اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں ظہیر دہلوی کی ادبی خدمات خاص طور پر ان کے کمال شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار تفصیل سے کیا تھا۔انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ سال گذشتہ میں ان سے حیدرآباد میں ملا تھا۔آخر میں ان کی تاریخ وفات فی البدیہہ کہی۔''زبدۂ عالم ظہیر دہلوی'' (۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء)۔

تفصیلات کے لئے راقم حروف کا مضمون ''اردو کے قادر الکلام شاعر ظہیر دہلوی'' مطبوعہ ''قومی زبان'' کراچی جلد ۷۲ شمارہ ۱۰ بابت اکتوبر ۲۰۰۰ء دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۰) آج سے تقریباً سو سال قبل دہلی میں ایک ضخیم ماہنامہ رسالہ ''تمدن'' کے نام سے پابندی کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کی ابتدا میں بہت ہی عمدہ اور دبیز کاغذ میں شائع ہوتا تھا۔اس کے متعدد شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔پہلا شمارہ اپریل ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا تھا۔تمدن کے دو تجربہ کار ادیب اور صحافی راشد الخیری (م۔۱۹۳۶ء) اور شیخ محمد اکرام (سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر مخزن لاہور) ایڈیٹر تھے۔ تمدن کے شمارے عنقا کے برابر ہیں۔میری نظر سے متعدد پرچے گزرے ہیں۔تمدن کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں اقبال کا غیر مطبوعہ کلام بھی شائع ہوتا تھا۔پہلے ہی شمارہ جلد ۱، نمبر ۱ (صفحہ ۸۔۹) میں

پروفیسر میرزا محمد سعید ایم۔اے نے زیر عنوان ''قند پارسی'' اقبال کی ایک فارسی غزل ذیل کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع کرائی تھی:۔

''حضرت اقبال کے اردو کلام سے ایک زمانہ مستفید ہو چکا ہے لیکن یہ امر نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جناب موصوف فارسی کلام پر بھی کماحقہٗ قدرت رکھتے ہیں۔اس صنف میں ان کے لطف زبان اور حسن بیان کا ذیل کی غزل سے اندازہ ہو سکتا ہے جسے تیمناً درج کرتے ہیں۔ان کی طبع نیساں کا یہ ترشح امید دلاتا ہے کہ تمدن کی کشت مضامین آئندہ بھی ان کے ترشحات قلم سے سیراب ہوتی رہے گی۔اردو اور فارسی کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ فارسی غزلیات کا اردو رسائل میں شائع ہونا کسی طرح بھی ناموزوں نہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ''تمدن'' آئندہ بھی صاحب کمال شعراء کے فارسی کلام کا نمونہ وقتاً فوقتاً پیش کش ناظرین کرتا رہے گا''۔(سعید)

۱۔ آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی — در بیابان جنوں بردی و رسوا ساختی
۲۔ جرم ما از دانۂ تقصیر او از سجدۂ — نے بہ آن بے چارہ ے سازی نہ باما ساختی
۳۔ اے خنک روزے کہ فرمان پریشانی دہی — مشتِ خاک را حشرِ آرزو ہا ساختی
۴۔ جرم امروزست فال چہرۂ فردائے حشر — آفتاب این سحر از ظلمتِ ما ساختی
۵۔ صد جہاں می روید از کشتِ خیال ما چو گل — یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختی
۶۔ ایں چہ افسوں ویں چہ نیرنگ ست اے حسنِ غیور — دیدہ بخشیدی و محرومِ تماشا ساختی
۷۔ طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانہ امروز و فردا ساختی
۸۔ اے سرت گردم چہ پنداری کہ ما نہ شناختیم — چاک دامن خود از دستِ زلیخا ساختی
۹۔ پرتو حسن تو می افتد بروں مانند رنگ — صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی
۱۰۔ بر لبِ اقبال مہر خامشی زیبانہ بود
چوں دل وارفتہ اش را نغمہ پیرا ساختی

اقبال نے ۱۲ سال بعد اس غزل پر نظر ثانی فرمائی اور ذیل کے چھ شعر پیام مشرق سے حذف کر دیے۔ ۳، ۴، ۶، ۷، ۸، ۱۰۔

(۱۱) ابھی اقبال کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔صرف چند نظمیں ہی مختلف رسالوں میں لاہور سے چھپی تھیں کہ ملت اسلامیہ نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔اس سلسلہ میں مجھے

ایک حیرت انگیز واقعہ یاد آتا ہے۔ جس کو مولوی محمد عبداللہ (لاہور) نے نیرنگ خیال بابت نومبر ۱۹۲۵ء (صفحہ ۲۶ الف) میں یوں بیان کیا ہے:۔

''دسمبر ۱۹۱۱ء میں بمقام دہلی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقعے پر جہاں ملکی عمائد سر برآوردہ اور ہر شعبہ کے فضلا جمع تھے، وہاں ڈاکٹر اقبال کو سب حضرات کی موجودگی میں ''ملک الشعراء'' کا خطاب دیا گیا جس پر مولانا شبلی (مرحوم) نے آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے وقت ایک مختصر تقریر بھی کی جس کا ماحصل یہ تھا:۔

''بادشاہوں کی طرف سے خطاب ملتے ہیں۔ وہ دائمی نہیں ہوتے اور نہ عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے قوم جب کسی شخص کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے کسی لقب سے ملقب کرتی ہے تو وہ خطاب جاودانی ہوتا ہے۔ جیسے امام فخر الدین رازی، وامام حنیفہ و دیگر آئمہ سلف۔ چنانچہ ملک الشعرا کا خطاب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو قوم عطا کر رہی ہے''۔

شبلی کے بیان پر مولوی عبداللہ (مضمون نگار) ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:۔

''یہ واقعہ چونکہ دلی میں ہوا۔ وہاں کے مدعیان ادب و ایڈیٹران اخبار کا ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس خطاب سے یاد نہ کرنا محض تعصب پر مبنی ہے۔ مگر ہم اپنے ملک کا کہاں تک گلہ کریں گے''۔

لاہور کے ادبا اور صحافی خصوصاً نیرنگ خیال کے ایڈیٹر اقبال کو ملک الشعرا کے خطاب سے ہی یاد کرتے تھے۔

(۱۲) **۱۹۱۲ء میں** اقبال کا آفتاب کمال نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق نظمیں ترانہ ہندی، ترانۂ ملی، وطنیت، خطاب بہ جوانان اسلام، شمع و شاعر، شکوہ و جواب شکوہ وغیرہ پورے ہندوستان میں خلعت مقبولیت کی سند حاصل کر چکی تھیں۔ دہلی اور لکھنو کے شعرا صرف غزلیں کہتے کہتے گل وبلبل اور وصل و ہجر کے خیالی افسانوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب اقبال کے جدید اسلوب شعر اور ان کی روز افزوں شاعرانہ عظمت کو عروج پر دیکھا تو ان کی مخالفت کرنے میں صف آرا ہو گئے۔ ان ہی ایام میں ۲۸، ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھنو میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس سے قبل چند سال اہل لکھنو نے اقبال کی زباندانی پر رکیک اور دل آزار حملے کئے تھے۔ ان میں

حسرت موہانی، حکیم برہم اور اودھ پنچ کا عملہ بھی شامل تھا۔ یہی خاص وجہ تھی کہ لکھنو والوں نے کانفرنس میں حسد کے مارے اقبال کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ اقبال کے دوست سید سجاد حیدر نے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔

(۱۳) **۱۰ جون ۱۹۱۳ء** کو محمد علی کامریڈ نے دہلی میں اردو روزنامہ ''ہمدرد'' کے نام سے جاری کیا۔ یہ آٹھ صفحوں پر مشتمل تھا۔ اس کی اولین اشاعت میں اقبال کی نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' ۱۵ شعر میں صفحہ اول میں شائع ہوئی تھی۔ پھر دوسری مرتبہ ''تمدن'' دہلی کے جون ۱۹۱۳ء میں دوبارہ چھپ گئی۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ ''صوفی'' پنجاب جولائی ۱۹۱۳ء میں زیب اشاعت ہوئی تھی۔ دونوں رسالوں میں نظم کی ابتدا میں ذیل کی عبارت درج ہے:-

''فاطمہ بنت عبداللہ یعنی وہ بی بی جس نے جنگ طرابلس میں زخمیوں کی خدمت ایسی کی کہ تمام دنیا میں نام روشن ہوگیا۔ اور جس نے شہیدوں کو دم مرگ پانی پلانے میں اپنی جان کی پروانہ کی''۔

بانگ درا میں نظر ثانی کرتے وقت اقبال نے اس کے تین شعر حذف کیے اور ''یاد فاطمہ'' کے عنوان سے اس عبارت کے ساتھ شامل کی۔

''عرب کی لڑائی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی''۔

اس نظم کی شان نزول اس طرح معلوم ہورہی ہے کہ ابوالکلام آزاد کا ''ناموران غزوہ طرابلس'' کے عنوان سے الاحیاء الذین لا یموتون (السیدہ فاطمہ بنت عبداللہ) ''الہلال'' نومبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں ایک پر مغز اور معلوماتی مضمون (ص ۱۳ تا ۱۵) شائع ہوچکا تھا۔ صفحہ ۱۳ میں دو تصویریں اوپر نیچے ہیں۔ اوپر کی تصویر ''ایک یازدہ سالہ مجاہد عثمانی الشہید فی سبیل اللہ علی نظمی بے'' کی اور نیچے والی ''ایک یازدہ سالہ مجاہدہ عربیہ السید فاطمہ بنت عبداللہ'' کی ہے۔ الہلال کے زیر نظر مضمون سے پہلے ''خون ناحق'' کے عنوان سے ایک زہرہ گداز کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کا اشتہار الہلال کے کئی شماروں میں چھپ چکا تھا۔ کتاب شیخ احسان الحق میرٹھی نے ترتیب دے کر بلالی پریس دہلی میں چھاپی تھی۔ الہلال کے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء (صفحہ ۸) میں اس کا مفصل اشتہار درج ذیل الفاظ میں شائع ہوا تھا:-

''یورپین اقوام اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے دوستی کے پردے میں خفیہ سازشیں کررہی ہیں۔ اگر آپ اس سربستہ راز کا پورا پورا انکشاف چاہتے ہیں تو ''خون ناحق'' کا مطالعہ کیجیے، جس میں سواحل طرابلس پر ان کے

خونیں کارناموں کو اسی دل ہلانے والی صورت میں پیش کیا گیا ہے جسے ایک نظر دیکھتے ہی یورپین چالوں کی بھول بھلیاں میں پہنچ کر انسان محو حیرت ہو جاتا ہے۔

خان بہادر لسان العصر مولانا سید اکبر حسین الہ آبادی مدظلہٗ فرماتے ہیں:۔

خون ناحق بہت عمدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں اس جنگ کی نسبت کیا خیالات تھے اور مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرتی تھی۔ نہ یہ زمانہ رہ جائے گا نہ یہ لوگ رہ جائیں گے۔ لیکن ہسٹری کے ورق حالات گزشتہ کا آئینہ رہیں گے''۔

آزاد نے فاطمہ بنت عبداللہ کی جو داستان خونچکاں الہلال کے مذکورہ بالا شمارے میں بیان کی ہے اس کے دلدوز اور لرزہ خیز چند ابتدائی جملے یہ ہیں:۔

''یہ چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو مضمون پر بچھانا چاہتا ہوں۔ کیونکر بچھاؤں؟ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں۔ کیونکر پھیلاؤں؟ آہ! ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں۔ جو دلوں میں ناسور پیدا کردیں؟ آہ اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں؟ کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں۔ پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے۔ مگر جب دل پتھر کے بن جاتے ہیں تو ان کا پگھلنا محال ہے اور کائنات انسانی میں جتنی زندگی ہے۔ جب تک دل زخمی ہیں، روح تندرست ہے۔ لیکن جس دن دلوں کے زخم بھر گئے اس دن یقین ہے کہ آپ زندگی سے خالی ہو گئے۔ آج کے نمبر میں ایک خاص صفحہ تصویر کا شائع کیا جاتا ہے۔ مگر میں آنکھوں کا طالب نہیں ہوں جو ان کو دیکھیں۔ دل کا طالب ہوں جو اس کو پڑھیں۔ پھر کوئی ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو''۔

اقبال الہلال کے پرچے غور سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے کتاب ''خونِ ناحق'' بھی دیکھی ہوگی۔ موصوف نے ان دونوں کی تحریروں سے متاثر ہو کر ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کے کردار کو نظم کے فلسفے میں ڈھال دیا۔ جب ہمدرد میں اقبال کی نظم آزاد کی نظر سے گزری تو انہوں نے بہ ظاہر اس کی تعریف کی، لیکن دل میں شکر رنجی دامنگیر ہوئی۔ موصوف نے اپنے خیالات کا اظہار الہلال جلد نمبر ۳ (صفحہ ۲) مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء میں ان الفاظ میں کیا:۔

''ہمدرد کے پہلے پرچے کا سر آغاز ڈاکٹر اقبال کی موثر نظم تھی جس میں انہوں نے

ایک عرب مجاہدہ لڑکی کی شہادت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ قارئین ہلال کو یاد ہوگا کہ گذشتہ نومبر میں بسلسلۂ نامورانِ غزوۂ طرابلس ایک مضمون "الاحیاء الذین لا یموتون" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اور اس میں فاطمہ بنت عبداللہ'' نامی ایک یازدہ سال مجاہدۂ عربیہ کے حالات، شہادت مع اس کے مرقع خونین کے شائع کئے گئے تھے۔ اس واقعہ کو ڈاکٹر اقبال نے اس نظم میں درج کیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بعض زہرہ گداز و عظیم الاثر حالات جو الہلال میں لکھے گئے ہیں ان کے متعلق احباب کرام کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے ذرائع علم اس درجہ نادر اور غیر معمولی ہیں کہ مصر و شام کے عربی اخبارات کا بھی ان پر دسترس نہیں۔ چنانچہ ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کا واقعۂ شہادت مصر کے تمام مشہور و غیر مشہور جراید میں سے کسی اخبار کو بھی نصیب نہ ہوا۔ ترکی میں صرف ایک ماہوار رسالے کو یہ معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح ''نامورانِ غزوۂ بلقان'' کا سلسلہ بھی الہلال میں جاری رہے گا۔''

آزاد کے تبصرۂ بالا سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ اقبال نے ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کا ماخذ ہمدرد میں نہیں لکھا تھا۔ یہ درست ہے کہ اقبال ''خونِ ناحق'' اور الہلال کی تحریروں سے متاثر ہوئے تھے۔ اگر وہ نظم کے نیچے ''الہلال'' کا حوالہ دیتے تو آزاد کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ اسی لئے موصوف نے نہایت محتاط اور دبی زبان میں اپنے احتجاج کا اظہار کیا تھا۔

اقبال اور آزاد میں مراسلت بھی تھی۔ اقبال کی مثنوی ''رموزِ بیخودی'' اپریل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ آزاد کو بھیج دیا۔ موصوف نے اسے پسند کیا اور رسید بھی بھیجی تھی۔ آزاد رانچی جیل سے رہا ہوئے تو اقبال نے خوشی کا اظہار کیا۔

اقبال کی نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کی اشاعت سے آزاد کی رنجش رفتہ رفتہ نظریاتی اختلاف میں تبدیل ہوگئی۔ آزاد کو یہ گمان ہوا تھا کہ الہلال نے ہی اقبال کو صحیح راستہ دکھایا تھا۔ چنانچہ اقبال، سید سلیمان ندوی کے ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

''مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد (منیجر الہلال اور الہلال پریس) لکھتے ہیں کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال کی آواز بازگشت ہے۔ شاید ان کو معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔

اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم ونثر وانگریزی اور اردو میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک الہلال نے اُسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی ہے۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا۔ اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں۔ ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچائے''۔

مولوی فضل الدین احمد کے الفاظ یہ ہیں:۔

''تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور مسٹر شوکت علی خان اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی اور بتدریج اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقاید میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی فی الحقیقت ''الہلال'' ہی کی صدائے بازگشت ہے'' (تذکرۂ ابوالکلام آزاد۔ دیباچہ نگار فضل الدین احمد۔ مورخہ ۱۱۶ اگست ۱۹۱۹ء البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس کلکتہ)۔

دراصل واقعہ یہ ہے کہ مولوی فضل الدین کٹھ ملا تھے۔ انہوں نے اقبال کے مذہبی عقاید پر جو اعتراض کیا تھا وہ درحقیقت اقبال کی مثنوی اسرار خودی میں جناب امیر علیہ السلام کو مسند خلافت الٰہی پر فائز کرنا اور مسئلہ امامت کو تسلیم کرنے کے بارے میں تھا۔ تذکرۂ ابوالکلام کے ترتیب کے وقت بعض

اخباروں نے یہ خبر اڑادی تھی کہ اقبال شیعہ ہو گئے ہیں۔ اس مسئلے کو اکبر الہ آبادی نے بھی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے خطوط میں خوب اچھالا تھا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابوالکلام آزاد فضل الدین احمد سے اس لئے خوش نہیں تھے کہ انہوں نے تذکرہ کی اشاعت میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اس بارے میں وہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء کے خط میں عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:-

> ''تذکرہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی۔ ایک صاحب نے ''بطور خود شائع کر دیا۔ یہ وجوہ اس کی اشاعت میرے لئے خوش آئندہ نہ ہوئی''

آزاد نے ایسے ہی خیالات کا اظہار سلیمان ندوی کے خط مورخہ ۲ جنوری ۱۹۲۰ء میں کیا تھا۔ مجھے کوئی ایسی شہادت نہیں ملی ہے کہ آزاد نے دیباچہ نگار کے ان اعتراضی جملوں پر کبھی لب کشائی کی ہو جو تذکرے میں موجود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آزاد مفسرِ قرآن کے علاوہ امام الہند بھی کہلائے جاتے تھے اور اقبال مردِ قلندر۔ اس مردِ قلندر کی شہرت کو جو عروج انتقال کے بعد ملا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا مقبرہ مرجع عوام الناس ہے۔ جو کوئی بھی صدر مملکت یا عظیم سیاسی رہنما یا عالم دین پاکستان آتا ہے وہ اقبال کے مقبرے پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے۔ آزاد کی تربت پر چراغ روشن کرنے والوں کا فقدان ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے راقم کا مقالہ ''اقبال کی ایک نظم'' فاطمہ بنت عبداللہ'' مطبوعہ صحیفہ لاہور جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء (شمارہ ۱۳۷) دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۴) سال ۱۹۱۵ء-- یہ اقبال کے لئے پریشان کن اور کڑی آزمائشوں کا سال تھا۔ مثنوی اسرار خودی شائع ہوئی تو اقبال کے نہایت دیرانہ دوست خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے خلاف تصوف کی آڑ میں صورِ اسرافیل پھونکا۔ کچھ ملاؤں نے خواجہ صاحب کا ساتھ دیا۔ حیرانگی اس بات پر ہے کہ اکبر الہ آبادی بھی خواجہ صاحب کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ ۲ فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں وہ خواجہ صاحب کے نام لکھتے ہیں کہ:-

> ''اقبال کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لئے بھیانک ہو گئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے.......

مسلماں تو وہ ہے جو ہے مسلماں علم باری میں

کروروں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں

بہرکیف اقبال سے زیادہ نہ لڑیے۔ دعائے ترقی ودرستی اقبال کیجئے"

خواجہ صاحب نے اس کے جواب میں ۲۶ا اگست ۱۹۱۶ء کو اکبر کو لکھا:۔

"ڈاکٹر اقبال کا اور میرا کیا مقابلہ۔ ان کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ میں بے دست و پا ہوں۔ آپ نے سچ فرمایا ہے اطاعت رب بڑا سہارا ہے۔ یہ ہو تو غیر اللہ کے خوش رکھنے کی ہوس کہاں سے آئے تب بھی اقبال کو میرے سامنے مجھ کو خوش کرنے کے لئے بُرا کہا جاتا ہے تو خود بہ خود جی دکھتا ہے۔ بعض اوقات لڑنے لگتا ہوں۔ اس وقت خیال کہتا ہے اقبال میرے دوست ہیں ان کو کوئی دوسرا برا کیوں کہے۔"

غرضیکہ کہ اقبال ملاؤں کے خلاف دوڈھائی سال تک اپنے موقف کے لئے جہاد کرتے رہے۔

میرے خیال میں اقبال کے دفاع کی پہل قدمی مولوی ظفر الملک علوی نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے مشہور رسالہ "الناظر" لکھنؤ جلد ۱۴ نمبر ۹۔ ۷ بابت یکم جنوری ۱۹۱۶ء (صفحہ ۵۳-۵۶) میں مثنوی اسرار خودی کی حمایت میں مضمون لکھا۔ اس کا حوالہ اقبالیات میں کہیں نہیں ملتا ہے۔ اس لئے یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"زمانہ حال کے جدید مطبوعات میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا کے زور طبیعت نے اسرار خودی نامی مثنوی کے ذریعہ سے ایک قابل قدر اضافہ کیا۔ قابل مصنف نے مثنوی کا موضوع فلسفۂ عمل دے کر مثنوی مولانائے معنوی کی بحر میں لطیف پیرایۂ بیان کے ساتھ مختلف عنوانون سے فلسفۂ تصوّف کے بالمقابل جدت طرازیاں کی ہیں اور قند پارسی کی گھلاوٹ ادائے مطالب کو اور زیادہ دلفریب بنانے میں کامیاب رہی ہے۔

آغاز کلام ایک مختصری نثر سے کیا گیا ہے، جو نہ صرف دیباچۂ کتاب کے ملخّص بیان بھی ہے۔ اس دیباچے میں انہوں نے دکھایا ہے کہ فلسفۂ طبعیات کے اس پرشکوہ مسئلہ کو جس پر تکمیل انسانیت کا دارومدار ہے اور جس کا مفہوم کلّی "انا" میں جملہ نشین ہے مختلف اقوام کے حکمائے طبعیات والہیات نے کس حد تک اثر ڈالا ہے۔

ہم اس موقعے پر اس پہلو سے معافی چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اسلامین میں

سے فقط چند متصوفین کے مجتہدات پر قناعت کر لیتے ہیں۔ وہ اگر محققین حکمائے اسلام کے مصنفات پر زیادہ گہری نظر ڈالتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جس اجتہاد کا سہرا انہوں نے سری کرشن جی کے سر باندھا ہے وہی اجتہاد اس سے زیادہ روشن، اس سے زیادہ واضح اس سے زیادہ قریب الفہم، رازداران شریعت محمدیؐ کا سرمایۂ ناز رہا ہے۔

شاعر کا انداز بیان ایک جداگانہ چیز ہے۔ اس سے قطع نظر اصطلاح میں ماسوی اللہ کا لقب دے رکھا تھا اور جس کو ان کی جہاں سوز شرارہائے محبت کی لپک ہر دم خاک سیاہ کرنے پر تیار رہا کرتی تھی، اس کے فنا کرنے کی حقیقی تعبیر بھی عدم دلبستگی سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

یہ دیباچہ ۲۲ صفحے تک پہنچکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اصل مثنوی اس نظم سے شروع ہوتی ہے جو بطور "پیش کش" فخر قوم آنریبل سر سید علی امام کی طرف منسوب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس دردمند دل کے تقاضے سے قوم کے چونکانے کے لئے یہ خون جگر کھایا تھا، حقیقت میں اس کے انتساب کے لئے بھی ایسے ہی دردمند بزرگ ملّت اور عظیم القدر شخصیت کی ضرورت تھی۔ سر سید علی امام کے نام نامی سے اس مثنوی کا معنون کرنا بالمقابل حق بجانب ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بزرگ سید کی شان میں لکھتے ہیں اور سچ کہتے ہیں۔

آشنائے معنی بیگانہ
جلوۂ شمع مرا پروانہ

پیش کش کے بعد تمہید اور تمہید کے بعد مقدمہ عنوان قائم کر کے ہر ایک پہلو سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نظام عالم خودی پر منحصر ہے۔ پیرایۂ استدلال تمثیلی جیسا کہ عموماً مواعظ و تنبیہات کا ہوا کرتا ہے اس مثنوی کا بھی ہے۔ باقی رہی اس کی شاعرانہ حیثیت، سو ڈاکٹر صاحب کے ذوق سلیم اور طبیعت داری میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ انہوں نے زمانہ حال کے مذاق پر اردو نظم کے ذریعہ سے جس قدر قوم کی خدمت کی ہے ظاہر ہے۔ ان کی شوخی طبیعت نے پہلے سے اہلِ ملک کو ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے اور اب تو ان کے توسنِ فکر نے کسی دوسرے ہی عالم کو اپنا جولان گاہ بنانا

چاہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح کی دلپذیر نظموں سے قوم کو فرسودہ خیالات کی بیڑیوں سے آزاد کر کے حکمت عمل کا دلدادہ بنائیں۔ خدا ان کی مدد کرے اور قوم و ملک کو توفیق عطا فرمائے۔

ہم کو اس سے پیشتر فارسی زبان پر ڈاکٹر صاحب کی قادرالکلامی کا کوئی بین ثبوت نہیں ملا تھا۔ اس مثنوی کی برجستگی بیان و بے تکلفی زبان نے ثابت کر دیا۔ کہ ان کو فارسی پر بھی اسی طرح قدرت حاصل ہے، جس قدر کہ اردو پر۔ ایک مقام پر جس کی سرخی ہے کہ ''خودی از عشق و محبت استحکام می پزیرد'' وہ کہتے ہیں ؎

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرار زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر　　زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

(اس کے بعد متعدد مثالیں ہم نے حذف کر دی ہیں۔ اکبر حیدری)

آخر میں الناظر میں یہ مضمون ذیل کے جملے پر ختم کرتے ہیں:۔

''ہم یہ مختصر سا انتخاب مشتے نمونہ از خروارے کے طریق ہدیۂ ناظرین کر کے تہ دل سے دادِ سخن دیتے ہیں۔ دردمندانِ قوم پر اس مثنوی کا مطالعہ واجب ہے''۔

اقبال کی ''رموز بیخودی'' پر بھی غالباً سب سے پہلا تبصرہ الناظر جلد ۱۸ نمبر ۱۰۰، بابت یکم اپریل ۱۹۱۸ء (صفحہ ۱) میں ایڈیٹر صاحب نے یوں شائع کیا ہے۔

(۱۵) ''رموز بیخودی''۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی مثنوی اسرار خودی دو سال ہوئے چھپی تھی اور گو فارسی زبان کا مذاق کم ہو گیا ہے، تاہم اسے پبلک سے خلعتِ قبول حاصل ہوا۔ رموز بیخودی اس کا دوسرا حصہ تیار ہوا ہے جسے احیائے ملّت اسلامیہ کے لئے بہ منزلہ ایک نسخۂ کیمیا کے سمجھنا چاہئے۔ زبان فارسی میں قلم ہندی کی روانی کا تماشا دیکھنا ہو، یا جذباتِ قوی و حسیاتِ ملّی کے بحرِ ذخار میں تخیّل کی طغیانی کا نظارہ کرنا ہو تو رموز بیخودی کا مطالعہ فرمائیے۔

اقبال کی شاعری کا تعارف کرانا اسی طرح دشوار ہے جس طرح لطفِ شراب سے کسی کو آگاہ کرنا، جیسے شوق و ولولہ ہو یا ہمت و حوصلہ آئے اور اپنے کام و دہن کو اس مئے ارغوانی سے لذت آشنا کرے۔ قیمت (اس کلام کی نہیں، بلکہ کاغذ اور چھپائی کی) الناظر کے اسی شمارے میں ''اکبری اقبال'' پر تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''یہ اشعار نہیں بلکہ اقبال کے خوان دل کی پکوڑیاں ہیں جو انجمن حمایت اسلام کے گذشتہ اجلاس میں حاضرین ضیافت طبع کے لئے حضرت اقبال نے پیش کی تھیں۔
چونکہ یہ جملہ اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں ہیں اس وجہ سے خواجہ حسن نظامی صاحب کے جنہوں نے اس پر تمہید لکھی ہے اس کا نام ''اکبری اقبال'' رکھا ہے۔ آخر میں بقول اقبال ایک ''ترلقمہ'' بھی ہے جو عام طور پر مسلمان نوجوان اور خاص طور پر جمعیت احرار کے سرلشکر کے لئے قابل توجہ ہے''۔

اقبال کی اسرار خودی کی اشاعت پر اکبر نے اقبال کی سخت مخالفت کی۔ جب ۱۹۲۱ء میں اکبر کا انتقال ہوا تو انہیں بڑا صدمہ ہوا اور اکبر کا مرثیہ کہا۔ صرف دو شعر پیش کرتا ہوں۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر — عیانش بحق بود روشن دلیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی — دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

(۱۶) ترقی۔ ترقی کے نام سے یہ ماہنامہ حیدرآباد دکن سے ابوالمکارم صدیقی کی ادارت میں ربیع الاول ۱۳۴۱ ہجری (مطابق اکتوبر ۱۹۲۲ء) میں جاری ہوا۔ اور ہر ماہ ہلالی کے پہلے ہفتے میں پابندی کے ساتھ چھپتا تھا۔ میں نے اس کے سال بھر کے شمارے دیکھے۔ اس کے بعد غالباً بند ہو گیا تھا۔ ترقی کے لکھنے والوں کے چند نام یہ ہیں:۔

علی حیدر نظم طباطبائی، ہاشمی فرید آبادی، شمس اللہ قادری، خان بہادر مرزا سلطان احمد، مولوی عبداللہ العمادی، نوازش علی لمعہ، سید وہاج الدین احمد شمیم، عزیز یار جنگ عزیز، آغا حیدر حسن دہلوی، کیفی حیدرآبادی، عبدالرزاق بسمل، مسعود علی محوی۔

ترقی جلد ۱، نمبر ۲ بابت ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۲ء صفحہ ۱ تا ۴) میں فصل الخطاب / جناب رسالت مآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ / حقیقی موضوع شاعری'' از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال چھپا ہے۔ مضمون کی ابتداء میں ایڈیٹر صاحب کا تمہیدی نوٹ قابل غور ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

''اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز''

''ہندوستان میں جس وقت بیداری کے دوسرے معنی خواب غفلت تھے جب اسلامی جذبات کے مضحکے اڑائے جاتے تھے۔ جب قومیت کا احساس موجود ہی نہ تھا۔ اس وقت سب سے پہلے اسلام کے جس فرد کامل نے اعلائے کلمۃ الحق کا آوازہ بلند کیا اور صور اسرافیل کو تا بفلک پہنچایا وہ ڈاکٹر اقبال کی اور صرف ڈاکٹر اقبال کی پاک ہستی

تھی جو حقیقت میں تحریک اسلامی کی من حیث الشرع والدّین محرک ہے۔ اکبر، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، محمد علی جوہر، شوکت علی، سب اس خرمن کے خوشہ چیں ہیں اور سب کے دلوں میں اس کے تعلیماتِ صدق وصفا سے گرمی پیدا ہوتی ہے"۔

ترقی جلد ۱، نمبر ۴، بابت جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ (مطابق جنوری ۱۹۲۳، صفحہ ۴۵) میں مولوی سید وہاج الدین احمد شمیم کی معرکہ آرا نظم بہ عنوان "خطاب بہ اقبال" دس شعر میں ہے۔ پیغام اقبال کو دیکھئے کس انداز سے ساز دل کے تاروں کو زخمہ زن کرتا ہے۔

تو اے اقبال! عندلیب گلشن اسلام ہے	نغمہ تجی تیری ملّت کے لئے پیغام ہے
تیرے نالوں نے بپا اک شورِ طوفاں کر دیا	خفتہ پا ملت کی بیداری کا ساماں کر دیا
سازِ ہستی مسلماں مدّتوں سے تھا خموش	بربطِ دل نے تیرے کی اس کو تلقینِ خروش
ہستی اسلام حرفِ نالہ و فریاد تھی	شکوہ سنج جور تھی فریاد تھی بیداد تھی
جز شکیبائی نہ تھی کچھ دوسری راہِ نجات	قوم تھی بیگانۂ اسرارِ پیکارِ حیات
سینے یادِ محفل دوشینہ سے معمور تھے	اور دل اندیشۂ فردا سے کوسوں دور تھا
کر دیا تھا خود فراموشی نے ناکام عمل	تیرے نغموں نے دیا ملّت کو پیغام عمل
کس قدر ہنگامہ زا تھا تیرے نالوں کا خروش	قصۂ خواب آور ماضی کو کر ڈالا خموش
تیرے دل کی ہر صدا ایک شورش قم بن گئی	اشک کی ہر بوند پیغام تلاطم بن گئی

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی

کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی

اقبال

(۱۷) **اقبال** کا مجموعہ کلام فارسی "پیام مشرق" ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں "لالہ طور" کے عنوان سے رباعیات کا حصہ ہے۔ ایک رباعی یہ ہے۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے	تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دل درد آشنائے	چو جوئے در کنار کوہسارے

پروفیسر عندلیب شادانی ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے استاد تھے۔ ان کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوتے تھے اور اس طرح مستند محققین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شادانی صاحب ۱۹۲۳ء میں لاہور آئے تھے اور ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوران گفتگو انہوں نے اقبال سے دریافت کیا کہ پیامِ مشرق میں "لالۂ طور" کے ماتحت جو اشعار درج ہیں ان کے لئے آپ نے

''رباعیات'' کا عنوان کس بنا پر اختیار فرمایا۔ اقبال نے جو جواب دیا تھا اس کو شادانی نے اپنی کتاب ''تحقیق کی روشنی'' میں یوں محفوظ رکھا:۔

''باباطاہرعریاں ہمدانی کی رباعیات تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ دیکھئے اس کا بھی وہی وزن جو میرے اشعار کا ہے۔ اور یہ رباعی کا مخصوص وزن نہیں ہے۔ اس کے باوجود اہل ایران انہیں رباعی کہتے ہیں۔ اور ایران، ہندوستان اور یورپ میں جتنے مجموعے کلام باباطاہر کے چھپے ہیں اُن سب کے سرورق پر ''رباعیات باباطاہر'' ہی لکھا ہے جہاں تک فارسی کا تعلق ہے، ایرانی اہل زبان ہیں اور ہم زباندان اور اصولاً زبان کے معاملے میں، جمہور اہل، زبان کا تتبع زبان والوں کے لئے ضروری ہے۔ دستورزبان کے لئے کلیات بجائے خود درست ہیں۔ لیکن استثنا کی صورتوں میں اہلِ زبان کی پیروی لازم ہے۔ مانا کہ رباعی کا ایک مخصوص وزن ہے۔ لیکن باباطاہر کے اشعار کو اگر اہل ایران عام طور پر رباعی کہتے ہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ عروض کی کتابوں کا سہارا لے کر ہم ان پر اعتراض کریں۔ اسی بنا پر میں نے اشعارزیر بحث کو رباعی کہنا درست سمجھا، کیوں کہ وہ بھی باباطاہر کی رباعیات کے وزن پر ہیں''۔

(۱۸) شمع آگرہ۔ پروفیسر محمد حبیب (آکسن) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جناب حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، آگرہ (۱۸۸۵-۱۹۶۰ء) نے دارالاشاعت حسن منزل آگرہ سے جنوری ۱۹۲۵ء میں ایک علمی وادبی اردو رسالہ ''شمع'' کے نام سے جاری کیا۔ سرورق پر دونوں مدیروں کے نام چھپتے تھے۔ ''شمع'' بہت نادرالوجود پرچہ ہے۔ اس کے متعدد شمارے میری نظر سے حیدرآباد میں گزرے ہیں۔ اگست ۱۹۲۵ء کے شمارے (صفحہ ۶۳) میں جعفری صاحب نے مولانا گرامی (م-۱۹۲۷ء) کے سلسلے میں لکھا تھا کہ:۔

''سر اقبال فارسی شاعری میں گرامی کے نہایت عزیز شاگرد ہیں''۔

جب یہ شمارہ علامہ کی نظر سے گزرا تو انہوں نے ایک خط جعفری صاحب مدیر شمع کو لکھا جس میں گرامی کی شاگردی کی تردید کی تھی۔ موصوف نے مخزن لاہور گرامی نمبر بابت اگست ۱۹۲۷ء (صفحہ ۳۵) میں دوبارہ اقبال کی شاگردی کا ذکر کیا۔ لکھتے ہیں:۔

''میں نے اپنے نوٹ میں جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شاگردی کا ذکر کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے شمع میں وہ نوٹ ملاحظہ فرما کر مجھے ایک خط لکھا اور اس کی تردید کی۔ وہ

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۳۱۲)

اُردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹرایٹ لا۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حسن عابد جعفری آکسن

بیرسٹرایٹ لا آگرہ

دارالاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

شمع

بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء

تصحیح اطلاع

اگست کے شمع میں غلط اطلاع کی بنا پر مولانا گرامی صاحب کے حالات کے تحت میں لکھا گیا تھا کہ محترمی علامہ سر محمد اقبال صاحب قبلہ اُن کے عزیز شاگرد ہیں۔ ہم کو علامہ سر محمد اقبال صاحب نے جو تحریر اس بارے میں بھیجی ہے اُس کا اخیر جملہ درج کرتے ہیں:۔ مولینا گرامی میرے نہایت عزیز دوست ہیں اور میں اُن کا ادب و احترام کرتا ہوں مگر تلمذ کا تعلق اُن سے مجھے کبھی نہیں ہوا شاگردی خواہ کسی کی ہو کوئی عار کی بات نہیں۔ مگر جو بات خلاف واقع ہو اس کی تردید ضروری ہے اسی واسطے میں نے یہ چند سطور لکھنے کی جرات کی ہے:۔

ہم کو اپنی غلطی پر افسوس ہے اور علامۂ موصوف سے خواستگار معافی ہیں ہم کو بہت زیادہ خوشی اس امر کی ہے کہ محترمی علامہ موصوف نے ہماری اس غلطی کا بُرا نہ مانا اور ان کی بزرگی کی یہ بھی ایک دلیل ہے۔ خطا از خوردان وعطا از بزرگان۔

خط میں نے شمع میں شائع کر کے اپنے بیان کی تردید کر دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مولانا گرامی نے سر اقبال کو محض جوش محبت، تفاوت عمر اور شاعری میں مشوروں کی بنا پر اپنا شاگرد ہونا مجھ سے فرمایا تھا''۔

یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا تھا جب جعفری صاحب حیدر آباد میں مقیم تھے۔ وہیں گرامی نے کہا تھا کہ اقبال ان کے شاگرد ہیں۔ اور فارسی میں مشورہ اور اصلاح لیتے تھے۔ جعفری صاحب کے مضمون ''حضرت گرامی مرحوم'' مطبوعہ مخزن (گرامی نمبر) بابت اگست ۱۹۲۷ء (صفحہ ۳۵) کے حاشیے میں مخزن کے ایڈیٹر حفیظ جالندھری شاگرد گرامی کا ذیل کا نوٹ قابلِ غور ہے:-

''یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت گرامی اور علامہ اقبال کے مابین بے انتہا رسم و راہ تھی۔ یہ رسم و راہ استادی شاگردی سے تعلق رکھتی تھی یا محض دوستانہ۔ اس کے متعلق دونوں کے بیانات مختلف ہیں۔ حضرت اقبال نے ''شمع'' کے نوٹ کی تردید کی جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو گرامی کا شاگرد تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن گرامی نے اکثر لوگوں سے کلام اقبال پر اصلاح دینے کا ذکر کیا۔ راقم حروف نے ایسے خطوط بھی دیکھے ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اپنے کلام پر گرامی سے مشورہ طلب کیا تھا''۔

مشورہ طلب کرنا اور چیز ہے اور زانوے تلمذ تہ کرنا اور -- اگر شاگردی کا ذکر صحیح ہوتا تو اقبال اس کا اعتراف ضرور کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اور گرامی دونوں ایک دوسرے کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ گرامی اقبال کے بارے میں کہتے ہیں۔

حکمت آموزِ حال و استقبال	وہ چہ علامہ ایست سر اقبال
می دہد جلوہ حال را در قال	گوئیے را جواب سر اقبال

آخر میں علامہ اقبال کا ایک فیصلہ کن اور نو دریافت دستاویزی خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس میں علامہ گرامی کی شاگردی سے انکار کیا۔ خط ایڈیٹر صاحب نے ''شمع'' بابت ستمبر ۱۹۲۵ء (صفحہ ۲) میں جلی حروف میں پورے صفحہ پر ''اطلاع'' کے تحت شائع کیا:-

''مولانا گرامی میرے نہایت عزیز دوست ہیں۔ اور میں ان کا ادب و احترام کرتا ہوں مگر تلمذ کا تعلق ان سے مجھے کبھی نہیں ہوا۔ شاگردی خواہ کسی کی ہو، کوئی عار کی بات نہیں۔ مگر جو خلاف واقع ہو، اس کی تردید ضروری ہے۔ اسی واسطے میں نے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کی ہے''۔

(۱۹) شمع آگرہ بابت مارچ ۱۹۲۷ء (صفحہ ۸۴) میں حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال کے ''اقبالی کلینڈر'' کا دیدہ زیب اور پرکشش اشتہار الفاظ ذیل میں چھپا تھا:۔

''ڈاکٹر محمد اقبال کی تصویر سے مزین ہے۔ تصویر کے نیچے کلنڈر کے اوراق ہیں۔ ہر ورق پر علامہ موصوف کا ایک شعر ہے جو مہینہ یا موسم کی رعایت سے دیا گیا ہے۔ کلنڈر خوب صورت اور خوش وضع ہے۔ قیمت دو روپے''۔ **مصطفی بلڈ پورنگ محل۔**

اس خوبصورت کلنڈر کی تلاش کے لئے میں نے مہینوں کتب خانوں کی خاک چھانی۔ بالاخر حیدرآباد میں مجھے ایک دوست سے آب رسیدہ اور کرم خوردہ صورت میں ملا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اشعار عبدالحمید کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ غالباً یہ وہی خوش نویس تھے جو علامہ کے خاص کاتب تھے۔ کلینڈر علامہ کی اجازت سے چھاپا گیا تھا۔ تصویر اور حواشی کے بیل بوٹے عبدالرحمن چغتائی نے کھنچے تھے۔ تصویر بہت پرانی تھی اور غالباً ۱۹۲۲ء میں اتاری گئی تھی۔

(۲۰) ''مرقع'' لکھنؤ۔ ایڈیٹر وصل بلگرامی۔

مرقع کے نام سے ایک رسالہ شاہجہاں پور سے احسان علی احسان کی زیر ادارت ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد وصل بلگرامی نے اسی نام سے دوسرا مرقع جنوری ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ مشہور و معروف شاعروں اور ادیبوں کے عکس تحریر بھی بہت ہی عمدہ اور ولایتی دبیز کاغذ پر چھپتے تھے۔ اس کے پہلے ہی شمارے (صفحہ ب) میں وصل لکھتے ہیں:۔

''عالی جناب علامہ ڈاکٹر سر اقبال۔ بیرسٹرایٹ لا، لاہور کے نام نامی سے ابتدا کرتا ہوں۔ جنہوں نے اپنا ایک شعر خاص مرقع کے سرورق کے لئے عنایت فرمایا۔ جناب ممدوح کا گرامی صحیفہ ذیل میں درج ہے''۔

''لاہور ۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۵ء

مخدومی تسلیم ۔ ایک شعر حاضر ہے۔ معلوم نہیں کہ سرورق کے لئے موزوں ہوگا یا نہیں۔

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشۂ دارد
شگافد سینۂ کہسار و پاک از خون پرویزست''

مرقع کے صفحہ ۶ اور ۷ کے درمیان ''افکار فلک پیما'' کے تحت **''عکس تحریر علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے بیرسٹرائٹ لا لاہور'' درج ہے۔ اور اس کے نیچے اقبال کے یہ شعر درج ہیں۔**

شیخ عنایت اللہ منیجر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ۱۹۳۶ء میں جب یورپ سے واپس آئے
تو حضرت علامہ اقبال نے آپکو جو خط بھیجا وہ درج ذیل ہے

جناب شیخ صاحب — السلام علیکم

یورپ سے مع الخیر واپس آنا مبارک ہو

میں تمام دن گھر پر رہتا ہوں۔ آپ جس روز چاہیں تشریف لائیں

صبح [illegible] آٹھ بجے [illegible] تو بہتر ہو گا اگر یہ وقت آپ کے لئے

موزوں نہ ہو تو شام چھ بجے تک

ضرب کلیم کی طباعت کا کام اس ماہ کے آخر تک ختم ہو جائے گا

اس کے بعد مجھے امید ہے عید [illegible] کی تعطیل ہو گی۔ اگرچہ میرا

مقصود ہے … کا مقصود ہے۔ والسلام

محمد اقبال ۲۴ جولائی ۳۶ء

لاہور میو روڈ

''گفتند دل آزاد کہ پر بستہ نکوتر گفتم کہ ز بند و جہاں رستہ نکو تر

گفتند ز خلوت کدۂ خویش بروں تاخت گفتم شرر جستہ زنا جستہ نکو تر

گفتند کہ دربارۂ اور چیز دگر گوئے

گفتم چو گل از باد صبا خستہ نکو تر

دانت کے درد سے افاقہ ہے۔ ہمدردی کا شکریہ قبول فرمایئے۔ ٹائٹل پیج کے لئے شاید یہ شعر موزوں ہو۔

تا تو بیداری شوی، نالہ کشیدم ورنہ

عشق کارے است کہ بے آہ وفغاں نیز کند''

مرقع کے پہلے شمارے میں یہ شعر اقبالؔ کے خطی عکس میں شائع ہو چکا ہے۔ بعد میں موصوف نے اسے زبورِ عجم کے دوسرے حصہ صفحہ ۱۰۱ میں شعر نمبر ۱۰ کے تحت درج کیا ہے۔ شعر مرقع کے سرورق کی زینت بنا تھا۔

(۲۱) اقبال اور محمد علی جوہرؔ کے درمیاں عرصۂ دراز سے برادرانہ، دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ اقبال کی متعدد نظمیں اخبار ہمدرد کے ابتدائی پرچون میں میری نظر سے گزری ہیں۔ دونوں کی دوستی اس وقت گہن میں آ گئی جب جوہر نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اقبال کو تار دیا کہ وہ علی گڑھ آ کر جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری قبول کریں۔ اقبال نے اس عہدے کی قبولیت سے انکار کیا۔ اقبال مسلم لیگی اور جوہرؔ کٹر کانگریسی اور دوقومی نظریہ کے خلاف تھے۔ اس وقت میرے پیش نظر جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' کی فائلیں موجود ہیں۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں درج ہے کہ:-

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ ابتدائی کلام نذر ناظرین کرام کیا گیا تھا جس میں انہوں نے اپنے حب وطن کو نظم فرمایا تھا۔ کل مضمون ختم کرنے کے بعد لیٹ گیا اور جی چاہا کہ گریموفون پر کچھ گانا سنا جائے۔ ۱۹۱۱ء کا ایک ریکارڈ لگایا گیا۔ پہلا ہی شعر ایک تیر کی طرح جگر کے پار ہو گیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیا ہندوستان کے مسلمان اپنی افسردگی اور اس مردنی سے جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے ثابت کر رہے ہیں کہ چین بھی ان کا ہے اور عرب بھی ان کا۔ خود انہی کے

پنجاب سے جو ہندوستان بھر "وطنیت" کی بدترین مثال پیش کر رہا ہے بار بار یہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں کہ چین تو کہاں کا ترکی و حجاز تک سے بھی ہمیں قطع نظر کر کے اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونے کے صرف یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کتنی ملازمتیں دلائی جائیں اور مسلمانوں کی "قوم" کے معنی زیادہ تر یا تو اپنی ذات شریف ہے یا بیٹا بھتیجا داماد ہیں۔ یہی ملت پرستی کی یہ مرغی ہر گز کڑک نہیں ہوتی ہے۔ یہ برابر انڈرے دے رہی ہے اور پیسے بٹور رہی ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء سے آج تک ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ملت پروری کا نتیجہ۔ یقیناً آج جب کہ ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن کیا یہ اس سے زیادہ سچ ہے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اقبال نے پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اعلیٰ عہدوں پر انگریزوں کا تقرر کیا جائے تا کہ "ہندو مسلم" تلخیاں، شکائتیں اور بدمزگیاں پیدا نہ ہوا کریں"

محمد علی جوہر کو یہ اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے "عجیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ" کے عنوان سے "ہمدرد" کی اشاعت مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۲۷ء میں لکھا:-

"وہ اقبال آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ ہندوؤں کو غیرت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہ کی جائے۔ جب تک کہ اس کو رام نہ کرلو گے ہندوستان کو آزاد نہ کر سکو گے۔ سوراج نہ لے سکتے ہو۔ اس استیصال کا خیال حماقت نہیں جنون ہے"۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں جوہر کا انتقال لندن میں ہوا۔ جب علامہ نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو بڑا دکھ ہوا اور ایک مختصر مگر غیر فانی مرثیہ کہا۔ یہ شعر قابل ذکر ہے۔

خاک قدس او را بآغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہی کہ پیغمبر گزشت

افسوس کہ اس جنگ آزادی کے سورما کی تربت کا اب کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ سچ کہا گیا ہے ۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

(۲۲) جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ علامہ کا کلام زمانہ کانپور میں ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپنے لگا۔ اور وہ اس میں عرصہ دراز تک لکھتے رہے۔ اقبالیات سے متعلق اس میں اچھا خاصا کلام موجود ہے۔ انشاء اللہ یہ سارا مواد اگلی کتاب ''اقبالیات۔زمانہ کانپور میں'' آپ بہت جلد ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

جب ۱۹۲۸ء میں ''زمانہ'' کا جوبلی نمبر شائع ہونے والا تھا تو ایڈیٹر صاحب نے اقبال سے درخواست کی کہ وہ ''زمانہ'' (رسالہ) کی مناسبت سے کوئی شعر عنایت فرمائیں۔ ایڈیٹر موصوف ''زمانہ'' فروری ۱۹۲۸ء (صفحہ ۱۰۷) میں اقبال کے لطف وکرم کا ذکر زیر عنوان ''علامہ اقبال اور زمانہ'' ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

''علامہ اقبال زمانہ کے اوّلین قلمی معاون ہیں۔ آپ کا مشہور ومعروف ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' سب سے پہلے ''زمانہ'' بابت ستمبر ۱۹۰۴ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا۔ اس کے لئے آپ نے یہ شعر خاص طور پر عنایت فرمایا تھا''۔

نہ کنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم
بہ سراغ صبحِ فردا روشِ زمانہ دارم

بعد ازاں علامہ نے اسے ''زبور عجم'' کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ جون ۱۹۲۷ء) کی غزل ۱۶ میں شعر نمبر ۳ کے تحت درج کیا ہے۔

(۲۳) آیت اللہ علامہ میرزا عبدالکریم زنجانی (۱۸۸۶ء-۱۹۶۸ء) بہت بڑے عالم اور کثیر التعداد تصانیف کے مصنف غالباً ۱۹۲۷ء میں نجف اشرف (عراق) سے تشریف لاکر لاہور میں نواب سر فتح علی خان (م۔۱۹۲۳ء) کے بڑے صاحبزادے نواب نثار علی خان (م۔۱۹۴۴ء) برادر بزرگ نواب سر مظفر علی خان قزلباش سابق وزیر اعلیٰ پنجاب کے یہاں مہمان کی حیثیت سے نثار حویلی میں قیام فرمایا۔ جب ان کے علمی تبحر اور قرآن فہمی کا غلغلہ اقبال نے سماعت فرمایا تو ان کی خدمت میں جاکر سوال کیا کہ قرآن کی روشنی میں ''وحی اور الہام'' اور امامت کے بارے میں مجھے آگاہ کریں۔ آیت اللہ زنجانی نے ان دونوں سوالوں کے جواب فارسی زبان میں تین گھنٹے تک دیا۔ یہ تقریر لاہور کے ایک جید عالم اور

اقبال کے دوست سید حسن جعفری نے قلمبند کی اور بعد میں اسے نہایت فاضلانہ فارسی اور عالمانہ اردو ترجمے کے ساتھ کتابی صورت میں ''وحی والہام اور برہان امامت'' کے نام سے نثار حویلی لاہور سے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ کتاب کا غالباً واحد نسخہ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنو میں زیر نمبر ۲۰۷ محفوظ ہے۔ سرورق کی پشت (صفحہ ۲) پر یہ ضروری اطلاع پورے صفحے میں جلی حروف میں نمایاں ہے۔

''موضوعات مہمہ فلسفی، اجتماعی، دینی ومذہبی کہ از حضور مجتہد اکبر واعلم وفیلسوف اعظم اسلام سرکار میرزا عبدالکریم زنجانی نجفی سوال نمودہ شد۔ سائل ڈاکٹر سر محمد اقبال بود۔ من کہ در آں مجلس حاضر بودم۔ جوابہائے سرکار مجتہد اعظم موصوف را کہ سہ ساعت وقت را مستغرق شد بقدر مقدور ضبط نمودم۔ دوتا ازاں جوابہارا کہ یکے متعلق بوحی و الہام ودیگرے متعلق بہ برہان عقلی امامت است۔ چونکہ دینی ومذہبی است فعلاً نشر نمایم برائے تعمیم نفع باقی را، نیز ہرگاہ توفیق مساعد شود نشر خواہم نمود''۔

(۲۴) **اردو** کے بہی خواہ اور علامہ اقبال کے نہایت قدردان دوست سر تیج بہادر سپرو نے سال ۱۹۲۸ء-۱۹۲۹ء کے لئے ہندوستانی اکادمی الہ آباد سے علامہ سر محمد اقبال سے لیکچر دینے کی درخواست کی تھی۔ اس مصارف کے لئے سپرو صاحب صدر اکادمی نے دو ہزار روپے کا قابل قدر عطیہ مرحمت فرمایا تھا۔ یہ اطلاع ''علمی خبریں اور نوٹ'' کے تحت زمانہ کانپور اکتوبر ۱۹۲۸ء (صفحہ ۲۵۴) میں چھپی تھی۔

(۲۵) **اقبال** نے حیدر آباد کا دوسرا سفر جنوری ۱۹۲۹ء میں کیا تھا۔ ''زمانہ'' جلد ۵۲ نمبر ۲ (صفحہ ۱۲۷) بابت فروری ۱۹۲۹ء میں لکھا ہے:-

''ڈاکٹر سر اقبال نے ''الٰہیات اسلامیہ جدیدہ'' پر مدراس میں چھ خطبات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر علالت کی وجہ سے ۱۹۲۸ء دسمبر کے آخر ہفتے میں آپ نے مندرجہ ذیل صرف تین عنوانات ہی پر خطبے دیئے۔

(۱) علم اور وحی الہام، (۲) وحی والہام کی تصدیقات کا فلسفیانہ معیار

(۳) ذات خدا کا اسلامی تصور اور دعا کا مفہوم

باقی تین عنوانات: ۱۔ مسئلہ جبر وقدر و حیات بعد موت

۲۔ علم النفس کی رو سے اسلامی تہذیب وتمدن کا حقیقی مفہوم

۳۔ ایک جماعت کی حقیقت سے اسلام کی تشکیل'' آئندہ سال کے لئے ملتوی کر دیئے گئے''۔

راقم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ جو خطبات علامہ نے مدراس میں دئے تھے اور جو اوپر درج کئے گئے ہیں ان کا آخر کیا حشر ہوا؟ کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں صرف ایک خطبہ ''خودی، جبر و قدر۔ حیات بعد الموت'' شامل کیا گیا ہے۔ باقی خطبات نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر کتاب سے حذف کر دئے گئے خاص کر ''وحی و الہام'' جس کا ذکر ''اقبال اور علامہ شیخ زنجانی'' کی متذکرہ بالا کتاب ''وحی والہام'' میں کیا گیا ہے۔

(۲۶) ''زمانہ'' میں دئے گئے خطبات کی تائید ''مجلۂ عثمانیہ'' حیدر آباد بابت دسمبر ۱۹۲۸ء و مارچ ۱۹۲۹ء (صفحہ ۲۱۶) میں ''کلیہ کی خبریں'' کے عنوان سے الفاظ ذیل میں درج ہیں:-

''ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ اس سال جامعہ عثمانیہ کی جانب سے توسیعی لیکچروں کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال کو مدعو کیا گیا تھا۔ معرکہ کے تین لیکچر فلسفۂ اسلام پر ٹاؤن ہال (باغ عام) میں ہوئے، جن میں متعلمین کلیہ نے بڑے شوق اور دلچسپی سے شرکت کی۔ پہلے روز ۲۲ جنوری کے جلسے کی صدارت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے کی۔ دوسرے روز سر حیدر نواز جنگ بہادر صدر تھے۔ تیسرے روز سر امین جنگ بہادر نے صدارتی فرائض انجام دئے۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال ان لیکچروں کو بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع کر کے اپنی اعلیٰ تحقیقات کے نتائج سے مشرق و مغرب کو مستفید فرمائیں گے۔ سر اقبال سے مدیرین مجلّہ (محمد عبدالرحمٰن خان اور عبدالجلیل) اور انجمن اتحاد کے معتمد نے دارالتصانیف میں ملاقات کی۔ موصوف دیر تک جامعہ عثمانیہ کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ مدیرین مجلّہ کو اس امر کے معلوم ہونے سے بڑی مسرّت ہوئی کہ وہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے مستقبل سے بڑی ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ ملاقات کے اختتام پر مدیرین نے مجلّہ کی جلدیں تحفتاً ان کی خدمت میں پیش کیں جن کو انہوں نے بڑی مسرّت کے ساتھ قبول کیا''۔

(۲۷) مندرجہ بالا خطبات کا ذکر اردو کے مشہور ادیب، صحافی اور گلابی اردو کے مؤجد ملاّ رموزی نے بھی مخزن بابت ''سالگرہ نمبر'' مارچ ۱۹۲۹ء (صفحہ ۸) میں ''شذرات و اشارات کے تحت کیا ہے۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ اقبال نے خطبات اردو میں نہیں پڑھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

''پچھلے دنوں جب حضرت علامہ مدظلّہ جنوبی ہند کے دورے پر تھے اور اسلام و اسلامیات پر اپنے محققانہ خطبات پڑھ رہے تھے تو اسی عرصے میں آپ حیدر آباد

بھی تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے باشندوں کو بھی ممدوح گرامی نے اپنے عالمانہ خیالات سے مستفید فرمایا۔ اس موقعہ پر حیدر آباد کے روشن خیال باشندوں نے حضرت علامہ سے درخواست کی کہ ممدوح اپنے عالمانہ اور گران منزلت خیالات کو زبان اردو میں ظاہر فرمائیں۔ مگر حضرت ممدوح نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ تمام خطبات کی زبان انگریزی میں رکھی۔ ممکن ہے یہ واقعہ حضرت علامہ کی ''کسی سخت مجبوری'' کے باعث ہو۔ لیکن صاحبان اردو اور خود حضرت علامہ کے لئے یہ واقعہ نہایت سخت افسوسناک اور مایوس کن ہے، جبکہ ممدوح کا شمار بھی چند برگذیدہ افراد میں ہے، جن کے فیض قلم و خیال سے اردو بہاریں ایسے مواقع پر زبان اردو کے حق کو فراموش نہ فرمائیں گے''۔

(۲۸) جناب کنھیالال گوبا ایم۔ اے ایل۔ ایل بی ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ صاحب ذوق اور اردو نواز تھے۔ انہوں نے الہ آباد سے جنوری ۱۹۳۰ء میں ''چاند'' کے نام سے اردو کا ایک ضخیم ماہنامہ جاری کیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ''چاند'' کا ایک شمارہ علامہ اقبال کی خدمت میں روانہ کیا۔ اقبال نے اسے پسند کیا اور انگریزی خط میں مسرت کا اظہار کیا۔ گوبا نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور ''چاند'' الہ آباد جلد ۲ نمبر ۷ بابت اکتوبر ۱۹۳۰ء (صفحہ ۴-۵) میں ان الفاظ میں شائع کیا:-

''مجھ کو کئی بار ''چاند'' پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ رسالے کے مضامین ان کی ترتیب اور طباعت وغیرہ کو دیکھکر خوشی ہوئی۔ ایڈیٹوریل مضامین نہایت ذہانت و قابلیت سے لکھے جاتے ہیں۔ اس کے سوا اور کیا خواہش ہو سکتی ہے کہ منشی کنھیا لال ....اس رسالے کو مقبول عام بنانے کی کوشش میں کامیاب ہوں۔ میری یہ دلی آرزو ہے کہ رسالے کی ترقی ہو''۔

(۲۹) منشی دیانرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) علامہ اقبال کے مخلص شیدائیوں میں تھے۔ وہ زمانہ میں اقبال اور ان کی تصانیف کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اقبال زیر ترتیب و طبع تصانیف کے بارے میں شائع ہونے سے پہلے ہی ان کو مطلع فرماتے تھے۔ جاوید نامہ جب زیر طبع تھا تو اس کے بارے میں نگم صاحب زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۱ء (صفحہ ۲۸) میں اپنے مخصوص کالم ''علمی خبریں اور نوٹ'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:-

''ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ہندوستان کی ادبی دنیا میں غیر فانی عزت و شہرت حاصل ہے۔

نیز غیر ممالک میں بھی آپ کے کلام کی کافی قدر ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ کی مثنوی ''اسرار خودی'' کا مکمل ترجمہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے اور پیام مشرق کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی (انگریزی اور جرمنی زبانوں میں شائع ہو گیا ہے) اب ڈاکٹر موصوف کی ایک اور تصنیف بھی مکمل ہوگئی ہے جو اٹلی کے شاعر اعظم ڈانٹے کی مشہور و مقبول نظم ڈوائن کوموڈی (Devine Comody) کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ڈانٹے نے مشہور درجل کو اپنا رہبر بنا کر جنت و دوزخ وغیرہ کی سیر کی اور وہاں کے مناظر کو دنیا کے روبرو پیش کر کے ناموری حاصل کی تھی۔ اقبال نے مولانا روم کو اپنا رہبر بنا کر سبع سیارہ کو اپنی سیر و سیاحت کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ ڈانٹے نے اپنی نظم میں اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر اقبال نے اس کا نہایت برجستہ جواب دیا ہے۔ لطف یہ کہ اُس کے جواب میں ڈانٹے کے مذہب یا اعتقادات سے کوئی تعارض نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ پیغمبر اسلام کے محاسن ذاتی کو اس طرح نمایاں کر دیا ہے کہ ڈانٹے کے اعتراضات خود بخود رد ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید ادبی کارنامہ جس کا نام ''جاوید نامہ'' ہے فی الحال زیر طبع ہے''۔

(۳۰) **نگم صاحب** ''علمی خبریں اور نوٹ'' کے عنوان سے زمانہ بابت جنوری ۱۹۳۲ء (صفحہ ۷۰) میں اقبال کی گول میز کانفرنس لندن کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''پچھلے دنوں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبال بھی انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ لندن کے ادبی حلقوں نے ان کی بحیثیت شاعر اچھی عزت افزائی کی۔ ''اقبال ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک جدید اعلیٰ انجمن آپ کی تشریف آوری کی یادگار قائم ہوئی۔ آپ کے خیر مقدمی جلسے میں من جملہ دیگر احباب کے مہاتما گاندھی، سر آغا خان، مسز سروجنی نائیڈو اور مسٹر عبداللہ یوسف وغیرہ شریک تھے۔

معلوم ہوا کہ لندن میں ڈاکٹر اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا کہ اب انہوں نے اردو میں شعر کہنا ترک کر دیا ہے اور اسلامی دنیا کی خاطر آئندہ فارسی زبان میں اپنے شاعرانہ خیالات و جذبات کے قلمبند کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اہل ملک علمی حیثیت سے کئی سال سے اس فیصلے سے واقف ہیں۔ تاہم وہ اس پر اپنے افسوس اور مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اردو کی سب

سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ جو لوگ اس کی توسیع و ترقی میں سب سے نمایاں حصہ لے سکتے ہیں وہ اس کے ساتھ انتہائی سرومہری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور نے شروع سے اب تک بنگالی زبان ہی کو اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار بنایا۔ اسی زبان میں ان کی بہترین تصانیف ہیں اور دنیا کی جن جن زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں وہ سب بنگالی سے کیئے گئے ہیں۔ مگر ڈاکٹر اقبال اردو کو اپنی شاعری کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ افسوس''۔

(۳۱) اسی زمانے میں امجد حیدر آبادی کا مجموعہ رباعیات شائع ہوا۔ انہوں نے ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھیجا۔ موصوف نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا:-

''ہر رباعی قابل داد ہے۔ اس کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے''

(جدید اردو شاعری صفحہ ۳۰۴ از عبدالقادر سروری حیدر آباد ۱۹۳۲ء)۔

(۳۲) حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم میں رسالوں کے علاوہ پرانے اخباروں کی بڑی تعداد ہے۔ ان میں علامہ اقبال کا ذکر بکثرت موجود ہے۔ ایک ہفتہ وار اخبار ''رعیت'' کے نام سے زیر رجسٹری آصفیہ نمبر ۵ جلد ۳ نمبر ۴۰ (صفحہ ۲) مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۳۳ء میری نظر سے گزرا۔ اس کے ایڈیٹر ایم۔ نرسنگ راؤ ادیب، صحافی اور شاعر تھے۔ دبیر تخلص کرتے تھے۔ اخبار سیاسی نوعیت کا تھا۔ اس میں علامہ اقبال کے تاثرات پنڈت نہرو کے بارے میں درج ہیں۔ ۱۱ دسمبر (۱۹۳۳ء) کے شمارے میں الہ آباد سے پنڈت نہرو کا جواب اقبال کے نام بہ عنوان ''سر محمد اقبال کو پنڈت نہرو کا جواب'' شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر اقبال کا درج ذیل مضمون چھپا تھا:-

''پنڈت جواہر لال کے متعلق سر محمد اقبال کا بیان''

''لاہور۔ ۱۶ دسمبر۔ ''صحافت'' کے موسومہ ایک بیان میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر سر محمد اقبال کہتے ہیں۔ مجھے پنڈت جواہر لال سے ملنے کی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوئی، اگر چہ میں ان کے خلوص اور ان کی صاف گوئی کی ہمیشہ قدر کرتا ہوں۔ ان کے تازہ ترین بیان میں جو انہوں نے مہاسبھائی کے جواب میں دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گول میز مندوبین کے طرز عمل کے متعلق سارے واقعات و حقائق کا انہیں علم نہیں ہے۔ انہیں یہ باور کرادیا گیا ہے کہ مسٹر گاندھی نے سارے مسلم مطالبات منظور کر لینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس شرط پر کہ

مسلمان آزادی کی سیاسی کشمکش میں کامل تائید کا انہیں یقین دلادیں اور فرقہ پرستی نہیں بلکہ رجعت پسندی نے مسلمانوں کو یہ شرط قبول کرنے سے باز رکھا۔ لندن میں جو واقعہ ہوا تھا اس کے متعلق یہ بالکل غلط بیان ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہز ہائنس آغا خان کو مسلمانوں میں سب سے بڑا رجعت پسندی کی اسپرٹ پیدا کرنے والا بتایا ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ وہ خود آغا خان ہی تھے جنہوں نے متعدد ہندوستانی مندوبین کی موجودگی میں جن میں وہ خود بھی شامل تھے مسٹر گاندھی کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ مسلم مطالبات سے اتفاق کرلیں گے تو ساری مسلم جماعت ان کے کیمپ کے پیروؤں کی طرح ان کی خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ مسٹر گاندھی نے آغا خان کے الفاظ کو تولا اور بعد میں مسلم مطالبات قبول کر لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن اس پیش کش کو شرائط سے گھیر لیا گیا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ مسٹر گاندھی مسلم مطالبات اپنی شخصی حیثیت میں منظور کریں گے۔ اور اس بات کی کوشش کرینگے نہ کہ ضمانت دیں گے۔ کانگریس بھی اس کو منظور کرے۔ میں نے درخواست کی کہ وہ کانگریس کی مجلس تنقیدی کے اراکین کو تار دیں اور اس پیش کش کے متعلق ان کی رضامندی حاصل کرلیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ کانگریس اس مسئلے کے اعتراض کے لئے انہیں اپنا مختار کل بنائے گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو بہت آسانی سے مسز سروجنی نائیڈو کا جو اس وقت میرے بازوں میں بیٹھی تھیں ذکر کر سکتے ہیں۔ ان خیالات کے متعلق جو مسٹر گاندھی کے بارے میں میری ہی رائے کی موافقت میں تھے۔ پھر مسٹر گاندھی سے کہا گیا کہ وہ اس پیش کش کے متعلق کم از کم ہندو اور سکھ مندوبین کے خیالات معلوم کریں جو اس وقت لندن میں تھے۔ انہوں نے ان کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کی اور رنج کے طور پر ان کے طرز عمل کے بارے میں اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔

مسٹر گاندھی کی دوسری شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے خصوصی مطالبات اور خصوصا خصوصی نمائندگی کے مطالبے کی تائید نہ کریں۔ انہیں بتایا گیا کہ مسلمانوں سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ اچھوتوں کی ان ہی مطالبات کی کی مخالفت کریں جو خود وہ اپنے لئے پیش کررہے ہیں اور کہ اگر مسٹر گاندھی اچھوتوں کے ساتھ کسی باہمی تفاہیم پر پہنچ جائیں تو

مسلمان یقیناً سنگ راہ نہ ہوں گے۔ لیکن مسٹر گاندھی اپنے مطالبے پر اڑے رہے۔
میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے اشتر کی خیالات کے ساتھ
کس حد تک ہمدردی کر سکتے ہیں:۔
یہ اندرونی تاریخ ہے اس گفت وشنید کی جو لندن میں ہوئی تھی ” پنڈت جواہر لال
نہرو پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ نتیجہ کی ذمہ دار مسلمانوں کی سیاسی
تنگ نظری ہے یا دوسروں کی؟ دو سال قبل ہز ہائنس آغا خان کی جانب سے گاندھی
جی کو جو پیش کش دیا گیا تھا وہ اب بھی قائم ہے۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت
میں ہندو اور کانگریسی محفظات سے اتفاق کریں جن کو مسلمان اپنے کل ہند اقلیت کی
حیثیت سے اپنی حفاظت کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں تو مسلم جماعت اب بھی
ملک کی سیاسی کش مکش اکثریت رکھنے والی جماعت کے لئے کیمپ کے پیروں کی
حیثیت سے کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اگر پنڈت نہرو اس پیش کش کو
قبول کرنے کے لئے قابل ہیں تو انہیں کم از کم مسلمانوں کو ہدف مطعاطن نہ بنانا
چاہئے۔ یہ کہکر کہ وہ رجعت پسند ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کو جو ہندو فرقہ پرستی کے
اغراض و مقاصد سمجھتے ہیں چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ یہ نتیجہ نکال لیں کہ فرقہ داری کے
اعلان کے خلاف مہا سبھا کی مہم میں وہ مہا سبھا کے ساتھ ہیں“۔

(۳۳) کاروان لاہور۔ اردو کا عدیم المثال اور بیش بہا در یتیم ۱۰x۱۹ انچ تقطیع کے ۳۱۲
صفحوں میں پہلی مرتبہ پروفیسر تاثیر کی ادارت میں آفتاب درخشاں کی مانند جنوری ۱۹۳۳ء میں افق
لاہور سے پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ اس کا سرورق ایسا دل خوش کن اور جاذب نظر ہے
جس کی تعریف کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس نے دیوان غالب
مرقع چغتائی دیکھا ہوگا اس کے بارے میں وہ اندازہ کر سکتا ہے۔ کاروان کا ٹائٹل پیج مشہور زمانہ مصور
عبدالرحمن چغتائی کے آرٹ کا آئینہ دار ہے۔ اس کی زمین ہلکے سلیٹی رنگ کی ہے۔ اس پر عربی خط میں
”کاروان لاہور“ لکھا ہوا ہے۔ خوبصورت بیلدار حاشیے کے نیچے ایک کبوتر بڑی بڑی آنکھوں والی
ایک حسین لڑکی کے سر کی اوڑھنی پر پیامبر کے طور پر اترا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبوتر اور حسینہ پیام وسلام
آشتی ومحبت اور امن وامان کی علامت ہے۔ اس کے نیچے بڑی خوبصورتی سے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“
کے بعد عبارت ذیل درج ہے:۔

''مشرق ومغرب کے علوم وفنون کا معیاری رسالہ سالنامہ کارواں / مرتبہ / پروفیسر تاثیر ایم۔اے منیجر رسالہ کارواں چابک سواران لاہور''

پروفیسر تاثیر اپنے اداریہ ''سخنہائے گفتنی'' صفحہ ۲ سے ۵ تک میں لکھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں وہ، عبدالرحمٰن چغتائی اور ان کے دونوں بھائی علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔عرض حال کے بعد تاثیر نے کارواں کی زینت آرائی کے لئے غزل کا مطالبہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں علامہ نے مسکرا کر کہا کچھ تو سناؤ۔ تاثیر نے ڈرتے ڈرتے اپنی غزل کا مطلع سنایا۔ علامہ اس کا ایک مصرعہ دہرانے لگے۔ ''تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں''۔ اس کے بعد علامہ نے اسی وقت تاثیر اور ان کے ساتھیوں کی موجودگی میں ذیل کی غزل فی البدیہہ لکھوائی۔

۱۔ اپنی جولانگاہ زیر آسمان سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

۲۔ عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

۳۔ بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

۴۔ تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیل کارواں سمجھا تھا میں

۵۔ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبال نے یہ غزل بعد میں نظر ثانی کر کے بال جبریل میں غزل نمبر ۱۴ کے طور پر شامل کی۔ ذیل کا شعر نمبر ۲ حذف کیا گیا جو آج تک لوگوں کی نگاہ سے اوجھل تھا اور اب پہلی مرتبہ پیش کیا جاتا ہے۔

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

کارواں کی پہلی اشاعت کے بعد تاثیر ڈاکٹریٹ کے لئے لندن گئے۔ اور کارواں کا دوسرا سالنامہ عبدالرحمٰن چغتائی کی سرپرستی میں تاثیر کے دوست کرنل مجید ملک (۱۹۰۲ء۔۱۹۷۶ء) کی ادارت میں جنوری ۱۹۳۴ء (۳۵۲ صفحات) میں نہایت ہی حسن اہتمام کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اشاعت سے قبل ایڈیٹر صاحب ۱۰ دسمبر ۱۹۳۳ء کو علامہ کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوئے۔ چنانچہ موصوف اس بارے میں اپنے طویل اداریہ ''سخنہائے گفتنی'' صفحہ ۱ میں لکھتے ہیں کہ:۔

''سال گذشتہ علامہ اقبال نے ''کاروان'' کے لئے ایک غزل عنایت فرمائی تھی اور اس سال صرف ایک شعر۔ لیکن اس عطیہ کو میں ''حاصل گلچینی و باغ

حیات'' سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر اس لئے کہ میری درخواست کے جواب میں حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا تھا!

''تم غزل لے کر کیا کرو گے۔ میں تمہیں ایک ہی شعر دیتا ہوں۔ لیکن ایسا شعر جسے بیسیوں اشعار سے بہتر جانتا ہوں''۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا اور میں نے قدرے سکوت کے بعد عرض کیا ''بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست'' یہ شعر قارئین کے سامنے ہے اور مجھے یقین ہے کہ اہل نظر اسے حرز جاں سمجھیں گے''۔

نمود تیری نمود اس کی نمود اس کی نمود تیری
خدا کو تو بے حجاب کر دے خدا تجھے بے حجاب کر دے

شعر فلسفہ اسلام سے لبریز ہے۔ میں تو اس کو کلام اقبال کی روح سمجھتا ہوں۔ اس میں اللہ اور محمد کی معرفت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ نے محمدؐ کو اپنے پہچوانے کی غرض و غایت کے لئے خلق کیا۔ اگر محمدؐ نہ ہوتے تو کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا۔ محمدؐ کے آنے پر اللہ کی کبریائی اور وحدانیت آشکارا ہوگئی۔ جن و انس وحوش وطیور اور ملائکہ غرضیکہ ذرہ ذرہ اللہ کی وحدانیت کا تسبیح خوان ہو کر سربسجود ہو گئے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ! تم نے ہماری وحدانیت کو بے نقاب کیا۔ اس کے عوض ہم نے تمہارے نام کو تا قیام قیامت بلند و بالا کر دیا ہے۔ اسی طرح آل محمدؐ نے حق اور اسلام کی بقا کی خاطر بے مثال قربانیاں دیں اور اللہ نے محمدؐ کو حکم دیا امت مسلمہ سے کہہ دو کہ میں تم سے اجر رسالت نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے اہلیت سے تمسک کرو۔ انہوں نے ہی اسلام کو جو کفر و نفاق کی ظلمتوں میں گھر گیا تھا ہمیشہ کے لئے سدا بہار کر دیا۔ اقبال کا یہ شعر چھپی ہوئی چیزوں کو روشن کرنے کے لئے ایک بڑی علامت ہے۔

یہ شعر سال تصنیف سے آج تک پردۂ حجاب میں چھپا ہوا تھا اور ہم نے پہلی مرتبہ اسے بے نقاب کر کے اقبالیات میں شامل کر کے محفوظ کیا ہے۔ راقم اس انمول موتی کو بے نقاب کرنے میں فخر کرتا ہے۔

کاروان کے اسی شمارے میں صفحہ ۱۷ اور ۱۸ کے درمیان چغتائی نے انتہائی کمال فن کا مظاہرا کر کے مختلف رنگوں میں بیل بوٹیوں کے ساتھ ذیل کے دو شعر مزین کیے ہیں۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ	صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا	اب کوئی سودائی سوز تمام آیا تو کیا

یہ شعر علامہ کی شہرۂ آفاق نظم ''شمع اور شاعر'' سے ماخوذ ہیں۔ اس کا سال تصنیف فروری ۱۹۱۲ء ہے اور غالباً سب سے پہلے ماہنامہ ''تمدن'' دہلی اپریل ۱۹۱۲ء میں ''خلاصۂ نظم اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوئی

تھی۔تمدن کے بعد نظم "پیغام سروش" کے عنوان سے مخزن جلد ۲۳، نمبر ۲ (صفحہ ۵۳) بابت مئی ۱۹۱۲ء میں دوبارہ چھپ گئی تھی۔ مخزن کے ایڈیٹر غلام محمد طور کشمیری ایم۔اے (م۔۱۹۱۸ء) اس کے بارے میں اپنے تعریفی کلمات میں یوں رطب اللسان ہیں:-

"ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے بیرسٹرایٹ لا نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پچھلے سالانہ جلسے میں جو دلپذیر نظم "شمع اور شاعر" کے عنوان سے پڑھی تھی اس کے آخر میں تین بند جن کا عنوان ہمارے معجز بیان شاعر نے "پیغام سروش" قائم کیا تھا۔ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ان اشعار آبدار میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے جس امید افزا مستقبل کا اندازہ لگایا ہے وہ بافہم اور دوربین مسلمانوں کے لئے فردوس نظر سے کم نہیں۔"

ذیل کا شعر اسی نظم کا جز ہے اور گویا کاروان لاہور کے صرف دو سالناموں کے فوت ہونے پر اظہار ماتم کر رہا ہے۔افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ لاہور سے کارواں کے دونوں شمارے رخصت ہو چکے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

کاروان کے لکھنے والوں کی طویل فہرست ہے۔ان میں سے چند نام یہ ہیں:-

اقبال، پروفیسر تاثیر، (تاثیر نظامی قدسی کے فرضی نام سے بھی لکھتے تھے) چودھری محمد حسین، حفیظ جالندھری، مجید ملک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عبدالمجید سالک، عبدالقادر سروری، مرزا یاس یگانہ، شہباز کشمیری، ممتاز حسن، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید امتیاز علی تاج، اصغر گونڈوی، عبدالرحمٰن چغتائی، محمد عبداللہ چغتائی، پروفیسر محمود شیرانی۔

(۳۴) **تاثیر** نے جنوری ۱۹۳۴ء کے کارواں کے لئے لندن سے اقبال کا یہ شعر بھیجا تھا۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اس شعر کے لئے تاثیر نے مصور چغتائی کو لکھا تھا کہ:-

"مسلمانوں کا اصلی قومی نشان توحید ہے جو اس کے سینے کے اندر ہے۔کیونکہ ظاہری نشان سب بیکار ہیں۔ مجھے قبلہ ڈاکٹر صاحب کا متذکرہ بالا شعر اس لئے بھی درج کرنا پڑا کہ اگلے روز یہاں میوزیم میں ایک فوجی انگریز جو لارڈ کچنر کے ساتھ

سوڈان کی جنگ میں معاون تھا ایک بہت عجیب وغریب جھنڈا لایا جس پر ذیل کی عبارت ایک سرخ ابھرے کپڑے پر ابھری ہوئی تھی۔

''یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم۔ یا حی یا قیوم یا ذوالجلال والاکرام
لا الٰہ الاّ اللہ محمد الرسول اللہ محمد المھدی خلیفۃ رسول اللہ''

میں نے کارواں کے یہ دونوں بھاری بھر کم شمارے حیدر آباد میں دیکھے تھے۔ غرضیکہ میں بثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے سیکڑوں رسالے دیکھے ہیں۔ لیکن کارواں کا سار سالہ کہیں نہیں دیکھا۔

(۳۵) مشہور تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور کے مالک شیخ عنایت اللہ تھے۔ ان سے علامہ کا رابطہ بال جبرئیل اور ضرب کلیم کی اشاعت کے سلسلے میں یوں تو ۱۹۳۶ء کے آغاز میں ہوا تھا۔ لیکن اقبال کی تحریروں سے ثابت ہے کہ شیخ صاحب اقبال کی طرف پہلے سے ہی متوجہ ہوگئے تھے۔ نیرنگ خیال لاہور کے اقبال نمبر ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء (صفحہ ۴۳۶) میں تاج کمپنی لمیٹڈ کا اشتہار پورے صفحے میں چھپا ہے۔ اس کے بیچوں بیچ علامہ ڈاکٹر سر اقبال کی یہ رائے درج ہے:۔

''یازدہ سورہ شریف کا نسخہ جو تاج کمپنی نے شائع کیا ہے بہت خوبصورت ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اسے پسند کرینگے۔ اردو ترجمہ بھی ساتھ ہے جس کے پڑھنے والوں کو مطالب کے سمجھنے میں سہولت ہوگی''۔

(۳۶) امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ میں ایک کتاب زیر نمبر B M 70 A میری نظر سے گزری۔ اس کا سرورق موجود نہیں تھا۔ آخر میں بعض کتابوں کے اشتہار دیئے گئے۔ ایک کتاب ''دین کامل'' جلد اول مصنفہ مفتی سید عبدالقیوم صاحب وکیل کے متعلق علامہ اقبال لکھتے ہیں:۔

''دین کامل کی پہلی جلد کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ کتاب نہایت اہم اور مفید مطالب پر حاوی ہے۔ مصنف کا طرز بیان ستھرا ہے اور مطالب کی ترتیب بھی نہایت اہم اور منطقیانہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب کی اشاعت نتیجہ خیز ہوگی''۔

(۳۷) تاج محل (سال تصنیف ۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۶ء)

ہمارے ایک لائق اور بزرگ دوست پنڈت دوار کا ناتھ کول مدظلہ (IPS) ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل پولیس کشمیر ستمبر ۱۹۳۸ء میں لاہور گئے اور وہاں گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کا داخلہ لیا۔ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے بھی اسی کالج سے انگریزی میں کیا تھا۔ نظم کی شان نزول یہ ہے کہ ایک دن کول صاحب تاج کمپنی کی دکان پر گئے۔ اور وہاں انہیں نظم مذکورہ کسی رسالے میں ملی تھی۔ انہوں نے اسے نقل کیا اور اپنے

پاس رکھی۔ موصوف اقبال کے دلدادہ اور باذوق شخص ہیں۔ میں کول صاحب کے مذاق سلیم کی داد دیتا ہوں کہ کشمیر کے نامساعد اور بدترین حالات میں جب انہوں نے کشمیر سے ہجرت کی تو تاج محل کو حرز جان سمجھکر اپنے پاس رکھا۔ کول صاحب نے اس کے بارے میں ایک تفصیلی خط بھی لکھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ نظم اقبال کے کسی مجموعہ میں یا کسی باقیات میں نہیں ملتی ہے تو اسے بمبئی کے ایک رسالہ ''اردو چینل'' میں شائع کرایا۔ اس سے قبل اسے اقبال اکادمی کے ''اقبالیات'' کی اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ نظم اقبالیات کے کسی خصوصی شمارہ ''نوادر اقبال'' کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بہرحال میں یہ نظم اقبال کے شیدائیوں کی لطف اندوزی کے لئے شامل کتاب کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو

چشم بینا! روضۂ ممتاز کی تعمیر دیکھ ۔۔۔ سنگ مرمر میں کبھی تخیل کی تفسیر دیکھ
دیکھ نور افشانی گنبد شب مہتاب میں ۔۔۔ ہے لب جمنا پہ گویا مہر روشن خواب میں
اللہ اللہ! کس قدر عجیب سا منظر ہے یہ ۔۔۔ واقعی صنائع انسانی سے بالا تر ہے یہ
بن کے جمنا کے کنارے اک مزار بے نظیر ۔۔۔ کر رہا ہے آج تک چشم جہاں کو مستیز
مٹ نہ جائے دیکھنا اے گردش لیل و نہار ۔۔۔ ایک شوہر کی محبت کی مجسم یادگار

یہ مزار اس عشق شاہانہ کی اک تصویر ہے
ذرہ ذرہ جس کا اخلاص وفا تنویر ہے

یہ نظم علامہ نے شیخ عنایت اللہ کی فرمائش پر تاج کمپنی کی شہرت افزائی کے لئے کہی تھی۔

(۳۸) اقبال کا ایک نایاب اور غیر مدوّن خط۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اردو اور فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ موصوف حد درجہ شریف اور مہذب تھے۔ جب انہوں نے دیوان مومن کا پہلا ایڈیشن مرتب کر کے شائع کیا اور اس کا ایک نسخہ علامہ کو بھیجا، تو انہوں نے کتاب کی رسید میں ذیل کا خط روانہ کیا، جو مکتوبات مرتبہ ضیاً احمد بدایونی مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں بغیر تاریخ کے شامل کیا گیا ہے۔ اقبال نے یہ خط ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا۔ یہ خط علامہ کے کسی خطوط کے مجموعے میں نہیں ملتا ہے اور اقبالیات میں پہلی مرتبہ شائع کیا جاتا ہے:۔

''آپ کی عین نوازش ہے کہ آپ نے مجھے اپنے مرتبہ دیوان مومن کا نسخہ ارسال فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے مرتب کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام کیا ہے۔ میں نے آپ کی بدولت اپنی عمر میں پہلی بار کلام مومن پڑھا'' ۔ محمد اقبال لاہور ۱۹۳۴ء۔

(۳۹) انجمن پنجاب لاہور ۱۹۳۶ء۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۲۴ اور ۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء

کو ناگپور میں ''بھارتیا ساہتیا پریشد'' (ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن) کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا تھا۔ ۲۵اپریل کو بقول ڈاکٹر عبدالحق اور دیگر ایڈیٹر صاحبان (اردو سہ ماہی، نیرنگ خیال اور معیار پٹنہ بابت مئی ۱۹۳۶ء، صفحہ ۲۲۴) ''اجلاس کے دوران میں جبکہ زبان کی بحث چھیڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن کی زبان میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سر تا سر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرانا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا.......... ایسی صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت ترقی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں''۔

ناگپور کانفرنس کی اردو مخالفت کے ردِعمل میں فروغ اردو کی اشاعت کے لئے پنجاب میں ''انجمن پنجاب'' قائم کی گئی تھی۔ قاضی عبدالودود (ماہنامہ معیار پٹنہ بابت مئی ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۹۳) اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

''لاہور میں ایک انجمن ''انجمن پنجاب'' کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) اردو زبان اور رسم الخط کی ترقی اور ترویج۔

(۲) اردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔

(۳) مستند اور معیاری زبان کو جدید اور مقامی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے وسعت دینا۔

(۴) ایک شعبۂ ادب کا قیام جس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور جس کے ماتحت تصنیف و تالیف اور تراجم اور تحقیق و تدقیق کا کام کیا جائے۔

(۵) اردو کے نشوونما کا جائزہ لیتے رہنا۔

(۶) اخبارات، رسائل، سینما، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ سے اردو کی

نشر و اشاعت۔

(۷) اردو زبان کی موجودہ دفتری عدالتی اور تعلیمی حیثیت کا تحفظ۔

(۸) پنجاب یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم میں اردو کے فروغ کی کوشش کرنا۔

(۹) درسی کتابوں کی زبان کا احتساب، انتقاد اور اصلاح۔

(۱۰) مختلف مقامات میں باقاعدہ و ملحقہ انجمنوں کا قیام اور الحاق اور جہاں کہیں ایسی انجمنیں موجود ہوں، ان کو الحاق دعوت دینا۔

انجمن کے سرپرستوں میں سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری، سر عبدالقادر کے نام نظر آتے ہیں۔ صدر پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی اور معتمد میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں''۔

(۴۰) سالنامہ ''منادی'' دہلی، بابت ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) صفحہ ۱۷۸، تالیف حسین بن حسن نظامی، دہلوی، نائب ایڈیٹر، منادی۔

خواجہ حسن نظامی کی پوری عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی۔ وہ متعدد رسائل اور اخبارات کے مدیر تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء کی ابتداء میں ''منادی'' ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا۔ اس کے متعدد شمارے حیدرآباد میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ موصوف نے اقبال کی تصویر، سیرت اور صورت اخبار مذکور میں یوں کھینچی ہے:-

''سر محمد اقبال- سروقد، گندمی رنگ، پُر تمکنت چہرہ، داڑھی صاف، شاعر بھی ہیں، نثر نویس بھی ہیں، بیرسٹر بھی ہیں اور پھر صاحب اقبال بھی ہیں۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ تو دوسری آنکھ میں عمر خیام کا خم خانہ۔ جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان۔ پہلے شاعر بنے، پھر بیرسٹر ہوئے اور اب لیڈر ہیں۔ انگریزی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں لیکن انگریزیت کے قابو میں نہیں آتے۔ انگریز ان کو سمجھتا ہے اور یہ انگریز کو سمجھتے ہیں۔ اگر انگریز کو سمجھنا نہ جانتے تو نہ سر بنتے اور نہ گول میز کانفرنس میں نظر آتے۔ عربی بھی جانتے ہیں اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ فارسی اتنی اچھی جانتے ہیں کہ اگر خاقانی اور انوری کے زمانے میں ہوتے، تو دوسرے خاقانی اور انوری مانے جاتے۔ مسلک حق پسندی، پیشہ علمی، خدمت مذہب، مسلمانوں کی بہبودی، مزاج میں سنجیدگی، متانت اور استقلال۔ یعنی شاعر

ہونے کے باوجود شاعرانہ تلون مزاجی نہیں ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی عشق باز ہے۔ لیکن ان کی شاعری کو گل وبلبل سے عشق نہیں ہے۔ ان کی شاعری کو قوم اور وطن سے عشق کرنے میں لطف آتا ہے۔ انگریز کی نظر میں پسندیدہ ہیں۔ مسلمانوں کی نظر میں محبوب ہیں۔ ان کی شاعرانہ قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی بہار نہیں آتی''۔ حسن نظامی۔

(۴۱) علامہ اقبال سے ایک ملاقات۔ اقبال اکتوبر ۱۹۳۳ء نومبر کے آخر میں افغانستان گئے تھے۔ واپسی پر ان کے چاہنے والے سید اکبر حسین رضوی اور ان کے ساتھیوں نے سیوی کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کی۔ ملاقات کا مضمون ''ہمایوں'' لاہور جنوری ۱۹۳۹ء (صفحہ ۳۵۔۳۶) میں شائع ہوا۔ یہ ملاقات خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ اس لئے اس کا ابتدائی حصہ نظر انداز کر کے رضوی صاحب کی ملاقات کا واقعہ ان ہی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے:۔

''چار پانچ سال کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر مرحوم تعلیمی مشورہ دینے کے لئے افغانستان تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر ممدوح براہ قندھار کوئٹہ تشریف لائے۔ کوئٹہ سے لاہور جاتے ہوئے گاڑی سیوی جنکشن سے گزرتی ہے۔ میں بھی ان دنوں سیوی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس دن ڈاکٹر صاحب مرحوم لاہور واپس تشریف لے جارہے تھے، میں بھی اتفاقاً چند احباب کے ساتھ سٹیشن پر موجود تھا۔ اگر چہ اس دن سے پہلے ڈاکٹر مرحوم کی زیارت کبھی نصیب نہ ہوئی تھی لیکن چونکہ متعدد بار آپ کی تصویر دیکھی ہوئی تھی اس لئے میں نے فوراً پہچان لیا۔ اور احباب سے کہا کہ آج کی گاڑی سے ڈاکٹر اقبال تشریف لے جارہے ہیں۔ چنانچہ ہم سب اس گاڑی کے پاس چلے گئے جس میں ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارے اجتماع کی طرف دیکھا۔ ہم سب نے ادب سے سلام عرض کیا اور خاموش کھڑے رہے۔ ہمیں دیکھکر ڈاکٹر صاحب نے استفسار فرمایا کہ بھائی کیا دیکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کی جناب آپ کی زیارت سے مشرف ہونے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ فرمانے لگے تو پھر اگر اچھی طرح زیارت کرنے کا شوق ہو تو میرے پاس آکر میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ فرما کر آپ

مسکرانے لگے۔ اور ہم یہ دیکھکر کہ دنیا کا یہ مشہور و معروف بزرگ جس کا کلام چار دانگ عالم میں اپنی فضیلت کا ڈنکا بجا رہا ہے اس قدر بے تکلفی سے گفتگو کر رہا ہے حیران ہو گئے۔ ہم نے عرض کی کہ جناب چونکہ ہم کافی تعداد میں ہیں اور گاڑی کا ڈبہ مختصر سا ہے اس لئے ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم باہر پلیٹ فارم ہی پر کھڑے رہیں۔
فرمایا اچھا یوں ہی سہی تو پھر میں بھی باہر آپ کے پاس چلا آتا ہوں۔ لیکن ہم نے پھر مؤدبانہ عرض کی کہ نہیں، جناب آپ گاڑی میں تشریف رکھئے اور ہم گاڑی کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔ اس کے بعد ہم سب خاموش ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب حقہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہماری خاموشی کو دیکھکر فرمانے لگے کہ میں تو خاموش زیارت کا قائل نہیں ہوں اور اگر آپ لوگ یوں ہی خاموش کھڑے ہوئے صرف میرے منہ کی طرف دیکھنا پسند کرتے ہیں تو پھر مجھے اجازت دیجئے تو میں اپنے حقے ہی سے گفتگو کرتا رہوں۔ اتنا فرماتے ہی حقہ پینے لگ گئے۔ میں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ادب کی وجہ سے جرأت نہیں ہوتی کہ جناب سے کلام کرنے کی گستاخی کر سکیں۔
فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کا ایک نمائندہ کمرے میں آ کر دیکھ لے کہ میں بھی آپ کی طرح محض ایک آدمی ہوں اور میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس سے آپ کو کوئی خوف ہو۔ آپ کی اس خوش اخلاقی نے ہمیں جرأت دلائی اور ہم نے گزارش کی کہ آپ صوبۂ بلوچستان میں سے گزر رہے ہیں۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔
فرمانے لگے، گاڑی میں بیٹھ کر میں کیا اندازہ کر سکتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس علاقے میں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور وہ بھی ایسے کہ ان پر کوئی درخت یا سبزی نہیں۔
ہم نے جواباً عرض کی کہ جناب ہمارے خیال میں جب خداوند تعالیٰ نے دنیا بنائی تو اس کے بنانے کے بعد جو ملبہ بچ گیا وہ اس علاقے میں پھنکوا دیا۔ اسلئے ان پہاڑوں پر سبزہ نہیں ہے۔ یہ سن کر آپ بھی ہنس پڑے اور ہم سب بھی۔
کچھ دیر تک علامۂ ممدوح مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے۔ اس اثنا میں گاڑی نے چلنے کی تیاری کر لی۔ ممدوح ہم میں سے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ کافی دیر تک علامہ موصوف گاڑی سے سر باہر نکالے مسکراتے رہے اور ہم دیکھ رہے تھے کہ اس گاڑی میں ایک انسان سادہ لباس میں

حضرات قابل ذکر ہیں:-

مولانا ماہر القادری، مولانا سلیم چشتی (شاگرد اقبال)، ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر تاثیر اور ڈاکٹر سچد انند سنہا۔ دوسرے دن کلن خان قوال کے علاوہ دوسرے قوالوں نے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ اس کے بعد ایک یادگار مشاعرہ ہوا۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ چند شعراء یہ تھے:-

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، نوح ناروی، بہزاد لکھنوی، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، مجاز لکھنوی، شکیل بدایونی، ادیب سہارنپوری، ساحر لدھیانوی، ذوالفقار علی خان بخاری۔

صدر مشاعرہ نواب نثار جنگ بہادر نے اپنی غزل سے مشاعرے کا آغاز کیا تھا۔ نظامت کے فرائض ذوالفقار علی بخاری نے انجام دیئے۔"

(۴۴) **اقبال کو شمع و پروانہ** کے موضوع کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر ان کی پہلی نظم "شمع و پروانہ" کے عنوان سے بارہ شعر میں منشی نوبت رائے نظر کے ماہانہ رسالہ" خدنگ نظر" لکھنو بابت جنوری ۱۹۰۳ء میں ایڈیٹر کے درج ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

"اس نمبر میں ہم "شمع و پروانہ" کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال ایم۔اے پروفسر گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک نو تصنیف نظم شائع کرتے ہیں جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے۔ تاہم ان اشعار سے ان کے فن وزباندانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے"۔

نظم دوبارہ مخزن لاہور جلد ۳ نمبر ۴ بابت اپریل ۱۹۰۳ء (صفحہ ۵۶) میں" کچکول" کے زیر عنوان چھپی تھی۔ مطلع ہے۔

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
یہ جان بے قرار ہے تجھ پہ نثار کیوں

اقبال کی ایک اور طویل نظم ۴۰ شعر میں "شمع" کے عنوان سے ایڈیٹر کے مبسوط نوٹ کے ساتھ پہلی مرتبہ مخزن بابت دسمبر ۱۹۰۲ء میں چھپی تھی۔ تیسرا شعر توجہ کا مستحق ہے۔

ہو شمع بزم عیش کہ شمع مزار تو
ہر حال اشک غم سے رہی ہمکنار تو

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب (ابتدائی کلام اقبال.... صفحہ۱۸۳) میں لکھتے ہیں:-

''یہ نظم مخزن دسمبر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اقبال کے دوست نیرنگ کی نظم ''شمع مزار'' ''خدنگ نظر'' لکھنو بابت جنوری ۱۹۰۳ء میں چھپی تھی''

ڈاکٹر جین صاحب نے خدنگ نظر کا پرچہ دیکھا ہی نہیں۔ ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ نظم نیرنگ کی ہے۔ دراصل ''شمع مزار'' کے مصنف نادر علی خان نادر کاکوروی (م۔۱۹۱۲ء) ہیں جو مرحوم نے اقبال کی متذکرہ بالا نظم سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

بیٹھی ہے کس سکوت میں شمع مزار تو
اے شمع کس شہید کی ہے تکیہ دار تو

اب مقطع دیکھئے۔

اس تیرہ روزگار و پُر آشوب دور میں
دو تیرے دردمند ہیں اقبالؔ اور میں

(۴۵) مخزن جلد ۶ نمبر ۲ بابت نومبر ۱۹۰۳ء (صفحہ ۴۴۔۴۶) میں نادر کاکوروی کی ایک نایاب نظم ''ریفارمیشن'' کے عنواں سے ۳۶ شعر میں چھپی ہے۔ اس کا ''انتساب'' اقبال کے نام الفاظ ذیل میں کیا گیا ہے:-

''ریفارمیشن جس کو میں اپنے ہم خیال دوست شیخ محمد اقبال کے نام معنون کرتا ہوں''۔

دل شگفتہ کیا گلِ تازہ کی ہو بو باس سے
دیکھتا ہوں ہر ترقی کو نگاہِ یاس سے

نظم کے آخری شعر یہ ہیں۔

منتظر ہوں میں امام آخرالایامؑ کا — خیر مقدم از سر نو دعوتِ اسلام کا
حسرت دیدارِ اعجازِ مسیحاؑ ہے مجھے — انتظار آمد مہدیؑ و عیسیٰؑ ہے مجھے

اے نوید وصلِ انصار و نصاریٰ السلام
السلام اے صبح شام خیر بطحیٰ السلام

(۴۶) اقبال کے ناشناسوں کی غلط تعبیریں

یہاں مجھے صائب اصفہانی کا یہ سبق آموز شعر یاد آتا ہے۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

یہ امر مسلمہ ہے کہ جب کوئی بے بنیاد اور گمراہ کن واقعہ کسی سستی شہرت کا باعث بن جاتا ہے تو پھر اس کا ازالہ کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ ناممکن بھی۔ ان باتوں سے کچھ عناصر مانوس بھی ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے انتقال کے بعد اقبالیات میں ایسی نامراد باتوں کا اضافہ کیا گیا جس کے سبب سے کچھ خود غرض اقبال فروش افراد بڑے بڑے تعلیمی اداروں کی کرسیوں پر پڑی جما گئے۔ ایسے بے سروپا افسانوں کو ہم نے بھوپال کے یوم اقبال کی تقریب پر ۹ نومبر ۱۹۹۴ء کو جناب ممنون حسن خان کی صدارت میں ایک بڑے ادبی اجتماع میں طشت از بام کیا۔ ہمارے مقالے کا عنوان تھا۔ ''ماہرین اقبال کی فاش غلطیاں''۔ بعض ناشناس اقبال والوں میں ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ جو لوگ تحقیق کے اصولوں سے نابلد اور لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ ان کے نظام سماعت میں کسی نئے انکشاف سے خلل پذیری واقع ہو جاتی ہے اقبال کا ذیل کا شعر مرکز توجہ رہا تھا۔

آں برہمن زادگان زندہ دل
لالۂ احمر ز روئے شاں خجل

اگر اقبال کے حاشیہ نشیں اقبال سے ایسے اشعار کے بارے میں استفسار کرتے تو غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوتے۔ متذکرہ بالا شعر ''جاوید نامہ'' میں اقبال کی ایک نظم ''در حضور امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی وملا طاہر غنی کشمیری'' کا ہے۔ کاش اقبال کی فوج در فوج قاہرہ نے نظم کے سباق وسیاق اور اس شعر پر توجہ کی ہوتی۔

شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقر او باطن غنی ظاہر غنی

شعر غنی کشمیر کے سیرت وکردار کا آئینہ دار ہے۔ اس کے بعد شاہ ہمدان زندہ رود (اقبال) کو متنبہ کرتے ہیں۔

تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

اقبال نے جو مدبرانہ جواب شاہ ہمدان کو دیا اس کو ہم ایک پیشین گوئی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے قیامت خیز واقعات ہمارے سامنے گویا بازیچۂ اطفال ہیں۔ اقبال کے ذیل کے اشعار قابلِ غور ہیں۔

زیر گردوں آدم آدم را خورد ملتے بر ملتے دیگر چرد
جاں، ز اہلِ خطہ سوزد چوں سپند خیزد از دل نالہ ہائے دردمند

زیرک و درّاک و خوش گل ملتے است — در جہان تر دستی او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست — در نے من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است — در دیار خود غریب افتادہ است
دست مزدِ او بدست دیگراں — ماہی رودش بہ شستِ دیگراں

از غلامی جذبہ ہائے او بمرد
آتشے اندر رگِ تاکش فسرد

ان اشعار کا لب لباب یہ ہے کہ کشمیریوں کا جذبۂ خودی فوت ہو چکا ہے۔ وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان میں خودداری، عزت نفس اور حریت پسندی کا شعلہ سرد ہو گیا ہے۔ اقبال کو یہ شکایت بھی ہے۔

ع۔ خاک ما دیگر شہاب الدین نہ زاد

اقبال نے کشمیریوں کی حالت زار بیان کر کے غنی کشمیری کی روح کو یوں ماتم زدہ دکھایا ہے۔

ع۔ روح غنی است ماتمی مرگ آرزوست

کشمیریوں کی بے حسی آپسی جھگڑوں، بے جا کشت و خوں اور سب سے بڑھکر غلامانہ طرز عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ اقبال کے انتقال کے دس سال بعد ان کی حق خودارادیت کی آواز اقوام متحدہ کی مجلس میں گونجنے لگی۔

بادِ صبا اگر بہ جینوا گزر کنی
حرفِ زِ ما بہ مجلس اقوام باز گوے

اقبال کا یہ شعر الہامی ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

کشمیر کے خرید و فروخت کے بعد ہی مسلمانوں کے مظالم میں مزید اضافے ہونے لگے۔ ''سفیر ہند'' ہفتہ وار اخبار امرتسر ابو سعید مولوی محمد حسین کی ادارت میں ۳ جنوری ۱۸۸۰ء کو جاری ہوا تھا۔ اخبار کے شمارہ ۲۹ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۸۸۰ (صفحہ ۴۵۲) میں ''مہاراجہ کشمیر اور ان کی مسلماں رعایا'' کے عنوان سے درج ہے کہ:-

''مرزا عزیز الدین افسر وزارت شہر خاص جو کہ مرزا محی الدین صاحب رئیس اعظم کے چھوٹے بھائی تھے اور سرکار کے دلی خیر خواہ اور رعایا کے بہت دادرس عرصۂ ڈیڑھ

برس سے بوصف منتظم اور دیانت دار ہونے کے عہدۂ مال جنسی (محکمۂ خوراک) بھی ان کے تفویض میں تھا۔ انہوں نے چند متعصبین کے خلاف کاروائی کی تو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انہیں موقوف کیا''۔

اخبار مزید لکھتا ہے کہ:-

''جب کہ یہ وزیر صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے موقوب کیا گیا، تو قیاس کرنا چاہئے کہ روئے زمین کے مسلمان تو اپنے دین پر فخر کریں اور کشمیر میں وہی دین وبال مال و جان ہے''۔

ابھی کشمیر کے سودے بازی کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۵ء میں تخت حکومت پر براجمان ہوتے ہی ایک کالے قانون کے تحت کونسل بٹھادی تھی۔ اس میں کسی مسلمان ممبر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس طرح کشمیریوں کے حقوق پامال ہونے لگے۔ اور گوناگوں مظالم ڈھائے جانے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد پنجاب کے جو مسلمان حکما، کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے سرکار ان کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے اس لئے دیکھنے لگی کہ انہوں نے جور و استبداد کے خلاف کشمیریوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ مہاراجہ نے ان تمام افسروں اور کشمیریوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو بھی جلا وطن کر کے پنجاب کی طرف دھکیل دیا۔ ان میں خواجہ نقشبندی (سٹی جج) اور مرزا اسعد الدین سعد (تحصیلدار) بھی شامل تھے۔ کشمیریوں نے لاہور کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ مفصل حالات منشی سراج الدین احمد نے اپنے ہفتہ وار اخبار ''چودھویں صدی'' جون ۱۸۹۵ء وغیرہ کی قسطوں میں بیان کئے ہیں۔ لاہور میں کشمیریوں نے ایک انجمن بنام ''انجمن مسلمانان کشمیر'' قائم کی جس کا پہلا اجلاس فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں اقبال نے جو اس زمانے میں طالب علم تھے کشمیریوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے ''فلاح قوم'' کے نام سے ایک انقلابی نظم اور چند قطعات کشمیریوں کے باہمی اتحاد کے لئے پڑھے تھے۔ کشمیریوں نے جدوجہد آزادی کا مرکز لاہور کو بنایا تھا۔ ان کی آواز دور دور تک پھیلتی گئی اور وائسرائے جنرل کے ایوان میں بھی گونجنے لگی۔ کشمیریوں پر کئے گئے مظالم کا ذکر کشمیر کے ایک نامور شاعر مرزا اسعد الدین سعد نے اپنے کلیات مطبوعہ ۱۹۰۳ء آگرہ میں کیا ہے۔ موصوف کشمیر کے رئیس اعظم مرزا کمال الدین شیدا کے عم بزرگوار تھے۔ اخبار چودھویں صدی کے نایاب شمارے الٰہی کے کتب خانہ واقع نگین باغ سرینگر میں موجود ہیں۔ اسی اخبار میں برطرف شدہ مسلمانان پنجاب اور جلائے وطن کشمیریوں کی فہرست درج ہے۔

۱۹۲۱ء میں اقبال نے کشمیریوں کی ابتر اور خستہ حالی کو سری نگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ انہوں نے اس کا اجمالی ذکر پیام مشرق (مطبوعہ ۱۹۲۳ء) کے ساقی نامہ میں کیا۔ چند شعر یہ ہیں ۔

کشیری کہ با بندگی خوگرفتہ ۔۔۔ بتے می تراشد ز سنگ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او ۔۔۔ نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ اور فروغ نگاہے ۔۔۔ نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

پیام مشرق کی اشاعت کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں ریشم خانے کے مزدورون اور تارکشوں نے اپنے حقوق کی بحالی کے لئے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ بہت سے لوگوں کو ریشم خانے کے متصل ایک بڑے میدان ''حضوری باغ'' (موجودہ اقبال پارک۔ سرینگر) میں حکومت نے کچل دیا۔ یہ خونچکان واقعہ فوق نے ایک نظم مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۲۴ء کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ نظم کا عنوان ہے ''بڈشاہ کی روح سے سوال وجواب''۔ نظم کلام فوق، طبع ثانی (صفحہ ۲۰۵۔۲۰۶) میں فوق کی طویل تمہید کے ساتھ درج ہے۔ ابتدائی الفاظ یہ ہیں:۔

''۲۲ جولائی ۱۹۲۴ء کی صبح کو ریشم خانہ سری نگر کے ہزارہا مزدوروں پر جو حضوری باغ میں جمع ہوکر اپنے ۲۵ سرکردہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کررہے تھے، فوج نے حملہ کردیا اور بے شمار نیزوں، بھالوں کی نوکوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں اور ڈنڈوں کی ضرب سے زخمی ہوئے''۔

ریشم خانہ تحریک نے بھی کشمیر کے حکمرانوں اور انگریزوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور آزادی کے نعروں سے پورے ہندوستان کو ہلادیا تھا۔ یہی واقعات غنی کشمیری نے علامہ اقبال سے بیان کئے ہیں ۔

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟ ۔۔۔ صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل ۔۔۔ لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش ۔۔۔ از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان اشعار اور حصہ نظم کے پچھ اور اشعار میں اقبال نے نہرو خاندان اور کشمیر کے کسی نوجوان یا بزرگ سیاستدان کا ذکر بقول جگن ناتھ آزاد (اقبال اور کشمیر) کیا تھا۔

علامہ اقبال کو نہرو خاندان سے نظریاتی اختلاف تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جنوری

۱۹۲۹ء میں (جب اقبال نے جاوید نامہ شروع کیا تھا) دلی میں آل پارٹیز کا اجلاس منعقد ہوا۔ اسی کانفرنس کی بدولت مسٹر جناح اور سر محمد شفیع کی مسلم لیگیں دوبارہ متحد ہوگئی تھیں۔ پنڈت موتی لال نہرو (م۔ جنوری ۱۹۳۱ء) اس کانفرنس کے انعقاد کے حق میں نہیں تھے۔ پنڈت جی نے اجلاس سے ایک دن قبل اقبال کو ایک تار سے مطلع کیا تھا کہ جو بیان دہلی میں عدم انعقاد کے بارے میں شائع ہوا تھا اس پر وہ دستخط نہ کریں۔ اقبال نے پنڈت جی کی تجویز تار دے کر مسترد کردی۔ اقبال کے تار کا متن جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا وہ اور اس کا عکس میرے پاس موجود ہے اور یہ ہے:

"Committed to joint statement already from Lahore sorry cannot now sign another statement another unity conference essential."

غرضیکہ برہمن زندگان زندہ دل سے مراد وہی جانباز کشمیری لوگ ہیں جنہوں نے ۱۹۲۴ء تک بیش بہا قربانیوں کا عدیم المثال نذرانہ پیش کیا تھا۔ مزید تفصیلات کے لئے راقم الحروف کا مضمون ''اقبال کا ایک شعر:

آں برہمن زادگان زندہ دل

لالۂ احمر ز روئے شاں خجل

(''ماہرین اقبال کے لئے لمحۂ فکریہ'') مطبوعہ صحیفہ لاہور، شمارہ ۱۶۴، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء) دیکھئے۔

کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ مظفر حسین برنی۔

(۴۷) جناب برنی صاحب نے کلیات مکاتیب اقبال چار ضخیم جلدوں میں مرتب کیں جو بعد میں دہلی اردو اکادمی نے شائع کیں۔ ہم سے جتنا ہو سکا بقدر مقدور قلمی تعاون دیا تھا۔ عرصہ پہلے ''ترتیب پبلشرز'' لاہور نے کتاب کی پہلی دو جلدیں جوں کی توں شائع کی تھیں۔ اکادمی کی جلدوں میں جو فاش غلطیوں کے انبار موجود ہیں وہ ان میں بھی ہیں۔ ہم نے صرف تین جلدیں دیکھیں۔ چوتھی جلد نہ مل سکی۔ اس بھاری بھرکم کام کو اگر کوئی مستند محقق انجام دیتا، یا مرتب کو کسی ایسے مددگار کا تعاون حاصل ہوتا جس میں خلوص کا جذبہ اور تحقیقی صلاحیتوں کی ذمہ داری کا احساس کارفرما ہوتا تو ایسی غلطیوں کے ڈھیر نہ ہوتے۔ ڈاکٹر تحسین فاروقی پروفیسر شعبۂ اردو یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور نے اپنی کتاب (اقبال! چند نئے مباحث صفحہ ۱۱۳ تا ۱۶۷) مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان میں ''کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم) کے ایک جائزہ'' میں ۴۸۸ متنی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ وہ صفحہ ۱۵۷ میں لکھتے ہیں:۔

''یوں متنی حوالے سے یہ کتاب خاصی مایوس کن ہے۔ مگر ہمارے نقاد اور مکتوب نگار ہیں کہ مرتب موصوف کی اس کتاب کو ان کا ایک لافانی کارنامہ قرار دے رہے ہیں۔ جب ہم فلیپ نگاروں کی صف میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر خلیق انجم جیسے اہم لکھنے والوں کو داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے دیکھتے ہیں تو سخت حیرانی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں مؤخر الذکر دو حضرات خصوصاً تدوین متن کے حوالے سے خاصے نیک نام ہیں اور تدوین متن کے منہاج اور مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔ ایسے حضرات کی جانب سے خطوط اقبال کے اس متن کو درست ترین اور سائنٹفک بنیادوں پر مرتب قرار دینا سوائے سہل انگاری یا غلط بخشی کے اور کیا ہے''۔

کتاب میں جو اقتباسات یا حوالے درج کئے گئے ہیں وہ بھی ناقص اور گمراہ کن ہیں۔ راقم حروف صرف ایک فاش غلطی کی نشاندہی کرتا ہے۔ کلیات مکاتیب جلد اول (صفحہ ۱۰۸۹) میں ارشاد ہوتا ہے:-

''ہوش ستمبر ۱۹۰۳ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ نومبر 1915ء میں ایک مصور رسالہ ''ذخیرہ'' نکالا۔ ۱۹۱۶ء میں کسی وجہ سے ہوش پر نظام حیدر آباد کا عتاب نازل ہوا نہ صرف یہ رسالہ بند ہوا، بلکہ انہیں شہر بدر بھی کر دیا''۔

اصل میں ''ذخیرہ'' حیدر آباد عنقا ہو گیا ہے اور کسی نے اس کی تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ سراپا بے بنیاد ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق ہوش بلگرامی ۱۳۰۹ھ (مطابق ۱۸۹۳ء) میں پیدا ہوئے۔ ''نظیر الحسن'' تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۹ کے اعداد نکلتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر سید علی بلگرامی (م۔ ۱۹۱۱ء) کے یہاں ہوش سنبھالا۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (م۔ ۱۹۲۶ء) کے پاس بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں حیدر آباد سے شہر بدر کر دئے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں واپس آ گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی سرپرستی میں کئی ماہ تک رہے۔ انہوں نے پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں سیونگ بنک انسپکٹر بنوایا۔ مہاراجہ موصوف نے ہی ملٹری سکرٹری کی مددگاری بھی دلوائی تھی۔ بارگاہ سلطانی میں بھی باریابی حاصل کی اور تقرب روز بروز بڑھتا گیا۔ ہوش یار جنگ کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۵ء کو انتقال کیا۔ شعری مجموعہ سرود غم کے نام سے یادگار چھوڑا (نقوش لاہور شخصیات نمبر صفحہ ۱۳۰۱)

''ذخیرہ''۔ ہوش بلگرامی نے اس نام سے ایک علمی ادبی ماہنامہ جنوری 1915ء میں جاری

کیا۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ رسالہ مصور چھپتا تھا۔ سالار جنگ میوزیم اور اردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد میں ذخیرہ کے سبھی شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ مسز نائیڈو نے اپنی منظومات (The Broken Wing) ۱۹۱۷ء میں شائع کی۔ اس کا ایک نسخہ اقبال کی خدمت میں روانہ کیا۔ انہوں نے اس تحفے کے عوض تین فارسی شعر کا ایک قطعہ بھیجا۔ جو ہوش نے حاصل کر کے اگست ۱۹۱۷ء (صفحہ ۸۱) میں شائع کیا۔ ہوش نے اقبال کی مثنوی رموز بیخودی پر تبصرہ کیا جو ذخیرہ بابت مئی ۱۹۱۸ء (صفحہ ۲۱۷۔۲۱۹) میں ''رموز بیخودی (ہماری میز پر)'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ غرضیکہ ''ذخیرہ'' جنوری ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا تھا۔ سال اشاعت کی تاریخ یہ ہے۔ ''کیا ذخیرہ ہوش کا اچھا ہے واہ'' (۱۹۱۵ء)۔

(۴۸) کلیات باقیات شعرِ اقبال۔ یہ پروفیسر صابر کلوروی صدر شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جو انہوں نے عرصہ پہلے تیار کیا تھا۔ اب یہ گرانقدر مقالہ اقبال اکادمی پاکستان کی طرف سے شائع ہوا۔ میں پروفیسر صاحب کے تحقیقی کاموں سے بخوبی واقف ہوں۔ ماشاء اللہ اچھا لکھتے ہیں اور اقبالیات میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ میری ان سے چند سال قبل خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ماہر اقبال جناب محمد عبداللہ قریشی مرحوم بھی اپنے خطوط میں موصوف کا ذکر خیر کرتے تھے۔

مجھے پروفیسر صاحب کی کتاب کا یہ نسخہ اقبال اکادمی کی جانب سے اس وقت موصول ہوا جب میں فروری (۲۰۰۵ء) میں زیرِ نظر مقدمہ لکھنے میں مصروف تھا۔ کتاب کی حسب عادت ورق گردانی کرنے لگا تو اتفاق سے صفحہ ۴۴۸ میں ذیل کا مسدس نظر آیا۔

''اقبال کا غلاموں سے خطاب''

دورِ محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام — دوستوں کی چاہ، آپس کی محبت ہے حرام
علم ناجائز ہے، دستار فضیلت ہے حرام — انتہا یہ ہے غلامی کی عبادت ہے حرام

سایۂ ذلت سے مومن کا گزرنا ہے حرام
صرف جینا ہی نہیں، بلکہ مرنا ہے حرام

پروفیسر صاحب نے یہ بند اخبار ''ایمان'' امرتسر مطبوعہ ۹ جنوری ۱۹۳۷ء سے منتقل کیا ہے۔ ''ایمان'' امرتسر پندرہ روزہ اخبار تھا جو عبدالحمید کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے متعدد شمارے کتب خانہ علامہ شبلی (ندوہ) لکھنو میں محفوظ ہیں۔

مجھے یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ پروفیسر صاحب موصوف سے ایسا سہو کیونکر ہوا کہ الحاقی بند شامل کتاب کر دیا گیا۔ اگر موصوف اس کے بارے میں چھان بین کرتے تو صحیح نتیجے پر پہنچ جاتے۔ دراصل اس بند کے خالق اقبال نہیں بلکہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ یہ مجھے طالب علمی کے زمانے میں جوش کے کسی مجموعہ کلام میں نظر سے گزرا تھا۔ تب سے مجھے ورد زبان ہو گیا ہے۔

میں اس بات کا معترف ہوں کہ مصنفِ کتاب غلطیوں سے بچنے کے لئے کتنا ہی محتاط کیوں نہ رہے، لیکن کتاب چھپنے کے بعد غلطی کہیں نہ کہیں سر اٹھا لیتی ہے۔ میں صاحبان فکر و نظر سے گذارش کرتا ہوں کہ اگر انہیں ان کتابوں میں کوئی کوتاہی نظر آئے گی تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔ میں تعریفوں کا خواہاں نہیں بلکہ اپنی تصانیف پر ناقدانہ نظر ڈالنے کا خواہش مند ہوں۔ اس لئے میں کاتب یا کمپوزر کو کسی بھی قلمی لغزش کے لئے ذمہ دار قرار نہیں دیتا ہوں۔ اور اسے ہمیشہ اپنی غلطی سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میری تحریروں میں کہیں کہیں تکرار کی غیر شعوری اور معمولی عبارتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ضخیم کتابوں میں ایسا سہو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں ترتیب دئے گئے اور ان میں سے بعض اشاعت پذیر بھی ہوئے اور بعد میں کچھ نیا مواد ملنے پر ان میں اضافے بھی کئے گئے۔ بہر حال اگر کوئی ایسی کوتاہی نظر آئے گی تو وہ میری بشریت کی دلیل متصور کی جائے۔ کسی زمانے میں میرا حافظہ بہت قوی تھا۔ مگر اب وہ بات کہاں۔

طالب علمی کے زمانے میں مجھے عرفی شیرازی کی بلند خیالی اور خودداری نے بہت متاثر کیا تھا۔ ان کے پر شکوہ قصیدے کے بعض اشعار زبانی یاد تھے اور آج بھی ہیں۔ یہ دو شعر میری رہنمائی کے ذمہ دار ہیں۔

راہِ مجنونی و فرہادیم آمد در پیش ... رفتم ایں راہ ولیکن نہ چو ایشاں رفتم

آشیانِ زغن و زاغ نہ چیدم بر سر ... سر قدم ساختہ و در خار مغیلاں رفتم

میں ایسے اشعار سے ہمیشہ استفادہ کرتا رہا ہوں۔ عرفی کے علاوہ مجھے اقبال سے بھی دلچسپی ہوئی تھی اور موصوف پر کچھ لکھنا بھی چاہتا تھا۔ جب دیکھا کہ ان کے فکر و فن پر ان کی زندگی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے تو جز بز ہو کر رہ گیا۔ اقبال کے انتقال کے بعد ہزاروں کتابیں اور دسیوں ہزار مضامین شائع ہوئے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ مجھے نوے فیصدی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جن میں اقبال کے فکر و فن میں کوئی اضافہ نظر نہیں آیا بلکہ وہی پرانے مضامین نئے سانچوں میں مختلف لیبلیں لگا کر ڈھال دئے گئے۔ یہ دیکھکر میں حیران و ششدر رہا کہ کون سا نیا موضوع اختیار کروں۔

غرضیکہ میں نے عرفی کے اشعار کے پیش نظر عام راستے پر چلنے کی بجائے ''تحقیق'' کا بہت ہی خطرناک اور دشوار گزار نیا راستہ تلاش کیا۔

خوش قسمتی سے میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف کتب خانوں میں گزارا جہاں بے شمار نادر الوجود اور پرانے رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے اقبال کے بارے میں خاک آلود بیش بہا آبدار موتی ہاتھ آئے جنہیں میں نے صاف کر کے ایک لڑی میں پرو دئے تاکہ محفوظ رہ سکیں۔

میں اپنی تحریروں میں کسی کی تقلید نہیں کرتا ہوں اور ہمیشہ پامال راستوں پر چلنے سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے ایک نئی روش پر چلنے کی عادت ڈالی ہے۔ اس کے طے کرنے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے مجھے وادی تحقیق کے لق و دق صحراؤں کے پر خار میدانوں میں سر کے بل گزرنا پڑا۔ اس صبر آزما کام کے لئے مجھے جن جن دشوار گزار اور پر خطر راستوں سے داخل ہونا پڑا اس کا اجمالی ذکر میں نے ایک مضمون ''اگر خواہی حیات اندر خطر زی'' مطبوعہ ہماری زبان دہلی مورخہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۳ء میں کیا ہے۔

اقبال پر میں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ کئی مسودے محتاج اشاعت ہیں اور کئی نام نہاد سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے اشاعت کے لئے طلب کئے۔ میں نے ان کی فرمائش قبول کی۔ ان کا کیا حشر ہوا کچھ معلوم نہیں۔ ایک بھاری بھرکم مسودہ ''اقبال! احباب و آثار'' ریاستی کلچرل اکادمی میں اس کی درخواست پر حاضر کیا۔ وہ گزشتہ آٹھ سال سے سولی پر لٹکایا گیا ہے۔ نہ واپس کیا جاتا ہے اور نہ چھاپ ہی دیا جاتا۔

میں اس شہر شملہ میں رہتا ہوں جہاں کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ فقدان علم کا یہ عالم ہے کہ کوئی کتب خانہ ایسا نہیں ملتا ہے جہاں ریسرچ اسکالر اپنی پیاس بجھا سکے۔ اقبال شناس نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اقبال فروش بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے نام بڑی بڑی منڈیاں قائم کی گئی ہیں جہاں نقل شدہ مقالوں پر ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

میں اقبال اکادمی پاکستان کا سراپا ممنون ہوں جس نے مجھے اقبال پر بہت سی نایاب کتابیں بھیجیں جو میرے خواب و خیال میں نہ تھیں۔ میں اقبال اکادمی کے نائب صدر عالی جناب ڈاکٹر جاوید اقبال مدظلہ کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تمام مطبوعات اپنے دستخط خاص سے روانہ کیں۔ اقبال کے شیدائی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر طب، ممتاز ادیب و شاعر ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کا شکریہ ادا کرنا میرا فریضہ ہے۔ موصوف نے مخلصانہ طور پر دونوں کتابوں کی اشاعت کے لئے دست تعاون بڑھا دیا۔

جناب مشفق خولبہ کے نام کے ساتھ "مرحوم" لکھنا میرے لئے افسوسناک امر ہے۔ بہر حال ان کا نام لینے سے مجھے وہ کرم فرمائیاں یاد آتی ہیں جو انہوں نے عمر بھر میرے ساتھ کیں۔ عبرت کا مقام ہے کہ وہ میری تصنیف معرکۂ اسرار خودی جو زیر طبع ہے اور ان دونوں کتابوں کو نہ دیکھنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے ہیں ان کو سلام کرتا ہوں اور اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ انہیں مغفرت کرے۔

جناب پروفیسر نیر مسعود رضوی کی عنایتوں کا کیا ذکر کروں۔ انہوں نے علالت کے باوجود اپنے نیک مشوروں سے میری معاونت فرمائی۔ ان کا بھی ہمہ تن سپاس گزار ہوں۔ میں اپنی اہلیہ محترمہ اور فرزند ڈاکٹر ظفر حیدری کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پروف ریڈنگ کے مشکل کام کو میرے لئے آسان کر دیا۔ جن دوستوں اور بہی خواہوں نے مجھے اپنی آراء سے نوازا، ان میں سید فضل اللہ (ڈائرکٹر آف لائبریریز جموں و کشمیر) عرفان ترابی، سید رضا صاحب، جناب حیدر خان صاحب اور صابر عمرانی قبلہ (تنظیم المکاتب لکھنو) قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات کا نیک خواہشات کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آخر میں خصوصیت کے ساتھ سید اقبال حسین کاظمی (موسس مرثیہ فاونڈیشن کراچی) ساحر لکھنوی قبلہ (کراچی) جناب باقر زیدی امریکہ، اور جناب عنبر نقوی (کراچی) کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ ان حضرات نے بیش قیمت قطعات تاریخ طباعت کہکر میری تصانیف میں زینت بخشی۔ یہ سب حضرات تاریخ گوئی کے مشکل فن میں مہارت رکھتے ہیں۔

آخر میں اپنا یہ طویل مقدمہ علامہ کے اس شعر پر ختم کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد آہے بہ آہے گاہے

اکبر حیدری کشمیری۔ سرینگر

قطعہٴ تاریخ

قطعہٴ تاریخ طباعت از حضرت ساحر لکھنوی مدظلہ (کراچی)

یعنی ''اقبال! نادر معلومات'' (۱۴۲۶ ہجری)

ڈکٹر اکبر حیدری ہیں مرد میدان ادب — ہے رہِ تحقیق میں ہر سعی ان کی کامیاب
تازہ تراک کارنامہ ان کا ہے زیرِ طبع — حضرت اقبال پر تحقیق ہے جو لاجواب
جس میں معلومات اقبال ایسی نادر جمع کیں — کوئی ماہر دیکھ بھی پایا نہ اب تک جن کے خواب
حضرت اقبال پر تحقیق اکبر حیدری — اس کو کہتے آفتاب آمد دلیل آفتاب
ڈاکٹر جاوید بیٹے ڈاکٹر اقبال کے — قائل اس تحقیق لاثانی کے خود ہیں وہ جناب
اُن سے بڑھکر کوئی ہوگا محرم اقبالیات — ہے یقیناً ان کی تعریف اک سند بہر کتاب
خواجہ مشفق بھی تھے مدح خوانِ اکبر حیدری — مطلع تحقیق پر موجود تھے مثل ماہتاب
مان لیں گے سب محقق اب یہ مصحف دیکھکر — ڈکٹر اکبر حیدری ہیں اس فلک کے آفتاب

لکھ دو یہ تاریخ تکمیل کتاب اے ساحر اب
''کس قدر نادر ہیں معلومات اقبال'' اے جناب **=۱۴۲۵ ہجری**

از روئے الہام ساحر مل گئی تاریخ طبع
''کس قدر نادر ہیں معلومات اقبال'' اے جناب **=۱۴۲۶ ہجری**

(اس تاریخ میں الہام کے الف کے ایک عدد کا تعمیہٴ تدخلہ کیا گیا ہے۔ ساحر)

قطعہٴ تاریخ طباعت از جناب باقر زیدی (امریکہ)

''اقبالیات کے نئے گوشے'' (سنہ عیسوی و ہجری)

''لکھی ابھی جو حیدری صاحب نے اک کتاب — اقبالیات کے نئے گوشے دکھائے ہیں''
=۲۰۰۵ء

''ان کا قلم ہے نقد و ادب کا مزا جدار — پابندگی فکر کے دریا بہائے ہیں''
=۱۴۲۶ھ

قطعات تاریخ از سید اقبال حسین کاظمی (موسس مرثیہ فاؤنڈیشن۔پاکستان)

اقبال! نادر معلومات'' (سن عیسوی و ہجری)

جس میں ہے لبریز صہبائے خودی ‏ نادر معلومات ہے ایسا ایاغ
عیسوی تاریخ کہتی ہے کہو ‏ ''نادر معلومات کو اقبال باغ
= ۲۰۰۵ء

شاعر مشرق کا ہے یہ تذکرہ ‏ حیدری تصنیف ہے یہ لاجواب
مصرع تاریخ ''ہم'' سے یہ ملا ‏ ''نادر معلومات ہے نامی کتاب''
۴۵ + ۱ ۸ ۳ ۱ = ۱۴۲۶ھ

(پہلے مصرعہ میں ''ہم'' کے ۴۵ اعداد کا تدخلہ کیا گیا ہے۔کاظمی)

قطعہ تاریخ طباعت -- نتیجۂ فکر جناب عنبر نقوی (کراچی)

''اقبال! نادر معلومات'' (سنہ عیسوی)

اکبر کے سمندر کے رشحات ‏ اقبال! نادر معلومات
ہیں اکبر حیدری کشمیری ‏ تحقیق کے بادل کی برسات
ہر حرف میں پنہاں زور یقین ‏ تحریر صداقت کا اثبات
اقبال شناسی کی کوشش ‏ ہے گویا یکے از مستحبات
اک ''معرکۂ اسرار خودی'' ‏ بے مثل ہیں جس کی تشریحات
مشفق خواجہ، جاوید اقبال ‏ اک ورثہ بکف اک ورثہ بہ ذات
مداح ہیں اکبر حیدری کے ‏ ہیں ان پہ عیاں ان کے درجات
جاوید اقبال تو منصف ہیں ‏ کیوں کر نہ کریں عدل کی بات
مشفق خواجہ اک جوہری ہیں ‏ جوہر کے وہ محرم ہیں بالذات
اقبال کے عاشق ہیں دونوں ‏ دل دادۂ فن دانائے نکات
مولا کا کرم یوں بات بنی ‏ لکھی تھی جو اک تاریخ صفات
دو حرف ستائش لکھ عنبر ‏ کہتے ہیں ادب کے سوغات

تاریخ طباعت خود بولی
''شبدیز قلم کی ہے سوغات''
۵ ۰ ۰ ۲ء

ایضاً سنہ ہجری

تحقیق کے مردمیداں پر شاعر کے ہیں ظاہر سب انداز
یہ اکبر حیدری کشمیری اقبال کے ہیں گویا ہمراز

اک نئی کتاب کے تحفے سے بھر دیا دامن اردو کو
کچھ اور بڑھا اقبال سخن ہے اوج پہ فکر کی یہ پرواز

لے "معرکۂ اسرار خودی" مشفق خواجہ سے داد ہنر
جاوید اقبال کی فرمائش ہے اکبر حیدری کا اعزاز

اس کارنمایاں کی خاطر دامانِ ستائش بھرنے کو
الفاظ کی صورت سازی کا عنبر نے کیا جس دم آغاز

تاریخ طباعت نے بڑھکر مصرع یہ قلم کو پیش کیا
"اقبال کی نادر معلومات" اکبر کی بزم کا ہے اعجاز

۶ ۲ ۴ ۱ **ہجری**

نواب سرذوالفقار علی خان بہادر

نواب ذوالفقار علی خان کی اقبال پر پہلی تصنیف

(A Voice From The East)

نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کے حالات زندگی کے بارے راقم حروف نے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا:

۱- یادگار دربار ۱۹۱۱ء مطبوعہ دین محمد یادگار آفس لاہور حصہ دوم (صفحہ ۳۰۶)

۲- ''زمانہ'' کانپور- جلد ۶۱ نمبر (صفحہ ۵۰-۵۲) بابت جولائی ۱۹۳۳ء

۳- اقبال بنام شاد (صفحہ ۸۵-۹۰) مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، مطبوعہ بزم اقبال کلب روڈ لاہور ۱۹۸۶ء

نواب سر ذوالفقار علی خان علامہ اقبال کے مخلص ترین احباب و معاصرین میں تھے۔ انہیں علامہ سے والہانہ محبت اور انتہائی عقیدت تھی۔ نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کی بنیاد سلاطین لودھی نے رکھی تھی۔ نواب صاحب کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی تھی۔ یادگار دربار میں ۱۸۷۵ء درج ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی ہے۔ موصوف کا خاندان ہمیشہ سے ذی حشم اور علم و دانش کی آماجگاہ تھا۔ فارسی کے مشہور شاعر ترکی[۱] بھی اس خاندان سے وابستہ رہے تھے۔ دیوان ترکی (صفحہ ۲۴۹) میں ''تاریخ تولد فرزند نواب مالیر کوٹلہ محمد علی خان درج ہے۔ ذیل میں تاریخ کے دو شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ہاتفم ز اندیشہ سر بیروں آورد و گفت	بامداں ایں دو تاریخ مبارک برمحل

ترکیا! برخواں کہ ''صاحب زادۂ فرخ شدہ'' ۱۳۰۵+۲ھ = ۱۳۰۷ ہجری

غالباً نواب محمد علی خان نواب ذوالفقار علی خان کے چھوٹے بھائی تھے۔

نواب ذوالفقار علی خان مالیر کوٹلہ کے نواب جمال علی خان ابن دلیر خان ابن غلام محمد خان کے صاحبزادے تھے۔ نواب غلام محمد خان کو اپنی جاگیر میں فوجداری کے اختیارات بھی

حاصل تھے۔ آپ بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ اس لئے جاگیر کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے سپرد رہا۔ نواب کی جائداد مالیر کوٹلہ کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات میں بھی تھی۔ مالیر کوٹلہ کی آمدنی کا دسواں حصہ ان سے امپریل اخراجات کے لئے بھی لیا جاتا تھا۔

نواب ذوالفقار علی خان کی ابتدائی تعلیم وارڈ اسکول انبالہ میں ہوئی جس کے ٹوٹ جانے پر آپ چیف کالج لاہور میں داخل ہو کر کالج مذکور سے امتحان انٹرنس پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف-اے کا امتحان پاس کیا۔ کالج چھوڑنے کے بعد دو سال تک لدھیانہ میں آنریری ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا کام کر کے قانونی تجربہ حاصل کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں بغرض تعلیم انگلستان تشریف لے گئے۔ چنانچہ پیرس میں فرانسیسی زبان میں خاص ملکہ پیدا کیا، جس کی بدولت یورپ کے ممتاز آدمیوں سے گفتگو کے بہت مواقع حاصل کئے۔ تقریباً تین سال یورپ میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۰۱ء سے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ چنانچہ فیروز روڈ پر ایک شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جہاں ہندوستان کے علاوہ یورپین سوسائٹی میں بھی خاص طور پر رسوخ پیدا کیا۔ آپ کی شادی نواب سرامین الدین خان والی لوہارو کی حقیقی بھانجی سے ہوئی جس سے اولاد بھی ہوئی۔

نواب صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ مناقشہ انجمن کے موقع پر آپ ثالثوں میں تھے۔ ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسہ میں انجمن کی تقریبات پر انجمن کو ایک ہزار روپیہ نقد سے نوازا۔ نواب صاحب نے مالیر کوٹلہ کے بجائے لاہور میں قیام کرنا اس لئے پسند کیا تھا تا کہ آپ کو عوام کی خدمت اور ملک کے سیاسی و اقتصادی امور میں دلچسپی لینے کا موقعہ ملے۔ ہندو مسلم اتحاد کے آپ ہمیشہ خواہش مند رہے۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آپ نے بمبئی کے مشہور سیاستدان اور ادیب مسٹر مالاباری[۲] کے انگریزی رسالے ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' (EAST AND WEST) میں کئی مضامین شائع کئے۔ مسٹر مالاباری کے انتقال کے بعد ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' کی عنان ادارت عملاً سردار امراؤ سنگھ گل، سردار جوگندر سنگھ اور نواب ذوالفقار علی خان ہی کے ہاتھوں میں رہی جس کی بدولت علمی اور سیاسی حلقوں میں آپ کا خاصا رسوخ ہو گیا۔ اس سلسلے میں آپ کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی جو ذوق و مشرب کی یگانگت کے

باعث بعد میں گہری اور مخلصانہ دوستی کی صورت اختیار کر گئی۔ یہ دوستی مثالی سمجھی جاتی تھی غرضیکہ نواب صاحب اقبال کے نہایت ہی گہرے، بے تکلف، عزیز اور مخلص دوستوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وہ دبلے پتلے، متین و سنجیدہ، خوش اخلاق اور ہنر پرور رئیس تھے۔ اور ثروت و عمارت کے باوجود نہایت سلجھا ہوا علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اقبال کے تعلقات سب سے پہلے جس نے انگریزی خوانوں کے سامنے پیش کیا اور ان کے ذہنی اور دماغی جوہر دنیا میں آشکار کیے وہ نواب صاحب ہی تھے۔ ان کی مشہور کتاب ''A Voice from the East'' اقبالیات میں کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اب تک جتنی کتابیں اقبال کے فکر و فن پر لکھی گئی ہیں ان میں کئی لحاظ سے منفرد ہے۔

نواب ذوالفقار علی خان کا دولت خانہ جس کا نام اقبال نے ''زرافشاں'' رکھا تھا، لاہور کی اعلیٰ سوسائٹی کا مجلسی مرکز تھا، جہاں اکثر معززین شہر اور مقتدر سرکاری حکام ٹینس کھیلنے اور چائے پینے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی سے آپ کے پرخلوص روابط تھے، جن میں ڈاکٹر اقبال کے علاوہ سردار جوگندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ شیر گل اور مرزا جلال الدین بیرسٹرایٹ لاء بہت نمایاں تھے۔ چودھری محمد حسین بھی پریس برانچ کی ملازمت سے پہلے نواب صاحب ہی سے وابستہ تھے اور نہ صرف پنجاب چیف ایسوسی ایشن کے کاروبار میں نواب صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے بلکہ ان کے صاحبزادوں نواب رشید علی خان اور نواب خورشید علی خان کے اتالیق بھی تھے۔ چودھری صاحب کا ربط ضبط ڈاکٹر اقبال سے یہیں بڑھا۔ جو اس کے بعد روز افزوں ہوتا گیا۔ اقبال نے اپنی وصیت میں جن لوگوں کو اپنی جائداد کا متولی مقرر کیا تھا، ان میں ایک چودھری صاحب بھی تھے جو اس اعتماد کے ہر طرح اہل ثابت ہوئے۔

۱۹۰۹ء میں نواب صاحب امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر تمام عمر مجالس آئین ساز کے رکن رہے۔ آپ عرصے تک پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر رہے۔ کئی سال تک انجمن حمایت اسلام لاہور کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ بیس برس تک پنجاب چیف ایسوسی ایشن (جاگیرداروں کی انجمن) کے آنریری سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۱۰ء میں آپ ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم مقرر

ہوئے اور قریباً تین سال وہاں رہے۔ اسی زمانے میں سردار جوگندر سنگھ بھی آپ کے ساتھ پٹیالہ کے ہوم منسٹر تھے۔

جدید اصلاحات نافذ ہونے پر ۱۹۲۰ء میں آپ مشرقی پنجاب کے حلقے سے کونسل آف اسٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے اور مسلمانوں کے مسلم رہنما تسلیم کئے جانے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت چھوڑ کر آپ پنجاب کے مشرقی وسطی مسلم حلقے کی طرف سے لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ دوبارا اسمبلی کے انتخاب کے وقت آپ ولایت تشریف لے جارہے تھے اس لئے مقابلے کے لئے کھڑے نہ ہوئے، مگر حکومت نے آپ کو اس ایوان عالیہ کا ممبر نامزد کردیا۔ اسمبلی میں آپ مدت دراز تک مرکزی مسلم پارٹی کے صدر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لئے جو سنٹرل کمیٹی مقرر ہوئی، اس میں آپ بھی شریک کئے گئے۔ بلکہ اسی سلسلے میں آپ ۱۹۲۹ء میں لندن بھی تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ انڈین فرنچائز کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ مسلم لیگ اور آل انڈیا مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ ہندوستان کی طرف سے مجلس اقوام میں ڈیلی گیٹ منتخب ہوکر تشریف لے گئے اور عرصے تک ہندوستانی وفد کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ان گونا گوں سیاسی او سماجی سرگرمیوں کے باوصف نواب صاحب نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں ''سوانح عمری مہاراجہ رنجیت سنگھ'' اردو میں اور ''شیر شاہ سوری'' انگریزی میں اب تک بڑے شوق اور قدر سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور کتب حوالہ کا کام دیتی ہیں۔ علامہ کے کمالات شاعری پر آپ کی قابل قدر انگریزی کتاب ''A Voice from the East'' اقبالیات میں اولین پیش کش کہی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس سے پہلے اگرچہ اقبال کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا مگر اردو یا انگریزی کسی زبان میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ ''سرگذشت الفاظ'' کے مصنف مولوی احمد دین کی اردو میں لکھی ہوئی کتاب کا پہلا ایڈیشن یقیناً ہراول ثابت ہوتا، مگر اقبال کے نزدیک اس میں کلام کا انتخاب معیاری نہ تھا، کیونکہ اس وقت تک اقبال ''بانگ درا'' ترتیب نہ دے پائے تھے، اس لئے یہ بازار میں لانے سے قبل تلف کردیا گیا اور اس کا دوسرا ایڈیشن حک و ترمیم کے ساتھ ''بانگ درا'' کی

اشاعت کے بعد ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب بہت کمیاب ہوگئی تھی۔ اسے اردو کے ممتاز محقق و ناقد جناب مشفق خواجہ صاحب نے مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں مرتب کر کے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) سے شائع کرایا۔

پروفیسر نکلسن کے انگریزی ترجمہ ''اسرار خودی'' نے، جو نواب صاحب کی کتاب کی اشاعت سے دو سال قبل ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا تھا، اقبال کو یورپ اور امریکہ روشناس تو کرا دیا تھا مگر اس ترجمے پر انگریز نقادوں کے جو تبصرے شائع ہوئے تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اقبال کے پیغام کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ چنانچہ اقبال کو خود ایک طویل خط کے ذریعہ پروفیسر نکلسن اور دوسرے لوگوں کو اپنا مطالب و مفہوم واضح کر کے ان کے شکوک و شبہات رفع کرنے پڑے۔ مگر نواب صاحب کو جو تعلق خاص اور قرب قریبی حاصل تھا اور افہام و تفہیم کے جو مواقع میسر تھے ان کے سبب وہ اقبال کے پیغام کی روح تک پہنچ گئے تھے۔ ان کی کتاب نے انگریز مصنفوں کی غلط فہمیاں دور کرنے اور اقبال کی آواز لوگوں تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

یہ کتاب اول تو اقبال کی زندگی میں لکھی گئی تھی اور پھر ایک ایسے شخص نے لکھی تھی جس کے ہاں اقبال کی اکثر نشست و برخاست رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب نے اس کام کو اقبال سے پوشیدہ نہ رکھا ہوگا۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ انہوں نے بعض مسائل کی پیچیدگیوں کے حل اور بعض نکات کی لطافتوں کو سمجھنے میں اقبال سے مشورہ بھی کیا ہوگا کیونکہ وہ نہایت بے تکلفی سے ایسا کر سکتے تھے۔ وہ خود بھی دانشور تھے، باذوق تھے اور مشرق و مغرب کے علوم سے بہرۂ واقعی رکھتے تھے۔ وہ اقبال کے عہد آفریں شعری کارناموں سے حد درجہ متاثر تھے اور خوب جانتے تھے کہ اقبال کے حیات افروز کلام نے ملک و ملت کی جواں نسل کو کس طرح بیدار کیا ہے۔ انہوں نے کتاب کی ابتدائیہ ہی میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:-

"If the Peacock Throne is the of persia, and the lustrous Koh-i-Noor the glory of the British Crown, Iqbal would surely adorn the Court of the muses in any Country."

(اگر ایران کو تخت طاؤس پر فخر ہے اور تاج برطانیہ کوہ نور پر ناز کر سکتا ہے تو اقبال یقیناً ملک سخن کے

دربار کی زینت ہے۔)

یہ کوئی شاعرانہ تعالیٰ نہیں جو یوں ہی جذبات کی رو میں یہ کہکر کہہ دی گئی ہو بلکہ یہ اقبال کے کلام کے گہرے مطالعے کے بعد ان تاثرات کا حقیقی عکس تھا جو شاعر نے مصنف کے دل پر چھوڑے تھے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اردو فارسی کے جتنے اشعار زیر بحث آئے ہیں ان کا ترجمہ نواب صاحب کے ایما پر سردار امراؤ سنگھ شیر گل نے کیا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے صحافی، انگریزی زبان کے ایک مشہور رسالے (ایسٹ اینڈ ویسٹ بمبئی) کے ایڈیٹر اور اقبال کے نہایت مخلص دوست اور مداح تھے۔ ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر زبان کی اپنی خصوصیات، اپنا مزاج، اپنی تراکیب، اپنے محاورے، اپنا روزمرہ، اپنی تشبیہات، اپنے استعارے، اپنی تلمیحات اور اپنے صنائع بدائع ہوتے ہیں جن سے پوری طرح لطف اندوز ہونا غیر زباں والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ترجمہ کرنے والی چیز اقبال جیسے عظیم شاعر اور مفکر کی کوئی ایسی شعری تخلیق ہو جو حسین ولطیف جذبات، جوش و سرمستی سے لبریز تخیلات، نازک اور عمیق افکار اور ولولہ انگیز پیغام کی حامل ہو اور مترنم بحور و قوافی میں لپٹی ہوئی ہو۔ سردار امراؤ سنگھ کا ان مشکلات سے کامیابی کے ساتھ گزر جانا واقعی قابل تعریف کارنامہ ہے۔ ان کے ترجمے نے کتاب کی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دئے ہیں ''A Voice from the East'' آج بھی فضا میں گونج رہی ہے اور کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

سردار امراؤ سنگھ ہی نے برگساں سے پیرس میں علامہ کی ملاقات کا انتظام کیا تھا اور علامہ کی شاعری پر زیر نظر کتاب (A Voice from the East) کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(''اقبال کا کلام بھگوت گیتا'' سے کم نہیں۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی جماعت کو بقا اور ترقی کے لئے مذہبی فلسفے سے کام لینا چاہیئے جس سے علیحدہ ہو کر اور جس کو نظر انداز کر کے سوسائٹی یکسر برباد اور تباہ ہو جاتی ہے.........اپنے دوست سر ذوالفقار کے مکان پر میں نے اقبال کو ایسی خوشگوار اور دلکش فضا میں اکثر لیٹے ہوئے دیکھا ہے جس کے محسوس کرنے کے تخیل کی ضرورت نہیں۔ ایسے لمحات میں ان کے نغمہ ہائے شیریں کے شروع ہونے سے پہلے گفتگو خود بہ خود ہو جایا کرتی ہے۔ ممکن ہے بعض ایسے

لوگ بھی ہوں جوان کے ترانوں سے وجد میں نہ آتے ہوں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی ایسا فرد بشر نہ ہوگا۔ وہاں تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ عالم بالا کی خالص اور چمکتی ہوئی شراب طہور کا مزہ آتا تھا اور پیالے جام کی طلب ہوتی تھی۔'' (ترجمہ)

اقبال عام طور پر گھر سے کم ہی نکلتے تھے۔ ضرورت کے سوا زیادہ تر خانہ نشیں رہتے تھے لیکن نواب صاحب کے ہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو نواب صاحب خود ہی موٹر بھیج کر انہیں بلا لیتے تھے۔ پہروں نشست و برخاست رہتی تھی۔ علامہ شیخ عبدالعلی ہروی عالم دین کی مجلسوں میں دونوں شرکت کرتے تھے اور ان کی نشست گاہ پر بھی نواب محمد علی خان قزلباش کی کوٹھی پر جایا کرتے تھے۔

نواب ذوالفقار علی خان کی کوٹھی ''زار افشاں'' میں یوکلپٹس کے بہت سے درخت تھے، جن سے گوند نکلا کرتی تھی۔ نواب زادہ خورشید علی خان جن کی عمران دنوں کوئی نو دس سال کی ہوگی، دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے تھے۔ یہی ان کا دل پسند کھیل تھا۔ نواب زادہ کا بیان ہے کہ علامہ ہماری موٹر میں آتے اور اترتے ہی پیار سے مجھے بلاتے ''چھوٹے میاں! کیا کر رہے ہو؟'' میں کہتا: ''گوند نکال رہا ہوں'' اقبال فرماتے:۔

''چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے''

میں کہتا ''بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرع پر ختم ہوگئی؟'' فرماتے: ''ہاں بھئی، ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے'' میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے۔ آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا۔

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے

یہ چھوٹے میاں تو ۱۹۶۴ء میں انتقال کر گئے۔ بڑے نواب زادہ رشید علی خان مرتے دم تک اسی کوٹھی میں رہے۔

علامہ اقبال نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں عمر بھر کرائے کے مکانوں میں رہا ہوں۔ جاوید منزل بھی جاوید کی ملکیت ہے میں جاوید کا کرایہ دار ہوں اور اس کو ہر ماہ کرایہ دیتا ہوں۔ ایک دفعہ

باتوں باتوں میں سر ذوالفقار علی خان نے مجھ سے کہا کہ اپنا مکان کیوں نہیں بنواتے؟ میں نے کہا ''آپ جیسے سرمایہ داروں نے چار چار پانچ پانچ مکانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہم جیسے کے حصے میں اپنا مکان کیسے آ سکتا ہے۔؟''

مولانا ظفر علی خان کا بیان ہے کہ نومبر ۱۹۱۷ء میں آنریبل نواب ذوالفقار علی خان اور ہمہ مقبرۂ جہانگیر دیکھنے گئے۔ علامہ نے مقبرہ پر سوز و گداز کے لہجے میں مولانا روم کی ایک غزل پڑھی جس کے یہ تین شعر ہمیں وجد میں لے آئے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر | کز دام ودد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت | شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

(ترجمہ: کل شیخ چراغ ہاتھ میں لئے شہر کے گرد گھوم رہا تھا اور بار بار کہتا تھا کہ میں ڈھور ڈنگر اور درندوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ مجھے کوئی انسان میسر آئے۔

میں اپنے سست نہاد ہمرائیوں سے برگشتہ خاطر ہو گیا ہوں۔ اب مجھے شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ و دستان (زال) کے بیٹے رستم کی صحبت کی تمنا ہے۔

میں نے جواب میں کہا ''ہم نے ہر چند تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔'' اس نے کہا ''جو تلاش کے باوجود تمہیں نہیں ملتا وہی تمہاری آرزو ہے۔''

علامہ اقبال جب کبھی انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے تو نواب ذوالفقار علی خان کی موٹر ہی میں ان کے ہمراہ ان کو دیکھا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی موٹر کی یادگار میں یہ نظم قابل ذکر ہے۔

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی | موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام ناز | مانند برق تیز مثال ہوا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر | ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش
ہے پاشکستہ شیوۂ فریاد سے جرس | نکہت کا کارواں ہے مثال صبا خموش
مینا مدام شورش قلقل سے پا بہ گل | لیکن مزاج جام خرام آشنا خموش

شاعر کے فکر کو پر پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ نواب صاحب کی طبیعت شاید علیل تھی یا اور کوئی وجہ ہوگئی تھی کہ انہوں نے اجلاس میں آنے سے معذوری ظاہر کی۔ اقبال نے بھی کہلا بھیجا کہ میں تو نواب ذوالفقار علی خاں کی صدارت میں ہی نظم پڑھوں گا۔ آخرارا کین انجمن کے اصرار سے مجبور ہو کر نواب صاحب اور ان کے ہمراہ علامہ اقبال جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ یہ ۱۹۱۶ء کے سالانہ اجلاس کی بات ہے۔ اقبال کے دوست منشی محمد الدین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' کے چچا منشی محمد خادم[۳] بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ انہوں نے حسب حال فی البدیہہ فرمایا۔

تخت اور تاج دونوں انہی کے تو ہیں غلام	اقبال و ذوالفقار کا ہو کیوں نہ احترام
وابستہ ذوالفقار ہے اقبال سے مدام	اقبال، ذوالفقار سے آتا ہے ہاتھ میں

اقبال نے اکبرالہ آبادی کے رنگ میں ایک نظم ۱۹۱۴ء میں کہی اور اسی سال اسے ''اکبری اقبال'' کے عنوان سے بعض دیگر ظریفانہ نظموں کے ساتھ مرغوب بک ایجنسی کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور نے شائع کیا۔ اس کے بعد کریم پریس لاہور اور الناظر پریس لکھنؤ وغیرہ نے بھی اسے شائع کیا۔ اقبال نے نظم کا عنوان ابتداء میں ''رگڑا[۴]'' رکھا تھا اور اسی نام سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ کتابچہ میں نے سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں دیکھا تھا۔ اس کی ابتداء میں خواجہ حسن نظامی کی شگفتہ تمہید بھی شامل ہے۔ صفحۂ اول میں درج ذیل عبارت ہے:-

''انجمن حمایت اسلام لاہور کے انتیسویں سالانہ (۱۹۱۴ء) جلسے میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے، پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لاء لاہور نے لسان العصر سید اکبر حسین صاحب پنشنر کے رنگ میں بصدارت نواب ذوالفقار علی خان صاحب ذیل کی نظم پڑھی اور اس کا عنوان مذاقاً ''رگڑا'' رکھا تھا۔ پریسیڈنٹ جلسہ جناب نواب ذوالفقار علی خان صاحب نے اپنی پرمعنی ابتدائی تقریر میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو شیکسپیئر اور سعدیؔ سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا:-

اگر یہی اقبالؔ ولایت میں ہوتا تو اس کی قدر و منزلت شیکسپیئر سے بھی بڑھی ہوتی۔ مگر افسوس کہ ہمارے اہل ملک اس کی قابلیت تامہ سے کم آشنا ہیں۔ اس کی دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہوگا کہ اقبال کیا چیز تھا۔

ڈاکٹر صاحب اس دفعہ بوجہ مصروفیت کاروبار (انجمن کے لئے) کوئی نظم پیشتر نہ تیار کر سکے۔ لیکن اراکین انجمن کے بار بار اصرار سے صرف دو تین دن پہلے جلدی میں اپنے چند خیالات کو منظوم کرنا شروع کیا۔ اس لئے آپ نے جلسے میں نظم پڑھنے سے پہلے تمہیداً فرمایا:-

''یہ چند پکوڑے ہیں جو پبلک کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ بعض تازے اور بعض تو ان میں ۲۴ گھنٹے تلے ہوئے ہیں۔ مگر ان پکوڑوں کے ساتھ ایک ''ترلقمہ'' بھی ہوگا۔''

اس اکبری رنگ کے کلام کو قوم کے اکثر افراد نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور قبولیت کے کانوں سے سنا اور تحسین کی زبان کو حرکت دی۔

اس نظم کے اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اکبری رنگ کی جھلک دکھانے پر بھی قادر ہیں۔ آپ کے اس نئے رنگ پر حضرت خواجہ حسن نظامی نے ذیل کی تمہید تسطیر فرمائی اور خواجہ صاحب نے ہی اس نظم کا عنوان اکبری اقبال موزوں فرمایا۔'' فضل الٰہی ،مرغوب رقم

اقبال نے نظر ثانی کرتے وقت اس میں دو شعر (نمبر ۵، ۶) بڑھا دئے اور پھر نظم کا عنوان ''ترلقمہ'' کی بجائے ''خطاب بہ جوانان اسلام'' رکھا اور اسی عنوان سے بانگ درا میں شامل کر دی۔ نظم کا پہلا اور آخری شعر یہ ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

''غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را''

نواب سر ذوالفقار علی خان متعدد بار انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں نواب صاحب صدر اور علامہ اقبال آنریری سکرٹری منتخب ہوئے۔ انجمن کا پینتیسواں سالانہ اجلاس ۲ تا ۴ راپریل ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا۔ ۲۰ راپریل والے اجلاس کی صدارت نواب ذوالفقار علی خان نے کی۔ صدر جلسہ نواب صاحب نے علامہ کو آنریری سکرٹری منتخب ہونے پر زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:-

''صاحبان! میں انجمن کے عہدہ داروں کے جدید انتخاب کی بابت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دو دن ہوئے کہ انجمن کے صدر اور آنریری سکرٹری کا سہ سالہ انتخاب ہوا ہے۔ جو آپ سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں خدا ان کو موجب برکت کرے اور وہ اہل اسلام کی ترقی اور بہبودی کا موجب ہوں۔ میں خود تو ناچیز ہوں، مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب جو آنریری سکرٹری ہوئے ہیں اور ان کی نظیر

ہندوستان بھر میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب میں جو طاقت اور علم ہے وہ کسی اور میں نہیں پائے جاتے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ اپنی لیاقت، اپنے بنی نوع انسان کی خدمت اور بہبودی میں صرف کریں۔ واقعات ایسے پیش آئے کہ تبدیلی ہونا ضروری تھی۔ اگر حالت ایسی بھی رہتی تو راستی کو فروغ نہ ہوتا۔ اس تبدیلی سے ظاہر ہو گیا کہ سچ بلند ہوتا ہے اور جھوٹ گرتا ہے۔''

(اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔محمد حنیف شاہد، صفحہ ۵۲ مطبوعہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۹۷۶ء)

۱۹۲۱ء میں نواب صاحب نے لدھیانہ میں مسافروں کے آرام و آسائش کی خاطر ایک سرائے بنوائی اور اس کا نام ''ذوالفقار گنج'' رکھا۔ اقبال نے اس کی تاریخ تعمیر کہی جو سرائے کے بڑے دروازے پر کندہ کرائی گئی۔

بانی ایں خوش بنا سر ذوالفقار	سال تعمیرش ز ہاتف خواستند
از فلک تاریخ چوں شبنم چکید	''بر زمیں خلد بریں آراستند'' =۱۹۲۱ء

''گفتار اقبال'' (مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۱۰۵) میں ''متحدہ سٹیج بناؤ'' کے زیر عنوان نواب ذوالفقار علی خان کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

۱۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو نواب سر ذوالفقار علی نے برکت علی اسلامیہ ہال میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرنی تھی، جس میں آپ نے اپنے تجربات بحیثیت رکن ''انڈین سنٹرل کمیٹی، اور اپنے اختلافی نوٹ جو انہوں نے سائمن کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ لکھا، پر اظہار خیال فرمانا تھا۔ جلسہ کے صدر علامہ اقبال تھے لیکن بجلی کے نظام میں خرابی کی وجہ سے جلسہ کی کاروائی جلد ختم کرنی پڑی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں علامہ نے فرمایا کہ ''نواب صاحب کی آج کی تقریر زیادہ مفصل و مبسوط تقریروں کا مقدمہ ہے۔ جس سے آپ کو صحیح سیاسی حالات کا اندازہ ہو سکے گا اور اپنی مستقبل کی سیاسی زندگی کے لئے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں گے۔'' نواب صاحب نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی اور جلسہ ملتوی ہو گیا۔

دوسرے دن ۱۹ دسمبر کو دوبارہ جلسہ ہوا، جس میں نواب ذوالفقار نے ایک طویل تقریر کی۔ علامہ اقبال نے افتتاحی تقریر میں فرمایا:۔

''میں نواب صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں، ان خدمات کا بھی جو آپ نے سرانجام دیں اور اس تقریر کے لئے بھی۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ڈاکٹر سہروردی اور نواب صاحب کا اختلافی نوٹ جو انہوں نے سائمن کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ لکھا ہے ضرور پڑھیں۔ جو رپورٹ اخبارات کے

ذریعہ آپ تک پہنچی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کو ہندوستان کے لئے محفوظ کردیا گیا ہے۔ [شیم] آپ اگر اپنی حالت پر رحم نہیں کرتے تو خدا کے لئے آنے والے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے لئے کچھ کرو۔ تمام سٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ سٹیج بناؤ اور آیندہ گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کرلو۔ ہندوؤں کو ایک موقعہ دو۔ محض اتمام حجت کے لئے تاکہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو ہو جائے۔ گو مجھے اس کا یقین نہیں۔ انگلستان متحد ہوگا۔ ہندوستان کو بھی متحد ہونا چاہیے اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مسلمان آپس میں اتحاد پیدا کریں، پھر ہندو اور مسلم کا اتحاد ہوگا۔ صوبجاتی حکومتیں آزاد ہوں۔ یعنی فیڈرل حکومت ہو تو پچیس فیصد مسلمان بھی اسمبلی میں جائیں تو کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔"

آخر کار زمانہ نواب صاحب اور اقبال کی دوستی کو کہاں تک نبھا سکتا تھا۔ حاسدوں کی وجہ سے دونوں میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ نواب صاحب کی ایک کوٹھی "نو بہار" کے نام سے شملہ میں بھی تھی۔ انہی دنوں علامہ شملہ گئے تو خلاف معمول ملک فیروز خان نون کے ہاں ٹھہرے۔ اس سے نواب صاحب کو بڑا صدمہ ہوا۔

نواب صاحب کا انتقال ۶۰ برس کی عمر میں ۲۶ رمئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو ڈیرہ دون میں ہوا۔ میت مالیر کوٹلہ میں دفن کردی گئی۔ اقبال اور مرزا جلال الدین نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لئے مالیر کوٹلہ پہنچے لیکن میت ان کے وہاں سے پہنچنے سے پہلے ہی سپرد خاک کی جا چکی تھی۔

رسالہ "ہزار داستان" اور حکیم احمد شجاع

حکیم احمد شجاع (پ ۱۸۹۴ء) حکیم احمد شجاع الدین کے بیٹے تھے۔ وہ کئی کتابوں کی مصنف تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور ساحر تخلص کرتے تھے۔ حکیم احمد شجاع الدین نے بقول احمد دین (اقبال صفحہ ۱ مطبوعہ ۱۹۲۶ء لاہور) انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک مشاعرہ کی طرح ڈالی تھی۔ مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن تھے جن کے نام پر بازار مشہور ہے منعقد ہوا کرتی تھی۔ میر مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے۔

حکیم احمد شجاع اپنے ایک مضمون "اقبال کا قیام لاہور" مطبوعہ نقوش لاہور شمارہ نمبر ۱۰۸

بابت ستمبر ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں :-

''۱۸۹۵ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کے روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے زمانہ کے مشہور طبیب، فلسفی اور شاعر تھے۔ ''داغ ہجراں'' کے عنوان سے ان کی غزلیات کا دیوان اور ''حزنیہ حزنیہ'' کے نام سے ان کے لکھے ہوئے مرثیوں کا مجموعہ ان کی کاوشوں کی یادگار ہیں۔ انہوں نے بزم مشاعرہ بھی قائم کی تھی۔ ''شور محشر'' اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے میں میرے بھائی امین الدین کے وسیع مکان میں منعقد ہوتا تھا اور جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا ماہانہ ''شور محشر'' میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر احمد حسین خان تھے۔ ان کا نام ایک ناولسٹ، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ اقبال بھی جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ہر ہفتے اس مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی محفل میں انہوں نے وہ غزل پڑھی جس کا شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اسی غزل کا مقطع ہے۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

اس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے دوسری غزل سنائی تھی جس کا مقطع ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں کا

گو حکیم شجاع اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے لیکن ان کی عظمت تمام تر علمی مشاغل کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ خوشگو شاعر، شیوا طراز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز مقرر بھی تھے۔ انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے کئی ڈراموں کے ترجمے بھی نہایت عمدگی سے کئے ہیں۔ افسانہ نگاری میں بھی ایک خاص اسلوب کے مالک تھے۔ انہوں نے ''خوں بہا'' کے چھٹے حصے میں ابتداء سے ۱۹۱۵ء تک اپنے حالات بے کم و کاست دل کش انداز میں تحریر کئے ہیں۔ ان کا ایک علمی کارنامہ قرآن کریم کی تفسیر ہے جو کئی سالوں سے زیر تکمیل ہے۔ ''باپ کا گناہ'' مطبوعہ فیروز سنز لاہور میں انہوں نے اپنے ادبی مشغلوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں وہ آغا حشر کاشمیری کے شاگرد ہوئے تھے۔

شجاع کے کچھ ڈراموں کے نام یہ ہیں۔ آخری فرعون، بھارت کا لال، تارا، حسن کی قیمت۔

حکیم صاحب کا ایک ادبی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ''ہزار داستان'' کے نام سے ایک علمی وادبی رسالہ جولائی ۱۹۲۲ء میں لاہور سے جاری کیا۔ اس کے قواعد وضوابط میں بصراحت لکھا گیا تھا کہ ''ہزار داستان'' ہر انگریزی مہینے میں دو بار یعنی دوسرے اور چوتھے ہفتہ میں دارالاشاعت ادب لطیف سے شائع ہوجایا کرے گا۔ زمانہ کانپور اور اخبار مدینہ نے اس پر تبصرے بھی شائع کئے۔ علی گڈھ میگزین بابت اکتوبر ونومبر ۱۹۲۲ء (صفحہ ۲۷) میں ذیل کا تبصرہ شائع ہوا تھا:-

''ہزار داستان بڑی شان کے ساتھ حکیم احمد شجاع کے زیر ادارت لاہور سے ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ مضامین علمی اور ادبی ہوتے ہیں۔ نظم کا حصہ بھی عمدہ ہے۔ مشاہیر شعراء کے کلام سے آراستہ ہے۔ شروع میں اساتذہ کے فوٹو بھی ہوتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ہزار داستان خوبصورت ہے۔''

حکیم احمد شجاع علامہ اقبال اور نواب سر ذوالفقار علی خان کے مشترکہ دوستوں میں تھے۔ ہزار داستان میں کلام اقبال کے علاوہ اقبال سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ اب نادر الوجود ہو گیا ہے۔ مجھے اس کے چند شمارے اردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد کے بے مثل کتب خانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جلد اول نمبر ۲ بابت جولائی ۱۹۲۲ء (صفحہ ۴۶) میں حکیم شجاع احمد بی-اے ایڈیٹر کا تبصرہ ''نظم اقبال'' کے عنوان سے آنریبل سر ذوالفقار علی خان بہادر کی کتاب ''A Voice from the East'' پر شائع ہوا۔ ہزار داستان عرصۂ دراز سے نایاب ہو چکا ہے۔ اس لئے ذیل میں یہ تبصرہ من وعن درج کیا جاتا ہے:-

''اگر چہ یورپ اور امریکہ کے خاص خاص ارباب ذوق نے نظم اقبال پر تنقید کر کے مشرق کے اس نامور اور ممتاز شاعر کی خصوصیات شعر کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے تاہم سر ذوالفقار علی خان بہادر کی مختصر اور جامع تنقید جو انہوں نے ایک عالمانہ فصاحت و بلاغت سے زبان انگریزی میں حوالہ قلم فرمائی ہے، ایک بڑی کمی کو پورا اور ایک ضروری فرض کو ادا کرتی ہے۔ نظم اقبال کے چند ٹکڑوں کا انگریزی ترجمہ ممکن ہے کہ اقبال کے شعر کو بہت سی خصوصیات اور ممیزات سے معرا کردے اور مغرب کے نقادان سخن کو اقبال کی شخصیت اور اس کی شاعری کا صحیح اندازہ لگانے سے محروم رکھے۔ مگر یقیناً یہ تنقید مغرب کے دلدادگان فن کے لئے ایک نئی حقیقت کا انکشاف ثابت ہوگی، بلکہ ہم کسی قدر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تحریر ہندوستان کے ایسے بامذاق لوگوں کے لئے بھی جو مشرقی علوم وفنون کو صرف انگریزی زبان کی

وساطت سے ہی سمجھ سکتے ہیں ایک نئی دنیا کی دریافت سے کم حیرت انگیز نہ ہوگی۔

ڈاکٹر رامیش چندر کا قول ہے کہ ”آج ہندوستانی دنیا کی نگاہوں میں اس لئے حقیر ہیں کہ اس میں ان افراد یا اشیاء کی کمی ہے جو اس کے لئے مایہ ناز ہوسکیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ ہندوستانی خود ان لوگوں یا ان چیزوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔“

ڈاکٹر ٹیگور کو جن کی شہرت کا ڈنکہ آج چار دانگ عالم میں بج رہا ہے ہندوستانیوں کی سخن فہمی یا قدر شناسی کی بدولت یہ عام قبولیت اور عالمگیر شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ اس جوہر قابل کی دریافت کا سہرا مغرب کے ان قدر شناسوں کے سر ہے جو بلا امتیاز ملک وملت علوم وفنون کی تحقیق وتدقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا یہ امر ایک زندہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر ڈاکٹر براؤن اپنی عمر کی قیمتی ساعتوں کو ایران اور ایران کے شعراء کے مطالعہ میں صرف نہ کردیتے تو آج فارس کے بے بہا علمی موتی گمناہی کے تاریک سمندر میں غرقاب رہتے اور اگر میکس ملر یا دوسرے مغربی مستشرق ویدوں کے راز کا انکشاف نہ کرتے تو ہندقدیم کے یہ قیمتی خزانے قدامت کی خاکستر تار میں ہی دفن رہ جاتے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر اقبال کو جس کی نظم نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے بہت سے ممالک کی رگ جاں میں خون زندگی بن کر دوڑ رہی اور جس کے شعر نے عالم مشرق پر ایک نئی دنیائے تفکر وتدبر کے دروازے کھول دیے ہیں۔ کوئی مغربی نکتہ شناس اور قدردان مل جاتا تو اس کی شہرت آج ٹیگور سے کم نہ ہوتی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ٹیگور کا صوفیانہ رنگ اور اس کے شعر کا کیف خواب آور مغربی ممالک میں اس لئے بھی زیادہ مقبول ومحبوب ہوا کہ وہاں کی مادہ پرست اور کشاکش حیات سے لبریز زندگیاں دنیاوی جدوجہد سے تنگ آکر مادی ترقی کے معراج تک پہنچ کر ایک ایسے ادب کے لئے چشم براہ تھیں جو ان کو مذہبی تعصب اور اعتقادی تفریق کے بغیر اطمینان قلب بخشے اور کارزار حیات کی نبرد آزمائیوں کو معطل کر کے ایک نئی روحانیت کے کیف سے سرشار کردے۔ اور اسی لئے جب بنگال کے اس روحانی نغمہ سرا نے اپنی آسمانی شاعری کے تاروں سے ایک عالمگیر محبت اور صوفیانہ معرفت کا راگ الاپا تو مغرب کے شور نفسانیت سے تنگ آئے ہوئے کان گوش برآواز ہوگئے اور آج ہندوستان کا یہ متبرک اور بزرگ شاعر مغرب کے لئے ایک روحانی پیغمبر بن گیا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ٹیگور جس کا ویدانت کے فلسفہ سے سرشار اور جس کی آنکھیں روحانی اطمینان کے نور سے منور تھیں۔ ہندوستان کی خوابیدہ قومیت کی حالت زار اور پراگندہ جمعیت کی پریشانی سے متاثر نہیں ہوا۔ ورنہ اس کا شعر ایک نغمۂ خواب پرور کی جگہ ایک رجز تہور ہوتا۔ مگر شاید قدرت کو یہ کام

اقبال سے لینا تھا کہ اس نے اس خاموش خلوت نشیں شاعر کے دل میں ایک سیلی آرزو، ایک طوفان جد وجہد متلاطم کردیا۔ اور اس کی آنکھیں ان نظاروں کو دیکھکر بے چین ہوگئیں جو آرزوئے ترقی سے معمور اور تمنائے آزادی سے بے قرار قومیت کی کشاکش حیات کا یقینی نتیجہ ہیں اس راہرو کی طرح جو سامنے افق میں منزل مقصود کے سنہری نشانوں کو دیکھکر اور بے تاب ہوجاتا ہے۔ اقبال کے تخیل نے ہندوستان کو حرکت آرزو اور ترقی کا فلسفہ سمجھایا اور ان اشعار میں شکوہ سنگ خارا سے زیادہ پائدار جن کا اثر برقی رو سے زیادہ تیز اور بے قرار تھا، اس نے ایک مردہ قوم میں جان ڈال دی اس ذمہ دار قائد کی طرح جو اپنے مقتدیوں کی روحوں سے کھیلنے کو گناہ عظیم سمجھتا ہے۔ اقبال نے اپنے پیروؤں کو بقائے (زیست) کے راز سمجھا کر ان کو آرام سے بیزار اور فتح و جاذبیت کے جذبوں سے معمور کردیا۔

یہ مختصر رسالہ بقول سر ذوالفقار علی اس غرض سے لکھا گیا کہ یورپ اور امریکہ کی توجہ کو اقبال اور اس کی شاعری کی طرف منعطف کیا جائے۔ یہ ایک مبارک مقصد ہے۔ خدا کرے نواب صاحب ممدوح کو اس میں کامیابی ہو۔ مگر ہم اس امر کا بصد غرور و ناز اعلان کرتے ہیں کہ اقبال امریکہ اور یورپ کی قدردانی کا محتاج نہیں۔ اس کا جوہر تعریف سے مستغنی ہے اور اس کا کام صلہ اور ستائش سے بے نیاز۔ ایک دن آئے گا کہ یورپ اور امریکہ کی متلاشی آنکھیں اقبال کو ڈھونڈنے کے لئے نکلیں گی اور ہندوستان اپنے اس مایہ ناز شاعر کو غیر فانی عزت سے دیکھنا سیکھ لے گا۔ خدا کرے وہ دن اقبال کی زندگی ہی میں آئے۔

نواب صاحب ممدوح کو اقبال کے دوسرے ناقدین پر وہ تمام فوقیت حاصل ہے جو ایک شاعر کے ہم نشین اور ہم مشرب دوست کو حاصل ہوسکتی ہے۔ ان کے کانوں میں اقبال کی شیرینی تکلم بسی ہے اور ان کی آنکھوں میں اقبال کی پرسحر صحبت کے جلوے ہیں۔

پس اقبال اور اس کے شعر کے متعلق جو کچھ وہ لکھ سکتے ہیں اور کون لکھ سکتا ہے۔ اگرچہ نظم اقبال میں زیادہ تر اقبال کے ابتدائی زمانے کے کلام اور پھر اس کلام کے بہت سے قلیل اور مختصر حصوں کو ہی پیش نظر کیا گیا ہے اور شمع و شاعر، شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ جیسی غیر فانی نظموں کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ تاہم نواب صاحب ممدوح نے انہی اقتباسات کی شرح میں اس تبحر و عبور کا ثبوت دے دیا ہے جو ان کو نظم اقبال پر ہے اور ان کی تحریر کے کلام کی تمہید کے طور پر کافی استفادہ کی اہل ہے۔

کاغذ اچھا ہے۔ مگر لکھائی اور چھپائی نظم اقبال اور نامور مصنف کی شایان شان نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قدردانان فن ظاہری خوبیوں کو نظر انداز کرکے اس بے نظیر ادبی کوشش کی باطنی سحرکاریوں سے مسرت اندوز ہوں گے۔

کتاب کی تقطیع ۲۶×۲۰/۸ ہے۔ حجم دیباچہ کے علاوہ جو سردار امراؤ سنگھ صاحب شملہ کے پتے پر نواب صاحب ممدوح کے پرائیوٹ سکریٹری کے نام خط لکھنے سے ایک روپے کے قلیل قیمت پر مل سکتی ہے۔"

راقم حروف کو یہ نسخۂ اولین بڑی مشکل سے دستیاب ہوا۔ اس لئے مضمون کے آخر میں شامل کیا جاتا ہے۔

حواشی

(۱) ترکی نور محلی - غلام احمد ترک علی شاہ قلندر ترکی- عجیب و غریب بزرگ تھے۔ ابتداءً غلامی تخلص کرتے تھے۔ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے سلسلے میں قلندر ہو گئے۔ اور ترک شاہ نام رکھکر ترکی تخلص کرنے لگے۔ فردوسی طوسی کی باقیات الصالحات سے تھے۔ ناطق مکرانی، واثق ہراتی، امام بخش صہبائی کی شاگردی کا فخر تھا۔ اپنے تذکرہ موسوم بہ "سخنواران چشم دیدہ" (مطبع شمس الاسلام حیدرآباد صفحہ ۲۵، ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۳ء) میں لکھتے ہیں:-

ترکی تخلص، ترک علی شاہ نام گمنام، ایں فقیر سراپا مصنف تذکرہ نمی خواستم کہ چوں تذکرہ نویسان دیگر ہمہ تذکرہ از اشعار و احوال خویش سیاہ کنم لیکن بعض احباب مجبور کردند، بناچار سرگذشت خود کم وبیش بقلم می آرم۔ مگر تاہم می ترسم کہ خانہ نشیناں کہ قدم خویش از کنج عزلت بیروں نہ گذاشتہ خواہند گفت

ع- جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

سلسلۂ ایں فقیر بچند واسطہ بفردوسی طوسی می رسد۔ جد من آباداں نام با نادرشاہ از ہرات آمدہ رخت اقامت درلاہور انداخت و بعدازاں درعہد سکھان والد من درشہر نور محل کہ از مضافات لاہور است قیام پذیر شد۔ والدۂ ماجدۂ فقیر صبیۂ سردار نور محمد ہدایت است سخن در پارسی می زدند۔ وبعدازاں کم کم در پنجابی ہم حرف زدن آموخت۔ ازیں باعث زبان پارسیم مادری است۔"

فارسی کے علاوہ ترکی اردو میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اور ریختہ میں میر علی اوسط رشک سے تلمذ تھا۔ ترکی خود کچھ نہ تھے، مگر شاعر ضرور تھے۔ ہزاروں کو شاعر بنا دیا۔ گرامی ان کے سالے تھے، اس لئے ترکی نے گرامی کی پرورش پرداخت کی، لکھایا پڑھایا اور شاعر بنا کر چھوڑا اور خود حیدرآباد پہنچ گئے اور یہاں بھی گرامی کو تنگ کرتے رہے۔

اردو کے مشہور ادیب تمکین کاظمی کے والد مرحوم سید منتخب الدین نام تخلص تجلی اپنا فارسی کلام

ترکی ہی کو دکھایا کرتے تھے اور ترکی سے بڑے پرخلوص مراسم تھے۔ تمکین کاظمی کہتے ہیں کہ ''میں نے ترکی کی گود میں کھیل کود کر ہوش سنبھالا ہے اور بعض عادتیں ترکی کی پائی ہیں۔ چنانچہ اعتراض کرنا ترکی ہی نے مجھے سکھایا تھا اور میرے نام سے اعتراض کر کے مجھے پٹوایا کرتے تھے۔ (نقوش شخصیات نمبر صفحہ ۱۲۴۵ تمکین کاظمی)

امجد حیدر آبادی حیدر آباد کے مشہور اور ہندوستان کے واحد رباعی گو شاعر تھے۔ وہ ترکی کے شاگرد تھے۔ ان کی قابلیت اور شہرت ترکی کو برداشت نہ ہو سکی۔ اور انہیں اپنی شاگردی سے خارج کر دیا۔ ''سخنوران چشم دیدہ'' میں لکھتے ہیں:-

''امجد تخلص، احمد حسین نام، حیدر آبادی، سی سال عمر دارد۔ قدرے از عربی و فارسی بہرہ یافتہ بہ تلامذۂ فقیر مسلک شدہ بر شعر خود در چندروز نازیدن و باہر کسے پیچیدن آغاز کرد۔ لہٰذا اورا از آمدن منع کردم۔''

ترکی اساتذۂ عجم کو بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں اردو قطعہ پڑھا۔ جس کے چند شعر یہ ہیں۔

میری نظر میں ذرہ سے کم ہے کلام مہر ۔۔۔ شاہد مرے سخن کا ہے خورشید خاوری

اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گذر گئے ۔۔۔ سعدیؔ و انوریؔ و دقیقیؔ و رودکیؔ

ورنہ دکھا کے رنگ طراز سخن انہیں ۔۔۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی ان کی بھی سن لیتا پارسی

ترکی اوائل میں غلامیؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کے دواوین میں دونوں تخلص ملتے ہیں۔

نام شدہ زیں دو نام ۔۔۔ ترکی است یکے دگر غلامیؔ

سلامیؔ شاعر ولد غلامیؔ شاعر کی ہجو میں لکھتے ہیں۔

گر غلامیؔ شدی تخلص من

پدرت گشتمی بہ مجبوری

ترکی کے ایک قلمی دیوان (صفحہ ۲۴۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ غلام قادر گرامیؔ ترکی کے شاگرد تھے۔ اور بعد میں گرامیؔ نے شاگردی سے انحراف کیا۔ دیوان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گرامیؔ ترکیؔ کا تخلص کاٹ کر ان کے اشعار اپنے تخلص سے دیوان میں جمع کرتے تھے۔ صفحہ ۲۴۱ (دیوان ترکی) میں یہ عنوان ہے:-

''ہجو گرامیؔ شاعرے کہ از شاگردی منحرف شدہ بود''

گرامی گر چہ می خواند بہر محفل کلام من ۔۔۔ بخواند لیک نام خویشتن در جائے نام من

غلامیؔ چوں بدش گویم کہ آں تلمیذ نیک اختر ۔۔۔ بخواند گر چہ نام من مگر خواند کلام من

ولہ۔ بہر مقطع کنوں ترکی تخلص کن غلامیؔ را ۔۔۔ کہ جائے سرقۂ خاطر خواہ باشد گرامیؔ را

ولہ۔ گرامی را چناں انکار از شاگردیم باشد ۔۔۔ کہ چوں ترکی بود ابلیس را از سجدۂ آدم

گرامی عاری دارد چناں از رشتہ ام ترکی	کہ باکس ہم نمی گوید زن ترکیست ہمشیرم
ولہ۔ گر گرامی زیباضم در مضمون برداشت	چیست غم تشنہ لبے قطرہ زجیحوں برداشت
وارث حضرت شیداست گرامی امروز	از بیاضم ہمہ تا معنی موزوں برداشت

(شیدا۔ نام شاعر کہ سارق بود)

ترکی اردو اور فارسی میں درجنوں کتابوں کے مصنف تھے۔

(۲) منشی غلام محمد خادم۔ مشہور شاعر، ادیب اور مورخ محمد الدین فوق (م۔۱۹۴۵ء) کے حقیقی چچا تھے۔۱۸۶۴ء میں بمقام گھڑتل (سیالکوٹ) پیدا ہوئے۔ خادم ابتدا میں سوختہ تخلص کرتے تھے۔

میں سوختہ ہوں شعر ہے میرا جلا بھنا
می خوار و میکدہ کو یہ آتش لگائے گا

۱۸۸۸ء کے اواخر میں سوختہ کو خادم میں بدل دیا۔ خادم کا آبائی وطن ہردوشیوہ کشمیر تھا۔ ۱۹۰۸ء میں آپ مولانا محمد علی، شوکت علی سے رامپور میں ملے۔ اور خان بہادر شیخ محمد مقبول حسین مشیر مال مرحوم کشمیر، سید جالب مرحوم اور حسرت موہانی سے لکھنؤ میں ملے۔۱۹۱۲ء کے اجلاس میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ میں آپ کشمیر کی طرف سے بطور ڈیلی گیٹ شامل ہوئے۔ آپ نے وہاں تعلیم مسلمانان کشمیر کے متعلق ایک دل ہلانے والی تقریر کی۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں بصدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خان کشمیر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی خدمت میں ایک وفد پیش ہوا۔ خادم نے کشمیر کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اور خوبیوں کے علاوہ خادم کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ آپ کا انتقال دسمبر ۱۹۳۸ء کے تیسرے ہفتے میں کوٹ غلام محمد میں ہوا۔ سیماب اکبر آبادی نے تاریخ کہی۔

آں غلام محمد عربی	باد مشہور در جہاں خادم
روز سہ شنبہ بدنہم ذی الحجہ	شدہ راہی سوئے جناں خادم
مقصدش بود خدمت کشمیر	تابہ پنجاب داد جاں خادم

سال جستم ز ہاتف اے سیماب
گفت ''فردوس آشیاں خادم'' (تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم صفحہ ۴۱۲)

(۳) ''مسٹر مالاباری ۱۸۵۹ء میں بہ مقام بڑودہ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد یہاں کے معمولی کلرک تھے۔ آپ ابھی کمسن تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ مالاباری کی والدہ کے قریبی رشتہ داروں میں ایک شخص میرواں جی تھا اس نے انہیں متبنیٰ بنالیا۔ ۱۵ سال کی عمر میں مالاباری بمبئی گئے اور مدرس کی حیثیت

سے معاش پیدا کرنے لگے۔ مدرسی کے بعد آپ بیس سال تک انڈین اسپیکٹر (Indian spectator) کے ایڈیٹر رہے۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی انگریزی میں جاری کیا۔ غرض مالاباری نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ سماجی کارکن اور اعلیٰ پایہ کے صحافی بھی تھے۔ ان کا انتقال شملہ میں ۱۱ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ہوا۔'' (ادیب الہ آباد بابت اگست ۱۹۱۲ء ایڈیٹر پیارے لال شاکر)

(۴) ''شاعر'' اقبال نمبر بمبئی ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ ''اکبری اقبال میں شامل ظریفانہ کلام'' انجمن حمایت اسلام کے ۲۹ویں سالانہ جلسے میں پڑھا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق کے مطابق ۲۹واں سالانہ جلسہ فروری یا مارچ ۱۹۱۴ء میں منعقد ہوا ہوگا۔ (مقالہ رگڑ یا اکبری اقبال اور بانگ درا کا بیشتر ظریفانہ کلام رسالہ ''زمانہ'' کانپور جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اکبری اقبال ۱۹۱۸ء کا اولین ماخذ رسالہ زمانہ کانپور کا یہی شمارہ ہے۔) ڈاکٹر گیان چند جین وغیرہ نے زمانہ بابت جولائی ۱۹۱۴ء دیکھا ہی نہیں۔ میرے پاس زمانہ کا یہ شمارہ موجود ہے۔ اس میں نظم رگڑ کا ایک شعر بھی موجود نہیں ہے۔ دراصل ''اکبری اقبال'' کا کتابچہ پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کتابچہ میرے پاس موجود ہے اور یہ ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۳ سے ۸ تک خواجہ حسن نظامی کی تمہید درج ذیل الفاظ میں موجود ہے:-

''تمہید از قلم حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی''

۷۸۶ ھوالکل یا معین

''لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں۔ جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ-ڈی ہے۔ وہ شعر گاتے ہیں اور شعر بجاتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا کر لیتے ہیں۔

میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں۔ ورنہ میں اقبال کو پیکر خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں۔ مگر ان کی بشریت فقط ان کی بیوی، بچوں یا ان کے لئے مبارک ہو جو ان کو گورا چٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی۔ سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ یورپین اقبال کو بھی دیکھا اور لندنی کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیات ابدی کے نشان ہیں۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ

جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔

برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں۔ مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رلاتا ہے۔

اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اُن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھکر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلے سمجھکر قربان ہونے آتے ہیں۔

اقبال ہمیشہ آسمان پر اڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آتا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور رہوتی ہے۔ اس لئے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں۔

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہیں۔ جن کا نام اکبر ہے۔ جو الہ آباد میں بیٹھکر اللہ کی آبادیاں بساتے ہیں۔ اکبر کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے۔ اکثر اشارات ربانی کے حامل ہیں۔ اکبر کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے۔ پھر قلم سے لکھواتا ہے۔ اکبر کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے۔ ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبر نے اس دھوپ میں بال سفید کئے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا باغ حساب کر دیا۔ اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبری اقبال ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دیکھئے ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے۔ ہندوستان کی بے قراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے کے لئے راستہ نہ ہو۔ اکبر و اقبال کا ابتداء سے یہی شیوہ رہا ہے۔ مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم میں جو منشی مرغوب رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوتی ہے اقبال نے اکبری نقش پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکچر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکرائیں گی، سواریوں کو چکر آئیں گے، بادل اٹھیں گے، اور زمین پر مینہ برسائیں گے۔ فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ

یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ "اکبری اقبال" میں کل پچاس شعر ہیں۔ اور ان میں سے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کوئی شعر زمانہ کا نپور بابت جولائی ۱۹۱۴ء میں نہیں ہے۔

لوگوں نے اصل میں "اکبری اقبال" کا پہلا ایڈیشن دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:-

"اکبری اقبال" مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا، لاہور / جس کو مینجر مرغوب ایجنسی لاہور نے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں طبع کرایا۔ قیمت ۳"

دراصل اقبال نے یہ نظم اپریل ۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور میں پڑھی تھی۔ اردو کے مشہور ادیب مرزا سلطان احمد (م-۱۹۳۱ء) نے اقبال کی نظم (اکبری اقبال پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا جو بعد میں شائع ہوا تھا۔ مخزن کا یہ شمارہ نادرالوجود ہے۔ لیکن میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ مضمون ہم نے کہیں درج کیا ہے۔ یہاں موقعہ کی مناسبت سے ایک ضروری اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"گذشتہ جلسہ سالانہ انجمن حمایت اسلام پر ہمارے کامیاب اور نامور شاعر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لا نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا کچھ حصہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۴ء کے زمیندار میں شائع ہوا ہے۔ اس نظم کی نسبت پنجاب کے بعض اخبارات میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے۔

(الف) یہ نظم حضرت اکبرالہ آبادی بالقابہ کے رنگ میں کہی گئی ہے۔

(ب) اس نظم کے بعض اشعار فقط اقبالی رنگ سے نکل گئے ہیں۔ ہم نے نظم زیر بحث کو پڑھا ہے۔ ہماری رائے میں حضرت اقبال کی شاعری پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔ اول تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اشعار میں اکبری رنگ کیا کچھ آگیا۔ اور اگر آ بھی گیا تو اس سے کیا قباحت پیش آگئی۔ خود حضرت اکبر کے اشعار میں سے ہم ایک نہیں بہت سے اشعار پیش کر سکتے ہیں جو حضرت غالب اور اقبال کے رنگ میں کہے گئے۔......"

دراصل اقبال کی متعدد نظمیں الگ الگ کتابچوں میں جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ نظمیں "مجلد مجموعہ کلام اقبال" کے عنوان سے شائع ہوئی تھیں۔ اس کا اشتہار "البلاغ" کلکتہ مورخہ یکم جولائی ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۴ میں چھپا تھا۔ قیمت اٹھارہ آنے۔ اقبال کی چند نظموں کے اولین ایڈیشن سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

ترانہ و مکمل ترانہ۔ فریاد امت، اکبری اقبال، طلوع اسلام و نالۂ یتیم

(۱) تصویر درد و بلال (مکمل ترانہ) مصنفہ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے پی ایچ۔ڈی بیرسٹرایٹ لاء لاہور۔ مرغوب ایجنسی لاہور کے لئے کپور آرٹ ورکس لاہور میں چھپ کر شائع ہوا، بار سوم۔ ملنے کا پتہ: مرغوب ایجنسی لاہور قیمت ۲ کتابچہ میں ترانہ (مسلمان بچوں کا قومی گیت) ''چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا'' (۱۱شعر) صفحہ ۱تا ۶

(۲) مسلمان بچوں کا ملکی گیت۔ع۔چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا، ۵ بند (صفحہ ۷تا۱۱)

(۳) مسلمان بچوں کا ملکی گیت۔ع۔سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ۹شعر (صفحہ ۱۲تا۱۶)

۲۔فریاد امت۔صفحہ ۱تا ۲۴۔ابتداء میں ذیل کی عبارت درج ہے:۔

''یہ وہ مقبول نظم ہے جو جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے قریباً ۱۳سال ہوئے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں (تخیلاً بآستانہ سرور کائنات خلاصۂ موجودات) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں (ابر گہربار کے عنوان سے) پڑھی تھی۔ازاں بعد ۱۹۱۳ء میں (باجازت مصنف) فریاد امت کے نام سے تقطیع ہذا پر چھاپ دی گئی۔''

پہلا شعر:

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔ قیمت ۳ر

۳۔اکبری اقبال (اس کے بارے میں تفصیلات اوپر دی گئی ہیں) ۳ر

۴۔طلوع اسلام: جو ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اڑتیسویں سالانہ جلسہ میں پڑھی/ بفرمائش/ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور/ باہتمام/ امیر امیر بخش کریمی پریس لاہور میں چھپی۔طبع اول ۱۹۲۳ء، قیمت ۴ر کل صفحات ۱۶

۵۔نالۂ یتیم: یعنی وہ درد انگیز نظم/ جو/ ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی/ بیرسٹرایٹ لاء لاہور نے/ انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی/ جسے مصنف موصوف کی اجازت سے/ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندروں لاہوری دروازہ لاہور نے/ کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر امیر بخش پرنٹر چھپوایا۔'' قیمت ۲ر کل صفحات ۱۷

۶۔تصویر درد: یہ اسم بامسمّٰی نظم جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی بیرسٹرایٹ لاء، لاہور نے انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔نظم واقعی قومی درد کی تصویر ہے جو

قومی مصور نے اپنے تخیل کے خداداد برش سے مُو بہ مُو کھینچ دکھائی اور باریک بین نظروں نے داد دی۔''

پہلا شعر۔ نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

۷- بلال: از جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب/ایم-اے، پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لاء باہتمام اسحاق علی علوی، درالناظر پریس واقع لکھنؤ طبع گردید۔ ۱۹۱۹ء، ۱۰ اشعر، ۸ صفحات

پہلا شعر۔ لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
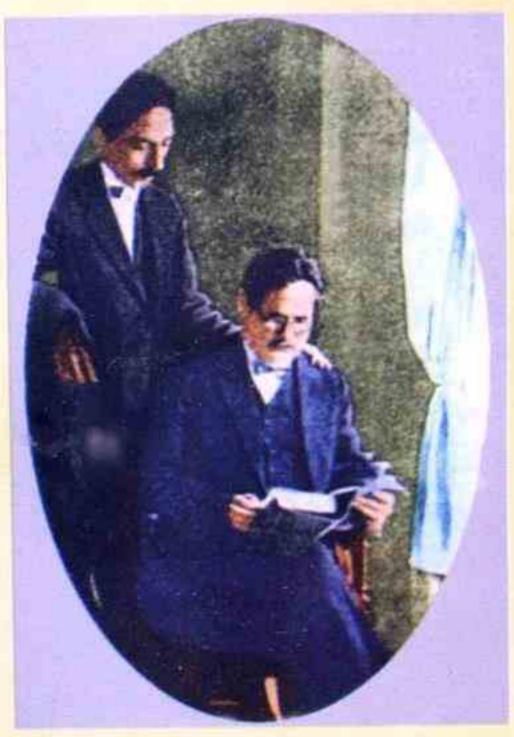
ڈاکٹر سر محمد اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان

A VOICE FROM THE EAST

(THE POETRY OF IQBAL)

ZULFIQAR ALI KHAN

KT. C.S.I. OF MALERKOTLA

FOREWORD BY

UMRAO SINGH

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ
(اقبال)

A VOICE FROM THE EAST

OF

THE POETRY OF IQBAL

BY

ZULFIQAR ALI KHAN KT.C.S.I OF MALER KOTLA.
VICE CHAIR OF THE COUNSIL OF STATE, INDIA
FELLOW OF THE PUNJAB UNIVERSITY, VICE
PRESIDENT OF THE PUNJAB HISTORICAL SOCIETY,
PRESIDENT, ANJUMAN-I-HIMAIT-I- ISLAM,
LAHORE: AND AUTHOR OF SHERSHAHSURI AND
MAHARAJAH RANJIT SINGH

1922
LAHORE
THE MERCANTILE ELECTRIC PRESS RY. ROAD
PRICE RUPEE ONE.

A VOICE FROM THE EAST

OR

THE POETRY OF IQBAL

BY

ZULFIQAR ALI KHAN, KT., C.S.I., OF MALERKOTLA,
Vice-Chairman of the Council of State, India; Fellow of the Punjab University; Vice-President of the Punjab Historical Society; President, Anjuman-i-Himayat-i-Islam, Lahore; and Author of the Lives of Sher Shah, Sur, and Maharajah Ranjit Singh.

1922

Lahore:

The Mercantile Electric Press, Ry. Road.
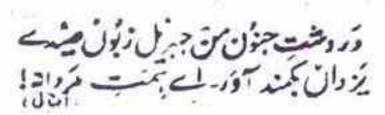
Price Rupee one

Facsimile of the 1922 edition

FOREWORD

SIR ZULFIQAR has tried in this paper to throw some light on the springs of Iqbal's genius as a poet and a thinker, who through his powerful expression draws the attention of the world to those constructive principles which underlie religion—Islam in this case particularly. To try to fathom the depths of genius is a profitable task for the individual, but as hopeless as fathoming nature. Unlike the platitudes of the common mind it does not yield to anyone, but presents a vista of vision which unfolds with the progress of the race. The poet writes not for the past or even the present, but for the coming age, and therein lies the possibility of his partial or fuller achievement. We skim the surface of the deep and take our fill.

To speak of the real value of Iqbal's poetry would be to scandalise the current notions. To do this with some restraint of enthusiasm is difficult but necessary. So far as his aesthetic value is concerned, for those who are endowed with some refined feeling for the charm of real beauty and harmony of words which have at the same time something to convey, touch with Iqbal's verse can be likened to one thing only, the feeling of sublimated and purified love. It is akin to reading the highest masters of Persian verse. Besides, his verse contains the concentrated mass of thought which characterises other masters of Persian verse who do not possess the aesthetic charm developed to that degree as we find for example in Hafiz. He combines idea with beauty of expression which one hardly finds in his precursors who represent either one or other quality in its excellence but who lack necessarily that something modern which pre-eminently belongs to him.

As to the constructive idea which he has tried to represent in his longer Persian poems, it is an attempt, and a very legitimate one, to prevent the premature broadening of the mystic sense of religious feeling which leads to seeming toleration but hides indifference towards duty, and neutralises and destroys the function of religion by trying to pour into unworthy vessels the elixir of experience which they cannot possibly contain. Men talk and profess things which they do not understand, and thus misinterpret, leading to chaos and decay and absence of that strength which characterises real faith and belief based on living experience, and thus help the disintegration of the social organism which religious feeling alone can hold together and help forward to progress. In this, his work is akin to that which the *Bhagawad Gita* essayed to accomplish for Brahminism, and which consisted in the application of the religio-philosophic idea to the maintenance and progress of human society from which it had been divorced and the neglect of which resulted in its disintegration. What looks like a narrowing tendency in these later poems is nothing but an attempt at wedding together of these two and bringing about a legitimate union between them. The poet had foreseen long ago the chaos which materialism has engendered in Europe and the world, but

which at first seemed to be the forerunner of progress. He aims at eliminating the weakness of undefined mysticism on the one hand and the still worse disintegrating tendency of materialism on the other. Read in this sense, as it seems to me these poems are meant, they are of universal application, thouth apparently addressed merely to the Islamic world.

While reading one of these poems with the poet, I have been struck with the wealth and terseness of constructive ideas which escape one in a cursory reading due to the association of the words with their older significance. He is enriching the content of idea in the words which his poetical genius has so appropriately selected for their phonetic harmony, in a manner which reveals the truly creative nature of his work. The future ages will read more sense into these words and expressions as we find in other languages which have not remained stationary, and the future generations will understand him better than we do now. In this consists the value of his work as a man who has ploughed up the soil of race ideas in their language, adding fresher significance to words, as we find in the works of F.W. Bain who has enriched the content of word and phrase in the English language by adding to them the significance of classic India which they hitherto lacked. With the same grace and absence of awkwardness Iqbal has been handling the Persian and Urdu tongues.

The word-harmony and beauty of a Hafiz is wedded to the wealth and terseness of a Rumi, which had a happy combination in Saadi, but this is more for the fact of its modernism. And yet Saadi does not touch Hafiz aesthetically, which Iqbal seems surely to do in the ode; and though in the more serious style of the longer poems the aesthetic level cannot be naturally kept up to his odes, in Iqbal you find a Rumi soaring above the halting and laboured style of the latter in which beauty does not keep pace with ideas, and where a certain amount of word-padding is to be found which one so happily misses in Iqbal. This is a thing which no translation can show in the case of Iqbal or any real poet—while the translations from the mediocre poets will sometimes sound better than the original—for, as has become a truism, only a poet can translate a poet, and that is hardly ever necessary.

Often at the house of my friend Sir Zulfiqar have I seen Iqbal enveloped in that blue haze which has become the accompaniment of the genial and magnetic atmosphere thrilling with subtle poetic vibrations which require no stretch of imagination to feel. Converse at such times has ceased through the touch of that spirit which precedes his song. There must be some dull spirits who would remain unaffected, but I find it hard to imagine any existing at such times. The pure and sparkling ambrosia of the gods flows and is demanded again and again, and one feels a wish to share it with other kindred spirits. Partly from these impulses and partly from a desire to light up, though momentarily, an edifice which seldom sees unconventional lights, arose the impulse to write this paper in the breast of my friend, and it may be hoped that though some windows may be closed still, this glow might get in through different chinks, "and steal in through another way," as Hafiz says. The other day I found one of his verses inscribed in a most unexpected place,

and no mean street wall too. I could not help smiling at the ways of life, and I hope I have not smiled for the last time in this matter. All credit to my friend. In the present instance the labour has been strenuous and prolonged, though no burden, I am sure. "The inebriate camel carries lightly," as Saadi says, and still more so on the way to Hijaz, as in this instance. And this to my mind symbolises the work, with its poetical wine and the direction to which the caravan happens to be moving.

UMRAO SINGH SHER GIL

Simla:
15 May 1922

AUTHOR'S PREFACE

MY chief object in writing this brief review of some poems written by Muhammad Iqbal of Lahore is to unveil his charming personality to the gaze of Europe and America. His extreme modesty in refusing permission to publish his poems has not allowed his fascinating muse to enter the penetralia of Western mind. That one of India's worthiest sons possessing a force of intellect which has initiated potential movements in the world of thought should have so long remained unknown to the world outside the continent of India is a distinct and positive loss to the progress of civilisation. If the Peacock Throne is the pride of Persia, and the lustrous Koh-i-Noor the glory of the British Crown, Iqbal would surely adorn the court of the muses in any country. The spirit of his thought constitutes the evangel of the future, especially for disintegrated societies. It lays the foundations of the renewed greatness of demoralised peoples. He comes therefore with an elixir for exhausted nations and a warning for aggressive Imperialism. As a Moslem poet his belief in the illimitable resources of human nature is such that he gives the tidings of boundless development of the individual. The human soul being an atom of energy is according to his philosophy capable of widest expansion, provided it loyally submits to a moral discipline which he expounds in his Persian poems.

His poems have profoundly stirred the soul of the people in India. The entire nation had lapsed into deep slumber, and there seemed little left to labour on behalf of moral progress. For several decades a contempt for religion was, in the circles of highest culture, regarded as an almost essential index of the liberal mind. It is not easy to explain how the soul of the nation had decayed under the influence of self-seeking pettimindedness. The poet awakened lofty feelings, aroused pride in the motherland, and set the people dreaming about the greatness of their destiny. The youth of the country realised that paltriness was the grave of all greatness. They like the poet determined not to adapt themselves to the world, but to mould the world in accordance with their own will.

In conclusion I wish to acknowledge with sincere admiration and affection the work of translation of Urdu poems which my friend Sardar Umrao Singh did for me. Quotations from the Persian poem *Asrar-i-Khudi* are taken from Dr. Nicholson's translation of that poem.

I am sensible of numerous defects in the treatment of this literary subject, but I hope that my venture will encourage a true scholar to accomplish what I have only essayed as a novice.

ZULFIQAR ALI KHAN

Lahore:
19 May 1922

CONTENTS

Introduction, iii
Foreword by Umrao Singh Sher Gil, v
Author's Preface, viii

The Period of Decadence, 3
The Dawn of Indian Renaissance, 6
Iqbal's Early Days, 7
His Studies in Europe, 9
Selections from His Poems, 17
His Great Work, 29

A VOICE FROM THE EAST

[THE POETRY OF IQBAL]

Iqbal with the Author of the book
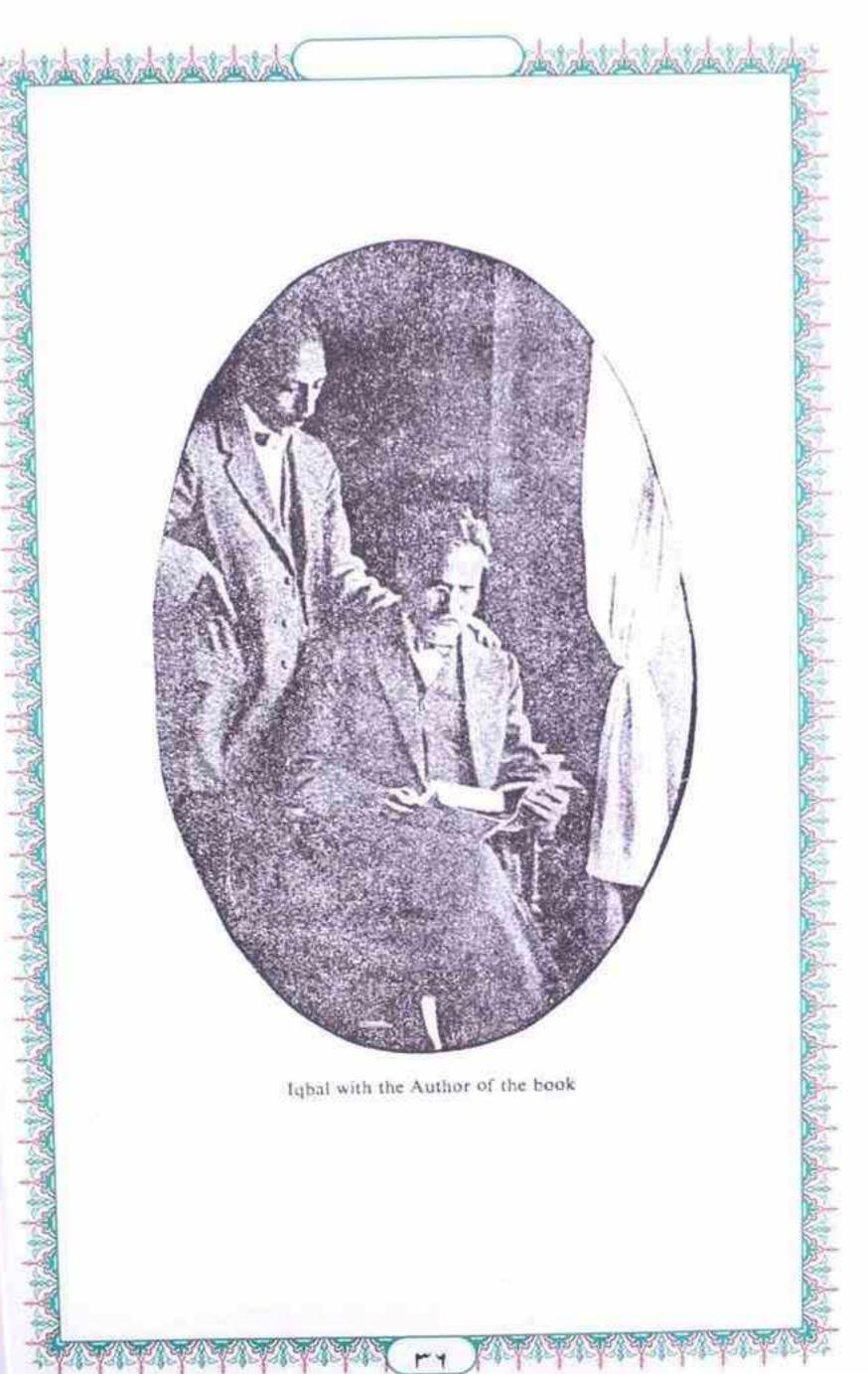
THE PERIOD OF DECADENCE

NATIONS, like individuals, have to endure periods of sterility, during which everything goes wrong. Such an epoch arrived for the disintegrated world of India after the death of Aurangzeb, so that it became hardly possible to recognise this country which had formerly abounded in men of first-class talent. Indian poetry for a long time to come volatilised almost exclusively in unctuous flatteries of the ephemeral personalities who appeared on the slippery stage of Indian politics. The depraved tastes of the *rois faineant* of Delhi and Lucknow created a saturnalia of poetic immorality and hastened the departure of the muses. Added to this was the horror of mutual strife and struggle which completed the destruction of the noble and high-minded men of this storm-tossed country. With moral degeneracy came also intellectual paralysis and henceforth we find India plunged in deep slumber. Everyone who breathed this atmosphere became infected with drowsiness. In an age affected with these morbid inanities, it was inevitable that imaginative literature should run wild. Nobility of form was replaced by an affected, pretentious and yet essentially corrupt style; a crude and lifeless scurrility usurped the throne of art. Everything sacred to Indian hearts was defiled by the literary pedants of the day. An incredible wealth of commonplaces and trivialities was brought to the market in the shape of erotic verse which displayed the mental poverty characteristic of decadence. True poetry no longer maintained its dominance in the realm of the spirit, and verse-writing became an elegant method of killing time. It is pleasant, however, to record that the land of poesy was not entirely submerged. A few peaks were still visible above the surface of the flood tide. The poets Mir and Ghalib, though they sang of the witcheries of entracing maidens, yet displayed an originality and freshness which even in these days of revolutionised taste appeal to the connoisseurs. The almost exhausted themes of the love-stricken souls, the blushing roses and the doting nightingales are treated with creative energy and possess a beauty which captivates the reader. Ghalib infused into poetry something new in tone, in feeling, in emotional expression. He was undoubtedly an artist whose brain and heart were both great. Urdu literature is enriched by the magic of his touch, and amid numberless noisy mediocrities he is the only one who has produced poetry of permanent value. But this was an occasional gleam and, apart from this solitary instance, it was sad to reflect that no longer was poesy to illuminate life by its ideals, but life,

with its finite aim and ephemeral caprices, was to dominate poesy. Consequently, the writings of this period passed into utter oblivion as soon as the society of a new age came into being.

After the establishment of British rule in India there began a period of dull repose, poor in great events, but rich in work and tranquil prosperity, a period in which the entire political life of the nation for nearly a century sank into profound slumber not to be disturbed without severe shocks. This serenity of political weather was utilised by the wisdom of the Royal officialdom in the work of organising the administration which gave promise of weighty consequences. Never in recent history has a great power had such difficult administrative problems to solve, but a crowd of officials of exceptional ability achieved wonderful results. By inaugurating a system of education on Western lines they thoroughly prepared the soil for a mighty transformation. It opened a new era of political opinion in India. It set the people yearning for a new heaven and a new earth. The nation arose phoenix-like from its ashes to reclaim its rights. The liberal tendencies of Western literature manifested themselves in the emancipation of the spirit overlaid with the dust of centuries. These were the tributary fountains that, as time went on, swelled into the broad confluence of our own times. The benumbed East was awakened to new life and its eyes were turned towards different ideals. How great is the debt of India to the thinkers and writers of the West I need not here dwell upon at great length, though its interest is not negligible. It is circumstance that inspires and moulds the thought. This glowing life, this world in resurrection received its impetus from the force of character of men who lighted their votive candles at the shrine of learning at different centres in India. (I will deal with one only in a brief manner.) Sir Syed Ahmad Khan was one of those solitary geniuses who are capable of awakening and elevating their nation by means of creative ideas. He, with a band of devoted friends who possessed the fire of joyful enthusiasm, started a small school at Aligarh for the education of Moslem boys. This was a veritable sanctuary of peace and faith from which radiated light in all directions. He himself occupied a simple hospitable home where a lively, at times too lively, society would assemble round the festive board. His happiest moments were those wherein, intoxicating and intoxicated, he could in inspired language give free issue to the flow of his thoughts and his feelings. The bewitching conversationist at the close of a laborious day would entertain the company with brilliant observations, ancedotes of early days and mischievous jokes far into the night. Nazir Ahmad, the eminent Oriental scholar and orator, Mohsanul Mulk, the talented and accomplished nobleman, Zakaullah, the famous mathematician, and Altaf Husain Hali, the national poet, and others were some of the representatives

of a fast vanishing literary epoch who formed the circle round the magnetic figure of the old Syed. These lifelong friends gathered in the modest rose-garlanded house, and in animated conversation would institute comparisons between the glorious past and the forlorn present. They matured plans for the regeneration of their fallen people. They travelled in various provinces addressing monster meetings and moving audiences to tears by the fire of their eloquence. The old Syed, unable to control his emotion, would sob like a child when he drew the sad picture of the lamentable condition of his people. The contrast between what is and what might have been is itself, as Dante teaches in a certain immortal verse, the greatest of all sorrows. The grief of the people on such occasions knew no bounds when they realised the extent of their melancholy destiny. Their spirit received a terrible shaking and burst the chains which the bigotry of the orthodox Mullas entwined round it and kept it in thraldom. An enthusiasm that was ardent and brimful of hope rejuvenated even the elderly. This movement towards Western education gathered a momentum which carried the whole people with it. It has invariably happened that in epochs of great transformation, at the right moment, the creative energy of history called forth the right men. These wonder-workers knew the vital need of the moment. They infused enthusiasm in the students, and delight in learning became the dominant impulse. Many of us can still recollect the first fervour for studies in India. A delirium seized the people. The youth went in groups singing songs from Tennyson, Byron and Shakespeare. As it was in Europe at the time of the revival of learning, men killed themselves by overstudy, so also in India young men in these days studied too hard and tried to do even more than they could do. This was the poesy of life, and the blossoming of the yearnings of earnest souls. The portly figure of the old Syed seemed triumphantly to hold in its hands the keys wherewith he opened the floodgates of a new life. But how many were the struggles through which his ardent spirit had at length fought down the old prejudice and repugnance towards all public activities, to wield in the end a great influence over the nation. How many defections of friends, how many disillusionments elaborately concealed by his keen wit, had to be endured before his richly endowed personality could set the stagnant current of Indian life in effective motion. We have now crossed the threshold with closed eyes. A new world lies before us but hidden by a thick veil not yet lifted. The spirit within, though partially liberated, clamours for unrestricted freedom. The future is pregnant with possibilities. The old society is overthrown; we gaze with grateful feelings towards departing shades. The old world with its polished manners and urbanity and tranquil ways had endeared itself to us; at any rate, it had become a second nature. To wrench ourselves from it is painful.

Why ?—because the future is uncertain and the armour, we have put on, pricks the sensitive flesh at several places, but the die is cast and there is no turning back now to clutch at incorporeal shadows. These have rolled back leaving us to face the temptations of the Siren song of the unknown. Fresh breezes have already begun to blow and our drooping spirit receives the exhilarating vigour of a new wine. We are impelled by mysterious forces to march forward. The changed outlook and the materialistic influence of new education bring into existence a blatant and aspiring bourgeoisie with its intense industry, its arrogant egotism and its pharisaical hardness of heart. After a formidable social and literary revolution, after the destruction of all the traditional ideas and forms of society, there remains nothing for this generation but the comparative liberty of the individual, which after all creates nothing new. Ignorance is replaced by scepticism yet more disastrous, by a condition of spiritual anarchy, wherein everyone believes himself to know everything. Religion is openly scoffed at, and moral restraint is superseded by a fugitive fear of the laws enacted by new rulers. Western manners, dress and slavish aping of forms of speech, come into vogue which scandalise the few survivors of the old school who continued to preserve a kernel of sound religious belief.

THE DAWN OF INDIAN RENAISSANCE

Epochs of literary struggle are rarely favourable to love-poetry, and therefore it was difficult to protect this quiet flower-garden of poesy from the keen winds of the day. The fermenting ideas of this age gave rise to a singer who came with a moralising muse. Hali, the national poet *par excellence*, appeared on the scene at this juncture with a work (*Musaddas*) which thrilled everyone. For the first time, now, did the life of ancient Moslems become personally, directly and vividly comprehensible to the philistines. In this poem Hali depicts the magnificent Islamic idealism which had illumined the days of the first age of Islam. He compares with inexpressible pathos that great age with the present forlorn state of the Moslem world. In so proud a nation as the Moslems, the comparison between the great past and the petty present could not fail to arouse painful feelings. But the absolute impossibility of winning back the lost glory was plain to all men's sight without reversion to old ideals. It, however, added momentum to the vital impulse of the age for national unity which manifested itself in the check which the spirit of mockery of religion received from its stirring tones. Henceforth the reverent glances of the nation were directed towards the glory of its past achievements, and the tendency to worship the materialistic character of modern civilisation became blunted. Young men touched the hidden springs of national sensibilities when they sang in melodious strains those portions of this great poem

which described the heroic deeds of a great age in history. From the date of the wonderful popularity of Hali may be discerned the birth of the romantic movement in India.

The unanticipated development of Indian thought joyfully welcomed yet another poet when Hali ceased to write inspiring poetry. This writer of destiny was Akbar whose playful muse disclosed the secret that "Poesy and life were inseparable." If literature is the mirror of a people's soul, then Akbar truly reflects that spirit in his inimitable poems. While Hali awakened the self-consciousness of the people and promoted love for past glory, Akbar exposed with irresistible humour the seamy side of the modern civilisation. He is extremely unpretentious and yet is so severe in his opposition to the fashionable idolatries of the day, so clear in his condemnation of all vanity, artificiality and untruth. The greatest attraction of his poems lies in his kindly wit which makes even those laugh with joy on whom it inflicts the deepest wounds. Whether in the open shop of an Indian bazar or in the cultured circle of high society the recital of his verses makes everyone roar with laughter, his inexhaustible humour continues to spin golden threads around every event of the day, and it cannot be denied that in the cordiality of his mood and in the freedom of his roguish wit he is unrivalled in India. It is truly said that humour is invariably democratic, for it sweeps away all social barriers and invests the common things of life with new aspects. The increasing self-respect of the masses is reflected in these poems which induce a sense of liberation from their dull and prosaic life and administer drubbings to the high and the low alike. How true is the fact that "the real power that shapes opinion in regard to other nations and other civilisations is literature—fiction and poetry. What one people in Europe knows about another people is largely obtained, not from serious volumes of statistics, or grave history, or learned books of travel, but from the literature of that people—the literature that is an expression of its emotional life." Newspapers and journals greedily contest for the privilege of publishing in the most prominent place any fresh effusion of his radiant wit. Millions thus read his verses that touch the heart, and through the heart influence the judgment. Akbar's popularity is so wonderful that I could not pass him over lightly. No man ever gave the public so much amusement, and no one helped more forcefully the reaction which now set in against the blind worship of Western civilisation.

IQBAL'S EARLY DAYS

AKBAR's light poetry served the great purpose of nature; it prepared the national mind for the reception of a poet-philosopher whose poems produced a delirium of enthusiasm all over India, nay even outside

India. In Afghanistan, Persia and Turkey, in England, Hungary and European countries, his reputation is rapidly spreading. This poet is Dr. Muhammad Iqbal whose powerful and revitalising poems it is my chief object to interpret in this paper. As a spirit messenger he is the bearer of a new idea which illumines life with a fresh significance. The dawn of this world of different ideals has separated the epoch of conscious reflection from the epoch of unconscious creation. I think it would interest you to know something of his early life and, therefore, I would speak of Iqbal himself in a brief manner before I speak of his poems.

He was born at Sialkot about the year 1876. His family, which belonged to the middle class and inherited strong Sufistic tendencies, was held in esteem by the people. At the usual age he was sent to an ordinary school in his own town. He passed through the gamut of Indian school routine. The soul-destroying curse of examinations proved no impediment to the rapid progress which he was making in the healthy atmosphere of keen competition. In the course of his school studies he was introduced to a venerable old scholar of Oriental learning, M. Mir Hasan, who unveiled to his admiring mind the beauties of Islamic literature. The knowledge of the Arabic and Persian languages thus acquired enabled him to assimilate the works of some of the most distinguished writers among Moslems. At this early age religious study exercised a great influence in moulding his character. We all feel that a boy is a savage without religion, without tenderness, but the ideas of right and wrong are quickened within him by religious feelings. This experience came to Iqbal, and his training in this respect blossomed and bore fruit subsequently when he grew to manhood. From the very beginning he was sensitive to beauty and this aesthetic feeling very probably developed the delicate musical sensibilities of his poetic mind. All great poets in their youth have been swayed by this feeling. In fact, emotional poetry has always been written under its pleasing influence. There was nothing extraordinary in the incidents of his life at school. In Iqbal the extraordinary gift was altogether of the mind and he was one of those rare juvenile prodigies who fulfil in manhood the promise of childhood. Even at this age he charmed people by his gentle and dreamy ways. In due course when he finished his school final he transferred his residence to Lahore in order to join a college for higher studies. Here the environment was fresh and vigorous; there was cheerful succession of work and lively society. Though during his school days he had produced some elegant trifles, yet the new atmosphere afforded better scope for the exercise of his intellect, and his hitherto dormant muse receiving the stimulus of inspiration manifested its boundless possibilities. One of his finest blossoms was a verse of marvellous beauty which a contemporary poet of first rank pronounced as unique

and on being told that a youth freshly arrived in Lahore had written it, he predicted a brilliant future for the young man. You cannot possibly reproduce the delicate music of artistic perfection of words in translation but I would attempt a rendering.

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے   قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

Interpreted in English it would mean: Divine grace gathered the dew-drops of remorse from my forehead taking them to be pearls. In one sublime verse the poet depicts the angelic sanctity of a soul after its resurrection. How the divine love rejoices to see the hidden and ennobling virtue of remorse! Supremely exquisite is the analogy of drops of perspiration to pearls whose purity resembles the chastity of awakened conscience. The poetic euphony which embellishes the dignity of the human soul with incomparable vesture lays claim to be enjoyed as a free work of art. Poetic critics unanimously paid homage to this aspiring genius for this single verse which immediately found currency all over the land. Iqbal was henceforth ranked as a luminary of first magnitude in the firmament of poesy, and his muse continually marched forward towards its goal, scattering flowers on its path and creating a new emotional utterance not to be imitated. In the midst of huge and admiring audiences Iqbal could be seen standing on a dais reciting his verses in sweet tunes, which exacted boundless applause and occasioned indescribable enthusiasm. I was a witness to this scene several times when amidst a tempest of acclamation Iqbal was carried away almost fainting through effort to meet the greedy demand of the cultured audience. It is rare indeed that a young man, as yet a student, should become the idol of the people, and the first fact for you to observe is that no poet ever had such vast and sudden popularity. Not only in the Punjab but all over India, so great was his influence that it crushed all competition out of existence. Nobody else could get a hearing while Iqbal sang. Nor is this all that is to be said about him. His influence chiefly initiated the romantic movement in India. The spirit of our earlier public life, which had exhibited a trait of unaesthetic torpor of the senses under close restraint, entered once more into its right and became freer and more venturesome. Iqbal unceasingly turned his talents to the best account, and ever pursued the highest aims. It remained his glory that in his poems he held up the mirror to his age, as Goethe had done before him in *Wilhelm Meister*.

HIS STUDIES IN EUROPE

THE charm and vitality of this expansive phase soon found a remote region and an alien society for its fruitful activities, for a friendly

fortune and the selfless affection of a brother made it possible for him to undertake a journey to Europe for professional training. Thus at the most impressionable period of his life he came into close touch with some of the profoundest thinkers of Europe and, finding the amenities of intellectual life at Cambridge suitable to his quiet disposition, he settled down there to drink, so to speak, at the very font and source of learning. But boys of pronounced character have always owed far more to their private reading than to their set studies and the young Indian, while devoting his time and labour to the soul-destroying curse of examinations, was feeding his mind on the copious resources of the University library and the soul-nourishing society of eminent professors. The profitable perusal of the former and the unceasing joys of the latter proved to be a veritable "pasture of great souls" for they contributed materially towards the growth of his mental powers which revealed their many-sidedness later on in his life. During the intervals of these academic studies he found ample opportunities to visit the Continent. He spent some time at Munich to prepare his thesis on Persian philosophy. These journeys afforded him glimpses into the secrets of the Western civilisation. To an Oriental mind the restless enterprise of Europe naturally presented such a contrast to the sleepy and contemplative life of the East. His acute intelligence constantly found vast and complex problems to reflect on, which awakened thought and added to the richness and variety of his faculties. Among these world problems he observed the invigorating influence of democracy and nationality on the peoples of Europe. He also saw mammon-worship in its most potent form which issued from harsh and remorseless commercialism. He could not fail to observe that triumphant materialism waged an unrelenting war against religion and morality. The consequence, as he clearly saw, was tragic. Men lost sight of the higher aims of life and wallowed among its sordid interests. To a keen student of history like him it was quite clear that materialised society constituted a danger to moral and spiritual life, for in the mad pursuit of almighty dollar the loftiest ideals were ever knocked down from their high pedestals. The body politic could never remain in a state of vigorous health and at once ceased to exercise its beneficial influence, when in its daily functions justice was regulated by selfish motives and ethics were divorced from politics. This corruption of morals inevitably undermined the greatest empires and destroyed the harmony and confidence obtaining in international relations. This debasement of character which supervened Western civilisation brought disenchantment and Iqbal who had previously imagined that the Occident was actuated by truth and justice wrote a poem embodying a piquant protest againt the prostitution of the noble ideas of freedom and equality.

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خارزار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

[The time of unveiling has come, the Beloved will be seen by all;
That secret which was veiled by silence shall become manifest.
That cycle has gone, O cup-bearer! when they drank in hiding,
The whole world shall become a tavern, and all shall drink.
Those who wandered insane shall return to dwell in cities,
Their feet shall be naked as before, but those meadows shall be new.
The silence of Mecca has proclaimed to the expectant ears, at last;
The compact which was made with the desert-dwellers shall become once more strengthened.
The Lion which came out of the wilderness and upset the Empire of Rome,
I hear from angels that he shall awaken once more.
O dwellers of Western lands! God's world is not a shop,
That which you considered good coin shall prove to be of low value.
Your civilisation will commit suicide with its own dagger;
A nest built on a slender bough cannot last.
Even the frail petal of a rose will be made into a boat for the caravan of the despised ant,
No matter what storms and cyclones may rage, but it will safely cross the angry seas.

One day I remarked to a dove, "The liberated of this place are rooted to the earth,"
The buds made a prompt reply and said, "Surely he has discovered the secret of our rose-garden."]

This poem forms a mine of prophecies and warnings and with a wonderful clarity of vision Iqbal gives intimation of the coming events twenty years before their occurrence. Realising the instability of the present structure of the Western civilisation he boldly declares in the first two lines that hypocrisy which so long clouded the minds of the people will be seen by them and that the time has come for the world spirit to manifest itself. The secret of the present universal unrest is found in the yearning of the masses for the advent of a new spirit of righteousness and truth. This insistent call of the people has made the spirit reveal itself and is shaping new destinies for nations long suffering under unhappy conditions. This prophecy becomes still clearer in the next two lines which emphatically announce the passage of the present times in which timid people spoke in whispers. The world in this poetic metaphor is converted into a huge tavern in which the wine of new ideas will be freely dispensed and all will become intoxicated by it. The beauty of living words is very sweet and the influence on the mind is tremendous. Whether it is Ireland, Egypt, India, Persia or Russia, the people there have torn the mask from their faces and are clamouring for their rights. They glory in the privilege of suffering and sacrifice riches and repose, nay even life itself, for an idea. This wonderful resurgence of a dauntless spirit is working openly and on an unprecedented scale. History does not relate the existence in any previous age of such a colossal revolt against organised governments. Those who carefully observe the phenomenon will have no hesitation in saying that the premonition uttered by Dr. Iqbal has found a wonderful fulfilment in the prevailing conditions in these countries. The nations appear strangely drunk with enthusiasm and it seems as though the entire world is transformed into a huge tavern. The astonishing verity of the prediction added to the charm of language awakens pleasing emotions and one insensibly feels that it is something that stirs us deeply and makes us think new thoughts. A great poet only can do this.

The third and fourth lines convey stern warning to the apostles of Western civilisation which is bound to be annihilated if the cult of imperial egoism and crushing industrialism is permitted to poison the sweet serenity of life. Many talented and sober thinkers have condemned in emphatic terms this aspect of the Western civilisation but the poet's method of explaining its cause is exceedingly effective. The mad rush of the Western nations in search of markets for their manufactures has, he says, made

them treat God's world as a shop. This, he says, will not endure and the disillusionment and disappointment will in the end reveal to them that what they considered genuine coin is only counterfeit. It is undoubtedly true that the Western intellect has wrested many priceless secrets from Nature by means of those marvellous discoveries it has made in scientific knowledge, and backward nations tremble before a union of immeasurable power with unfathomable craft such as has never existed before, but with all this, "There is," says Napoleon, "but one step from triumph to a fall. I have seen that in the greatest affairs a little thing has always decided important events." This formidable force created by the modern civilisation may recoil on it and the poet in this prophetic verse predicts that the Western civilisation will commit suicide by the weapon it has forged. Matthew Arnold in his poem called "The Future" depicts the prospects of human happiness as gloomy. It seems to him that the necessities of this civilisation are turning men's minds away from noble ideas to selfish and material ambition. It seems to him that even the feeling which makes poetry must die. The tendency of the industrial civilisation undeniably is to compel men to think more about money than ever before, and less about truth and beauty and divine things. The world is becoming material in the ugliest meaning of the term. How dismal is likely to be the plight of the people before the actual tragedy is enacted, is made obvious by Mr. Rutherford, M.P., in his little brochure *Commonwealth or Empire*. "The rulers of Europe," he says, "have made and are making fools of people, as they have done many a time before—fooling with big promises and little or no performance. In times of peace the struggle for bare existence is so intense, so cruel, and so demoralising that the masses have neither the leisure nor the strength to think beyond what they shall eat and what they shall drink. Perpetual motion on the brink of poverty degrades large sections of the community into little better than dazed insects." The mystic poet Rossetti proclaimed his deeper perception of human misery in the famous lines so full of pathos :

> War that shatters her slain
> And peace that grinds them as grain.

This apparently is too detrimental to the divine scheme of things and must inevitably come to an end. The European civilisation escaped by an hair's breadth from destruction during the last Great War, and the armies were hardly demobilised when portentous activity was displayed in devising scientific and diabolical means of blasting human happiness by preparing for another war. The whole world is afflicted with a dangerous malady. Very few seem to pause and consider whither we are drifting.

The golden vision of youth and the clairvoyance of a poet priest are visible in the fifth and sixth lines. Since the affairs of the world cannot evidently be conducted on the lines of selfish and materialistic policy of the West, the ineffable divine wisdom must replace it by a more humane and just polity. A reformer or a poet of high type of genius, who is summoned by the law of nature to become the regenerator of society, realises at once by intuition that all progress is through faith and hope in something and, knowing well the strange possibilities of the human soul, announces in magic words the advent of a new world of pure and lofty ideas. He will make men appear once more upon the stage who will command and inspire national policy with new ardours, and awaken lesser spirits to a comprehension of their own powers. In the fifth line the allusion is made to the Arabs who having once performed heroic deeds in a glorious chapter of history withdrew to their desert wilderness. It was apparently a cunning design of Nature to recuperate their exhausted energies, for life in cities is demoralising and conservation of life forces is possible only when you live in a primeval state of society. These virile Arabs refertilised the played-out nations of Asia, Europe and Africa and the poet says that they will again play the same role and reconstruct the world in ruins. In the sixth line reference is made to the compact which was made with these nomad Arabs whereby the nation became transformed. The compact, the poet predicts, will be reaffirmed. The verse of the Holy Qur'an which embodies this promise by God was recited by the Prophet to the Arabs who were accepting Islam and were taking the oath of fealty to him. In those early days when only a handful of Arabs constituted the entire strength of a new religion, not even the wildest imagination could have thought it possible that those few forlorn Arabs would become the rulers of a world empire. This sublime prophecy found marvellous fulfilment in a very short time. Here is the text of this divine promise :

وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصلحٰت ليستخلفنهم
فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم ـ وليمكنن لهم دينهم الذى
ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا ـ

[God has promised to those of you who believe and do the things that are right that He will cause them to be the rulers of the earth as He made those who were before them and that He will establish for them that religion which He has chosen for them, and that after their fears He will give them security in exchange (xxiv. 55).]

History bears witness to the miraculous conquests of the Arabs. Their empire stretched from the Bay of Biscay to the walls of China and

this phenomenal success they achieved in as many years as other nations did not do even in as many centuries. That a despised nation of desert wanderers should have led the entire world in the paths of civilisation, developing science, philosophy and arts to the highest pitch, is an enigma to modern nations. But God's promise was kept. In their triumphant onrush they utterly destroyed Rome and Persia and set up their own world empire on the ruins of those once irresistible States. In the process of time they forsook what the Qur'an had said: "Be virtuous and God commands you to be scrupulously just and act in a manner that people may be grateful to you."

But the world grew older and the dream vanished. Decadence set in and the Moslem world empire was dismembered. Now when the soul of humanity is sickened unto death by the industrial civilisation, the poet two decades earlier prophesied that this compact would be strengthened and the revitalised Arabs will again issue from their inaccessible retreats in the desert equipped with the highest morality as before and inaugurate a new era of freedom, equality and justice. That the possibility of the despairing soul of man re-establishing the millennium exists as one of the sweet secrets of Nature, is expressed by Browning in one beautiful gleam of thought:

> The high that proved too high
>   The heroic for earth too hard,
> The passion that left the ground,
>   To lose itself in the sky.
> Are music sent up to God by the
>   Lover and the bard;
> Enough that he heard it once,
>   We shall hear it by and by.

The eternal power has provided the reward or penalty for every human act and thought and if you transgress this law and try to cheat it, then the divine tribunal surely intervenes and corrects the failure of human codes to give justice. This higher morality under these conditions makes even seemingly impossible things to happen, so the poet in the seventh line visualises the successful crossing of the high seas by these divinely-inspired men. Their boat may be as delicate as the tender petals of a rose and they themselves as the poor ant, but heaven's light will guide them to the haven of glory and they will surmount the barriers placed in their way by mighty rulers possessing the deadliest machines produced by modern science. These people will again start the music and the world will once more ring with forgotten melodies.

Though short, this poem possesses the extraordinary charm of providing spiritual as well as material stimulation. The witchery of artistic

language in which both form and feeling are clothed makes confidence and hope in the future penetrate the youthful dreams of all enslaved and aspiring hearts, and the surging of sentiments involuntarily challenges them to burst out in song. It is the buoyancy of the spirit thus invoked which goes to the fashioning of human destiny.

Dr. Iqbal while in England chanced to meet Dr. Nicholson at Cambridge. The conversation was so delightful that the distinguished professor felt a strong desire to meet this talented Indian again. Luck brought them together once more and the admiration felt for the brilliant young man resulted in Dr. Nicholson translating, years after Iqbal's return to India, his Persian poem *Asrar-i Khudi* into English. It is not often that Indians capture the fancy of eminent men of letters in Europe. In those days Indians were generally looked down upon by Europeans as cringing weak-willed fools. The esteem shown by Dr. Nicholson for the young poet recalls to mind the astonishment evinced by Napoleon when he saw Goethe. It reveals (as it does in this case) what had been regarded for centuries as the "German spirit." When Goethe entered the room, Napoleon, impressed by his personality, exclaimed: "Voila un homine"—that was as much as to say: "But this is a man! and I only expected to see a German." The fragrant breeze of his reputation which began to blow in England has now crossed the ocean separating the old from the new world and with an airy touch has refreshed the dainty blossoms of intellect there. Discussing the potentiality and intrinsic value of literature, Mr. Herbert Reed, an eminent American writer, in a pleasing and scholarly criticism of Iqbal's *Asrar-i Khudi* (translated by Dr. Nicholson) says, "But subject to these elucidations, this ideal of Whitman's is a critical ideal of workability, of direct use. Applying it here and now, I can think of only one living poet who in any way sustains the test, and almost necessarily he is not of our race and creed. I mean Muhammad Iqbal whose poem *Asrar-i Khudi*, 'The Secrets of the Self,' has recently been translated from the original Persian by Dr. Reynold Nicholson and published by Messrs. Macmillan. Whilst our native poetasters were rhyming to their intimate coteries about cats and corncrakes and other homely or unusual variations of a Keatsian theme, there was written and published in Lahore this poem, which, we are told, has taken by storm the younger generation of Indian Moslems. 'Iqbal,' writes one of them, 'has come amongst us as a Messiah and has stirred the dead with life.' And what catch-penny nostrum, you will ask, has thus appealed to the covetous hearts of the market place, you will then be told, as I tell you now, that no nostrum, neither of the Jingo nor of the salvationist, has wrought this wonder, but a poem that crystallises in its beauty the most essential phases of modern philosophy, making a unity of faith out of a multiplicity of ideas, a

universal inspiration out of the esoteric logic of the schools." Similar tributes of genuine praise have been paid by others equally competent to appreciate merit, but I cannot overburden my paper with quotations.

SELECTIONS FROM HIS POEMS

WHILE studying Law, Iqbal was awarded the Diploma of Doctor of Philosophy by the University of Munich in recognition of his original thesis on Persian philosophy, and in due course after having been called to the Bar he returned to India where his countrymen gave him enthusiastic reception. Though the profession of law was uncongenial to his aesthetic temperament, he had reluctantly to devove hiself to it to earn his living. This period of his career is interesting to those who value his invigorating influence on Indian life more highly than his cautious advances in the realm of law. During precious intervals between his professional work he wrote some thrilling poems which awakened the people from the torpor of centuries and breathed into them something of his own faith and hope. He thus became both the herald and the exponent of a new age. Past history and the events of our own time teach us that to slay men has ever been easier than to mould their thoughts, anew, and only true grandeur of character can defy the withering influence of an age of general corruption. But the fertility of his mind and the magic of his muse enabled Iqbal to dispel the thick fog of apathy and to create yearnings by penetrating the innermost recesses of the national heart. The force of sentiment and emotion which he so vigorously concentrates in these few lines is creative of new energies.

تصویر درد[1]

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگ وفا سب کو
کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کرکے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کرکے چھوڑوں گا

نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاک زنداں کا
کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کرکے چھوڑوں گا

1. Out of these ten verses, only five are present in the *Bang-i Dara* (p. 67). The second hemistich of the third verse has been changed into تری تاریک راتوں میں چراغاں کرکے چھوڑوں گا. The second, fourth, sixth, eighth and ninth verses are missing in the present edition of the *Bang-i Dara*.

مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کرکے چھوڑوں گا

تعصب نے مری خاک وطن میں گھر بنایا ہے
وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھرکو ویراں کرکےچھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہو تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑوں گا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نامسلماں کرکے چھوڑوں گا

اٹھا دوں گا نقاب عارض محبوب یک رنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کرکے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کرکے چھوڑوں گا

[This day I shall expose my hidden wounds,
I shall weep blood till I have turned my assembly into a garden.
I shall show to everyone what faithfulness means, O Hindustan!
For I shall not cease till I have sacrificed my life to thee.
I have to light every heart's lamp with my hidden fire;
I shall celebrate a festival of illumination in the darkness.
Not without reason in my frenzy I scatter dust in the prison home,
For I shall create an expansive desert with this dust.
So that out of it hearts full of feeling may come to life like buds,
I shall sow the handful of my dust.
Bigotry has made its home on the earth of my country;
I am that storm which shall wreck this home.
To string all these scattered beads in a single rosary,
Even if it is difficult, I am determined to accomplish it.
If to be a Moslem in these days means to quarrel with one another,
I shall convert these Moslems into non-Moslems.
I shall lift the veil from the face of the Beloved of Divine Unity,
And I shall make thee ashamed of this internal discord.
I shall show to the world what mine eyes have seen,
And I shall make thee wonder like the eye of the mirror.]

In this poem the high-minded poet speaks as a master architect of national destiny. The times are out of tune with him but as a custodian of the honour of his people he will grapple even single-handed with adverse fate and hasten the advent of a new spring-time in his country. In all ages it has been the priceless privilege of the poet to dream of restoring the current to the abandoned channel of national greatness, and Iqbal who sees the gloomy faces of his countrymen vows that he will not rest till he has wrenched the necessary concessions to the spirit of the age

even from the gods. That the experiences of these ideal forces of human soul are common to all thinking lives, is borne out by Cowper's exquisite lines :

Oh ! happy shades to me unblest,
Friendly to peace, but not to me.
How will the scene that offers rest,
And heart that cannot rest agree.

Not willing to think about life in the old simple way the poet says that to-day marks the turning point in his life and the tears of blood which he sheds must necessarily transform the place into a rose-garden. The tears of blood which signify acute mental anguish will, when scattered thick on the ground, bear the semblance of full-blown roses. We know that suffering and sacrifice build up character and bring emancipation. The fervour of a poet's soul exercises a stimulating charm on the reader, but in the translation much of its attractive beauty is lost.

It is not without difficulty to make a selection out of a collection of gems of scintillating beauty. However, I give here a poem which to my mind is fascinating in point both of form and sound. It is called "The Birth of Love." It crystallises the Oriental idea of the composition of love which is the acme of all illusive and capricious loveliness. The Greek conception of love embodied in Cupid fails to evolve the idea of its intrinsic essence and the perfection of its physical symmetry. The idea of the exquisite beauty represented even in the form of Venus does not approach more closely to it, for this also materialises the radiance of Greek imagination of female physical grace and comeliness. Iqbal elaborates the Eastern intellectual and sensuous ideal of love's inherent principles. The subtlety of his analysis combined with the elegance of diction produces feelings of joy and sweetness. All nations in their days have experienced the irresistible influence of this divine passion and they have attempted to express it in poetry, sculpture or music. The voluntary homage paid to it in all ages shows that the subject is immortal. Whether the modern singers or painters will excel the ancients in the felicity and originality of their conception is yet doubtful, but I leave it to the reader to judge of the merit of Iqbal's effort.

محبت

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دنیا
مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
سنا ہے عالم بالا پہ کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیٔ پیہم سے
پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہم دم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

[As yet the tresses of the bride of night were not familiar with their graceful curls;
And stars of heaven had tasted not the bliss of whistling motion through the depths of space.

The moon in her new robes looked rather strange
And knew not revolution's ceaseless law.
From the dark house of possibilities the world had just emerged to spin along,
No joy of life had throbbed as yet within the furthest limits of immensity.
The order of existence scarcely had begun unfolding to perfectionment;
It seems as if the world, like a ring whose socket waiteth for its precious stone, longed to evolve the archetypes to come.
They say there was an alchemist on high,
Dust of whose footsteps sparkled even more than Jamshed's crystal cup (wherein the king beheld the marvels of a universe).
And on the pedestal of heaven there was engraved Elixir's wondrous recipe,
Which angels always guarded from the ken of Adam's soul destined by it to live.
The alchemist was ever on the watch
Knowing this recipe more precious than the Great Name itself.
Till seemingly saying his orisons, he nearer drew
And gained the strictly guarded pedestal, his constant effort yielding in the end the fruit of his desire for which he burned.
And having learnt it, he went forth to seek through the vast field of possibilities for its ingredients and collected them;
Yea ! what is there that can be hid from those who know the halls where truth for ever dwells.
From stars he took their brightness ; from the moon the marks of burnt-out passions of the past ;
And from night's floating and dishevelled tresses a little darkness;
From the lightning he received its restlessness; and purity from Houries;
And the gentle warmth that runs rippling from healing breath of Mary's son.
Then from the quality of Providence he took that splendour which dependeth not on aught else than itself,
And from the dew and angels took he their humility.
Then in the waters of the spring of life he made them to dissolve;
And from the Throne of the Most High they called this essence "Love."
That alchemist sprinkled this liquid on the new sprouting being,
And its magic touch released the spell-bound process of the worlds.
Motion appeared in atoms ; forthwith they abandoned their repose,
And roused themselves embracing their affinities again.
The suns and stars rolled in majestic curves.
The buds received fresh tints, and poppy flowers were branded with the burning marks of Love.]

The first part of the poem portrays the sublime scene of the creation of the universe. The sun, the moon and millions of other planets and solar systems, the animal kingdom and the human beings in this scheme

received their allotted places and knew their functions, but the one supreme motive was still lacking even as a ring of artistic beauty is worthless without its socket being adorned with a lustrous jewel. This was the paramount law of motion. Nature could not evidently achieve its essential purpose without activity which was to be infused into different bodies by means of that divine recipe blazoned on the pedestal of heaven. The cunning alchemist who possessed himself of that celestial secret collected the rare ingredients with infinite labour and ingenuity. The potency of his science then enabled him to produce an elixir to which the unseen majesty gave the name of "Love." The miraculous powers of this liquid were apparent when it was sprinkled on the stagnant bodies. All of a sudden they became animated and intense movement was visible everywhere. The universe was set on its course of patient evolution. Two ideas stand out prominently in this poem: first, that the secret of progress is restless activity, second, that love should be the guiding principle of that activity. In sex relations love is a dominant factor, for the warmth and sunshine of its supreme sovereignty penetrates the gloomiest recesses of the human heart. It strews roses in the path of those whose soul is enraptured by the magic of its glance. The noblest achievements and the sublimest sacrifices of humanity are the result of exaltation roused by this divine passion. It is joy, laughter and tragedy all in one. The ravishing songs of the nightingale, the purity of the dew-dropping pink roses, the wondrous grace of the swaying cypress, the voluptuous fragrance of sweet jasmine, the green serenity of myrtle, the divine narcissus holding its court in a *parterre* longing for spring in a glimpse of heaven, the bewitching beauty and the capricious moods of the beloved become themes of poetic inspiration under its seductive influence. The composition of this ruling passion is analysed with consummate skill and the poet's fancy wanders over all the possibilities of Love's all-embracing activities when he selects the ingredients. Science may deride this idea, but the charm of his thought and the vigour of his description remain unaffected.

The revolution which has been wrought in the ideas of the masses of the proletariat in all countries after the stirring events of the Great War has presented such paradoxes to the embarrassed statesmen of the Western world that they cannot bring back peace to the distracted nations. Indeed, the tangle of the world's affairs is such that bankrupt statecraft is helpless to find a solution for the soul forces which have been awakened by their own selfish and immoral policy. The poet in a short poem in Persian suggests methods to the puzzled rulers of the world whereby they could capture the imagination of the people in revolt.

بملازمان سلطان خبرے دہم ز رازے
کہ جہان توان گرفتن ز نواے دلگدازے

بمتاع خود چہ نازی کہ بشہر دردمندان
دل غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے

ہمہ ناز بے نیازی ہمہ ساز بے نوائی
دل شاہ لرزہ گیرد ز گداے بے نیازے

ز ستیز آشنایان چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

رہ دیر تختۂ گل ز جبین سجدہ ریزم
کہ نیاز من نہ گنجد بدو رکعت نمازے

ز تغافل تو خامم برہ تو ناتمامم
من و جان نیم سوزے تو و چشم نیم بازے

[Let the tidings of this secret be carried to the kings, that a world can be subdued by a soul-enthralling melody.
Pride not thyself over thy wealth, for in the city of love, the heart of a Mahmud is not worth the smile of an Ayaz.
All this pride, to want nothing; all his possessions, to have nothing. The heart of a king trembles from a poor man who wants nothing.
What humble demands and coquettish refusals arise in the conflict of lovers? The tiny heart that would burn all excuses; and the glance which makes excuses.
I scatter a bed of roses from my forehead bowing in prayer on the way to the infidel's temple; for my worship overflows the limits of a couple of prayers of the faithful.
Owing to that neglect I remain imperfect on the path: I and my half-smouldering spirit, and thou with thy half-opened eyes.]

The idea that it is kindness and not force that can sweeten the embittered feelings of the people is illuminated by the gentle wisdom of antiquity. The poet has presented this truth in a new vesture which our senses find extremely attractive. That there is affinity of ideas between all great poets, is confirmed by Tennyson's sweet lines :

However it be, it seems to me,
'Tis only noble to be good.
Kind hearts are more than coronets,
And simple faith than Norman blood.

Sa'di, the immortal sage of the East, has voiced the same sentiment in his incomparable verse :

Since the people are like the roots,
And the rulers like the trunk,
The tree, my son, can weather
All storms if the roots are firm.

That the egotism of power displayed by modern rulers is incapable of understanding the all-conquering force of love, is within our daily experience of the terrible state of the people's mind all the world over. The poet in a fascinating poem wishes to inculcate the old truth that the thrones can remain unshaken only when they are established on the affection and gratitude of the subjects. How the power of kindness obliterates all evil memories is made clear by a touching incident "illustrative of the difference between the modern and the old-fashioned way of thinking." A French man-of-war is on its way from Tongking to Europe, and there are many soldiers and sailors to be fed, so the ship carries many cattle. Every day one or two animals are killed and at last there are only two cows left. When one of these is killed in the presence of the other, the living cow becomes horribly frightened, and moans, and struggles so that everybody is sorry for it. Then a sailor goes up to the moaning cow and gently rubs its nose, and speaks kindly to it. Thereupon the cow licks his hand, forgets its fear, forgets the killing and the blood and everything, and begins to eat quite happily again. This is a good and touching little study of animal psychology, but are human beings less susceptible to the healing influence of kindness?

It is easy to realise how the kings tremble in the presence of a poor man who is above all wants, when we see in the history of ancient kingdoms how the courage and self-denial of reformers or philanthropists have shaken the mightiest empires to their foundations. More recently in our own times the strange spectacle of Tolstoy and Gandhi fearlessly confronting the two world empires furnishes a convincing proof of their acquiring phenomenal power by interpreting the soul forces of the masses. It is the time spirit which electrifies people and, though poor, a devoted patriot becomes irrisistible when carried on the high tide of popular will.

The second half of the poem is an address to the divine beauty of the eternal will which has now been unveiled and the poet, looking upon it as the goal of all his desires, approaches it with humble mien. His living and intense faith is so wonderfully gracious that as he prostrates himself on the way to the temple of this spirit of the universe the arid ground is converted so to speak into a carpet of roses. He is painfully conscious that the apathetic indifference of the beloved has left him imperfect and in following the spirit he realises his deficiencies (immaturity); then the cry rises from his heart: "I am only midway to my goal because the beloved looked at me with only half-opened eyes." To the supersensitive nature

of the poet it is agonising that he of all the people should be unable to revel in the delirium of ecstasy. It is due, he knows, to the lack of sufficient ardour in wooing the beloved. In his headlong quest of an ideal state of human society it is mortifying to him to see how difficult it is for a people to renew their youth who have learnt to hug their chains. The law of Nature prescribes that the attainment of the loftiest ideals of life depends on your capacity for persistent and mad pursuit of the object, and the poet bewails that he is still timid and hesitating and, therefore, must burst his manacles. In melodious language he conveys a massage both to the prince and the people. It moves the heart by explaining the great mystery of the universe, the power of deep faith and persistent yearning.

The steamer which carried Iqbal to the coast of France passed through the straits of Massena. The sight of the enchanting island of Sicily touched the profound sensibility of the poet and conjured before his mental vision the picture of its past glories under Moslem rulers. The Arab civilisation and all its glittering associations, over the whole field of science, ethics, poetry and art, seemed enough to inspire pride in its most evident sense, but the recollection of its ruthless destruction by the barbarians evoked from him a patriotic lament which reflects the anguish of Moslem soul in all countries. This genuine though mournful effusion of the poet's muse stirs the emotions to the boiling point when you read it in the original composition ; even the translation makes you see the latent beauty of its sweet but sad ideas.

صقلیہ

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

یہ محل خیمہ تھا آن صحرا نشینوں کا کبھی[1]
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
شعلۂ جاں سوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے[2]

آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل

1. In the present edition of the *Bang-i Dara*, this hemistich has been changed by Iqbal as:

تھا یہاں ھنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی

2. This hemistich has been changed as:

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

زندگی دنیا کو جن کی شورش قُم سے ملی
مخلصی انساں کو زنجیر توہم سے ملی[3]
جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے ؟

آہ ! اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا
نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی
مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا میری قسمت میں تھا[4]
ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں
درد اپنا مجھ سے کہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہ کے تڑپا دے مجھے

3. This and the following verses have been changed as:

مردہ عالم زندہ جن کی شورش قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے ؟

4. This verse has now been changed as:

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

[Weep to thy heart's content, O blood-weeping eye!
Yonder is visible the tomb of Muslim culture.
Once this palace was the tent of those dwellers of the desert,
For whose ships the ocean was a playground;
Who raised earthquakes in the palaces of the kings of kings,
In whose swords lay hidden life-scorching flames;
Whose birth was death for the old world,
Whose fear caused the palaces of error to tremble;
Whose cry of "arise" gave life to the world
And freedom to men from the chains of superstition.
Is that drum silent for ever,
Whose reverberations delight the ear to this day?
Oh Sicily! the sea is honoured by thee,
Thou art a guide in the desert of these waters.
May the cheek of the ocean remain adorned by thy beauty spot;
May thy lamps comfort those who measure the seas;
May thy view be ever light on the eyes of the traveller,
May thy waves ever dance on thy rocks!
Once thou wast the cradle of the civilisation of the people,
The fire of whose glance was world-burning beauty.
The nightingale of Shiraz wailed over Baghdad,
And Dagh wept tears of blood over Delhi.
When the heavens scattered the wealth of Granada to the winds,
The sorrowful heart of Ibn Badrun cried out.
The dirge of thy ruin was to fall to my lot;
It was in my lot to suffer this agony and to make others suffer.
Whose story is hidden in thy ruins?
The silence of thy footfall hath a mode of expression.
Tell me of thy sorrow—I too am full of pain;
I am the dust of that caravan whose goal thou wast.
Paint over this picture once more and show it to me;
Make me suffer by telling the story of ancient days.
I shall carry thy gift to India;
I shall make others weep as I weep here.]

The spirit of the poem is essentially one of pleasure-pain which finds a responsive vibration in Shelley's dream musings:

We look before and after, and pine for what is not,
Our sincerest laughter with some pain is fraught;
Our sweetest songs are those that tell of saddest thoughts.

Like a great poet Iqbal captures the reader's imagination by instantly seizing the core of an emotional fact and presenting it in a brilliant verse with an artistic blending of sweet and melancholy memories such as you find in the songs of the nightingale. He stands on the deck while the steamer slowly moves—his heart profoundly stirred by the sight of that

land of dreams wherein Moslem civilisation put forth some of its sweetest blossoms. While a prey to agonising reflections he feels the fullness of the past; and the void of the present which is without joy, glory or greatness. His anguished soul sees the

> Old, unhappy, far off things
> And battles long ago. (Wordsworth)

He sees the relic of a civilisation which has utterly vanished, a civilisation of exquisite beauty, joyous and simple. Its flourishing cities have disappeared from the face of this fairy island and the vestiges of its liberal institutions exist only in museums and libraries. Its people who brought liberty to the oppressed and downfall to the tyrants are nowhere. Everything is gone but the art of that people which by its dainty loveliness preserves the memory of their great past. A mouldering arch, the ruins of a minaret, the perfection of a dome are frozen music which once enthralled the world and now even in its decay captivates the lovers of art. The silent melody of their pathetic beauty is heard by the imagination of all Moslems. Keats expresses the same idea in his golden verse:

> Heard melodies are sweet; but those unheard
> Are sweeter; therefore, yee oft pipes, play on;
> Not to the sensual ear, but more endeared,
> Pipe to the spirit, ditties of no tone.

Whilst under the influence of these sad reflections, he says that the immortal Sa'di composed a dirge on the fall of Baghdad, the destruction of Granada was described by Ibn Badrun and that of Delhi by the poet Dagh, but the melancholy story of Sicily's destiny was allotted to him and, therefore, in obedience to the dictates of unkind fate he expresses his emotion in most winning and beautiful verse. If literature is the reflection of the soul of a people, then we can understand the magic of this poem which has moved great audiences to exaltationand to tears. The Moslems feel a legitimate pride in the great achievements of their brethren in times when the nations of the world were groaning under the weight of chains which enslaved them. It was both spiritual and physical slavery of a most degrading nature. History abounds with instances in which the Moslems reclaimed the Christians and others from gross superstition and brought freedom to servile nations. How grateful it is to the ear of a Moslem when he reads the petition which the Christians of Palestine wrote to the Moslem Amir: "O Moslems, we prefer you to the Byzantians, though they are of our own faith, because you keep faith with us and refrain from doing us injustice, and your rule over us is better then theirs, for they have robbed us of our goods and our homes" (Arnold, *Preaching*

of Islam, p. 55). Even in our own times one of the foremost thinkers of Europe bears testimony to the spiritual beauties of Islam. Renan, the great Frenchman, says: "Je ne suis jamais entre dans une mosquee sans une vive emotion, le diraije? sans un certain regret de n'etre pas Musalman" [I have never gone into a mosque without a lively emotion, shall I confess it, without a positive regret for not being a Musalman]. The conduct of the Moslems who became the liberators of oppressed humanity was moulded by such sublime teachings of their Prophet as is contained in this injunction. The Prophet was asked who was the most favoured of God's creatures. He replied, "He from whom the greatest good comes to His creatures," and then when asked what actions were most excellent, he answered: "To gladden the heart of a human being, to feed the hungry, to help the afflicted, to lighten the sorrows of the sorrowful, and to remove the wrongs of the injured." "He who helps his fellow creatures in the hour of need and he who helps the oppressed, God will help him in the day of travail." The poet had these exalted ideals in view when he said that the mightiest tyrants shrunk from the sight of those Arab conquerors whose cry of "Arise" elevated the slaves to the status of equality with free men, and set new values to moral conduct. The east and the west rising from its ashes then witnessed the dawn of a new era of a new movement in art and thought in an environment exceedingly fresh, rich and enchanting. The island of Sicily is so favoured by Nature that its possession was coveted by the Greeks, the Romans, the Carthaginians and the Arabs. The last named adorned it with liberal institutions of their wonderful civilisation. The poet invokes profuse blessings on this "guide in the desert of these waters" because it was once the abode of the beloved and, although this nymph of the Mediterranean is wedded to a new lord, the memory of its old associations is so dear that he would again listen to the recital of the story of ancient happiness. "Paint over this picture," he says, "once more and show it to me," but the sad reality brings pain and despair and he sees :

> Yon rising moon that looks for us again,
> How oft hereafter will she wax and wane ;
> How oft hereafter rising looks for us,
> Through this same garden and for one in vain.

HIS GREAT WORK

IQBAL's monumental work so far produced is the Persian poem in two separate parts called *Asrar-i Khudi* and *Rumuz-i Be-Khudi.* The first, "Secrets of the Self," is translated by Dr. Nicholson of Cambridge into English. This poem may rightly be called world poetry or world music meant for all times and all climes. The master singer possessing a

sensitive nature cannot endure the evils which eat so to speak into the vitals of his people and it is mortifying to him to see how difficult it is for a people to renew their youth who have learnt to honour their chains. But in prophetic tones he describes the potency of certain ideals which will rejuvenate a degenerate society. The poem forms a unique piece of literary art. It establishes a new system of character-training. It formulates a philosophy which will produce saviours of a misguided world. What flavours and forces do we not find mingled in it? It has fire and courage which make the soul restless. It directs thought into new channels. It inspires self-confidence in palsied wills to climb ice and frowning heights. In a fascinating style he deals with the whole problem of "man," his life and the worth of his life, and attempts to forge a new destiny for his people by preaching reversion to the vigorous but simple life of the early Moslems based on the teachings of the Prophet. Great thinkers among all nations in the past as well as in our own times have experienced patriotic anguish as a result of the fallen fortunes and the disintegrated morals of their people. They have tried to set in motion floods of sentiment by their thrilling music, but the continuation of a current of thought depends on the strength which a conviction may possess. That it is not always safe to play with souls, is made clear by the disastrous consequences which have followed the preachings of some great masters. Nietzsche, the famous German philosopher, has developed a system of ideas whose majesty is undeniable. His wonderful intellect in propounding this theme has evinced a grandeur which is truly awe-inspiring. His readers, however, will not fail to notice that this superb edifice of thought is not based on any secure moral foundation, but reposes merely on the bold assumption of a brilliant intelligence. He sees in Nature no more than the stage for the ego without elucidating the necessity of any restraint on its wild impulses. His ideal of superman consequently glorifies the brute in man and exalts the malignant and evil propensities of his nature. This philosophy of Nietzsche has overwhelmed the world with calamitous consequences, and the cult having proved an entire failure, the unhappy humanity longing for peace, justice and liberty will discover in Iqbal's philosophy the elements essential for reconstructing its shattered hopes. Although the poem is addressed to the Moslem peoples, its underlying truths are eternal verities and can be applied to the uplift of all those societies whose forms remain when the soul is dead, when the spirit has vanished. Such people may find themselves suddenly at the mercy of other nations. Hegel says that philosophy brings forth ideas suited to the epoch. Iqbal has, therefore, rightly understood the condition of his own people who belong to the day before yesterday and the day after to-morrow—they have as yet no to-day.

This dynamic philosophy of Iqbal inculcates the vital principle of developing the latent forces inherent in man, in order that a radiant and commanding personality may find manifestation, the travail of humanity being a necessary preliminary.

سوز پیہم قسمت پروانہ ها   شمع عذر محنت پروانہ ها
خامہ او نقش صد امروز بست   تا بیارد صبح فردائے بدست
شعلہ هائے او صد ابراهیم سوخت   تا چراغ یک محمد بر فروخت

['Tis the fate of moths to consume in flame ;
The suffering of moths is justified by the candle.
The pencil of the self limned a hundred to-days
In order to achieve the dawn of a single morrow.
Its flames burned a hundred Abrahams,
That the lamp of one Muhammad might be lighted.]

The advent of a redeemer in this world takes place when exhausted and oppressed humanity lies prostrate. His work is superhuman for he has to put the whole world in a melting pot and extract the alloy from the corrupted metal, but only a personality so unique can accomplish this task, and then what a scope and final satisfaction the wonderful achievement affords to his refined pride and tenacious will! His person is like a globe of light which illumines the profound darkness. In order that a single supreme entity may come into existence, Nature ignores the inevitable sacrifice of millions of beings for she rejoices in the keen struggle for life. In her workshop the tragedies of daily life are countless and according to her pitiless law it is only the fittest who survive. The poet, therefore, affirms that the advent of the highest knowledge and the highest morality is of such imperative necessity to rebuild the shattered fabric of humanity that all conceivable suffering is worth it. When you read this culling from Iqbal's poem you are reminded of Renan who has said in one of his philosophical dialogues that perhaps there is no God existing at present, but that men are gradually working to make a God, and that out of all the sorrow and labour of mankind a God will be created at last. This God of the French philosopher is no other than the poet's ideal man who will possess godly attributes. To a world of toil, misery and despair, upon which the sun of hope and happiness does not shine, this great personality gives an altogether new force and colour. In this youthful new world of his own creation he will build his chosen realm of natural and rational rights ; his great deeds will be commensurate with his great thoughts. But for this mighty soul also there is a period of rigorous discipline in order to attain to larger life and higher development. It must not be forgotten that this careful preparation is absolutely essential in

order that his gradual purification may illumine his entire nature. The poet prescribes three stages for this education of the self—Obedience, Self-control and Divine Vicegerency.

در اطاعت کوش اے غفلت شعار　می شود از جبر پیدا اختیار
نا کس از فرمان پذیری کس شود　آتش او باشد ز طغیان خس شود
هر که تسخیر مه و پروین کند　خویش را زنجیری آئین کند
باد را زندان گل خوشبو کند　قید بو را نافهٔ آهو کند
می زند اختر سوے منزل قدم　پیش آئینے سر تسلیم خم
لاله بیهم سوختن قانون او　بر جهد اندر رگ او خون او
قطرها دریاست از آئین وصل　ذره ها صحراست از آئین وصل
باطن هر شے ز آئینے قوی　تو چرا غافل ز این سامان روی
باز اے آزاد دستور قدیم　زینت پا کن همان زنجیر سیم
شکوه سنج سختی آئین مشو　از حدود مصطفیٰ بیرون مرو

[Endeavour to obey, O heedless one!
Liberty is the fruit of compulsion.
By obedience the man of no worth is made worthy;
By disobedience his fire is turned to ashes.
Whoso would master the sun and stars,
Let him make himself a prisoner of law!
The wind is enthralled by the fragrant rose,
The perfume is confined in the navel of musk-deer;
The star moves towards the goal
With head bowed in surrender to a law.
To burn unceasingly is the law of the tulip
And so the blood leaps in its veins.
Drops of water become a sea by the law of Union
And grains of sand become a Sahara.
Since law makes everything strong within,
Why dost thou neglect this source of strength?
O thou that art emancipated from the old custom!
Adorn thy feet once more with the same fine silver chains.
Do not complain of the hardness of the law,
Do not transgress the statutes of Muhammad.]

The second stage in the process is self-control and he warns the aspirant that :

هر که بر خود نیست فرمانش روان　می شود فرمان پذیر از دیگران
تا عصاے لا اله داری بدست　هر طلسم خوف را خواهی شکست
هر که حق باشد چون جان اندر تنش　خم نگردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینهٔ او راه نیست　خاطرش مرعوب غیر الله نیست

هر که در اقلیم لا آباد شد فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ماسوی قطع نظر می نہد ساطور بر حلق پسر
با یکے مثل ھجوم لشکر است جان بچشم او زباد ارزان تر است
لا الله باشد صدف گوھر نماز قلب مسلم را حج اصغر نماز

[He that does not command himself
Becomes a receiver of command from others.
So long as thou hold'st the staff of "There is no God but He."
Thou wilt break every spell of fear.
One to whom God is as the soul in his body,
His neck is not bowed before vanity;
Fear finds no way into his bosom;
His heart is afraid of none but Allah.
Whoso dwells in the Moslem faith
Is free from the bonds of wife and children;
He withdraws his gaze from all except God
And lays his knife to the throat of his son.
Though he is like a host in onset,
Life is cheaper in his eyes than wind.
The profession of faith is the shell, but prayer is the pearl;
The prayer is the small pilgrimage for a Muslim heart.]

The third and final stage is the acme of perfection, when you feel as though the whole universe is created for you, and as its supreme lord or the vicegerent of God you receive the homage of all. The poet describes him thus :

نغمه زا تار دل از مضراب او بہر حق بیداریٔ او خواب او
شیب را آموزد آھنگ شباب می دھد ھر چیز را رنگ شباب
نوع انسان را بشیر و ھم نذیر ھم سپاھی ھم سپہ گر ھم امیر
چون عنان گیرد بدست آن شہسوار تیز تر گردد سمند روزگار
خشک سازد ھیبت او نیل را می برد از مصر اسرائیل را
از قُم او خیزد اندر گور تن مردہ جان‌ھا چون صنوبر در چمن
زندگی را می کند تفسیر نو می دھد این خواب را تعبیر نو
ھستیٔ مکنون او راز حیات نغمۂ نشنیدۂ ساز حیات

[Heart-strings give forth music at his touch,
He wakes and sleeps for God alone.
He teaches age the melody of youth,
And endows everything with the radiance of youth.
To the human race he brings both a glad message and a warning;
He comes both as a soldier and as a marshal and prince.

When that bold cavalier seizes the reins,
The steed of time gallops faster.
His awful mien makes the Red Sea dry,
He leads Israel out of Egypt.
At his cry "Arise" the dead spirits
Rise in their bodily tomb, like pines in the field.
He gives a new explanation of life,
A new interpretation of this dream.
His hidden being is life's mystery,
The unheard music of life's harp.]

It is for this glorious personality that tortured and despairing souls in their gloomy surrounding look towards the heavens even as a dry and parched seed in a desert would look for beneficent and bounteous drops of rain; and the cry of agony goes forth from the darkest recesses of these people.

اے سوار اشہب دوران بیا اے فروغ دیدۂ امکان بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو در سواد دیدہ ها آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن نغمۂ خود را بہشت گوش کن
خیز و قانون اخوت ساز دہ جام صہبائے محبت باز دہ
ریخت از جور خزان برگ شجر چون بہاران بر ریاض ما گذر
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر از جبین شرم سار ما بگیر
از وجود تو سر افرازیم ما پس بہ سوز این جہان سازیم ما

[Appear, O rider of destiny!
Appear, O light of the dark realm of change!
Illumine the scene of existence,
Dwell in the blackness of our eyes;
Silence the noise of the nations;
Imparadise our ears with thy music;
Arise and tune the harp of brotherhood,
Give us back the cup of the wine of love!
Protect the tree's leaf against autumn's cruelty
Oh! do thou pass over our gardens as the Spring.
Receive from our downcast brows
The homage of little children and of young men and old!
When thou art there, we will lift up our heads
Content to suffer the burning fire of this world.]

The poet like the maker of a new world deems it necessary that a painful process of preparation may be gone through in order that a people may reach the zenith of their glory. The historical law teaches us that the discipline of suffering, indeed of great suffering, has produced all the elevation of humanity hitherto. This world is a huge workshop in which individuals and nations are constantly making or unmaking

their destiny. Every moment of your lives is precious beyond conception. You either add to the beauty of the edifice wherein your destiny dwells or allow the storm and stress of time to lay it in ruins. There is fire above, beneath and all around you and if you shrink from it in dismay and become a coward and desert your post, you are lost and you create a hell for yourself. Beware, therefore, and do not recoil from facing the trials of this world, nay, even go forward and meet them joyfully. Remember also that the tension of a soul in misfortune will communicate its energy to your designs if only you will show indifference to all pain. Calamities in this world are like hammer strokes which serve to harden your character. They should make you insensible to all sense of fear and develop in you the faculty of self-control, and while you are passing through this crucible of suffering you will realise that in you both the creature and the Creator are united, for you are fashioning and forging an exquisite divinity by burning the dross in you. Thus the highest grade of purity ennobles you and places you in a unique position for it is the highest spiritualisation of the instinct. You will then feel the joy of holy music which will perpetually impel your soul out of night into morning and out of gloom, out of affliction, into clearness, brightness and refinement. This is the pinnacle of glory rendering you fit to assume the supreme functions of the Vicegerent of God on Earth. Under your fostering care people will enjoy the privilege of freedom, justice and equality.

The poem gives you a deep insight into the infinite mystery of the self whose possibilities of illimitable development are incomprehensible. "Rejoice, therefore, O man! that you are capable of becoming God-like; adorn yourself with these gifts and cultivate the habits which conduce to purity, rigour and manliness. Do not let the odour of paltry people cling to you, but show the rush, the breath and the emancipating scorn of a wind which makes everything healthy by making everything run." Swinburne also detects God in man when he says:

But this thing is God,
To be man with thy might,
To grow straight in the strength of the spirit, and
Live out thy life as the light.

In another place in *Asrar-i Khudi*, Iqbal condemns the negation of desire as the *Nirvana* of the self which means stagnation and ultimate death of individuals and nations :

دل ز سوز آرزو گیرد حیات   غیر حق میرد چو او گیرد حیات
چون ز تخلیق تمنا باز ماند   شهپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو هنگامه آرائے خودی   موج بیتابے ز دریائے خودی

آرزو صید مقاصد را کمند   دفتر افعال را شیرازه بند
زنده را نفی تمنا مرده کرد   شعله را نقصان سوز افسرده کرد
عقل ندرت کوش وگردون تازچیست   هیچ میدانی که این اعجاز چیست
زندگی سرمایه دار از آرزو است   عقل از زائیدگان بطن اوست

[From the flame of desire the heart takes life and when
It takes life all dies that is not true.
When it refrains from forming wishes,
Its pinion breaks and it cannot soar.
Desire is an emotion of the self,
It is a restless wave of the life's sea.
Desire is a noose for hunting ideals,
A binder of the book of deeds.
Negation of desire is death to the living,
Even as absence of burning extinguishes the flame.
Why does the mind strive after new discoveries and scale the heavens?
Do you realise whose wonderous deal it is ?
'Tis desire that enriches life,
And the intellect is a child of its womb.]

The secret of all human motive for action is desire. It serves in the human body the same purpose which steam does in an engine. Man-made machinery ceases to operate if the propelling force loses its power. Similarly, the God-made mechanism of the human body loses the zest for life if desire is dead. It is only the keen struggle for life which will keep man alive. Individuals and nations animated by vigorous desires must take part in this struggle or perish. The competition is terrible, for man has to fight if it comes to that even with the elemental forces of Nature which will serve him only as long as he is masterful and constant effort is the rule of his life. But the moment he seeks rest from the conflict these very forces will destroy him. The birds and beasts of prey will descend upon him and tear him to pieces. Therefore, beware of longing for repose. It conceals the will to the denial of life which is a poisonous principle of dissolution and decay. A man who is not yet a degenerating, waning type will welcome every shock that does not allow him to remain idle, to sit and amuse himself, for he realises that he who struggles best in the world is very likely to obtain the best that it has to offer. The poet lays great emphasis on the necessity of keeping the flame of desire burning to serve as an incentive and stimulus to life.

This message to the world unlocks the treasure-house of wisdom. The content of poetry and the experiences of the past are the content of individual as well as of national life. They teach you that you must constantly advance and feel sure that you are really alive. The possibility of

retrogression can be removed from your path only if you continue to grow day by day. Therefore effort which desire generates must be the first and the highest duty of life. Men who seek the happiness of repose are apt to shudder and recoil in face of mysterious decisions and new paths, but your mental energy and moral effort will, if you keep the flame burning, make you appropriate everything. You will assimilate and absorb the very nature which in the case of indolent and played-out people proves so destructive. Do not forget that as a new-born child you felt the appetite and thirst for mother's milk. Hunger was the first sensation you felt on arrival in this world. Your Creator, therefore, expects you to strive for your nourishment. Strive joyously and revel in the ecstasy of effort even as a lover rejoices at the prospect of greeting his beloved. Only then success will come to you. He who refuses to struggle, says Meredith, is Nature's accursed, let him perish! let the curtain of death hide him away for ever. Even God seems to envy man the happiness of effort. Addressing the spirit of man, God says :

> O man ! my creature, thy lot was more blest than mine
> I taste not delight of seeking nor the boon of longing know.
> There is but one joy transcendent and I hoard it not but bestow;
> I hoard it not, nor have tasted, but freely I give it thee,
> The joy of most glorious striving, which lieth in victory. (Watson)

In the literature of some of the Oriental peoples you come across the idea of rest as the culmination and crown of human ambition. You must refuse to accept this dangerous doctrine for it is the siren call for your destruction. Only the birds, strayed and fatigued by flight which let themselves be captured with the hand, can yield to such a foolish sentiment. Many a mighty people who have succumbed to this temptation have this sad epitaph engraved on their tombs. It should serve you as a warning in time lest you should waver in your resolve to keep alive the fire in you. The poet pours forth the consecrated fire of historic truth when he says, "Negation of desire is death to the living." It is even more than this. A little slip or neglect on your part in your career of conscious activity blasts the hopes of generations yet unborn and condemns them to a misery over which the fates may justly weep. Your very memory will be loathsome to those who are consigned to slavery by your criminal desire to extinguish the flame in you. Forget not that if you cease to preside over the immortal banquet spread before you by the submissive forces of Nature you become a beggar longing for the crumbs falling from the tables of that happy divinity who occupies the seat left vacant by you. "Your pinions will be broken," says the poet. Yes, you become a sport of other nations and slave for their aggrandizement. You lose half of your virtues, says Plato, if you lose your liberty. Nay, you lose all you possess. With the

misfortune of slavery everything seems at once to crumble about you. Freedom, joy, glory, ambition, religion, power—all desert you as the soul deserts the dead body. For centuries you have no will of your own and during this weary time you administer to the happiness and greatness of others finding strange consolation in it. Do not, therefore, let the war of effort die within you. Drive away all unworthy longing for repose which may threaten your fabric with destruction.

The fire which burns in you and enables you to conquer obstacles, even to plunge your horse into the ocean to swim across to the unseen world, to raise the standard of the unity of God, was kindled by a divinely-inspired personality. You will rue the day when you extinguish that flame deliberately, and before you commit that crime think of the dreary fate and the nights of torment which will surely supervene that supreme act of folly. What is there on earth like the delight of an eagle poised on the highest peak between heaven and earth, the interpreter, so to speak, of the unknown to the world of manifestation spread before him. He is unique; he is above the proximity of the common and the base. It is truly the victory of steady desire over the obscurity of destiny. You were placed in that enviable position by the miraculous energy of that God-inspired will. Keep that position, nay, cherish the ambition to strike your pinions even against the blue vault of heaven by an unceasing impulse towards higher life. Divorce the idea of lassitude from you and gather fresh forces every moment. Yes, be a storm pregnant with new lightnings; only then is greatness possible.

The poet entering the sacred shrine of history attains to the most fertile and soundest idea of his philosophy. To his artist spirit there truly come moments of illumination in which the nature of things becomes directly manifest to his eyes. From the contemplation of the eternal rush of world forces he derives with definite assurance that for which Nietzsche has an inexpressible loathing, the knowledge that law and religion are to be understood as manifestations of the world-constructive intelligence, and therefore as necessary growths. A system of ethics based upon physics and religion makes you realise the harmony of necessity and freedom in the eternal life of reality, and while some enlightened nations, who look upon thought as a universal solvent, apply it to obscure problems of life and thereby lose their strength. This virile system which Iqbal expounds in his poem makes you retain that elemented principle which is the basis of all greatness and beauty. The energy of its conception provides him with inspiration for the creation of an ideal man whose mechanism he animated with religious vitality. In his subtle yearning for a purer spiritual life he stands in sharp contrast to the anti-religious philosophy of Nietzsche, who vigorously denounces all moral scruples. In developing

his archetype, Iqbal devotes himself to the contemplation of an age which was rich in moral feeling when fortunate mankind absorbed the secrets of religion from the precept and example of lofty spirits whose dazzling personalities produced momentous results for human progress. Their burning moral passions consumed vice and their very touch ennobled the vulgar. This highly evolved being, the constitution of whose soul is richly endowed with manly and masterful virtues, is presented by Iqbal to the demoralised world with the enthusiasm of a priest and the magic of a great poet. The annals of past ages will confirm the truth that

در عمل پوشیده مضمون حیات　　لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہان تازہ شو　　شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہان نامساعد ساختن　　ہست در میدان سپر انداختن
مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار　　با مزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہان　　می شود جنگ آزما با آسمان
بر کند بنیاد موجودات را　　می دہد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برہم زند　　چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوت خود آشکار　　روزگار نو کہ باشد سازگار
از رموز جزو و کل آگاہ بود　　در جہان قائم بامراللہ بود
خیمہ چون در وسعت عالم زند　　این بساط کہنہ را برہم زند
فطرتش معمور و می خواہد نمود　　عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہان مثل جہان جزو و کل　　روید از کشت خیال او چو گل
پختہ سازد فطرت ہر خام را　　از حرم بیرون کند اصنام را
نغمہ زا تار دل از مضراب او　　بہر حق بیداری او خواب او

[The pith of life is contained in action;
To delight in creation is the law of life.
Arise and create a new world!
Wrap thyself in flames, to be an Abraham.
To comply with this ill-starred world
Is to fling away thy buckler on the field of battle.
The man of strong character who is master of himself
Will find fortune complaisant.
If the world does not comply with his humour,
He will try the hazard of war with Heaven.
He will dig up the foundations of the universe
And cast its atoms into a new world.
He will subvert the course of time
And wreck the azure firmament.

By his own strength he will produce
A new world which will do his pleasure.
He knows the secrets of parts and wholes,
That they exist in the world by Divine command.
When he pitches his tent in the wide world
He rolls up this ancient carpet.
His genius abounds with life and desires to manifest itself,
He will bring another world into existence.
A hundred worlds like this world of parts and wholes
Spring up like roses from the seed of his imagination.
He makes every raw nature ripe;
He puts the idols out of the sanctuary.
Heart-strings give forth music at his touch,
He wakes and sleeps for God alone.]

The supreme object of Iqbal's philosophy is the production of the typical or ideal man by a rigorous training of the human faculties. This system seeks to work from within to without. It aims at transforming character and thus transforming the world. The value of this conception is immeasurable for the type—man, whose development is strongly influenced by religious sentiment, will bring a message for a new greatness of man which has not been surpassed in the adumberated past. In contradistinction to Nietzsche's Superman who mocks at religion and springs exclusively from the aristocratic stock to ride roughshod over the demos, Iqbal's Perfect Man is adorned with the attributes even of God. From the super-plenitude of his angelic soul flow the rarest blessings to the whole creation. He smooths rough souls and makes them taste a new longing. From contact with him everyone goes away richer and fresher than before. He mobilises the latent forces of human nature and presses them in the service of mankind. Woe to him who thwarts his wishes, for in executing the commands of God he will try the hazards of war with heaven. His delicate moral sensibilities do not tolerate the current follies and corruption of men. He will, therefore, says the poet, dig up the foundations of the universe and cast its atoms into a new mould and thus create a new world. Being the beloved of Nature he sets at naught the laws of biology. He transmutes the base metal of humanity into a precious substance and sets new values to everything. This ideal man of the poet represents the individual whose divine essence has reached the highest development, and only some of the greater prophets have reached this stage. But taking into consideration men of lesser calibre such as Alexander, Ceasar and Napoleon we find that they tried to recast the world in which they lived and almost succeeded in their great designs. The men who served them as instruments, though originally insignificant, became mighty leaders as a result of their association with them, but the grand fabric which these

superior personalities reared crumbled in the dust as soon as they disappeared from the scene of their action. These were indeed ephemeral entities who shot like the meteor across the dark firmament creating only a transient glow leaving no trace behind them. On the contrary, we see with wonder the work of the Prophet of Islam who excels the fancy of the poet in the radiance of his soul. He it was who transformed the whole world by the sublimity of his ideals – the world in which the voice of justice and liberty had been ruthlessly stifled creating a favourable atmosphere for sin and sorrow. His associates were mightier people than Alexander, Ceasar and Napoleon. His work has endured in spite of the desparate efforts of the whole world to destroy it. He alone was competent to work the miracle of remodelling a people like the Arabs who issued from a most unpromising land enraptured by unknown fervours and irresistibly forced out of themselves, intoxicated and longing to fructify humanity with the nectar of God's knowledge. These were truly the people who showed that pious nations alone were free and valiant.

Such is Iqbal's archetype who forges a future for those people who have done penance for wandering away from the path of the great. He stimulates their slumbering passions and by his mere touch and superabundant powers he shows how unexhausted man is still of the greatest possibilities. Iqbal's philosophy thus explains in a forceful manner the conditions and methods by virtue of which a soul grows up to such an elevation and power. And the most essential and indispensable of these conditions is the ascendency of mind over matter, in other words, the acquisition of power to conquer the animal part of one's self which one shares with inferior creatures. The idealism permeating the poem tends thus to create divine conditions in man and makes him supreme, morally, intellectually and physically. The boundless energy and purity of his mind contribute to a general rise in the moral standard of life and character for the whole community. He inculcates by his own precept and example the necessity of acquiring a self-respect that does not permit a man to yield to what he believes to be wrong, no matter how great the power behind the wrong. In his claim to sovereign control in the ordering of human conduct is the guarantee of the reality of human progress. This perfect man, serene, fearless and firm, enfranchises the soul of humanity; this is his sure touchstone. He lifts the people upwards so that with clarified intelligence and extended vision they can gaze around them into this beautiful world and instantaneously, as if by a miracle, men make larger claims on life, and there manifests itself a more vigorous impulse towards a sensuous fullness of existence which henceforth receives a new colour and a new mission.

This poem conveys the message of life to decadent nations. It also

contains a fearful warning to the blind apostles of a materialistic civilisation. These messages are delivered in a joyfully creative mood. None but rare and strong spirits like Iqbal will ever be animated by the great ambition of creating, not for an age but for all time and for all people. It has the merit to charm the cultured by the beauty of its style and by the idealistic inclinations of its author. The vibrations of Iqbal's melody pass over withered roses like the fresh breeze of a summer morning infusing in them fragrance and freshness. That it will awaken forsaken music among decadent people, is apparent from the intense passion and soul-stirring emotions which pervade this immortal work. By pouring new inspiration into new matter and thus helping the generation of an impulse towards unknown greatness and happiness, Iqbal has rendered unique service to humanity, truth and virtue. Goethe, recognising the idealistic yearning of the human mind, pays high tribute to the genius which awakens the fervour of faith and hope. "The proper study of mankind is man," he says, "and the teacher who is competent to awaken a sentiment responsive to a single good deed or to a single good poem effects more than the teacher who records for us by form and by name whole series of classified natural objects." Nations whose faculties have become atrophied by long and arbitrary restraints on their free exercise, will feel the compelling force of this poem and will be impelled to seek their fullest and freest expressions by developing their moral and mental energies and thus adding to the richness and variety of human thought and action. For them Dr. Iqbal holds out the promise of renewed youth and a supreme life of imperishable glory.

دگر به دشت عرب خیمه زن که بزم عجم
مئے گذشته و جام شکستنی دارد

خان بہادر مرزا سلطان احمد

النظر

یعنی

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

کی مثنوی اسرار خودی پر عالمانہ تنقید

مصنفہ

جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

مرغوب ایجنسی لاہور کیلئے

کوہ نور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپا

۱۹۱۹ء

قیمت فی جلد [illegible]

اقبالؔ اور خان بہادر مرزا سلطان احمد

مرزا سلطان احمد مشہور و معروف مرزا غلام احمد صاحب قادیانی (م-۱۹۰۸ء) کے فرزندار جمند تھے۔ وہ بسیار نویس تھے۔ ان کے بے شمار مضامین گوناگوں موضوعات پر کثیر التعداد رسائل میں ۱۸۸۸ء سے ۱۹۳۰ء تک میری نظر سے گذرے ہیں۔ موصوف مخزن علم و ادب کے ایسے بیش بہا در شہوار تھے جس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ مرزا صاحب کا تقرر ایک کلرک کی حیثیت سے محکمۂ مال میں ہوا تھا۔ ملازمت کے زمانے میں انہوں نے ایسے جوہر دکھائے کہ مختلف عہدوں پر فائز ہو کر ترقی کرتے کرتے مشیر مال کے جلیل القدر منصب سے سبکدوش ہوئے۔ ان کا انتقال ۲؍جولائی ۱۹۳۱ء کو ہوا۔

مرزا صاحب بے مثال ادیب، عظیم فلسفی، ماہر نفسیات اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ افسوس کہ ان کے حالات پردۂ اخفاء میں ہونے کے سبب مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔ وہ کثیر التعداد تصانیف کے مصنف تھے۔ قرآنی تعلیمات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

مرزا سلطان احمد، ڈاکٹر اقبال، اکبرالہ آبادی اور خواجہ حسن نظامی کے مخلص ترین دوستوں میں تھے۔ اردو ادب کے لئے یہ ایک المیہ ہے کہ لوگوں نے مرزا صاحب کو فراموش کیا ہے۔ اقبالیات میں ان کا نام مفقود نظر آتا ہے حالانکہ وہ اقبال کے مداحوں میں تھے۔ انہوں نے سب پہلے اقبال کی مثنوی اسرار خودی پر ایک لاجواب اور مستقل کتاب لکھی جو لاہور میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب سے غالباً ماہرین اقبالیات واقف نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے کسی کتاب میں اس کا نام نہیں دیکھا ہے۔ اس کی نشاندہی آج سے ۸۶ سال پہلے مولوی محمد عبداللہ لاہوری کے مضمون ''رسالہ اسلامیکا، رسالہ معارف و علامہ اقبال'' مطبوعہ نیرنگ خیال لاہور بابت نومبر ۱۹۲۵ء (صفحہ ۲۵) میں درج ذیل الفاظ میں کی گئی تھی۔

''مرزا سلطان احمد مشہور و معروف مضمون نگار نے اسرار خودی پر ایک مستقل کتاب بنام ''النظر'' لکھی۔اس کے علاوہ بھی کئی دفعہ لکھا۔''

تعجب اس بات پر ہو رہا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی اپنے خطوط میں مرزا صاحب کی اس عظیم الشان کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔موصوف اقبال کا نام نہایت قدر و منزلت اور عقیدت کے ساتھ لیتے تھے۔ مجھے اس کتاب کی تلاش و جستجو عرصہ دراز سے ہو رہی تھی اور اس کے لئے میں نے ہندوستان کے تمام کتب خانوں کی خاک چھان ڈالی۔آخر کار جوئندہ یابندہ کے مصداق اس کتاب کا ایک مکمل نسخہ اقبال کے وطن مالوف لاہور جہاں ماہرین اقبالیات کی فوج ظفر موج رہتی ہے دستیاب ہوا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرزا سلطان احمد نبیؐ برحق کو خاتم المرسلین اور پیغمبر آخر الزمان دل و جان سے تسلیم کرتے تھے۔اس سلسلے میں میں نے ان کے کئی مضامین دیکھے ہیں۔مثال میں ایک مضمون پیش کیا جا سکتا ہے جو بعنوان ''رسولؐ کا احترام عقلاً واجب ہے'' اردو کے پرانے رسالے ''صوفی'' پنڈی بہاءالدین ضلع گجرات (پنجاب) بابت اپریل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور باپ کے نظریہ کے بالکل خلاف تھے۔سچ کہا گیا ہے

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

انجمن حمایت اسلام لاہور کا ایک اجلاس ۱۰ر اپریل ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔اقبال نے اس میں اپنی مشہور نظم ''شمع اور شاعر'' پڑھکر سنائی تھی۔نظم طویل تھی اور اتفاق سے انجمن کے دوسرپرستوں نے اصرار کیا کہ اقبال کی نظم ان کی صدارت میں پڑھی جائے۔چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے اس کو دو نشستوں میں سنایا۔ایک نشست کی صدارت سید افتخار الدین نے فرمائی اور دوسری مرزا سلطان احمد نے۔ثانی الذکر نے آتے ہی یہ فقرہ چست کر دیا کہ:۔

''اقبال بھی عجب ہرجائی ہے۔کبھی میری بغل میں،کبھی فقیر سید افتخار الدین کی آغوش میں۔''

علامہ نے نظم پڑھنے سے پہلے ذیل کے اشعار ارشاد فرمائے۔جن میں ''سلطان'' اور فقیر کا واضح اشارہ موجود ہے۔

ہم نشیں بے ریایم از رہ اخلاص گفت　　　　اے کلام تو فروغ دیدۂ برناؤ پیر

درمیان انجمن معشوق ہرجائی مباش　　　گاہ با "سلطان" باشی گاہ با "فقیر"

مرزا سلطان احمد کی دو نادر الوجود کتابیں قیام حیدر آباد کے زمانے میں میری نظر سے گذری تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب اکبر الہ آبادی اور دوسری ڈاکٹر اقبال کے نام منسوب ہیں۔ کتابیں یہ ہیں:-

(۱) رسالہ فن شاعری- اس کا ایک نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں زیر نمبر ۴۳۱۰۱، ۸۹۱ محفوظ ہے۔ اس کی تقطیع ۸/ ۱۸/۲۲، اور صفحات ۱۶۲۔ کتاب مطبع احمدی علی گڈھ سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اکبر کے نام انتساب کے الفاظ یوں ہیں:-

نذر اکبر

ہدیۂ مانگ دستاں را بچشم کم مبیں

از مروت بر سر خوان تہی سر پوش باشی

جیسے کہ ہر جزو کے واسطے کوئی نہ کوئی کل اور ہر کل کے لئے کوئی نہ کوئی جزو لازمی ہوتا ہے ایسے ہی ہر جزو اصغر کسی نہ کسی ظل اکبر اور ہر اکبر کسی نہ کسی وجود اصغر سے نسبت رکھتا ہے۔ گو ذرہ بھی بہ ظل آفتاب ایک قسم کی چمک دمک رکھتا ہے، لیکن اس کی ہستی کا پورا نشو و نما آفتاب اکبر یا دیگر انوار یا اشعۂ منعکسہ سے زیادہ تر وابستہ ہوتا ہے۔ ذرہ ذرہ کی ذاتی چمک و دمک آفتابی کرنوں یا دیگر شعاعوں کے بغیر کچھ بھی وزن اور ہستی نہیں رکھتی۔

دنیا کی اکثر ہستیاں نسبتی رشتے سے ہی نشو و نما اور فروغ حاصل کرتی ہیں۔ برگ گل و خار گل باوجود اس کی کس مپرسی کے زیب منبر ہوتے اور ان محترم ہاتھوں تک پہنچتے ہیں جن تک ان کی رسائی مشکل کیا ناممکن تھی۔ یہ نسبی قانون ہمیں بھی مجبور کرتا اور شوق دلاتا ہے کہ ہم بھی اس نسبت سے مستفید اور مستفیض ہونے کے لئے یہ خیال نقش تعظیم اور سکۂ احترام کے جو ہمارے دل میں جناب خان بہادر مولانا مولوی سید محمد اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی کی جادو اثر نظموں اور جادو نما رباعیات کا بزور اثر حکما بیٹھ چکا ہے۔ کوئی راہ سلیم یا کوئی نسبت حاصل نہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ہاں اس ہدیۂ احقر سر مو قلم کی نسبت سے شرف اندوز ہو کر یہ گلدستۂ فن شاعری نہایت خلوص دل اور

محبت غائبانہ سے پیش اور منسوب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

گر قبول افتدز ہے عز و شرف

پیش کنندہ سلطان احمد، میاں والی (پنجاب)

مصنف نے کتاب میں اکبر او راقبال کی شاعری کا تذکرہ بالترتیب نو نو جگہوں پر کیا ہے۔ صفحہ ۶۲ میں اقبال، اعجاز اور رنیرنگ کی ایک ہی بحر اور ایک ہی زمین کے تین تین شعر درج کیئے۔ اور یہ دکھایا ہے کہ ہر ایک شاعر کی طبیعت کا زور کہاں تک پہنچا ہے۔ ذیل میں اقبال کی غزل کے تین شعر نقل کیئے جاتے ہیں۔ غزل پہلی مرتبہ مخزن لاہور کے اولین شمارے اپریل ۱۹۰۱ء میں چھپی تھی۔ دوسرا اور تیسرا شعر اقبال نے بانگ درا سے حذف کیئے ہیں۔ غالباً پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہے ہیں۔

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھکو کہاں تک ہے　　　سر بازار رونق ہے سودائے زیاں تک ہے

نہ سیکھی تو نے مرغ رنگ گل سے رمز آزادی　　　یہ قید بوستاں بلبل خیال آشیاں تک ہے

میں خار خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں

پڑے رہنا مرا گلشن میں رحم باغباں تک ہے

مرزا سلطان احمد صاحب اور اکبر کے درمیان عرصۂ دراز تک خط و کتابت بھی جاری تھی ''مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد'' اب ناپید و نایاب ہے۔ عرصہ ہوا کہ مجھے اس کا ایک نسخہ امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ میں نظر سے گزرا۔ اب یہ نسخہ وہاں سے ہٹایا گیا۔ مرزا صاحب صفحہ ۴ میں لکھتے ہیں:۔

''سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام ہیں ان کا ایک انتخاب معہ مقدمہ کے شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں گے تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے۔ جیسا کہ مکاتیب اکبر، خطوط اکبر دو مختلف مجموعے اس سے پہلے دہلی و لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت اقبال مجاز ہیں کہ وہ اس ادبی مرحلے کو جلد طے کریں اور اپنے نام کے اکبر کے خط چھاپ کر ملک و قوم کو مستفیض فرما دیں۔''

۲۴ رجنوری ۱۹۱۳ء کو اکبر الہ آبادی مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:۔

''ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے الہ آباد تشریف لائے تھے...... ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الٰہی میں

سے ہیں۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے۔ وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم، فلاسفر، نیک دل بزرگ کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ (صفحہ ۴۹)

۲۰ رجنوری ۱۹۱۴ء ''ڈاکٹر صاحب سے آپ کا ایڈرس دریافت کیا گیا تھا ہنوز جواب نہیں آیا۔ لیکن پرچہ ''اقبال'' لدھیانہ میں آپ کا مضمون تحت عنوان ''اقبال'' نظر آیا۔ دل جامع کہ مدح سرائی کروں، لیکن وہ خیال اس پیرائے میں ظاہر ہوا۔

خوب ہے موعظت حضرت سلطاں احمد — دل انساں کی چمک خوب کہ سونا بہتر
غفلت و کبر سے غم خانۂ اکبر اچھا — خندۂ جام سے اقبال کا رونا بہتر
ظلم ہے ان کو اگر داد نہ دوں میں لیکن — اپنے مداح کا مداح نہ ہونا بہتر

چونکہ آپ نے اکبر و اقبال کا ذکر خیر اپنے مضمون میں کیا تھا۔ اس بنا پر یہ اشعار موزوں ہو گئے۔ میں نے دفتر ''اقبال'' لدھیانہ کو بھیج دیے۔

آج آپ کا الطاف نامہ پہونچا۔ جناب والا! اگر مجھ میں یا حضرت اقبال میں کچھ ہے تو آپ ہی کے دل کی زبان ہے۔ امام غزالی کے زمانے میں ایک مغربی سیاح جب وطن کو واپس گیا تو کسی نے پوچھا کہ اسلام کی نسبت تم نے کیا رائے قائم کی۔ اس نے کہا کہ مجھکو موقعہ زیادہ تحقیق کا نہیں ملا۔ لیکن امام غزالی سے ملا تھا۔ ایسا شخص چونکہ پیرو اسلام ہے لہذا میں اسلام کی نسبت اچھا خیال رکھتا ہوں۔'' (صفحہ ۶۵)

۲۵ رجنوری ۱۹۱۶ء ''خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہ لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پہ قلم نہ اٹھائیں۔ بعوض کہ ہم رنداں بے ساماں کے ساتھ ساقی بنے رہے۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں۔ میں نے شاید اقبال صاحب کو اپنا یہ شعر لکھا تھا۔

واعظا! ایں نہ جنوں است نہ کافر شدہ ام
اولت ناشدہ ختم ست و من آخر شدہ ام

ڈاکٹر اقبال صاحب، صوفی صاحب، حافظ شیرازی صاحب سب کی حمایت میں۔

وفا کا رنگ بدل جائے ہے یہ ان سے بعید — فقط موافق موسم لکھی ہے اک تمہید
عمل کا رخ نہیں قوت افزا مرض پہ ہے — کیا ہے نسخہ جو تحریر بس غرض یہ ہے
جہاں میں قوت بازو دکھایئے اس وقت — مراقبے سے ذرا سر اٹھایئے اس وقت
اٹھاؤ ان پہ نہ ہرگز تم اعتراض کا ہاتھ — یہی کہو کہ بہت خوب ہم ہیں آپ کے ساتھ
دکھایئے تو خدارا خودی کے جوبن کو — مراقبہ بھی اٹھا دے اب اپنی گردن کو

شراب حضرت حافظؔ سے کچھ نہیں نقصاں　　ز مارچ تا بہ مئی اس کا ہے فقط ساماں
بس ایک ربع ہے کافی برائے مستی و حال　　بقیہ سال ہے نذر غریق سعی و جدال

وہ خود ہی کہہ گئے ہیں یہ بپاس فکر معاش
سہ ماہ می خور و نو ماہ پارسا می باش

بہت سی نظموں کا مسودہ میرے پاس ہے کہ آج تک کوئی مطلع نہیں۔ کاہلی سے صاف نہ کرسکا۔ ازاں جملہ مندرجہ بالا اشعار میں بے تکلفانہ پیش کرتا ہوں۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ آپ محظوظ نہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو تسلیم‘‘ (صفحہ ۶۹)

اکبر مرزا سلطان احمد صاحب کو مزید لکھتے ہیں:۔

’’اقبال بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا درّہ اٹھائیں یہ عوض اس کے ہم رنداں بے ساماں کے ساقی بنیں رہیں۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں۔ ہم کو ان سے محبت ہے۔‘‘ (۶۹)

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۶ء　’’ڈاکٹر صاحب بلا شبہ نہایت عالی خیال بزرگ ہیں اور اسلامی جماعت کے ترقی خواہ۔ ان کی طبیعت نہایت غیور واقعہ ہوئی ہے۔ خدا مدد کرے‘‘ (صفحہ ۸۰)

۱۹ر اپریل ۱۹۱۸ء　’’اقبال نے رموز بے خودی عنایت فرمائی ہے لیکن میں نے ہنوز نہیں دیکھا۔ نہ اس کی امید ہے، نہ دل چاہتا ہے۔ اسرار خودی کی تمہید دیکھ چکا ہوں۔ میرے کلیات حصہ اول میں ایک شعر ملاحظہ فرمائیں گے۔

خودی و بے خودی دونوں ہیں عکس صورت جاناں
اسی کو جلوہ گر پاتے ہیں جس عالم میں جاتے ہیں

یہ شعر ابتدائی زمانے کا ہے۔ لیکن اسرار خودی اور رموز بے خودی پر حاوی ہے۔ مولانا روم اور مسٹر تلک کا مرکب بہت قوی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہو، میں نے تو اسے پڑھا ہی نہیں۔ آپ نے ماحصل نکالا ہو تو لکھ بھیجیے۔‘‘ (صفحہ ۹۳)

۲۸ر مئی ۱۹۱۷ء　’’حسن نظامی صاحب کو آپ نے ٹوکا تھا۔ کچھ معلوم ہے کہ حضرت اقبال کدھر جاتے ہیں۔ (حاشیہ۔ حضرت اکبر صوفی اور پکے صوفی تھے۔ حضرت اقبال کے فلسفۂ اسرار خودی و بے خودی سے سخت ناراض تھے) اقتباس کا یہ جملہ ’’رقعات اکبر مرتبہ محمد نصر ہمایوں‘‘ سے لیا گیا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب اقبال نے اپنی نظم ’’شمع وشاعر‘‘ جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے اور جو فقیر افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد کی صدارت میں سنائی تھی دوسرے دن (۱۱ر اپریل)

اخبار زمیندار لاہور میں شائع ہوئی تو اکبر الہ آبادی کی نظر سے گذری۔ اکبر نے اس کی تعریف میں ذیل کی رباعی ایڈیٹر زمیندار کو ارسال کی جو ۱۹ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور　　　　ہر حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور

اوج مملکت ہے عالم ہر لفظ　　　　ہر بیت اقبال کی ہے ''بیت المعمور''

(۲)　فنون لطیفہ ۔ یہ مرزا سلطان احمد کی دوسری کتاب جو اواخر ۱۹۱۲ء میں چھپی تھی۔ اس میں شاعری، موسیقی، مصوری، فن تعمیر اور سنگ تراشی پر نہایت جامعیت سے بحث کرنے کے علاوہ علامہ اقبال اور اکبر کے اشعار کو سراہا گیا۔ مرزا صاحب نے یہ کتاب اقبال کے نام ان الفاظ میں منسوب کی تھی۔

''آداب ایشائی اقوام کے مطابق تحقیقی ہدیہ اور نذرانہ دینے کے واسطے پہلے سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس رواج کی پابندی سے مجھے حضرت ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے بالقابہ سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس خلوص اور اس روز افزوں احترام اور محبت کے اعتبار سے جو حضرت اقبال کی نسبت میرے ناچیز دل میں ہے، میں یہ ادبی نذر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

حضرت اقبال کی خداداد قابلیت، کشادہ دلی اور دوست نوازی سے امید کرنی چاہیے کہ ''مجھے ''شرف قبولیت'' سے ممتاز فرمایا جائے گا۔

''احقر سلطان احمد، ۲۶ رنومبر ۱۹۱۲ء''

اقبالیات میں اس کتاب کا ذکر میری نظر سے کہیں نہیں گزرا ہے۔ البتہ جب یہ کتاب اکبر کو موصول ہوئی تھی تو انہوں نے ۲۴ ردسمبر ۱۹۱۲ء کو مرزا صاحب کے خط میں یہ لکھا:۔

''کیا میں اور میرے شعر کیا۔ آپ کی تحسین سے حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے۔ میں بہت خوش کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام پر کتاب کو معنون کیا۔ حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرز ادا ہے، کیا بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل۔ اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو۔ ان کا یہ مصرع

ع ''در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند''

میں کبھی نہیں بھولتا۔ میں ان کی طرف سے بھی سپاس گذاری کرتا ہوں۔ اگر چہ اب تک مجھکو ان سے ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ عجب قید میں ہوں۔ اس موسم میں ناتوانی اجازت سفر نہیں دیتی۔ یہاں سردی تیز ہے۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں تعطیل ہوتی ہے۔ دیکھئے کب زیارت کا موقعہ ملتا ہے۔

بہر کیف اس مطلع سے تسکین ہو جاتی ہے۔

آرزو دنیا میں کب نکلی ابوالابصار کی
چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی

(مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد صفحہ ۵۴-۵۵، اکبر کے شب و روز صفحہ ۱۲۹-۱۳۰)

علامہ اقبال کے تعلقات خان بہادر مرزا سلطان احمد کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار اور مربوط تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قدردان اور کمالات کے معترف تھے۔ علامہ کے متعلق مرزا صاحب کی کئی نادر چیزیں میں نے حفاظت سے رکھی تھیں۔ ان میں ''اقبال'' مطبوعہ لدھیانہ ۱۹۱۴ء ''پاسبان عقل'' مطبوعہ مخزن جلد ۲۳ شمارہ ۳ بابت جون ۱۹۱۲ء اور ''اقبال کا طرز جدید'' مطبوعہ مخزن بابت اگست ۱۹۱۴ء بڑے اہم مضامین تھے۔ یہ مضامین اور دوسری اہم تحریریں کشمیر کے حالیہ نامساعد حالات اور نقل مکانی کے دوران تلف ہوگئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں مضامین برسوں کی مسلسل تگ و دو کے بعد مجھے دوبارہ مل گئے۔ مخزن کے یہ شمارے نایاب ہیں اس لئے دونوں مضامین ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) ''پاسبان عقل''

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (حضرت اقبال)

قدرت نے انسان کو جس قدر قوتیں عطا کی ہیں اگر چہ وہ بذاتہ اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنی اپنی حیثیت اور مقدار کے مطابق خصوصیت رکھتی ہیں اور ہر قوت سے کسی نہ کسی حد تک ایک نسبت رکھتی ہے۔ یہ کیفیت ہر قوت ظاہری اور باطنی میں پائی جاتی ہے۔ ظاہری قوتیں ظاہری قوتوں سے بھی نسبت رکھتی ہیں اور باطنی قوتوں سے بھی۔ یہی حال باطنی قوتوں کا ہے۔

قوت بینائی یا قوت بصارت اگر چہ بذاتہ ایک کیفیت اور ایک تصرف رکھتی ہے اور دوسری قوتیں اس کے کام اور تصرفات میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں اور نہ بصارت کا ان پر انحصار ہے۔ لیکن پھر بھی بصارت اور قدرت بینائی کو دوسری قوتوں اور دوسرے اعضاء سے ایک نسبت حاصل ہے اور اس نسبت کی وجہ سے وہ متاثر ہوتی ہے یا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

اگر معدہ میں فتور اور دماغ میں تصور ہو تو آنکھوں اور آنکھوں کی بینائی پر ضروری نزلہ گرے گا اور بصارت کسی حد تک ماؤف ہوگی۔ اس طرح قوت شامہ اور قوت سامعہ وغیرہ کی کیفیت ہے۔ یہ سب

قوتیں ایک ہی رشتہ میں پروئی گئی ہیں۔ایک کے فتور سے دوسری میں فتور آنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اگر واہمہ میں فتور ہو تو اس کا اثر کچھ نہ کچھ متفکرہ پر بھی پڑے گا۔مدبرہ اور خیالیہ بھی متاثر ہوگی۔ چاہے ان قوتوں کو جداگانہ کیفیتیں کہو اور چاہے جداگانہ عمل اور جداگانہ حالتیں، دونوں صورتوں میں اس کے درمیان ایک نسبت پائی جاتی ہے۔ایسی نسبت ہمیشہ موثر اور دخیل نہیں ہوتی۔کبھی کبھی عمل پذیر ہوتی ہے۔

بعض قوتیں ایسی ہیں کہ وہ دوسری قوتوں کے مقابلہ میں بطور ایک نگران موید پاسبان کے کام کرتی ہیں۔اگرچہ اصلی قوتوں کی عملی رفتار سبک اور وسیع یا وقیع ہوتی ہے۔لیکن پاسبان قوتوں کی معیت اور موجودگی ان کے واسطے ضروری سمجھی گئی ہے یا سمجھی جاتی ہے۔قدرت نے انسان کو دل، ضمیر، قلب جیسی بے بہا نعمت جو عطا کی ہے اگرچہ وہ بذاتہ بھی ایک طاقت اور ایک وسعت رکھتی ہے اور اسے بہت کچھ حاصل ہے لیکن اس کی پاسبانی اور تائید اجتہاد کے واسطے عقل بھی کام کرتی ہے اور ایسی خدمات بجالاتی ہے کہ جو اپنی ضرورت کے اعتبار سے نہایت قیمتی ہیں۔قوت ارادہ بذاتہ ایک خودرو یا خود عامل طاقت ہے اور اس میں بہت کچھ زور پایا جاتا ہے لیکن باایں ہمہ حالات عقل اس کی نگراں یا پاسبان ہے اور باوجود ارادہ کی وسعت اور مضبوطی کے عقل بہت کچھ مقابلہ کرتی ہے۔

ہر شخص کچھ نہ کچھ عقل اور ارادہ رکھتا ہے اور اسی طرح ہر شخص دل، ضمیر، قلب بھی رکھتا ہے۔اگرچہ ان قوتوں کی کیفیتوں اور مقدار میں فرق ہو لیکن ان کے ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔اگر ایک حکیم تعلیم یافتہ کو یہ قوتیں حاصل ہیں تو ایک جاہل کو بھی حاصل ہیں۔اگر ایک مہذب یہ چیزیں رکھتا ہے تو ایک وحشی بھی رکھتا ہے۔اگر ایک بچہ کے قالب میں ان کا تہیہ کیا گیا ہے تو ایک جوان اور پیر کے جسم میں بھی یہ سامان رکھا گیا ہے۔

اگر دل کے ساتھ قوت عقل کی پاسبانی نہ ہو اور اگر قوت ارادہ کے مقابلے میں عقل کا وجود نہ ہو تو انسانی کاروبار اور اجتہادات میں عموماً وہ خوبصورتی، وہ کمال، اور وہ خصال اجتہاد نہ پائے جاتے جو آپ پائے جاتے ہیں۔قوت ارادہ بہت دفعہ زور میں آکر ان مراحل اور ان منازل پر لے جانے کی کوشش کرتی ہے جو دائرۂ انسانیت اور احاطۂ تمدنی (سوشل) یا مرکز روحانیت سے کہیں دور ہوتے ہیں۔لیکن عقل ایسے اجتہادات کا زور سے مقابلہ کرتی ہے اور ارادہ کو باز رکھتی ہے۔اسی طرح اگرچہ دل قدرتاً ایک بصیرت رکھتا ہے لیکن بعض وقت اس کا اجتہاد عقلی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔

قوتوں کی یہ اثباتی صورت یا ان کا اثباتی پہلو ہے۔اس کے مقابلے میں دوسری منفی صورت بھی ہے جس کا اقتضاء یہ ہے کہ بعض وقت قوتوں کی پاسبانی اور نگرانی یا امداد اور موجودگی کی ضرورت نہیں

رہتی اور قو تہائے زیر پاسبانی کو کچھ عرصے کے لئے آزادی دی جاتی ہے تا کہ اس آزادی سے وہ متمتع ہو کر انسانی زندگی کے نشو ونما کا باعث ہوں اور ایک دوسرے طریق پر انسان ان سے فائدہ اٹھائے۔

دل کے اجتہادی شعبوں کی اصلاح اور امداد کے واسطے عقل کی پاسبانی لازمی ہے اور عقل ہمیشہ سلطان قلب کے دائرۂ دولت پر خلوص کے ساتھ کھڑی رہتی ہے اور ہر وقت خدمات پیش کرنے میں جرأت اور تقدم دکھاتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ بعض اوقات دل عقل کی پاسبانی سے آزاد بھی ہو اور ایسی آزادی وہ کیفیتیں ، وہ چیزیں اور وہ منافع حاصل کرلے جو عقل کی موجودگی میں بہ مشکل حاصل ہو سکتے ہیں یا ہو ہی نہیں سکتے۔ جنہیں عقل پسند نہیں کرتی یا ایسی کیفیتیں عقلی جذبات کے کسی حد تک منافی اور خلاف ہیں۔

انسانی زندگی کے دو شعبے یا دو پہلو ہیں: (الف) شعبۂ فراست (ب) شعبۂ وحشت

بعض انسانی قوتوں کا دونوں شعبوں سے واسطہ اور تعلق ہے اور بعض کا صرف ایک ہی شعبہ ہے۔ قوت عقلیہ کا واسطہ اور وابستگی شعبۂ فراست سے رہتا ہے۔ شعبۂ وحشت سے وہ کوئی وابستگی نہیں رکھتی۔ دل اور ارادہ کا واسطہ دونوں شعبوں سے رہتا ہے۔ عقل دل اور ارادہ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوتی ہے جب شعبۂ فراست کی نوبت آتی ہے۔ جب شعبۂ وحشت سے واسطہ یا سابقہ پڑتا ہے تو عقل وفراست کنارہ کر جاتی ہے اس وقت دل اور ارادہ کی قوتیں آزاد ہو کر متصرف ہوتی ہیں اور وہی تمیز ان کی رہبر اور پیش رو بنتی ہے جو خود ان کی ذات میں موجود ہوتی ہے۔

انسان کے طریق عمل اور مراحل زندگی سے یہ ثابت ہے کہ وہ ایک ہی شعبہ کے ماتحت زندگی خوش اسلوبی سے بسر نہیں کر سکتا۔ اسے دونوں شعبوں سے کام لینا پڑتا ہے اور دونوں شعبے اس کی زندگی کے مرکز اور راہ نما ہیں۔ اگر شعبۂ فراست ہی سے ساری عمر انسان کا تعلق اور وابستگی رہے تو یقیناً وہ ان فوائد اور مقاصد سے محروم رہے گا۔ جو شعبۂ وحشت سے وابستہ ہیں اور اگر ہمیشہ شعبۂ وحشت میں ہی منہمک رہے تو ان منافع سے دور جا پڑے گا جو شعبۂ فراست کی بدولت حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگر انسان زندگی کے تمام حصوں میں شعبۂ فراست ہی سے وابستہ رہے تو اس کی زندگی خود اس کے حق میں اور نیز اس کے ابنائے جنس کے حق میں، تمدن کے حق میں، معاشرت کے حق میں، معاد کے حق میں ایک بے مصرف اور بے سود زندگی ثابت ہوگی۔ گو وہ فراست سے بھرپور رہے گا اور اس کے دل ودماغ میں عقل کا مصالحہ کثرت سے جاگزین ہوگا لیکن جو سرور، جو فرحت، جو حظ اور جو معادی منافع شعبۂ وحشت سے حاصل ہو سکتے ہیں وہ شعبہ فراست سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

جب تک کہ عقل کی پاسبانی یا عقل کی نگرانی سے بعض انسانی قوتیں آزاد نہ ہوں۔

خبر از حال من نمی گیرد

تا مرا بے خبر نہ گرداند

انسان طبعاً سرور اور فرحت کا طالب یا خواہاں ہے اور بغیر اس کے اس کی زندگی کے اکثر حصے بے سود رہتے ہیں۔ سرور اور فرحت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ کوئی مشاہداتی سرور ہے اور کوئی معانقیہ، کوئی عملی ہے کوئی نظری، کوئی لمسی ہے کوئی کیفی ہے، کوئی حقیقی ہے کوئی عارضی یا لازمی۔ بعض سرور اور بعض فرحتیں شعبۂ فراست سے بھی وابستگی رکھکر حاصل ہوتی ہیں لیکن بعض بجز اس کے حاصل نہیں ہوتیں کہ شعبۂ فراست سے قطع تعلق کر کے صرف شعبۂ وحشت سے ہی چندے واسطہ رکھا جائے۔

منازل دنیوی اور مقاصد تمدنی سے گریز فراست سے خلاف ہے۔ فراست ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ انسان انہیں بکھیڑوں میں مدت العمر سرگرداں رہے۔ لیکن کبھی کبھی انسان بہ اثر شعبۂ وحشت اس بات کا بھی خواہاں ہوتا ہے کہ ان دماغ سوزیوں اور بکھیڑوں سے رہائی بھی پائے اور یہ خوشی بھی حاصل کرے۔

دلا بہ یاد دہانش چہ غنچہ مے چینی؟

ترا کہ گفت کہ برخویش کار تنگ بگیر؟

عورت اور مرد کے تعلقات اور وابستگیوں میں جو انسان کی خوشیوں اور مقاصد کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہیں۔ بہت کچھ ایسے طریق عمل پائے جاتے ہیں کہ شعبۂ فراست سے کسی قدر دور ہیں اور فراست جن کا تعاقب غیر موزوں سمجھتی ہے یا یہ کہ ان کے بعض حصوں میں فراست کو کوئی دخل نہیں ہوتا وحشت ہی وحشت ہوتی ہے۔

یا ایسی کیفیتیں ہوتی ہیں کہ جن کی تاویل وحشت کے اصول پر کی جاتی ہے اگر چہ بعض وقت بعض ایسی وحشتوں کا نتیجہ اور اثر فراست کے مطابق ہوتا یا نکلتا ہے۔ لیکن اگر ان کا شروع اور خاتمہ دیکھا جائے تو وہ سراسر وحشت کا ایک واضح خاکہ ہوتا ہے۔ ایسی وحشت یا ایسا خاکہ جس سے انسان باوجود خود عاقل ہونے کے بھی شمع فراست کی روشنی میں ایک وحشت ہی سمجھتا ہے اور باوجود ایسا سمجھنے کے مارے شرم یا حجاب کے ان کی تاویل فراست آمیز کرنے کی جرأت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کا راز افشا نہ ہو۔ اور اگر کبھی ہو تو فراست ان کا پہلو لئے ہوئے ہو۔

ہیچ گفتن نتوانم زدہان و کمرش

خبر از عالم اسرار نہ دارم چہ کنم؟

محبت کی لے میں انسان جو کچھ کرتا یا کر بیٹھتا ہے اس کا اکثر حصہ بعض وقت فراست سے بعید اور متانت

سے بالا ہوتا ہے۔ فراست مزاحم اور مانع ہوتی ہے لیکن شعبۂ وحشت کی سینہ زوری اور کش مکش فراست کا مقابلہ کرتی اور اسے زک دیتی ہے۔ گو بعد میں کسی وقت انسان ایسے ظلماتی جذبات سے پشیماں ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ لیکن شروع شروع میں ان سے باز رہنا زندگی کی خوشیوں کی کمی سمجھی جاتی ہے اور ایسے ہی جذبات پر زور دیا جاتا ہے۔

بہ گلشن وصف رویت کردم وگل را خجل کردم
حدیثے گفتم از موئے تو سنبل را خجل کردم

گو بعض حرکات اور بعض امور ایسے جذبات کے تابع محض وحشت ہی نہیں ہوتے ان میں کچھ کچھ فراست بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کا اکثر حصہ وحشت سے وابستہ ہوتا ہے اور اسی وحشت پر انسان کی خوشی اور فرحت کا بہت کچھ مدار ہوتا ہے اور وہ آگے چل کر کسی دوسرے پہلو میں تمدن اور دنیا کے واسطے مفید ثابت ہوتی ہے۔

بیوی اور خاوند کے تعلقات میں دنیا اور تمدن کی تمام عمدگیاں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں اور انسانی معاشرت کا یہ ایک بڑا جزو اور اہم حصہ ہے لیکن اگر اس اہم حصے کے ان اجزا کا مطالعہ کیا جائے جو اپنی تہہ میں وحشت اور کثافت رکھتے ہیں تو کہنا پڑے گا کہ وہ اجزائے کثیفہ فراست سے ایک فاصلہ پر ہیں۔ یا یہ کہ ان میں فراست کا نام ونشان ہی نہیں پایا جاتا اور دونوں فریق ایسے اجزا سے عقلی پیرایہ میں مجتنب رہنا بعض وقت مناسب خیال کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کے دل و دماغ میں ایک قسم کی شرم آمیز گدگدی سی ہو کر انہیں ناگفتہ بہ حرکات پر محترزانہ توجہ دلاتی ہے۔

پانچ چیزیں یا پانچ کیفیتیں ایسی ہیں جو انسان کی فراست وبینش پر پردہ ڈالتی ہیں یا فراست اور بینش اس کی موجودگی میں تھوڑی دیر کے واسطے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

(الف) عورت، (ب) بچہ (ج) آئینہ (د) خوبصورتی (ہ) جدت

عورت کی صحبت، عورت کی قربت، عورت کی خواہش، عورت کی چاہت، عورت کی محبت، عورت کی عداوت عورت کی کاوش میں کچھ نہ کچھ یا کسی نہ کسی وقت وحشت کا سماں ہوتا ہے۔ فراست اور عقلمندی دور سے تماشا دیکھتی ہے لیکن ان جذبات پر غالب نہیں آسکتی اور جب غالب آتی ہے تو یہ جذبات باقی نہیں رہتے۔

بچہ کے سامنے یا بچہ کے ساتھ ہونے سے عقل وفراست تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ جاتی ہے۔ دانا سے دانا ماں باپ بچہ کے ساتھ ایسی حرکات کرتے ہیں جو عقل وفراست سے دور ہوتی ہیں۔ گویا بچہ کے ساتھ بچہ ہی ہو جاتے ہیں اور ان حرکات وجذبات میں ایک حد تک وحشت کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ آئینہ کے سامنے بھی انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کی وحشت طاری ہونے لگتی ہے گویا اس کا پیمانہ

بہت بڑا نہ ہو مگر کچھ نہ کچھ ہوتی ضرور ہے۔

وہ لوگ جو ہمیشہ اس وعظ کرنے کے عادی ہوتے ہیں کہ اترانا انسان کی ذلیل ترین صفات سے ہے وہ بھی آئینہ کو دیکھکر کسی نہ کسی حد تک ایسی حرکات کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جن کا مفہوم اترانا ہی ہو سکتا ہے۔

خوبصورتی بھی بعض حالات میں عقل وفراست کی دشمن ہے۔ چاہے یہ خوبصورتی ہو، چاہے روحانی، چاہے مجسم ہو اور چاہے خیالی، چاہے مادی، چاہے معادی۔ خوبصورت شے، خوبصورت صنعت، خوبصورت حرفت، خوبصورت سماں، خوبصورت انساں، خوبصورت حیواں کے دیکھنے سے انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کا جوش پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنے جذبات میں ایک ایسا تموج پاتا ہے جو اسے کسی حد تک فراست سے دور لے جاتا ہے۔ طبیعت للچاتی ہے اور دل و دماغ بے انداز امنگوں سے بھر جاتے ہیں اور ایسی حرکات یا ایسے جذبات سے انسان اپنے دل میں ایک قسم کا سرور اور خوشی پاتا ہے۔

سب سے اخیر پر جدت ہے۔ جدت بھی ایک حد تک وحشت کا سماں لاتی اور وحشت کا تماشا دکھاتی ہے۔ کوئی چاہے روز راگ سنے لیکن جب کبھی موسیقی میں کوئی شخص جدت طراز ہوتا ہے تو انسان پر کسی اور ہی حیثیت سے اثر ہوتا ہے۔

عشق پیدا کرد آں لیلےٰ نسب

بید مجنوں گشت سر و قامتش

بانسری کی آواز سن کر بعض انسانوں کے دل اور دماغ پر جو کچھ گزرتی ہے وہ وحشت اور تذبذب کا ایک زندہ نمونہ ہوتا ہے۔ دوسرے انسان خیال کرتے ہیں کہ ہر ایسا شخص ان حالات میں کیفیت فراست اور مادۂ بینش سے کسی حد تک خالی ہے اور اس پر وحشت حکمران ہے۔

انسان چاہتا ہے کہ ایسے اوقات وحشت میں دل کی کہانی سنائے اور دوسروں کو بھی اپنے ذوق وشوق میں ملائے۔ لیکن ایسا کر نہیں سکتا۔ خود ہی مزے لیتا اور اور خود بھی وحشی بنتا اور اپنا تماشا خود دیکھتا ہے۔

کس چو من حسرت کش آں لعل شکر بار نیست

زہر دارم در دہان و زہرۂ اظہار نیست

بعض وقت انسان بے تکلف مجلسوں، محفلوں، کلب گھروں میں جا کر بھی ایک حد تک فراست سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کا ایک حصہ اس سرور، اس حظ اور اس فرحت میں گزارنا چاہتا ہے جو اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ وحشت اور آزادی بھی رکھتی ہو۔ یہ ایک ایسی دھن ہے کہ اس سے بہت ہی تھوڑے انسان

خالی ہوں گے اور باوجود اس کے کہ یہ ایک وحشت نما سماں کہا جاتا ہے پھر بھی اس کی ضرورت ہے۔ کسی تفریح کی محفل میں جا کر دیکھو کہ فراست ایسے مجمع میں کس خاموشی سے دور دراز فاصلہ پر کھڑی ہے۔ اور دل جیسی طاقت تفریحات کی لے میں کس خوشی سے وحشت کا خیر مقدم کر رہی ہے۔

از پئے آں بت برہمن گشتہ ام
آدمی را عشق کافر می کند

عنوان میں جو شعر درج کیا گیا ہے یہ اس تمام بحث کا گویا خلاصہ ہے۔ یہ شعر حضرت اقبال سیالکوٹی ثم لاہوری کی نازک خیالیوں کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ حضرت اقبال نے اس شعر میں جس متانت، جس عمدگی، جس وسعت اور جس خوبی سے مضمون زیر بحث کو دکھایا اور ثابت کیا ہے، الحق وہ انہیں کا حصہ ہے۔ آپ پہلے مصرعے میں فرماتے ہیں۔

ضروری ہے کہ پاسبان عقل دل کے پاس رہے اور دلی اجتہادات میں اس کا رہبر اور مددگار ثابت ہو۔ کیونکہ قدرت نے عقل و فراست کی نوکری لگا رکھی ہے۔ ایسی پاسبانی اور نگرانی بری نہیں۔ اس میں تمدنی، معادی اور معاشرتی منافع متصور ہیں۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ کیونکہ زندگی کی اصلی خوشی اور اصلی نشوونما کبھی کبھی تنہا چھوڑ دینے سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ لازمی ہے کہ طائر دل قفس عقل میں قید اور بند رہے۔ مگر آزادی کے لطف اٹھانے کے واسطے وحشت اور خود روی بھی ضروری ہے اور یہ آزادی سوائے اس کے حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کا لطف جبھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ کبھی حضرت دل مصاحبت فراست سے الگ بھی گزاریں۔

عقل و فراست اجتہادی رنگ میں ایک نکتہ چیں مصاحب ہے اور نکتہ چینی کی زندگی میں فرحت و خوشی اور آزادی کا ہونا معلوم۔ عقل و فراست کی پابندیوں سے اگرچہ انسانی دل بہت کچھ نیک اور مفید اجتہادات کرتے اور کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن جب حضرت دل بقول حضرت اقبال دام اقبالہ تنہا چھوڑ دئے جاتے ہیں تو اس حالت میں ان کی کیفیت جس خوبصورتی اور جس آزادی سے جلوہ افروز ہوتی ہے اس کا مقابلہ عقل و فراست کیا کر سکتی ہے گو وہ ایک قسم کی دیوانگی ہی کہی جائے لیکن ایسی دیوانگی پر ہزاروں فرزانگیاں بھی قربان ہیں۔

بڑے بڑے حکیموں اور بڑے فلاسفروں نے بھی اخیر پر حضرت اقبال کے مشورہ پر عمل کیا اور فرزانگی سے جان چھڑا کر دیوانگی تلاش کی ہے۔

در مرا جسم رگ سودائے ہست
زاں مژہ نیشترے می خواہم

ڈاکٹر اقبال کی اس تھیوری کا ثبوت جو انہوں نے اپنے شعر میں قائم کی ہے، ہر دل، ہر دماغ، ہر ضمیر اور ہر شخص دے رہا ہے اور ہر شخص کی زندگی کی اس کی گواہ ہے اور عملی رنگ میں اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے اور کوئی شخص اس سے انکار اور اعراض نہیں کر سکتا۔ یہ تھیوری تمدن کی بنیاد انسانیت کی جز، آدمیت کی بنیاد اور آزادی کی جان ہے۔

معاشرت اور معاد دونوں کا اس سے اپنے اپنے وقت پر واسطہ پڑتا ہے اور ہر شعبہ اپنے اپنے رنگ میں اس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مرزا صائبؔ نے اپنے رنگ میں زندگی کے متعلق ایک شعر کہا ہے۔ لیکن حضرت اقبال کے شعر میں جس خوبی سے یہ نکتہ حل کیا گیا ہے وہ کچھ اور ہی لطف رکھتا ہے۔ ہم حضرت مرزا صائب کے شعر پر یہ بحث ختم کرتے ہیں۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں گداز نیست

(سلطان احمد از بہاولپور)

---

(۲) ''حضرت اقبال کا طرز جدید''

''شاعری ایک فن ہے۔ جس طرح کوئی فن محض علم کی صورت میں فن ہونے کے اعتبار سے اپنی خوبیوں اور کمالات کے اظہار میں کامیاب نہیں ہوتا، اسی طرح فن شاعری بھی محض علمی دائرہ میں رہ کر شاعرانہ کمالات کے اظہار میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ شاعری کی کتابیں پڑھ لینا ایک علم ہے اور شاعر بننا ایک ایسی مشق ہے جس سے انسان باعتبار ایک شریف فن کے فن شاعری میں عملی رنگ میں مہارت پیدا کرتا اور ان کمالات تک پہنچتا ہے جو اس فن میں مُستتر ہوتے ہیں۔ علم محض جاننا یا معلوم کرنا ہے۔ لیکن فن وہ ہے جس میں جاننے اور معلوم کرنے کے بعد مختلف مواد اور مختلف اشیاء کو جدید تراکیب اور جدید ترتیب کے تابع کیا جاتا ہے۔ جو شخص عملی مراحل سے گزر کر فن مراتب تک پہنچ جاتا ہے وہ گویا مختلف قسم کے معلومات پر ایک ایسی دسترس حاصل کر لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ گویا اس کا ایک حکم بن جاتا ہے اور مشق

کرتے کرتے اس فن کی مختلف صورتیں عملی رنگ میں اس کے قابو میں آجاتی ہیں۔اور رفتہ رفتہ وہ اس فن اور تجربہ کے ماتحت ایک صحیح الذہن حکم ہونے کی وجہ سے مختلف عملی شوارع اور طرزوں کا وارث ہو جاتا ہے مثلاً جو شخص فن معماری میں کامل ہے۔ وہ اس کمال کی وجہ سے معماری کی مختلف خوش آیند اور خوش نما صورتوں سے واقف ہوگا۔ اور ان کے اظہار میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔اپنے اپنے وقت پر بلا تکلیف ان سے کام لے سکے گا۔ایک تجربہ کار انجینئر مختلف شعبوں میں کام کر سکتا ہے۔باوجود اس کے بھی اس کے مختلف طرزوں میں سے ایک وہ طرز ہی ایسے ہوں گے جو اس کے مذاق کے زیادہ تر تابع یا موزوں ہوں گے اور ان ہی طریقوں سے اس کی طبیعت کو ایک اخص نسبت ہوگی۔ جیسے ایک طبیب یا ایک ڈاکٹر باوجود تمام امراض کا علاج کرنے کے بھی خاص کر چند ہی امراض کے متعلق خاص تجربہ رکھتا ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ سوائے ان چند امراض مخصہ کے ایسا طبیب یا ایسا ڈاکٹر دوسرے امراض کا علاج یا تشخیص کر ہی نہیں سکتا۔

یہی صورت اور نقشہ شاعروں کا بھی ہے۔ ہر شاعر بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں شاعر ہی ہو۔ باوجود ایک خاص طرز کے رکھنے کے بھی دوسری طرز پر بھی طبع آزمائی کر سکتا ہے اور اسی مشق سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ اپنا طرز خاص چھوڑ چکا ہے یا کسی جدید طرز کے اختیار کرنے سے وہ شاعری کے دائرہ سے نکل گیا ہے۔یا خدانخواستہ اس کی شاعری میں کوئی نقص آ گیا ہے۔ جو لوگ فن شاعری میں کچھ بھی دسترس اور مہارت رکھتے ہیں وہ ایسی بحث کا بہت اچھی طرح سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔مختلف نامور شاعروں کی شاعری یہ ثابت کر دے گی کہ ایک طرف شاعر ایک حد تک پابندی میں ہوتا اور دوسری طرف اپنے خاص طرز کا بھی مالک یا خود مختار بادشاہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک ایسا دریا ہے جو اپنے طبعی زور اور فطری جذبات سے ہر طرف جا سکتا ہے لیکن بعض اوقات اس کی ایک خاص رو بھی ہوتی ہے جو دوسرے بھنور اور دریاؤں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ہم ایک حد تک جداگانہ مذاق کے تابع ہیں۔لیکن باوجود اس کے دوسرے مذاق سے بھی ہم ایک حد تک آشنا ہو سکتے ہیں۔

گذشتہ جلسہ سالانہ انجمن حمایت اسلام لاہور پر ہمارے کامیاب اور نامور شاعر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لاء نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا کچھ حصہ ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء کی زمیندار میں شائع ہوا ہے۔اس نظم کی نسبت پنجاب کے بعض اخبارات میں یہ بحث اٹھائی گئی ہے۔

(الف) یہ نظم حضرت اکبرالہ آبادی بالقابہ کے رنگ میں کہی گئی ہے

(ب) اس نظم کے بعض اشعار فقط اقبالی رنگ سے نکل گئے ہیں

ہم نے نظم زیر بحث کو پڑھا ہے۔ ہماری رائے میں اگر حضرت اقبال نے ان ابیات میں حضرت اکبر کا رنگ اختیار کیا ہے تو اس سے اقبال کی شاعری پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔ اول تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اشعار میں اکبری رنگ کیا کچھ آ گیا۔ اور اگر آ بھی گیا تو اس سے کیا قباحت پیش آ گئی۔ خود حضرت اکبر کے اشعار میں سے ہم ایک نہیں بہت سے اشعار ایسے پیش کر سکتے ہیں جو حضرت غالبؔ اور اقبالؔ کے رنگ میں کہے گئے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب شاعر فن شاعری کے کمالات کی حد تک رفتہ رفتہ پہنچ جاتا ہے تو چونکہ کمالات کا مرکز فقط انتہائی یا ایک ہی ہوتا ہے اس واسطے حدود و کمالات اور اظہار کمالات میں ایک حد تک توافق اور تناسب پایا جاتا ہے اور بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اہل کمال یا دونوں شاعروں کے کلام میں ایک توارد یا ایک تناسب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دونوں اہل کمال یا دونوں شاعر ایک ہی نقطۂ خیال یا ایک ہی نقطۂ بحث سے مناظر اور واقعات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ انتہائی نقطۂ خیال یا نقطۂ بحث ان حالات میں حضرت اکبر اور حضرت اقبال کو ایک ہی مذاق اور ایک ہی دھن کا مشاق ظاہر اور ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھو مختلف مذاقوں کے صوفیائے کرام کے کلام میں کس قدر یگانگت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ان میں بظاہر کوئی آشنائی اور تو اصل نہیں ہوتا۔ انسان کو دو حواس دیئے گئے ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے ظاہری اور باطنی حواس ہیں اور ایک وہ حواس جو ان دونوں سے جداگانہ ہیں اور جو ان حواس سے بہت افضل اور اعلیٰ ہیں۔ جب کوئی انسان کسی فن میں کامل ہو جاتا ہے تو اس تیسری قسم کے حواسوں سے کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس وقت ایسے مختلف قسم کے حواسوں کے ادراکات اور جذبات میں ایک قسم کی نسبت اخص پائی جاتی ہے۔ حضرت اقبال اور حضرت اکبر کے شاعرانہ حواس اپنی اپنی کمالات کی وجہ سے تیسری قسم کے حواس ہیں۔ ان میں مناسبت اور توارد کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے۔ بلا تکلف ایک حواس دوسرے حواس کے تصرفات اور جذبات سے کام لے سکتا ہے اور ان حالات میں شاعر کا ہر حدیہ رنگ اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ اگر لوگ آئینۂ خیال میں اس بحث کا خوبی و عمدگی سے عکس لے کر دیکھیں گے تو انہیں اپنے سطحی خیالات سے ہٹنا پڑے گا۔ میں ادب سے یہ پوچھوں گا جو کاریگر جو ماہر ایک حد تک دوسرے کا رنگ اڑا نہیں سکتا اس کی کاریگری اور مہارت ہی کیا ہے۔ رہی ابھی یہ بات کہ ایسا کرنے میں کامیابی کہاں تک ہوئی یہ ایک دوسری بحث ہے۔ اگر لوگوں کو حضرت اقبالؔ اور حضرت اکبر کے طبائع کے نکات کے وزن کرنے کا موقعہ ملتا ہو تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان کے ان کمالات میں کہاں تک نسبت ہے۔ اور خود حضرت اکبر حضرت اقبال کی شان میں کیا کہتے ہیں اور حضرت اقبالؒ کو حضرت اکبر کے کمالات کا کہاں تک اعتراف ہے

باوجودیکہ دونوں کا طرز جداگانہ رنگ رکھتا ہے لیکن بعض خیالات میں دونوں ایک ہی نقطہ کے پرستار ہیں۔

حضرت اکبر کا رنگ ایسا نہیں ہے کہ اسے حضرت اقبال بعض وقت اختیار نہ کر سکیں۔ اکبری رنگ وہ ہے جس سے حضرت اقبال مدتوں سے مانوس ہیں اور ان الفاظ میں اس کے مداح ہیں جن سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں۔ اور حضرت اقبال کی وقعت حضرت اکبر کے دل میں جو کچھ ہے وہ حضرت اقبال کے واسطے ایک بزرگانہ سارٹفکیٹ ہے۔

یہ کہنا کہ ابیات زیر بحث حضرت اقبال کے اپنے رنگ سے نکل گئے ہیں یا ان کا وہ رنگ نہیں جو حضرت اقبال کی شاعری کا خاصہ تھا درست نہیں۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر فن کی خصوصیات میں سے یہ بات بھی ہے کہ جب اس کے اصناف مختلفہ سے کام لیا جاوے تو ان کا رنگ جداگانہ ہو۔ شاعر جب قصیدہ کہتا ہے تو اس کا رنگ غزل اور رباعی سے جداگانہ ہوتا۔ جب شاعر رزمی مباحث میں پڑتا ہے تو اس کا رنگ عاشقانہ مثنوی سے الگ ہوگا۔ ابیات زیر بحث میں حضرت اقبال نے مختلف مضامین پر بحث کی ہے اور ایک خاص رنگ میں ضروری تھا کہ ان سب کا جداگانہ رنگ ہوتا۔ کیا شاعر مختلف مضامین کا ایک ہی طرز پر بیان کر کے کمالات شاعری کا اظہار کر سکتا ہے۔ ان ہی بعض اشعار کے بعض بندوں کی نسبت یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا بعض مضمون یا مبحث نفاست یا ضرورت کے مدارج سے گرا ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو ہمیشہ مقولہ کی نسبت زیادہ تر قایل پر نظر کرنے کے عادی ہیں۔ ہماری رائے میں ان تمام اشعار کے مضامین اپنی اپنی مبحث کے اعتبار سے قابل غور اور قابل بحث ہیں اور ان پر بہت کچھ بحث ہو سکتی ہے۔ اس واسطے نکتہ چینی مفید بحث نہیں ہو سکتی کہ اس کا قایل فلاں ہے۔ بلکہ اس جہت سے کہ یہ مقولہ یا یہ قول کیسا ہے، مدعی ہو سکتا ہے۔ حضرت حافظؔ اور شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے مختلف اصناف شاعری کو جداگانہ دیکھو کہ ان میں کہاں تک مناسبت پائی جاتی ہے۔ بعض وقت کہنا پڑتا ہے کہ خدا جانے کہ یہ کسی دوسرے شاعر کا کلام ہے۔ بے شک غور و تعمق سے ایسے اشارات شاعری بھی شاعر کے مذاق اور اصلی رنگ پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن پھر بھی دوسرا یا اجنبی نمونہ ضرور پایا جاتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اشعار زیر بحث میں غور کرنے والوں کے واسطے اقبالی جھلک موجود اور درخشاں نہیں ہے۔ غور کرنا شرط ہے۔ حضرت اقبال ارشاد فرماتے ہیں:۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

حضرت اقبال نے ان تین شعروں میں تعلیم نسواں کا جو فلسفہ باعتبار ضروریات اور حوائج تمدنی اور مشرقی رسم و رواج کے بیان کیا ہے۔ اس پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ حضرت اقبال کا استدلال اور پیشین گوئی اپنی تہ میں بہت کچھ صداقت رکھتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نری انگریزی پڑھنے سے قوم کی اصلی فلاح مقصود نہیں ہے۔ کتنے انگریزی دان ملک و قوم میں ایسے ہیں جو باوجود انگریزی دانی کے بھی انواع و اقسام کی تکلیفات میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہ کسی محکمہ میں جا کر دیکھ سکتے ہو کہ محض انگریزی دانی سے ہی قومی فلاح متصور نہیں، اس کے واسطے کوئی ایسی راہ نکالو جو تمدنی رنگ میں بھی مفید ہو۔ نہ صرف یہ کہ انگریزی بول کر خوش کر چھوڑا کیا اس میں کوئی شک ہے، اور کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ محض انگریزی دانی فلاح کی راہ نہیں ہے۔ کیا جن ممالک میں انگریزی نہیں ہے ان کی عورتوں میں فلاح نہیں ہے۔ فرانس کی عورتوں میں سے شاید چند ہی عورتیں انگریزی جانتی ہوں کیا ان میں فلاح اور فلاحی جذبات نہیں ہیں۔ عورتوں کے واسطے باعتبار اپنے ملک اور اپنی قوم کی ضروریات کے اصلی فلاح کی ضرورت ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ جو لوگ عورتوں کو محض انگریزی پڑھانے میں ساعی ہیں ان کی کچھ بھی رائے ہو۔

اگلے شعر میں حضرت اقبال نے اس خصوصیت بادلیل کی یہ تفصیل کی ہے کہ یہ طریقہ محض اس واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ روش مغربی یا روش یورپین مدنظر ہے۔ اور اس کے مقابلے میں وضع مشرقی کو گناہ سمجھا گیا ہے۔ ورنہ مشرق کو طے کرنے کے بعد لڑکیوں کا مغرب کی جانب جانا ضروری تھا۔ اس میں کوئی بھی مبالغہ اور تحکم نہیں ہے۔ جب ایک طرف قوم قوم کا راگ گایا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بنیاد رکھی جاتی ہے کہ بجائے مشرقی راہ و رسم کے ازسرتاپا مغرب ہی مغرب ہو تو اس کے معنی کیا ہیں۔ کوئی قوم اس وقت تک اس زمانہ میں باقی نہیں رہ سکتی جب تک اپنی قومیت باقی نہ رہے اور کوئی قومیت باقی نہیں رہ سکتی جب تک ایک بڑی حد تک اپنے رسوم واجبہ سے محبت اور رسوم اغیار سے امن و امان اور آزادی کے ساتھ نفرت نہ ہو۔ اور یہ صورت کسی صورت میں متصور ہے جب اپنا اثاثہ باقی ہو۔ جب اپنا اثاثہ باقی ہی نہیں رکھا جاتا تو غیرت کس طرح ہو سکتی ہے۔ نمونے کے طور پر لے لو۔ مغرب اور رسوم مغرب کو کیا مغرب میں آنے والوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مغرب میں جو کچھ سیاہ و سفید پایا جاتا ہے وہ قابل تقلید اور قابل اخذ ہی ہے یا اس میں کوئی برائی نہیں۔ میری رائے میں ہر ملک کی تہذیب ضرور ایک حد تک اختیار ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ بیسیوں اس قسم کی مغربی روشیں ہیں جو بادی النظر میں بھی قابل اخذ نہیں یا قابل تعریف نہیں ہیں۔ ایسی رسمیں اور ایسی پابندیاں کہ خود بعض اہل مغرب بھی ان سے بے زار ہیں۔ مگر اس واسطے

چھوڑتے نہیں یا چھوڑ سکتے نہیں کہ قومیت کے دائرہ سے نکلنا پڑتا ہے۔

حضرت اقبال درد بھرے دل سے فرماتے ہیں کہ ان معنوں میں انگریزی خوانی موجب فلاح ثابت نہ ہوگی۔ کیا اس میں کوئی شک وشبہ کرسکتا ہے۔ جو ایسا شبہ کرتا ہے وہ سوچنے کے بعد معلوم کرسکتا ہے کہ اس کی رائے ایک بڑی حد تک فریب دہ ہے۔ تیسرے بند میں حضرت اقبال فرماتے ہیں:۔

یہ روش جو اختیار کی جارہی ہے اور جس پر بعض جلد باز اور ظاہر بین لوگ زور دے رہے ہیں کیا نتیجہ پیدا کرے گی اور اس کا ماحصل کیا ہوگا۔ عمل کے بعد ظاہر ہوگا جب اس کا پردہ اٹھے گا اس وقت دیکھنے والے دیکھ لیں گے کہ حضرت اقبال کے کہنے میں کہاں تک صداقت تھی۔ حضرت اقبال نے بعض واقعات پر مدبرانہ استدلال کے بعد ایک رائے قائم کی ہے۔ لوگ انتظار کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک درست اور صحیح نکلتی ہے۔ قاہرہ اور مصر میں یہ چالیں ثمر آور ہورہی ہیں۔ ان سے لوگ قیاس کرسکتے ہیں کہ اس کا اثر ہندوستان میں کیا کچھ ہونے والا ہے۔ لوگ ان ہر سہ بندوں کو تجربہ کی خاطر شیشوں میں لگوا کر کمروں میں رکھ چھوڑیں اور رفتہ رفتہ دیکھیں کہ حضرت اقبال کے خیالات کا ظہور کس کس رنگ میں ہوتا ہے۔ حضرت اکبر نے بھی اس بارہ میں بہت کچھ کہا ہے۔ وہ اشعار بھی ساتھ ہی رکھے جاویں۔

پھر حضرت اقبال فرماتے ہیں:۔

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند	غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض	کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

ان اشعار میں بھی زمانہ کا نقشہ کھینچ کر دکھایا گیا ہے اور کس خوبصورتی سے جب عورتیں کونسل کی ممبری کے واسطے کوشاں ہوں گی تو کیا یہ کہا جائے گا کہ انہیں خانہ داری اور اولاد کی خواہش باقی رہے گی۔ فرانس کا نقشہ پیش نظر ہو جائے گا اور ہر عورت ممبری کی خاطر بار خانہ داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش میں رہنا اعلیٰ فرض سمجھے گی۔ لیکن یورپ میں اس وقت عورت نے حضرت اقبال کی اس پیشین گوئی کو سچ کرکے نہیں دکھا دیا اور کیا صدہا عورتیں لندن میں اس وقت مردوں کی خرابی کا باعث نہیں رہیں۔ اور کیا ان کے اس مشغلہ یا اس استدعا سے خانہ داری کا کارخانہ تباہ نہیں ہورہا۔ کیا مغرب کا بہت سا حصہ ان مشکلات کا احساس نہیں کررہا۔ اگر حضرت اقبال نے غیرت کا واسطہ ڈال کر یہ خبر دے دی ہے، تو گناہ کیا کیا۔

حضرت اقبال نے اخیر پر ایک معنی خیز بند کہا ہے۔ ہم اور اشعار کی تشریح کو ملتوی رکھ کر اس پر ختم کرتے ہیں۔

اس دور میں سب مٹ جائیں گے پھر زندہ رہے گا باقی وہ
یہ قائم اپنی رہ پر ہے جو پورا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو، کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کیسی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
اک وقت وہ تھا جب رہتے تھے باہم مل کر ایک سے ایک
اب بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

ناظرین! یہ بند دوسری تمام نظم اور بندوں سے ملا کر پڑھیں۔ پھر انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حضرت اقبال کا ان اشعار سے مطلب کیا ہے اور وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت اکبر مدظلہم کی تمام شاعری جس طرح واقعات کی بنیاد پر ہے اسی طرح حضرت اقبال کا کلام بھی ہے۔ حضرت اکبر کی شاعری ایک بسیط تشریح کی محتاج ہے۔ اور خوش قسمت ہوگی وہ نسل جو عملی رنگ میں اس کی شرح سے مستفید ہوگی۔ اس اخیر بند اقبالی کی تشریح میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بیسیوں جلسوں میں اس پر بحث ہو سکتی ہے اور وہ نکات روشنی میں لائے جا سکتے ہیں جو قومی اور ملکی بہبود کے واسطے تمدنی پہلو سے اصول اور گر شمار ہو سکتے ہیں۔" (سلطان احمد از لندن)

بے مثال ادبی شاہکار

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مرزا سلطان احمد اقبالؔ کے مخلص ترین پرستاروں اور مداحوں میں سرفہرست تھے۔ اقبال کی پہلی تصنیف اسرار خودی ۱۹۱۵ء کے وسط میں شائع ہوئی تو لوگوں نے اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس سیل کارواں کے علمبردار خود علامہ کے دیرینہ یار غار خواجہ حسن نظامی صاحب تھے۔ انکے علم بغاوت کے زیر سایہ چھوٹے بڑے مولوی صاحبان سراپا احتجاج رہے اور دوڈھائی سال تک اقبال کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ مخالفین نے تصوف کی آڑ میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ اقبال نے اسرار خودی لکھکر خواجہ حافظ شیرازی اور متوصفین کا مذاق اڑایا ہے۔ انہوں نے متعدد رسالوں اور اخباروں میں اقبال کے خلاف مضامین کے طومار شائع کئے۔ اکبر الہ آبادی بھی اقبال کے خلاف ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب اور اکبر نے مرزا سلطان احمد کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ موصوف سب کچھ سنتے رہے لیکن ایک لفظ بھی اقبال کے خلاف منہ سے نہیں نکالا۔ بلکہ اسرار خودی کا بغائرنظر مطالعہ کرنے میں مصروف رہے۔ اس بارے میں اقبال

مہاراجہ کشن پرساد شاد کو ۳۰ر ستمبر 1915ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

''مرزا سلطان احمد خان بہادر جو پنجاب کے مبصر اور اہل ہیں اس (اسرار خودی) پر ریویو کر رہے ہیں۔ آپ کا ریویو مثنوی کو چار چاند لگا دے گا۔''

خدا مغفرت کرے مرزا سلطان احمد کو جنہوں نے سب سے پہلے اقبال پر ایک مستقل کتاب ''النظر'' کے نام سے لکھی جب اسرار خودی اور اقبال کے خلاف کٹھ ملاؤں نے ایک محاذ قائم کیا تھا۔ النظر مرغوب ایجنسی لاہور سے ۱۹۱۹ء کی ابتداء میں شائع ہوئی تھی۔ سرورق کے دوسرے صفحے میں ''مرغوب ایجنسی لاہور'' کی طرف سے ''شکریہ'' کی عبارت ذیل جلی حروف میں چھپی ہے:۔

''عالی جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی کرما فرمائی کا تہ دل سے ادا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بطیب خاطر الطاف کریمانہ کو کام فرما کر اپنے اس النظر کے چھاپ لینے کی اجازت کا ہمیں پورا اختیار اور ایجنسی کو کامل امتیاز بخشا۔''

یہ بات میرے لئے انتہائی حیران کن ہے کہ مرزا صاحب کے اس گوہر نایاب اور بیش قیمت دُرِ یتیم کا نام و نشان اقبالیات میں مجھے کہیں نظر نہیں آیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال کا صد سالہ جشن ولادت پاکستان کے طول و عرض کے علاوہ ہندوستان میں بھی منایا گیا اور یہ سال ''سال اقبال'' قرار دیا گیا تھا۔ سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مضامین شائع کئے گئے۔ اقبال پر کئی کتابوں کے نت نئے ایڈیشن بار بار شائع کئے گئے۔ لیکن النظر کا یہ انمول موتی نہ معلوم کن اسباب کی بنا پر ماہرین اقبالیات کی نگاہ سے پوشیدہ رہا۔ ماہرین کا ذکر ہی کیا خود علامہ اقبال نے اپنے خطوط یا مضامین میں النظر کے چھپنے کے بعد کوئی تذکرہ اس کتاب کے حوالے سے مرزا سلطان احمد یا ان کی اقبال شناسی کا نہیں کیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں الناظر لکھنؤ میں اسلم جیراجپوری صاحب کے مضمون اسرار خودی پر اقبال کی حمایت میں شائع ہوا تھا۔ جب اقبال کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو انہوں نے جیراجپوری صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ راقم حروف کو النظر کے نسخے کی سالہا سال سے تلاش تھی۔ اس کے لئے کئی لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ متعدد کتب خانوں کی خاک چھاننا پڑی۔ آخر کار اقبال کے ہی وطن مالوف لاہور میں جہاں ماہرین اقبالیات کی فوج ظفر موج کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے اس کا مکمل نسخہ ملا۔ ہم نے اس بیش قیمت سرمایۂ ادب کو اپنی زیر طبع کتاب ''معرکۂ اسرار خودی'' میں شامل کر کے مرزا صاحب کی اقبال شناسی کا حق ادا کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب نہایت دیدہ ریزی

سے کئی برسوں میں ترتیب دی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کتاب کو قرآن اور احادیث پر کتنا عبور حاصل تھا۔ موصوف نے نفس انسانی کے لئے تین موٹی موٹی قسمیں قرار دی ہیں: ۱۔نفس امارہ ۲۔نفس لوامہ ۳۔نفس مطمئنہ۔ نفس امارہ سے مراد وہ نفس ہے جو سرکش اور متمرد ہو۔ دوسرے الفاظ میں رعونت اور تکبر۔ نفس لوامہ سے وہ نفس مراد ہے جو اپنی کمزوریوں ،معاصی غلط کاریوں کا معترف ہوکر اصلاح اور ندامت کا محرک رہتا ہے۔ نفس مطمئنہ وہ نفس ہے جو صفات ذمیمہ سے نکل کر صفات حمیدہ اختیار کرتا ہے۔ نفس مطمئنہ اور نفس لوامہ ایک خودی اور خودداری ہے۔ کیونکہ خوددار وہی ہوتا ہے جو اپنی کمزوریوں اور غلطیوں پر آگاہ ہوکر اعتراف قلبی ایک ندامت کے ساتھ صفات حمیدہ کی طرف رجوع لائے اور ان پر ثابت قدم رہے۔ خودی اور خودداری کے معنی اپنی حفاظت جائزہ اور پوزیشن قائم رکھنے کے ہیں۔

ذیل میں النظر سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:-

''حضرت اقبال مثنوی اسرار خودی میں اس خودی کی یاد دلاتے ہیں جو نفس قوامہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ یا خودداری کے معنوں اور رنگ میں ہے۔ اس خودی اور خودداری کا اپنے رنگ میں قرآن بھی معترف ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے:-

یَا اَیَّتُھَا النَّفسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِی اِلیٰ رَبِّکَ رَاضِیَۃً مَرضِیَۃً...(فجر آیہ ۲۷-۳۰)

(اے اطمینان پانے والی جان اپنے پروردگار کی طرف چل، تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔)

فلسفۂ خودی کے سمجھنے کے واسطے سوچنا چاہیئے کہ کیا قدرت نے ہماری فطرت اور سرشت اور ہمارے جذبات کو لاشئے اور پست بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم خود ہی دے سکتے ہیں ہر شخص اپنے اندرونہ پر غور کرکے کہہ سکتا ہے کہ کیا اس کی فطرت پست اور ذلیل بنائی گئی ہے یا وہ خود کو ذلیل سمجھتا ہے اور کیا وہ ذلت اور پستی کا مرجع اور مصدر ہے۔ نہیں نہیں، ہمیں کہا گیا ہے۔ وانتم الاعلون گویہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم عجلت پسند ہیں۔ لیکن باوجود اس کے بھی ہماری فطرت سب فطرتوں اور ہمارے جذبات سب جذبات سے اعلیٰ اور ارفع بنائے گئے ہیں۔ یا ہم حیوان ناطق ہیں۔ شرف نطق ہی میں ایک فضیلت اور عظمت ہے اور نطق کامل ہی خودداری کا پہلا زینہ ہے۔

ہماری نسبت ہی کہا گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صورۃ۔ گو اس قول کے معنی نہیں کہ

سچ مچ خدا کی صورت پر ہی ہماری خلقت ہوئی ہے۔ کیونکہ خدا تو شکل و شباہت سے منزہ اور پاک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں خدا نے اور مخلوقات کے مقابلے میں ایک خصوصیت دے رکھی ہے۔ وہ خصوصیت کیا ہے؟ ہمارا غلو، بلند خیالی اور بلند پروازی کیا ہے؟ وہی خودی اور وہی خودداری جس کا وعظ حضرت اقبال نے شروع کیا ہے۔

در جہاں ہر فتح از کراری است
آبروئے مرد از خودداری است

عورتوں کی عفت و عصمت، پاکدامنی، پاکیزگی، حیا و شرم، مردوں کی یہ شجاعت، یہ تہور، یہ مردانگی، یہ بہادری کیا ہے؟ خودی اور خودداری ہی کا تماشا تو ہے۔ شجیع اور متہور میدان میں دیکھتا ہے کہ دشمن قوی ہے پھر بھی مرد میدان بن کر کھلا رہتا ہے، زخم کھاتا ہے، مگر اف نہیں کرتا۔ ایک پاک دامن عورت باوجود انواع واقسام کی تحریکات کے بھی دامن عصمت پر دھبہ نہیں لگنے دیتی۔ یہ خودداری ہی تو ہے۔ خودداری دو لفظوں سے مرکب ہے۔ (الف) خود (ب) دار سے

اپنے تئیں ہر صعوبت، ہر مصیبت پر امتحان اور ہر آزمائش میں قائم رکھنا۔ غیرت اور حمیت ہاتھ سے نہ دینا، اللہ پر بھروسہ رکھنا، ہر رنگ میں عصمت، عظمت، وقار و اکرام واحترام کا خواہش مند رہنا اور اس کی لے میں ہی لگا تار چلے جانا اور اس انہماک سے نہ گھبرانا شخصی اور قومی رنگ میں ایک خودداری ہے۔ خودی اور خودداری میں تکلیفات اور نقصانات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ ان سے ڈر کر ریشہ خطمی ہو جانا خود کو بزدل ثابت کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خودی کا مفہوم مقابلہ تکالیف اور مصائب بھی ہے۔ تحمل، بردباری اور اس کے ساتھ استقامت و طمانیت ایک منصوص خودی ہے۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب بہ غیر اللہ نیست

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ۔ صبر بھی ایک قسم کی خودی اور خودداری ہے۔ انسان پر صدہا صعوبتیں زندگی میں آتی ہیں۔ صابر رہ کر ان کا مقابلہ کرنا ایک صادق خودداری ہے۔ صبر کے ساتھ لفظ صلوٰۃ ایک دلچسپ کیفیت رکھتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی دعا اور رحمت کے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ مصائب اور امتحانات میں صبر کرو اور دعا میں مشغول رہ کر رحمت کے خواستگار ہو۔ یعنی اور سب بزدلیوں، لجاجتوں اور چاپلوسیوں سے ایک ہو کر صرف اللہ ہی کی درگاہ میں متدگی ہو۔ دیکھو کس رنگ میں خودی اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" (اسلام ہی

پر تمہیں مرنا چاہیئے) اسلام میں تیری نماز، روزہ، زکوٰۃ ہی شامل نہیں ۔ کیونکہ خود قرآن ہی کہتا ہے لَیسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ اسلام میں عبادات اور حالات دونوں شامل ہیں ۔ دیکھو اس آیت میں کس جامعیت سے ہمیں خودی اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے ۔ یہ ارشاد ہوتا ہے چاہے کیسا ہی تم پر ضغطہ اور تنگی ہو اور کیسی ہی آزمائش میں تم گھر جاؤ پھر بھی تمہیں اپنی وضع نباہنی چاہیئے ، اپنا حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے ۔ دیکھو کس خوبصورتی سے شخصیت اور اور قومیت کی خوبیوں اور ضروریات کی تعلیم دی گئی ہے ۔ اگر ہم دل لگا کر قرآن پڑھیں تو ہمیں ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کس جامعیت اور کس وسعت سے خودی اور خودداری کی تعلیم دے رہا ہے ۔ قرآن آپ کا خوددار ہے ۔ وہ دعویٰ سے کہتا ہے کہ میری خودداری میں کبھی فرق نہیں آ سکتا ۔ میری خودداری کا بہ منشائے و اِنّا له لحافظون ۔ خدا خود حافظ ہے ۔ جب تک خدا کی خودی ہے تب تک میری خودداری بھی ہے ۔ چونکہ قرآن خوددار ہے اس واسطے وہ اپنے پرستاروں اور قارئین کو بھی خودداری سکھاتا ہے اور خودی کی برکات سے آگاہ کرتا ہے ۔ بہ منشائے "فَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً" جب تک ہم میں خودی کا جوہر نہ ہو ، جب تک ہم خوددار نہ ہوں تب تک ہم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے ۔ خودی خودداری کھو دینا اسلام کھو دینا ہے ۔ خودی اور خودداری اسلام ہے اور اسلام خودی اور خودداری ہے ۔

علم مسلم کامل از سوز دل است
معنی اسلام ترک آفل است

بعض لوگ مثنوی اسرار خودی کا نام سن کر کسی قدر متعجب ہوتے ہیں اس پرانی غلطی کی وجہ سے جو انہیں خودی کے معنوں کے متعلق ہے ۔ حضرت اقبال نے اس مثنوی کے شروع میں ہی یہ مغالطہ رفع کر دیا ۔ میں باادب ایسے لوگوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اخلاقی کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں اور یہ اخلاقی سبق جو دئے جاتے ہیں ، ان کا اصل مطلب کیا ہے؟ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ان کا اعلیٰ مطلب خودی اور خودداری کا قائم کرنا ہی ہے ۔ جب ایک شخص کو کتب اخلاقی اور قانون شرعی میں صداقت کی تعلیم دی جاتی ہے تو اس کا دوسرے الفاظ میں اور مطلب کیا ہوتا ہے ۔ یہی کہ جو ہو سو ہو ، صداقت سے روگردانی نہ ہو ۔ یہ اخلاقی جرأت اور ہے کیا؟ یہی خودی اور خودداری ہی تو ہے ۔ قرآن سے غور سے پڑھو ۔ احادیث کا مطالعہ ذرا وسعت قلب سے کرو ۔ یہ تمام مجموعہ خودداری ہی تو سکھا رہا ہے ۔ مجھے کسی ملامت کا خوف نہیں میں صاف صاف کہوں گا کہ :-

"دنیا بھر میں قرآن سے زیادہ تر اور کوئی کتاب صحیح معنوں میں خودی اور خودداری کا سبق نہیں دیتی ۔ اس کا اہم اور بڑا وعظ یہی ہے ۔ قرآن کو اس بات پر بجا فخر ہے کہ وہ انسان کی حیثیت سے رکھنا

چاہتا اور پورا خوددار بننے کی تاکید کرتا ہے۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤمِنِیْنَ ۔مومن کون ہے جو خودی رکھتا ہو۔ قرآن بار بار پڑھو تاکہ تم پر مثنوی اقبال کے راز کھلیں اور تمہیں معلوم ہو سکے کہ یہ مثنوی قرآن کی ایک جید اور دلاویز تفسیر ہے۔ اپنے اپنے رنگ میں قرآن مجید کی صدہا تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ حضرت اقبال نے یہ اپنے رنگ میں لکھی اور یہ اکثر رنگوں پر غالب ہے۔ گو حضرت اقبال نے مثنوی میں یہ دعویٰ نہیں کیا مگر میں بحیثیت ایک نقاد ہونے کے یہ کہوں گا کہ یہ ایک تفسیر یا تعبیر ہے گو کہ صرف چند اور مختص مسائل ہی کی ہو۔ یہ اخلاقی تفسیر اور سیر تانہ مثنوی قوم کے تمدنی اور اخلاقی خزانہ میں حضرت اقبال کی جانب سے پہلی قسط انفرادی رنگ میں ادا ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسی طرح اسی سلسلہ اور محال اخلاقی میں دوسری قسط اجتماعی رنگ میں بھی اسی درد اور اسی شان وشوکت سے داخل ہو کر رہے گی اور یہ دونوں ادبی، تمدنی اور اخلاقی اقساط قوم وملک کی تمدنی، اخلاقی اور ادبی دولت مندی، تموّل، اقتصادیات، فارغ البالی اور سرسبزی کے مراحل میں ایک کامل ذریعہ اور مفید ضابطہ ثابت ہوں گی اور لوگ شکریہ کے ساتھ حضرت اقبال کی نازک خیالیوں سے مستفید ہو کر اخلاقی اور عملی رنگ میں ادائے خراج تحسین سے معتذر نہیں رہیں گے۔''

محمد عبداللہ قریشی صاحب مرحوم

محمد عبداللہ قریشی - ایک ماہر اقبالیات

علامہ اقبال پر برصغیر میں اگر کسی نے ٹھوس بنیادوں پر کوئی تحقیقی کام کیا ہے تو وہ میری ناقص رائے میں جناب محمد عبداللہ قریشی مرحوم و مغفور تھے۔ ان کا شمار ماہرین اقبالیات میں سرفہرست ہے۔ قریشی صاحب مرحوم سے میری خط و کتابت کا آغاز اس وقت ہوا جب آج سے بیس سال قبل پروفیسر صابر کلوروی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی مقالہ (کلیات باقیات شعر اقبال) کے لئے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ مرحوم نے ازراہ ادب نوازی مجھے اپنی بیش بہا تخطی تصانیف سے سرفراز بھی کیا تھا۔ میں نے موصوف پر ایک مقالہ بعنوان ''علامہ محمد عبداللہ قریشی اور اقبال'' لکھا جو شائع بھی ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ نقل مکانی کی نذر ہو گیا۔ اسی زمانے یعنی جولائی ۱۹۸۸ء میں میرا دوسرا مضمون ''کلام اقبال کی بازیافت'' کے عنوان سے چھپا۔ اور دونوں مضامین کے تراشے مرحوم کی خدمت میں روانہ کئے گئے۔ اس سلسلے میں موصوف نے ۳ر جنوری ۱۹۸۹ء کو ایک خط لکھا جو درج کیا جاتا ہے۔

''ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے لاہور آتے ہی آپ کا رقعہ مجھے پہنچایا۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ امید ہے اب آپ حیدرآباد آگئے ہوں گے۔ آپ نے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے ذریعہ اپنے مضامین کے جو تراشے بھیجے تھے، وہ ان کے ساتھ نہیں آسکے۔ ان کے پاس تحفے کی کتابوں کا بوجھ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے کسی دوست کے سپرد کر آئے ہیں جو چند روز تک لاہور آئیں گے۔ امید ہے وہ مل جائیں گے۔ وہ ایک ایک پرت اپنے پاس رکھ کر مجھے دے دیں گے۔ مل گئے تو پروفیسر صابر کلوروی صاحب کو بھجوا دوں گا۔ حیدرآباد سے آپ نے جو نقل بھجوائی تھی وہ مجھے مل گئی تھی۔ اس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ کلام اقبال کی بازیافت والے مضمون میں آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ اس کی داد دیتا ہوں۔ اپنی کتاب ''باقیات اقبال'' کو اگر از سر نو چھاپنے کی نوبت آئی ہے تو آپ کے شکریہ کے ساتھ اس سے استفادہ کروں گا۔ ''محمد عبداللہ اور اقبال'' والے مضمون میں آپ نے اپنی محنت کوٹ

کوٹ کر بھر دی ہے۔ البتہ میرے نام کے ساتھ ''علامہ'' کا لفظ دیکھکر مجھے شرم آنے لگی ہے۔ یہ نہ لکھا ہوتا تو میں ایک ایک کو فخر سے وہ مضمون دکھاتا۔

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں

آپ نے میری بھولی بسری باتوں کو جس طرح اپنے مضمون میں سجایا ہے، اس سے مضمون کے حسن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اور دوسرے دوستوں نے آپ کے مضمون کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے بھی آگاہ فرمایئے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا پتہ اگر آپ کے پاس ہو تو مجھے بھی عنایت فرمایئے۔ میں ان کو خط لکھنا چاہتا ہوں۔ جب وہ جموں میں ہوتے تھے، انہوں نے اپنے کئی مضمونوں میں میرے حوالے دیے ہیں۔ پھر وہ حیدر آباد چلے گئے۔ میری ان سے ابھی تک ملاقات تو نہیں ہوئی۔ اب پتہ نہیں کہاں ہوتے ہیں۔

گذشتہ چند ماہ سے میری صحت اچھی نہیں رہتی۔ کوئی نئی چیز لکھ بھی نہیں سکا۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے کی ایک طالبہ نے ''محمد عبداللہ قریشی بحیثیت اقبال شناس'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ مضمون مکمل ہو کر ممتحنوں کے حوالے کیا جا چکا ہے۔ اب صرف وائیوا (Viova) ہونا باقی رہ گیا ہے۔ دیکھیے وہ کیا گل کھلاتی ہے۔ آپ کا مضمون استفادہ کے لئے اسے دے دیا تھا۔ اور اس نے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری (کراچی) ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (راولپنڈی) ڈاکٹر غلام حسین اظہر، پرنسپل گورنمنٹ کالج بھمبر (آزاد کشمیر) اور ڈاکٹر انور سدید (لاہور) نے میری اقبال شناسی پر الگ الگ سیر حاصل مضامین لکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مجھ سے کچھ سرزد ہو ہی گیا ہوگا۔ جبھی تو انہیں کچھ لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ میرے جیسے خاموش درویش کا کون نام لیتا ہے۔

صابر کلوروی صاحب کا کالج موسم سرما کی وجہ سے آجکل بند ہوگا۔ وہ ان دنوں لاہور آتے رہتے ہیں۔ اس دفعہ ابھی تک نہیں آئے۔ ان کے پی ایچ ڈی کا نگراں بھی لاہور میں ہی ہوتا ہے۔ ان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ جس طالبہ نے میری اقبال شناسی پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے، اس کے نگراں بھی وہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب۔ ان سے راہ و رسم ہے۔ مگر کئی روز سے وہ بھی تشریف نہیں لائے......
اقبال اکاڈمی حیدر آباد والوں سے بھی کبھی ملاقات ہوئی؟''

محمد عبداللہ قریشی مرحوم اقبالیات کے بحر زخار تھے۔ انہوں نے ایسے گوہر نایاب دریافت کیے، جن کی نظیر نہیں مل سکتی ہے۔ ''باقیات اقبال'' اور ''اقبال بنام شاد'' مرحوم کے دو بڑے

زندۂ جاوید کارنامے ہیں۔ موصوف کثیر التعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ راقم نے ان کی اکثر و بیشتر تصانیف کا مطالعہ کیا۔ میں ان کی تحریروں سے بے حد متاثر ہوا تھا، اس لئے ان سے استفادہ کرتا رہا۔ میرے پاس ان کے درجنوں خط اقبال سے متعلق تھے۔ کچھ تو تلف ہو گئے ہیں۔ باقی جو رہ گئے ہیں وہ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انشاء اللہ ان خطوط کو ترتیب دینے کی کوشش کروں گا۔

قریشی صاحب کی عمر کا بیشتر حصہ (۷۲ سال) ادبی خدمات میں گزرا تھا۔ انہوں نے میری گذراش پر مضمون لکھنے کے لئے اپنے خود نوشت حالات (آپ بیتی) بھیجے تھے جو اس طرح ہیں:-

آپ بیتی

یہی اک ہوش والے کو سبق ہے
یہ میری آپ بیتی کا ورق ہے

''میں لاہور کے ایک قدیم متوسط الحال قریشی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا۔ چند ہی ماہ بعد ۴ اپریل ۱۹۰۵ء کی صبح کو کانگڑے کا آتش فشاں جوالا مکھی پھٹا اور اس زور کا زلزلہ آیا کہ سارا پنجاب ہل گیا۔ لاہور بھی اس کی تباہ کاریوں کی زد میں آیا۔ بے شمار مکان گرے۔ سیکڑوں تناور درخت جڑوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہوئے۔ کئی انسانی جانیں ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہوئیں اور لوگوں نے سمجھا قیامت آگئی۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ:-

''تھا قیامت کا نمونہ زلزلہ لاہور کا''

میرے والد رحیم بخش ان دنوں ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھے۔ وہ کام پر جانے کے لئے گھر سے نکل کر ابھی موچی دروازے کے باہر باغ میں ہی پہنچے تھے کہ ایک خوفناک گونج کے ساتھ زمین ان کے پاؤں تلے ناچنے لگی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ شہر سے گردو غبار کا طوفان اٹھا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ لوگوں کی چیخ پکار نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کئی منٹ کی ہل چل کے بعد خدا خدا کر کے بھونچال تھما۔ میرے والد اس تباہ خیز منظر کو دیکھکر آگے جانے کی بجائے گرتے پڑتے الٹے گھر واپس آئے۔ جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایک دو دن یہی حالت رہی۔ آخر وہ ہم سب کو روتا پیٹتا چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کے نہیں آیا۔

اس وقت میں بہت کم سن تھا۔ مجھے رنج و راحت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اس لئے یتیمی کا احساس بھی نہ ہوا۔ ماں کی آغوش ہی میرے لئے سب کچھ تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے پڑھنے بٹھا دیا

گیا۔ ہمارے ساتھ والے مکان میں ایک بی بی رہا کرتی تھیں ۔ خدا بخشے بہت ہی نیک اور بے حد پارسا تھیں ۔ان کے گھر میں تعلیم و تعلم کا اتنا چرچا تھا کہ ہر چھوٹا ، بڑا قرآن مجید کا حافظ اور دینوی تعلیم سے بہرہ ور تھا۔ وہ خود بچیوں کو قرآن مجید پڑھایا کرتی تھیں ۔ان کی شفقت اور توجہ سے میں نے بہت جلد قرآن پاک کا ناظرہ ختم کرلیا۔ پھر نماز ، روزہ اور دوسرے ضروری مسائل اور اس کے بعد اردو نوشت و خواند اور حساب کے بعد چند ابتدائی قاعدے سیکھے۔ قرآن پاک کے میں نے کئی دور کئے۔ ہر دفعہ مجھے ایک نئی لذت حاصل ہوئی۔ جیسے جیسے میرا شغف بڑھتا گیا۔ میرا ذہن کھلتا گیا اور آئتیں مجھے ازبر ہوگئیں ۔ یہ اسی مذہبی ماحول میں پلنے اور تربیت پانے کا نتیجہ ہے کہ میں بچپن ہی سے ''مولانا'' مشہور ہوں ۔اور آج تک ہر چھوٹا بڑا مجھے اسی لقب سے پکارتا ہے۔ حالانکہ مولویوں والی کوئی بات مجھ میں نہیں ۔ نہ میں زیادہ باتیں کرتا ہوں نہ کام سے جی چراتا ہوں ۔صرف ''خاموش کارکن'' ہوں ۔ ''خاموش کام کرنے والا'' کا خطاب علامہ اقبال نے مجھے اس وقت دیا جب ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب کونسل کی رکنیت کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے اور خاموش کارکن کی حیثیت سے میرا ان سے تعارف کرایا گیا۔ موصوف نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر فرمایا ''ہاں کام کرنے والے خاموش ہی ہوتے ہیں'' ۔اس طرح مجھے یہ رمز معلوم ہوگئی کہ زیادہ کام کرنے کے لئے زیادہ بولنا ضروری نہیں ہوتا۔ کفایت بیانی اور خاموشی بھی ترجمانی اظہار ہی کا ایک طریقہ ہے۔

میں جب تک بی بی کے ہاں رہا، پڑھائی لکھائی کے سوا کسی کھیل کود کی طرف متوجہ ہی نہیں نہ ہوا۔ بی بی اپنی شاگرد بچیوں کو کئی قسم کی دستکاریاں بھی سکھایا کرتی تھیں ۔ان کی دیکھا دیکھی میں ، میں بھی ازار بند بنتا اور کبھی کبھی لڑکیوں کو کڑھائی کے لئے بیل بوٹے بنا کر دیتا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میں بری صحبتوں سے بچا رہا اور محنت کا عادی ہوگیا۔ دوسرے کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی مجھے ضرورت پیش نہ آئی ۔ میں ازار بند بنا کر اپنے جیب خرچ کے لئے چار پیسے خود کما لیتا تھا۔ پھر آگے چل کر میں نے کشیدہ کاری کے فروغ کے لئے دو کتابیں ''سوزن کاری'' اور ''سوئی کے سو کام'' شایع کیں ، جن کی فروخت سے میں ہمیشہ آسودہ حال رہا اور گھر سے ایک پیسہ لئے بغیر ہر سال کشمیر کی سیر کرتا رہا۔

جب میں نو دس برس کا ہوا تو بی بی نے ایک عزیز کی معرفت مجھے رنگ محل مشن ہائی اسکول لاہور میں دوسری جماعت کا امتحان دلوا کر تیسری جماعت میں داخل کرادیا۔ جہاں سے میں نے چھ سات سال میں دسویں جماعت کا امتحان اول آکر پاس کیا۔ اسکول میں میرا شمار چوٹی کے ہوشیار طالب علموں میں ہوتا تھا۔ استاد مجھے عزیز جانتے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ میں جماعت میں ہمیشہ اول یا دوم رہتا تھا۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت کا ذکر ہے کہ حساب کے ماسٹر نے گرمیوں کی چھٹی کے لئے کچھ کام دیا۔

تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے پر کاپیاں طلب کیں۔ کئی لڑکوں نے گھر بھول آنے کا عذر کیا۔ ماسٹر نے دوسرے دن لانے اور نہ لانے پر سخت سزا دینے کی دھمکی دی۔ ان دنوں ملک میں عدم تعاون کا زور تھا۔ جگہ جگہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ لڑکے سرکاری تعلیم گاہوں کو بائیکاٹ کر رہے تھے۔ میری جماعت والوں نے ایکا کر کے دوسرے دن حساب کے وقت ہڑتال کر دی اور کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے حساب کا کام کیا ہوا تھا۔ اس لئے ہڑتالیوں کا ساتھ نہ دیا۔ دوسرے دن جب یہ مقدمہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش ہوا تو بھاگنے والوں نے یک زبان ہو کر میرا نام جڑ دیا کہ اس نے ہمیں اکسایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اگرچہ میری بے گناہی کا یقین تھا، تاہم انہوں نے اسکول کی سیاست اور مصلحت کے پیش نظر سب کے ساتھ مجھے بھی سزا دی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا واقعہ یاد نہیں جو قابل ذکر ہو۔

۲۶ دسمبر ۱۹۱۷ء کو میری والدہ بھی مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ اب میں الطاف پدر سے نا آشنا اور ماں کی ممتا سے یکسر محروم تھا۔ میری زندگی حسرت نصیبی کا ایک مرقع بن گئی۔ میں بے یار و مددگار رہ گیا۔ اس صدمے نے میرے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں بچپن ہی میں ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ میری بڑی بہن کی محبت اور بہنوئی کی خدا ترسی نے مجھے سہارا دیا۔ لیکن میں بالکل چپ چپ اور گم سم رہنے لگا۔ کسی کھیل تماشے میں میرا جی نہ لگتا۔ آفاق کی لامحدود وسعتوں میں دلچسپی کے ہزاروں، لاکھوں سامان موجود تھے۔ ہر منظر جاذب نظر اور ہر کرشمہ دامن گیر دل تھا۔ مگر مجھے کوئی شے بھلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سورج میرے دل کی تاریک بستی کو روشن کرنے کی کوشش کرتا۔ چاند نور کی کمندیں پھینک کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرتا۔ مگر۔

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

ستاروں کی چمک سے رگ جاں پر چوٹ پڑتی۔ باغوں میں بہار آتی، رنگ رنگ کے پھول کھلتے، شگوفوں کی تر و تازگی اور پتوں کی شادابی فرحت بخشتی مگر میرے دل کی کلی نہ کھلتی۔ ہر وقت یہی سوچ رہتی کہ کیا ہوگا اور اب کیا ہوگا؟ کسی نے کہا۔ بیٹا! غم کا بوجھ ہلکا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن پاک کثرت سے پڑھا کرو اور اس کا ثواب اپنی ماں کی روح کو بخشا کرو۔ میں نے یہی کیا۔ تلاوت قرآن پاک میں انہماک ہی کی برکت سے میرے دل کو تسکین حاصل ہوگئی۔ میرا یقین ہے کہ قرآن پاک انسان کے دل پر نازل ہوا۔ اس لئے براہ راست دل پر دستک دیتا ہے۔ اور ہم جب تلاوت کرتے یا پانچ وقت کی نمازوں میں اس کی آئتیں پڑھتے ہیں تو خدا تعالیٰ ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں روحانی غذا نصیب ہوتی

اور اہتزاز حاصل ہوتا ہے۔

اس غم و فکر میں طالب علمی کا زمانہ بیت گیا اور ۱۴ جون ۱۹۲۲ء کو امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد میں ریلوے ہیڈ کوارٹر میں ملازم ہو گیا۔ اس وقت تک ہیلے کالج آف کامرس قائم نہیں ہوا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے نویں دسویں جماعت سے اس کی ابتدا کی تھی۔ دو سال کا کورس تھا۔ امتحان کا نام اسکول لیونگ سرٹفکیٹ اکزامنیشن (School Leaving Certificate Examination) تھا۔ نصاب میں انگریزی، شارٹ ہینڈ، ٹائپ رائیٹنگ، بک کیپنگ کمرشل کارسپانڈنس، کمرشل ارتھمیٹک، اختصار نویسی وغیرہ مضامین شامل تھے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ اس لئے مجھے دفتر کا کام سنبھالنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ملازمت کا یہ سلسلہ اڑتیس سال جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو میں نیک نامی کے ساتھ وہاں سے سبکدوش ہو گیا۔

میری تخلیقات کی ابتدا ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ اس وقت میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اسکول نے بچوں کو تحریر کی مشق کرانے اور مضمون نویسی کا شوق دکھانے کے لئے ایک رسالہ جاری کیا۔ میرا پہلا مضمون ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی بوالعجبیوں پر انگریزی میں تھا۔ اردو شاعری سے لگاؤ تو اس سے بھی پہلے تھا۔ بیت بازی کے مقابلوں کے لئے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ مولانا حالی کی مسدس مد و جزر اسلام، علامہ اقبال کی نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ اور مولانا محمد حسین آزاد کی آبحیات مجھے مرغوب تھیں اور اکثر میرے مطالعہ میں رہتی تھیں۔

ہمارے مکان کی بیٹھک میں رات کے وقت چند بزرگ میرے بہنوئی (م-۱۹۲۶ء) کے پاس جمع ہو کر گپ شپ لڑاتے۔ کبھی کبھی وہ چندہ کر کے کوئی کتاب خرید لاتے اور مجھے پڑھ کر سنانے کو کہتے۔ ان دنوں داستانوں کا چراغ روشن تھا۔ ایک ایک کر کے میں نے انہیں قصہ گل بکاؤلی، قصہ چار درویش، باغ و بہار، آرائش محفل اور داستان امیر حمزہ وغیرہ، داستانیں پڑھ کر سنائیں۔ یہ ایسی داستان سرائی کا ثمرہ ہے کہ میں دو چار سطریں سیدھی لکھ لیتا ہوں اور ان میں کوئی جھول نہیں ہوتا۔

عمر کے ساتھ سنجیدگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ پروفیسر محمد علیم الدین سالک، اور منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار ''کشمیری'' لاہور کی رفاقت نے مجھے تحقیق اور تاریخ کی ایسی چاٹ لگائی کہ اب اسی میں لذت محسوس کرتا ہوں۔ سیر و سیاحت میں بھی ان دونوں بزرگوں کا ساتھ حاصل رہا۔ میں نے چل پھر کر بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ حاصل کیا۔ میرے دل کے آثار قدیمہ کی کھدائی کی جائے تو بہت سی بھولی بسری دفن شدہ یادیں از سر نو زندہ اور تازہ ہو کر سامنے آ سکتی ہیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ میں نے تعلیم

جاری رکھی۔ پرائیویٹ طور پر بی-اے کیا اور مختلف وقتوں میں کئی رسالوں کی ادارت کا اعزاز بھی مجھے حاصل رہا۔ ان میں رسالہ تصوف، فردوس، قوس وقزح، حقیقت اسلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، قوس وقزح، فردوس، حقیقت اسلام، ادب لطیف، اقبال ریویو، صحیفہ اور دیگر اخبار و رسائل میں میرے بے شمار علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ ان کا انتخاب کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ملازمت سے طویل رخصت لے کر اور فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۴ء تک مسلسل سات سال میں رسالہ نقوش کا معاون رہا۔ اس عرصے میں چند خاص نمبروں کی تسوید و ترتیب میں مدیر نقوش محمد طفیل صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ مکاتیب نمبر، غزل نمبر، لاہور نمبر، طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر اور آپ بیتی نمبر میں میری مثبت تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۶۵ء سے مجھے ادبی دنیا کی ادارت کا شرف حاصل ہوا اور مارچ ۱۹۷۲ء تک میں نے اسے بڑی محنت سے چلایا۔ مولانا کے منتشر مقالات جمع کر کے تین جلدوں میں شائع کرنے میں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے جناب معز الدین احمد کی معاونت کی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ادبی دنیا کا کشمیر نمبر نکالا جو اتنا مقبول ہوا کہ کئی ہزار کی تعداد میں دوبارا چھپا اور اب بھی آئینہ کشمیر کے نام سے مل جاتا ہے۔ حکومت آزاد جموں وکشمیر نے اس کی پذیرائی کی۔ اپنے اسکولوں اور کالجوں کے لئے اسے منظور کیا اور مجھے گراں قدر انعام سے نوازا۔ اس قدر حوصلہ افزائی کے بعد حکومت آزاد جموں وکشمیر نے ایران اور کشمیر کے تاریخی، علمی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور لسانی روابط پر ایک کتاب مرتب کرنے کے لئے مجھے منتخب کیا۔ یہ کتاب ''ایران کبیر وایران صغیر'' کے نام سے شائع ہوئی اور پسند کی گئی۔ اب بھی مل جاتی ہے۔

''ادبی دنیا'' کے اقبال نمبر کو علمی حلقوں نے اتنا پسند کیا کہ اسے ''آئینہ اقبال'' کے نام سے سفید کاغذ پر دوبارہ چھاپنا پڑا۔ ''وحشت نمبر'' بھی ایک قیمتی دستاویزی یادگار تھی۔ اب نایاب ہے، مگر اس کی داغ بیل پر ڈاکٹر وفا راشدی نے کتاب ''حیات وحشت'' مرتب کر کے شائع کرادی ہے۔ ادبی دنیا کے بند ہوجانے کے بعد سے اب تک میں ''فنون'' کے انتظام وانصرام میں مشغول ہوں۔ ۷۷-۱۹۷۸ء میں کچھ عرصہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ المعارف کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے۔

میرے دوست پروفیسر علم الدین ایک جید عالم، مستند مورخ اور فصیح البیان مقرر تھے۔ ان کے ذہن میں خیالات اس تیزی سے ہجوم کر کے آتے تھے کہ قلم ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ میں نے اپنی خدمات ان کے لئے وقف کردیں۔ ان کی کوتاہ قلمی کو اپنی زود نویسی سے سہارا دیا۔ اور ان

کے خیالات قلم بند کر کے محفوظ کر دئے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان کے مضامین کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔

منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور نے کشمیر کی ہر جہتی تاریخ لکھ کر کشمیریوں اور ان کے لٹریچر پر احسان عظیم کیا۔ میں نے ان کے ادھورے کاموں کو مکمل ہی نہیں کیا بلکہ ان کے نام کو بھی زندہ کیا۔ اور اب تک حق دوستی ادا کرتا رہا ہوں۔ تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد کی تکمیل میں نے ہی کی۔

ساغر صدیقی مرحوم قلندری کے نشے میں اتنا مگن رہتے تھے کہ جو لکھتے رہتے تھے اسے محفوظ کر لینے کے بارے میں انہیں سوچنا بھی گوارا نہ تھا۔ میں نے مرحوم کے کلام کو ہمیشہ کے لئے ضائع ہونے سے بچا لیا۔ ان کے کلام کے پانچ مجموعے (۱) غم بہار (۲) شیشۂ دل (۳) لوح جنوں (۴) شب آگہی اور (۵) مقتل گل۔ نہ صرف مرتب کر کے طبع کرا دئے بلکہ ساغر کو ان کا معاوضہ بھی دلوایا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے پنجاب یونیورسٹی کے سرمایہ سے ایک کتاب KASHIR (کشیر) شائع کی۔ اس کا ایک باب مجھ سے لکھوایا اور کتاب میں میرے نام سے شامل کیا۔ میں نے چند مقالے اردو انسائیکلو پیڈیا کے لئے بھی لکھے جو شائع ہوئے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا شرف و اعزاز ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور کئی سال سے میری خدمات اور مشوروں سے جز وقتی فائدہ اٹھا رہی ہے۔ حکومت پنجاب نے بزم اقبال لاہور کی مجلس منتظمہ کا ایک رکن بھی مجھے نامزد کر رکھا ہے۔

میری مطبوعہ تصنیف و تالیف کے نام یہ ہیں

(۱) تاریخ اقوام کشمیر جلد سوم (۲) شاعر کشمیر (۳) آئینہ کشمیر (۴) معاصرین اقبال کی نظر میں (۵) ایران کبیر و ایران صغیر (۶) حکمت رفائی (۷) مکاتیب اقبال بنام گرامی (۸) آئینہ اقبال (۹) روح مکاتیب اقبال (۱۰) باقیات اقبال (۱۱) مقالات اقبال (۱۲) حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں (۱۳) اسلامی رنگ کا ایک سچا نمونہ (۱۴) غلامان رسول۔ بچوں کے لئے (۱۵) صبر حضرت ایوب علیہ السلام (۱۶) شہنشاہ کا فیصلہ (۱۷) سلطان محمود غزنوی (۱۸) شہزادوں کا امتحان (۱۹) اکبر اور سپاہی (۲۰) اقبال بنام شاد (۲۱) حیات جاوداں (۲۲) تذکار اقبال

محمد عبداللہ قریشی مرحوم راقم حروف کے تحقیقی کاموں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ آخر زندگی میں میرے اشتراک و تعاون سے ایک کتاب "معرکۂ اسرار خودی" کے نام سے مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان کے پیش نظر کئی منصوبے اقبالیات کے بارے میں

تھے اس لئے خواہش ظاہر کی تھی کہ جو مسالہ میرے پاس موجود ہے وہ ان کو بھیج دوں یا جو ان کے پاس ہے وہ مجھے بھیجیں گے۔ اس موضوع کے بارے میں خط و کتابت ہو رہی تھی کہ ضعف بصارت اور بیماری کے سبب وہ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے۔ میں نے ان کی فرمائش کی تکمیل یوں کی جو مسالا میرے پاس وافر مقدار میں موجود تھا اور ان کے پاس نہیں تھا اس کو میں نے اس طریقے سے ترتیب دیا کہ گویا ان کی وصیت پر عمل کیا۔ انجام کار میں نے ''معرکۂ اسرارِ خودی'' کو سالہا سال کی دیدہ ریزی کے بعد سال گذشتہ کی ابتدا میں مرتب کر کے اردو کے محقق اعظم جناب مشفق خواجہ صاحب (کراچی) کو اشاعت کے لئے روانہ کیا۔ موصوف کو مسودہ پسند آیا اور اس کی کمپوزنگ شروع کر دی۔ انشاء اللہ جب کتاب شائع ہو گی تو مرحوم قریشی کی روح شاد ہو گی۔

ذیل میں محمد عبداللہ قریشی کی ان تصانیف پر نقد و نظر کیا جائے کہ جو علامہ اقبال پر لکھی گئی ہیں:-

(۱) باقیات اقبال- اقبال کے غیر مدون اشعار مخزن کے ابتدائی شماروں کے علاوہ مجموعہ کلام اردو (اقبال) ۱۹۱۴ء میں، تذکرۃ الشعراء موسومہ گلدستہ سخن ۱۹۲۱ء لاہور مرتبہ سدرشن اور ''انتخاب زرین'' سر راس مسعود کے پہلے ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں نظر آتے ہیں۔ بانگ درا کی اشاعت اول (۱۹۲۴ء) کے بعد اقبال کا یہ غیر مدون کلام مولوی عبدالرزاق حیدر آبادی کے مرتبہ کردہ ''کلیات اقبال'' ۱۹۲۵ء اور مولوی احمد الدین کی کتاب ''اقبال'' میں مزید اضافوں کے ساتھ شامل کیا گیا۔ سید عبدالواحد معینی پہلے شخص ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ اقبال کا غیر مدون کلام کتابی صورت میں ''باقیات اقبال'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جناب محمد عبداللہ قریشی کے تعاون سے ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ معینی صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''خوش قسمتی سے اسی زمانے میں راقم الحروف کی ملاقات شفیق محترم جناب محمد عبداللہ قریشی سے ہوئی۔ صاحب موصوف کو باقیات کے ہر شعبے سے ایک والہانہ شغف ہے۔ ان کو اقبالیات کے سلسلے میں دوسری دلچسپیوں کے علاوہ کلام جمع کرنے کا بھی شوق ہے۔ انہوں نے نہایت دریا دلی سے اپنی برسوں کی محنت سے جمع کیا ہوا کلام باقیات میں شامل کرنے کے نذر کر دیا۔ صاحب موصوف نے باقیات کی ترتیب نو میں اس قدر دلچسپی لی کہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقیات کا موجودہ ایڈیشن انہی کی مساعی جمیلہ کا مرہون احسان ہے۔''

''باقیات اقبال'' کا تیسرا ایڈیشن جناب محمد عبداللہ قریشی کے ترمیموں اور اضافوں کے

ساتھ ۱۹۷۸ء میں ۶۰۸ صفحوں پر مشتمل آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور سے شائع ہوا۔ حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ موصوف نے کتنی عرق ریزی سے اقبال کے ان آوارہ اشعار کو یکجا کر کے اتنی ضخیم کتاب میں ترتیب دیا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:-

''مجھے اقبال کا منتشر کلام جمع کرنے کا شوق ابتداء ہی سے تھا۔ تلاش و جستجو کے اس سفر میں جو پھول پتی کہیں ادھر ادھر پڑی مل جاتی ہے اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیتا ہوں۔ ۱۹۶۶ء سے پہلے جو سرمایہ میرے پاس جمع تھا وہ میں نے باقیات اقبال کے دوسرے ایڈیشن کی نذر کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی تلاش و جستجو کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ اس عرصے میں جو کچھ میرے ہاتھ آیا وہ آئندہ صفحات میں حاضر ہے۔''

قریشی صاحب نے اس دفعہ ۱۸ نظموں، بانگ درا سے حذف شدہ ۱۰ نظموں، ۲۰ غزلوں اور متفرقات کے تحت کئی فارسی اردو نظموں، قطعوں وغیرہ کا اضافہ کیا ہے۔ باقیات میں اقبال کا معتد بہ حصہ ایسا بھی ہے جو بانگ درا میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مثال میں ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔

مری جاں! نہیں ربط غیروں سے اچھا	بھلا! میں تمہارا برا چاہتا ہوں
مجھے جلوۂ گل ہے برق تجلی	سنبھالو، مجھے، میں گرا چاہتا ہوں
نہ کوثر کا خواہاں، نہ حوروں کا شیدا	خدا جانے میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں
اگوں، سبز ہوں، پس کے ہوں خون آخر	میں قسمت مثل حنا چاہتا ہوں
شجر ہوں گری مجھ پہ برق محبت	ہرا ہو گیا ہوں، پھلا چاہتا ہوں
مری جاں، تری بے حجابی سے پہلے	تری دید کا حوصلا چاہتا ہوں
محبت مٹا دے گی بیگانگی کو	سنبھل بیٹھ میں تو ہوا چاہتا ہوں
ہوا خاک میں اے ہوائے محبت	مدینے کی جانب اڑا چاہتا ہوں

چلو مل کے اقبال کے گھر کو تو ڈھونڈیں
کہ میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں

(۲) معاصرین اقبال کی نظر میں- جناب مرحوم قریشی صاحب نے اس ضخیم کتاب (تقطیع ۶×۱۹ انچ صفحات ۶۵۶) میں اقبال کے ۵۱ مشاہیر پر سیر حاصل تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے نیرنگ، مولوی محبوب عالم، محمد الدین فوق اور سروجنی نائیڈو کے سلسلے میں اقبال کے متعدد اشعار پہلی مرتبہ دریافت کیے ہیں۔ وہ مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

''اس کتاب کا معتد بہ حصہ ان ہم عصر شعراء پر مشتمل ہے جن کے بارے میں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ چند وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن کا اقبال احترام کرتے تھے اور جن سے انہوں نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ اقبال کے ہمسن بھی ہیں جنہیں وہ اپنا ''ہمصفیر'' کہتے ہیں اور وہ بھی ہیں جن کی اقبال حوصلہ افزائی کرتے تھے اور جو اقبال کی شاعری سے متاثر ہو کر ان سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

کتاب میں جن معاصرین کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:۔

امیر مینائی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی حالی، عزیز لکھنوی، نسیم بھرتپوری، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، مہاراجہ کشن پرساد شاد، مولانا گرامی، نادر کاکوروی، مولوی محبوب عالم، اسد ملتانی، مسز سروجنی نائیڈو۔

یہ بات میرے لئے حیرت انگیز ہے کہ قریشی صاحب نے کتاب میں مرزا سلطان احمد، علامہ شیخ عبدالعلی ہروی، علامہ مرزا عبدالکریم زنجانی، خواجہ غلام السیدین، سر شیخ عبدالقادر اور سجاد حیدر یلدرم کو شامل کیوں نہیں کیا۔ علامہ اقبال کی ان کے ساتھ خط و کتابت بھی تھی۔ بہر حال کتاب نہایت اہم ہے۔ قریشی صاحب لکھتے ہیں:۔

''میں نے اقبال کی آرا کو بنیاد بنا کر ایک ایک شاعر پر الگ الگ مضمون لکھا۔ پھر ان تمام مضامین کو ایک ساتھ پڑھنے پر مجھے احساس مسرت ہوا کہ میں نے تو اقبال کا نظریہ فن مرتب کر ڈالا ہے جو بہت واضح نظریات کا ابلاغ کرتا ہے اور تنقیدی شعور اور مذاق سلیم کا حامل نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب جہاں تاریخی اور تحقیقی مواد پر مبنی ہوگی وہیں یہ ایک عظیم فنکار کے نظریہ فن پر بھی پہلی مرتب دستاویز کا درجہ حاصل کرے گی اور مستقبل کے نقاد اس کتاب کے حوالے کے بغیر اقبال کے نظریہ فن پر بحث نہ کر پائیں گے۔''

راقم حروف مرتب کتاب سے متفق ہے کہ کتاب اقبالیات میں ایک اور مستند ریفرنس کے طور پر لکھی گئی۔ واقعی اکبر آلہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، نادر کاکوروی اور مولانا گرامی کے لئے ایسے نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

(۳) روح مکاتیب اقبال- یہ ضخیم کتاب ۷۷۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اقبالیات میں عظیم الشان کارنامہ ہے۔ کتاب اقبال اکادمی پاکستان نے بڑے حسن اہتمام کے ساتھ نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع کی تھی۔

اس سے قبل ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۶ء تک خطوط اقبال کے گیارہ مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ پہلا مجموعہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ''شاد اقبال'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر خط جو علامہ اقبال نے شاد کو لکھے تھے بخط اقبال ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانے میں

میری نظر سے گذرے اور میں نے ان کے عکس بھی حاصل کئے۔ قریشی صاحب مرحوم نے خطوط اقبال کے تمام مجموعوں کو پہلے تاریخ وار ترتیب دیا۔ پھر ان کو اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ موصوف کو جہاں کہیں بھی اقبال کی تحریریں باندازِ خطوط دستیاب ہوئیں ان کو بھی تاریخ وار شامل کتاب کیا۔ قریشی صاحب مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

''روح مکاتیب اقبال حضرت علامہ کے کم وبیش ساڑھے بارسو خطوں کا نچوڑ ہے۔ جو پھول جس گلدستہ سے چنا ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے تاکہ شائقین اصل تک بآسانی پہنچکر پورا خط حاصل کر سکیں۔ ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو علیٰحدہ ہے مگر سب مل کر کچھ اور ہی لطف اور کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ میں اپنی خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ انکے رنگ برنگے پھولوں کو باہم آمیخت اور کشید کرنے کی سعادت میرے حصے میں آئی ہے۔''

موصوف نے خطوط اقبال کا عطر نچوڑ کر اس کتاب میں اس طرح جمع کیا ہے کہ شائقین اقبال کا دماغ اس کی گوناگوں خوشبوؤں سے مہکتا رہے گا۔ غرضیکہ یہ کتاب حیات اقبال کو نئے انداز سے مرتب کرنے کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ یہ خطوط کا مجموعہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بغیر اقبال کے سوانح حیات یا کوئی یادگاری کتاب مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

اگر مرتب، اقبال کی ان تحریروں کو بھی شامل کتاب کرتے جو پرانے رسالوں اور اخباروں کی زینت رہ چکی تھیں۔ تو سونے پر سہاگہ ہوتا۔ اس قسم کی مختصر تحریریں راقم نے یکجا کر کے شائع کی ہیں اور قریشی صاحب کی نظر سے گذری ہیں۔

(۴) حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں- کتاب سوانح اقبال کے سلسلے کی ایک مربوط کڑی ہے جو ''بزم اقبال'' کلب روڈ لاہور سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں ایک علمی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نمائش سے فراغت پانے کے بعد قریشی صاحب نے ان اخباروں کو اس طرح کھنگالا کہ ان کے ہاتھ اقبال کے سلسلے میں ایک خزانہ آیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے اقبال پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ زیر نظر کتاب مثال میں پیش کی جاسکتی ہے۔ کتاب ۳۶۴ صفحات میں درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:۔

(۱) جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست (کشمیری الاصل، برہمنوں کی سپرو گوت، اجداد، والدین)
(۲) لاہور کے مشاعرے (۳) انجمن کشمیری مسلماناں (۴) اقبال کا تعلیمی سفر (۵) اقبال اور فوق

(۶) اقبال اور طریقت (۷) اقبال اور کشمیر (۸) عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں۔

زیر نظر کتاب محنت شاقہ سے لکھی گئی ہے اور اقبالیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اقبال کے حالات لکھنے میں یہ کتاب سنگ میل کا کام دے سکتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' مرتب کرنے میں اس کتاب سے کماحقہ استفادہ کیا ہے۔ البتہ مجھے پہلے باب کی چند مندرجات سے شدید اختلاف ہے۔ قریشی صاحب مرحوم نے خاندان اقبال کے بارے میں اپنی تھیس کی بنیاد فوق کی تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم پر ہے۔ فوق نے ہی بغیر کسی ٹھوس شہادت کے اقبال کو لولی حاجی کی اولادوں میں قرار دیا ہے۔ انہوں نے اعظم دیدہ مری کی تاریخ کشمیر (سال تصنیف ۱۱۴۸ھ) میں لولی حاجی کے تذکرے کو غلط انداز سے بیان کیا اور لکھا کہ لولی صاحب نے پاپیادہ بارہ حج انجام دئے تھے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بابا نصیب الدین غازی کے مخطوطہ ''نورنامہ'' (سال تصنیف ۱۰۴۶ ہجری) کے مطابق لولی حاجی چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھے۔ اور ان کا عقد نکاح بھی ثابت نہیں ہوتا ہے۔ ہم نے اپنا یہ موقف کئی اخباروں اور رسالوں میں آج سے پچیس تیس سال قبل شائع کرایا تھا۔ فوق کے علاوہ تمام ماہرین اقبالیات نے اس بات پر اپنا زور قلم صرف کیا ہے کہ اقبال کے والد بزرگوار کو نظر بد سے بچانے کے لئے والدین نے بارہ سال تک نتھ پہنائی تھی۔ اس لئے نتھو ان کی عرفیت ہوگئی تھی۔ ہم نے اس ''عرفیت'' کی بھی تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر تردید کی ہے۔

(۵) اقبال بنام شاد- علامہ اقبال کا غائبانہ تعارف شاد حیدر آبادی سے ۱۹۰۴ء میں دکن ''ریویو'' کی ایک غزل سے ہوا جو اقبال کے نام سے چھپی تھی۔ اس کے چھ سال کے بعد دونوں کی پہلی ملاقات مارچ ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ اس دوران دونوں بزرگوں میں خط و کتابت بھی ہوئی ہوگی۔ مگر وہ دستیاب نہیں ہے۔ دوسری ملاقات جولائی ۱۹۱۳ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں کے بعد اقبال اور شاد کے درمیان عرصۂ دراز تک مراسلت جاری تھی۔ ان خطوط کو ڈاکٹر زور نے ''شاد اقبال'' کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔ زور صاحب نے اس مجموعے میں اقبال کے ۴۹ اور شاد کے ۵۲ (کل تعداد ۱۰۱) خطوط شامل کئے۔ کتاب میں اقبال کا پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء اور آخری ۴ جنوری ۱۹۲۷ء کے موجود ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اقبال اور شاد میں ۱۹۱۶ء سے قبل اور ۱۹۲۷ء کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔

محمد عبداللہ قریشی صاحب کا کیا کہنا کہ انہوں نے سالہا سال کی سرتوڑ محنت اور تلاش و

جستجو کے بعد اقبال اور شاد کے وہ خطوط دریافت کیے جو ڈاکٹر زور کی کتاب ''شاد اقبال'' میں نہیں ہیں۔ موصوف نے اقبال کے مزید ۵۰ غیر مطبوعہ خطوط کا اضافہ ''اقبال بنام شاد'' میں کر کے داد تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ مرحوم اگر یہ بتانے کی زحمت فرماتے کہ یہ پوشید خزانہ انہیں کیسے اور کس طرح ہاتھ آیا تو مناسب رہتا۔ وہ کتاب کے مقدمہ (صفحہ ۵۶) میں صرف اتنا لکھتے ہیں:۔

''میں نے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد جب ہندوستان اور حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں سے خط و کتابت شروع کی تو ان گمشدہ خطوط میں پچاس سال کا سراغ مجھے ملا۔ میرے عزیز دوست بشیر احمد ڈار صاحب ان دنوں اقبال اکیڈمی کراچی کے ڈائرکٹر تھے۔ اقبال کے خطوط اور فوٹو جمع کرنے میں خاص دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے ان کو ''مومن کی اس گمشدہ پونجی'' کے ملنے کی اطلاع دی اور انہوں نے ہزاروں روپے صرف کر کے یہ متاع بے بہا اکیڈمی کے لئے حاصل کر لی۔ اب اقبال اکیڈمی کے شکریے کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے''۔

ان خطوط کی بڑی اہمیت ہے اور یہ اقبال کے سوانح نگاروں کے لئے نہایت اہم ہیں۔ ان میں ان جذبات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ جو پہلی دفعہ منظر عام پر آ گئے ہیں۔ خطوط سے یہ بھی واضح ہوا جاتا ہے کہ دونوں بزرگان ایک دوسرے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور گھریلو معاملوں میں آپس میں مشورہ بھی کرتے تھے۔ ذیل میں ایک خط مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو شاد کے نام ہیں:۔

''الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں...... چونکہ میرے ذمہ داروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے...... گھر بھر کا خرچ میرے ذمہ ہے۔ بڑے بھائی جان جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا اب پنشن پا گئے۔ ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمہ ہیں..... خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرتناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس لئے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں اُسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔ غرضکہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کے کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔''

کتاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مرتب نے بعض ''دھندلے نقوش'' کو

تعلیقات میں نمایاں طور پر روشن کیا ہے اور ایسی شخصیتوں، ادیبوں اور دانشوروں کے متعلق مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ خطوط میں اقبال کے کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اقبال کے کسی مجموعے نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر۔

(۱) گم گشتۂ کنعاں ہے اے خوگر زنداں تو — ہستی کے خیاباں میں ہر پھول زلیخا ہے

(۲) دل کو یک بین و یک اندیش تو کرلے پہلے — پھر جو ہو ذوق نظر آنکھوں کو ہر جائی کر

(۳) وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی — سنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

(۴) بناوٹ کی بے اعتنائی کے صدقے — بڑے کام آیا مجھے دور کرنا

(۵) نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے — ہر ایک چیز میں دیکھا اسے کہیں میں نے

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

(۶) حیات جاوداں۔ یہ کتاب ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور بزم اقبال کلب روڈ لاہور کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اقبال کے وہ تاریخی قطعات یکجا کیے گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً کسی کی ولادت یا وفات کے موقعوں پر کہے گئے تھے۔ مرتب کتاب نے ہر تاریخ کی ابتدا میں معتبر تعارفی نوٹ بھی لکھے ہیں۔ اقبال کی یہ تاریخیں اس سے قبل مرحوم قریشی نے ''سرود رفتہ''، نقوش اقبال لاہور، اقبال نمبر بابت ۱۹۷۷ء اور باقیات اقبال (طبع ثالث) میں شائع کی تھیں۔ یہ قطعات اب زیر نظر کتاب مفید اضافوں کے ساتھ دوبارہ شامل کر کے محفوظ کر دئے گئے ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۵۶ میں اقبال کی وہ تاریخ بھی درج ہے جو انہوں نے کلام فوق کی اشاعت کے موقعہ پر کہی تھی۔ تاریخ یہ ہے۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار — معلوم ہوا مجھکو بھی حال نظر فوق

شستہ ہے زباں جملہ مضامین ہیں عالی — تعریف کے قابل ہے خیال نظر فوق

تاریخ کی مجھکو جو تمنا ہوئی اقبال — ہاتف نے کہا لکھدے ''کمال نظر فوق''

یہ تاریخ پہلے ''نظر فوق'' کی ردیف کے ساتھ فوق، محمد عبداللہ قریشی اور دوسرے لوگوں نے اپنی تصنیفات میں شائع کی تھی۔ مادۂ تاریخ کا مصرعہ یوں تھا۔

ہاتف نے کہا لکھدے ''کمال نظر فوق''

''کمال نظر فوق'' سے ۱۳۲۷ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں جبکہ ''کلام اقبال'' ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں

چھپا تھا۔ مشہور شاعر حفیظ ہوشیار پوری نے روزنامہ ''آفاق'' لاہور (مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۵۰ء) کی اشاعت میں اس قطعۂ تاریخ پر ان الفاظ میں اعتراض کیا تھا:۔

''یہ مادۂ تاریخ درست نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم سے اعداد وشمار کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ ''کمال نظر فوق'' کے اعداد ۱۴۲۷ ہیں حالانکہ ۱۳۲۷ ہونا چاہیے۔''

فوق کو بھی علامہ کے اس تسامح کا احساس ہوگیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے ''کلام فوق'' کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۳ء میں شامل نہیں کیا تھا۔

جناب کسریٰ منہاس فن تاریخ گوئی کے ماہر تھے۔ وہ اور قریشی مرحوم اس بات پر مصر تھے کہ اقبال نے تاریخ تو صحیح کہی لیکن کاتب نے اسے غلط لکھا۔ چنانچہ قریشی صاحب زیر نظر کتاب کے صفحہ ۵۷ میں لکھتے ہیں:۔

''حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کو اعداد وشمار کرنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ غلطی کاتب کی تھی۔ کاتب نے ''کمال نظر فوق'' لکھ کر سب کو چکر میں ڈال دیا۔ حالانکہ صحیح لفظ ''نضر'' ہی لکھا تھا۔ جس کے استعمال سے صحیح تاریخ ۱۳۲۷ھ نکلتی ہے۔ اس نکتے تک پہنچنے کے لئے میرے دوست کسریٰ منہاس کی توجہ میرے شامل حال رہی ہے۔ جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔''

راقم حروف جناب حفیظ ہوشیار پوری سے متفق ہے کہ اقبال کو اعداد وشمار کرنے میں سہو ہوگیا تھا۔ ''کلام نضر فوق'' غیر مانوس ترکیب ہے۔ ''نضر'' اردو میں کیا فارسی میں بھی استعمال نہیں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں راقم کا مقالہ ''اساتذہ اردو کی فاش غلطیاں'' کشمیر یونیورسٹی کے میگزین ''بازیافت مطبوعہ ۱۹۸۶ء اور ہماری زبان نئی دہلی مطبوعہ یکم جون ۱۹۸۲ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دراصل اقبال کو تاریخ گوئی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شاذ و نادر ہی تاریخیں کہتے تھے۔ حیات جاوداں میں قریشی صاحب نے چند اہم شخصیتوں کی تاریخوں کے ساتھ نوحے بھی شامل کئے ہیں جو ان کے انتقال پر کہے گئے تھے۔ ان اشخاص کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اقبال نے اپنی کتاب میں ان کو جلا بخشی ہے۔

(۷) تذکار اقبال- یہ کتاب محمد الدین فوق کی ان نادر و نایاب تحریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اقبال سے متعلق ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۳ء تک اپنے اخباروں، رسالوں، کتابوں اور قلمی یادداشتوں میں مختلف اوقات میں قلمبند کی تھیں۔ یہ جملہ تحریریں قریشی صاحب نے اپنے مبسوط اور پر مغز مقدمے کے ساتھ ترتیب دیں جو بعد میں اقبال اکادمی لاہور سے

۱۹۸۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔

میں نے کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ اور خاندان اقبال کے جد اعلیٰ لولی حاجی کے بارے میں فوق نے جو کچھ لکھا اس کے ساتھ اختلاف کیا۔ قریشی صاحب نے کتاب کے صفحہ ۱۲۵ میں اقبال کی تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں اس تاریخ سے اختلاف ہے۔ ہمارا ایک مضمون ''علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش'' ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے عنوان سے نقوش لاہور اقبال نمبر (۲) بابت دسمبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ مضمون کے بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ''نقوش محمد طفیل نمبر صفحہ ۵۱۰ مطبوعہ جولائی ۱۹۷۸ء میں لکھتے ہیں:۔

''اقبال کی ولادت پر برصغیر کے دو نامور محققوں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے مقالات زیادہ تر اہم ہیں، جن کے مطابق اقبال کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ یہ عین وہ زمانہ تھا جب سرکاری طور پر ۱۸۷۷ء کو علامہ کا سن پیدائش قرار دیا جا چکا تھا۔ اور اس حساب سے صد سالہ جشن ولادت منایا جا رہا تھا۔ جن دنوں نقوش کی جلد دوم منظر عام پر آئی انہی ایام میں ۲-۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو لاہور میں اقبال پر سب سے بڑی بین الاقوامی کانگریس منعقد ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال میں مقالہ نگاروں کی جرأت مندی کے ساتھ نقوش کی جسارت آفرینی بھی لائق داد تھی۔ تاریخ ولادت کے مسئلے پر یہ دونوں مضامین محاورے کی زبان میں پتھر کی لکیر ثابت ہوئے۔ اور آج تک کسی سے ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ یہ بات نقوش کے لئے باعث افتخار و اعزاز ہے۔''

راقم پہلا شخص ہے کہ جس نے ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر علامہ اقبال کے والد گرامی کا نام شیخ نتھو قرار دیا۔ اس تحقیق کے لئے مجھے ہندوستان کے کم ظرف اور نگاہ غلط انداز والے نام نہاد ماہرین اقبالیات کے بغض و تعصب کا شکار ہونا پڑا۔ ڈاکٹر گیان چند پہلے محقق ہیں جنہوں نے ہماری تحقیق کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور ایمانداری سے اپنے گرانقدر مقالے ''اردو میں تحقیق و تدوین کے معیار کا جائزہ'' مطبوعہ علی گڈھ میگزین (صفحہ ۳۱۴) بابت ۱۹۷۹-۱۹۸۲ء میں بابانگ دہل فرمایا:۔

''ڈاکٹر اکبر حیدری نے ''ہماری زبان'' میں دو قسطوں میں ایک مضمون لکھا جس میں ثابت کیا کہ اقبال کے والد کا نام شیخ نتھو تھا۔ بہت بعد میں اسے شیخ نور محمد بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اس کے دو ثبوت دئے ہیں۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک سیالکوٹ میونسپلٹی کے چار اندراجات جن میں اولادوں کے والد کا نام محض ''نتھو'' درج ہے۔ دوم ایک بیع نامہ جو مارچ ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اس میں خریدار کا نام تین جگہ ہے اور صرف ''شیخ نتھو'' ہے۔''

یہ بات قابل ذکر ہے کہ محمد عبداللہ قریشی نے اپنی کتاب ''تذکار اقبال صفحہ ۱۲۵ میں فوق کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

''اقبال کے والد کا اصل نام شیخ نتھو تھا۔ بعد میں یہ نام شیخ نور محمد کے نام سے بدل دیا گیا۔ وہ لکھے پڑھے نہ تھے۔''

راقم حروف اور محمد عبداللہ قریشی میں خط و کتابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ وہ خط و کتابت کے معاملے میں سخت پابند تھے۔ موصوف کے میرے پاس ادبی خطوط کا ایک ذخیرہ تھا۔ بہت سے خطوط تلف ہو گئے۔ بہت کچھ باقی ہیں۔ یہ سبھی خطوط ادبی نوعیت کے ہیں اور بیشتر میں علامہ اقبال کا ذکر خیر کیا گیا ہے۔ ذیل میں سر دست چند خطوط من وعن درج کیے جاتے ہیں:-

(۱) از محمد عبداللہ قریشی

1031-آئی، کوچہ کماں گراں، رنگ محل، لاہور (پاکستان)

محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب السلام علیکم!

میں نے پروفیسر اجمل نیازی (گورنمنٹ کالج لاہور) کے نام آپ کا ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ء کا گرامی نامہ دیکھا۔ میرے بارے میں آپ نے یہ الفاظ لکھ کر کہ ''میں آپ کو بہت بڑا محقق اور سب سے بڑا ماہر اقبالیات سمجھتا ہوں۔ فوق کے بارے میں آپ ان سے ضرور مشورہ لیجئے۔'' اپنی بہت بڑی عزت افزائی سمجھتا اور اس کو آپ کی محبت پر محمول کرتا ہوں۔ اجمل نیازی صاحب یہ مقالہ میری ہی تحریک اور توجہ دلانے پر لکھ رہے ہیں۔ میرے پاس ان کا تحقیقی مقالہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ انشاءاللہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

جہاں تک اقبالیات کا تعلق ہے، میری پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی دو تین باقی ہیں میری کتاب ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے اور ''میر جالب دہلوی'' والے مضمون میں اس کے حوالے بھی دے چکے ہیں۔ اب یہاں کے اہل نظر کی توجہ بھی اس کتاب پر پڑی ہے اور کراچی، کوئٹہ، ملتان، لاہور، اسلام آباد اور پشاور کے نقادوں نے جمع ہو کر اقبالیات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس کتاب کو مثبت اور مستند قرار دے کر اسے انعام کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ عنقریب اس کا اعلان ہو جائے گا۔

۱۹۱۲ء میں فوق مرحوم نے ''کشمیری میگزین'' کا ایڈیٹر نمبر شائع کیا تھا۔ جو بعد میں اخبار نویسوں کے حالات کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں میر جالب نے ''جالب ناکام'' کے نام سے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ جو بعد میں نقوش کے ''آپ بیتی نمبر'' میں نقل کر دیئے تھے۔ آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے۔

آپ کے مضمون کے ابتدائی حالات بالکل اسی کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔ میر جالب کی وفات کے وقت پشاور سے ایک رسالہ ''ادیب'' شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اس نے جالب نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا اور اس وقت کے مشہور اخباروں کے ماتمی نوٹ بھی نقل کیے تھے۔ اب وہ نمبر نہیں ملتا۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے ''وکیل'' امرتسر کے کچھ پرچے امر سنگھ کالج لائبریری میں محفوظ کر دیے ہیں۔ کیا آپ اپنے کسی شاگرد کو اس کام پر لگا کر مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان میں علامہ اقبال کا کوئی مضمون بھی ہے؟ ہے تو کون سا ہے؟

جناب مرزا کمال الدین شیدا کے کتب خانے میں ''چودھویں صدی'' اور ''سرمور گزٹ'' کے پرچوں کی موجودگی کا سن کر بھی خوشی ہوئی۔ میں مرزا شیدا اور ان کے بزرگ مرزا غلام مصطفیٰ ریٹائرڈ وزیر وزارت سے ملتا رہا ہوں۔ مگر اب ملوں تو شاید وہ مجھے پہچان بھی نہ سکیں۔ پچاس سال پہلے کی بات ہے۔

میری کون سی کتاب آپ کے پاس ہے؟ شاید میں کوئی کتاب بھجوا سکوں۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم کی پرنسپلی کے زمانے میں آپ کے کالج میگزین ''وتستا'' میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ کشمیر کے متعلق تھا۔ اس وقت نواب مرزا جعفر علی اثر کشمیر کے منسٹر تھے۔ ان کی نظمیں اور ڈاکٹر تاثیر کا اپنا ایک مضمون اقبال کے متعلق بھی تھا۔

چودھویں صدی کے مضمون نگاروں میں ایک نام آپ نے شہزادہ گوہر کا بھی لکھا ہے۔ یہ بیرسٹر نہیں تھا۔ ان کی کیا چیز اس میں شامل ہوئی ہے؟ میں نے انہیں دیکھا، مگر ان کی قبر لاہور میں دیکھی ہے جو اب بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ والی قبر پر علامہ اقبال کا یہ قطعۂ تاریخ وفات کندہ ہے۔

سلطان اسماعیل جان

از جہاں شہزادہ اسماعیل رفت	آں امیر ابن امیر ابن امیر
از فلک آمد بگوش من ندا	سال آں ''مغفور'' را مغفور گیر (۱۳۲۶ھ)

یہ کابل کے ایوب شاہی خاندان کی قبریں ہیں۔ یہ بات خط لکھتے لکھتے یوں ہی ذہن میں آ گئی۔ ورنہ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں خود کشمیری نہیں ہوں، مگر کشمیر سے محبت کی بنا پر اقوام کشمیر سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ اپنی ذاتی معلومات کے لئے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لکھنؤ کے کس کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں خواجہ عزیز الدین عزیز، مرزا ہادی عزیز اور خواجہ عبدالرؤف عشرت سب کشمیری تھے۔''

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

(۲) 1031 - آئی، کوچہ کماں گراں، رنگ محل، لاہور (پاکستان)

۲۴ جون ۱۹۸۶ء

محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب! السلام علیکم

آپ کا ۸ جون ۱۹۸۶ء کا محبت نامہ ملا۔ کشمیر سے ٹھنڈی ہوا آئی، فرحت محسوس ہوئی۔ اپنی تعریف پڑھکر سخت شرمندہ ہوا۔ میں بالکل ایک گوشہ نشیں درویش ہوں۔ کسی تعلیمی یا تدریسی ادارے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں یتیمی کی گود میں پلا بڑھا۔ ماں باپ بچپن ہی میں مجھے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۰ء تک اڑتیس سال میں ریلوے کی ملازمت کرتا رہا۔ یہ خدا کی دین ہے کہ اس سارے عرصے میں، میں اپنے شوق اور لگن سے لکھتا پڑھتا رہا۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے ۱۹۲۲ء میں میرے متعلق کہا تھا

وہ اک جوان قریشی محمد عبداللہ ادا شناس معانی، مزاج دان ادب
وہ ایک ذرہ جو پامال رہگذر ہو کر بنا خود اپنی ہی کوشش سے آسمان ادب

یہ جو کچھ میں نے اب تک لکھا ہے یہی میری کل کائنات اور میری میراث ہے۔ جب کوئی میرے کام کی تعریف کرتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ آخر انسان ہوں فرشتہ نہیں۔

بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقبال کشمیری پنڈتوں کی سپرو گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے کہ اقبال خود اپنے سپرو برہمن کہتے ہیں۔ ''اثبات جرم کو نہیں حاجت گواہ کی'' اس میں منشی محمد الدین فوق اور سر شیخ عبدالقادر کا کوئی قصور نہیں۔ اقبال نے کچھ انہیں بتایا انہوں نے لکھ دیا۔ انہیں غلط بیانی کرنے یا دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ میری کتاب ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' کا پہلا مضمون ''جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست''۔ ایک بار پھر ملاحظہ فرماویں۔ اس میں اقبال کے دو خط اسی سلسلے میں موجود ہیں۔ اگر وہ کشمیری الاصل نہیں تھے تو وہ ''تنم گلے زخیابان جنت کشمیر؟'' کیوں کہتے؟ اگر وہ سپرو نہ تھے تو اس کی وجہ تسمیہ معلوم کرنے کی اتنی تگ و دو کیوں کرتے۔

رہا لولی حاجی کا لنگڑا اور لاولد ہونا، تو یہ بعد کی بات ہے۔ اس سے قبل وہ کئی حج پاپیادہ کر چکے تھے اور شادی شدہ بھی تھے۔ بیوی کے آزردہ ہو جانے کا قصہ تاریخ اعظمی میں موجود ہے اور اس کا ذکر اقبال نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔

''آں برہمن زادگان زندہ دل''......وغیرہ اشعار کی بات دوسری ہے۔ اقبال اپنے شعروں کے مفہوم کے لئے کسی کو پابند نہیں کرتے تھے۔ کہ اس کا مفہوم یہ ہے یہ نہیں ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ شعر کی بلاغت یہ ہے کہ وہ پہلودار ہو اور اس کے کئی کئی معنی نکلیں۔ جو سنے اسی کی داستاں معلوم ہو۔

اخبار ''وکیل'' امرتسر کے جن مضامین کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ سب میرے پاس موجود ہیں اور میں انہیں اپنے مضمون ''معرکہ اسرار خودی'' میں استعمال کر چکا ہوں۔ یہ مضامین ''مقالات اقبال'' میں محفوظ کردیئے گئے ہیں۔ مضمون ۱۹۵۲-۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ''بازیافت'' ابھی تک مجھے نہیں ملا۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی کتاب میں بھی آپ کو بھیجوں گا۔ میری تصویر آپ ''شیرازہ'' کے فوق نمبر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

---

(۳) 1031- آئی، کوچہ کماں گراں، رنگ محل، لاہور (پاکستان)

23-11-1986

محترم ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم

آپ کا ۱۶ نومبر ۱۹۸۶ء کا لکھا ہوا گرامی نامہ ملا۔ دلی خوشی ہوئی کہ فنون کا سالنامہ اور ''اقبال بنام شاد'' دونوں چیزیں آپ کو رجسٹری کے ذریعہ مل گئیں۔ رجسٹری کے ذریعے بھیجنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ آپ نے جو کالج میگزین (بازیافت) بڑی محنت سے خود پوسٹ کردیا تھا وہ آج تک مجھے نہیں ملا۔ خوشی اس بات کی بھی ہوئی کہ دونوں چیزیں آپ کو پسند آئیں۔ آپ ''اقبال بنام شاد'' کے متعلق جو کچھ بھی لکھیں وہاں کے پرچوں میں تو ضرور شائع کرائیں۔ مگر اس کی ایک فوٹو سٹیٹ کاپی مجھے بھی بھیج دیں۔ میں یہاں کے کسی پرچے میں بھی شائع کرادوں گا۔ آپ اپنے مضامین بھی بھیج دیجئے۔

میں ''نیرنگ خیال'' کی ابتداء سے اس کا مضمون نگار رہا ہوں۔ منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار ''کشمیری'' لاہور اور پروفیسر محمد علم الدین سالک کے مضامین بھی میرے ہی ذریعے اس میں شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر سالک صاحب کے تقریباً تمام مضامین اور افسانوں کے نیچے میرا نام آپ کو درج نظر آئے گا۔ میں ۱۹۲۱ء سے مختلف رسالوں میں چھپ رہا ہوں۔ نیرنگ خیال میں بھی میرے بے شمار مضامین ہیں۔ مگر نومبر ۱۹۲۵ء کے جس مضمون کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ میرا نہیں بلکہ مولوی محمد عبداللہ چغتائی کا ہے جو بعد میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں ہم تین ہمنام تھے اور تینوں لکھتے تھے۔ اس سے سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی اشتباہ ہوگیا تھا۔ اور ہم تینوں نے آپس میں سمجھوتہ کرلیا تھا۔ میں اپنے نام کے ساتھ قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ (جو ابھی ڈاکٹر نہیں ہوئے تھے) اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح موصوف مولوی صاحب بعد میں اپنے نام کے ساتھ چغتائی لکھنے لگے

تھے۔ سید سلیمان ندوی ہم تینوں کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ جب میں نے ان کی غلطی رفع کی تو انہوں نے معذرت کا خط لکھا کہ قرآن مجید کی اس آیت ''شعوبًا و قبائلا'' کی سمجھ آج ہی آئی ہے۔ آئندہ میں آپ سے خط و کتابت کے وقت، سید، قریشی اور چغتائی کو ذہن میں رکھوں گا۔ سید سلیمان ندوی کا وہ خط جو میرے نام ہے، طفیل مرحوم کے بھیجے ہوئے مکاتیب نمبر میں موجود ہے۔ اسی مکاتیب نمبر میں جس میں میرا مضمون ''مشاہیر ادب'' شائع ہوا ہے۔ اسی مکاتیب نمبر میں چند خطوط مولانا سیماب اکبر آبادی کے بھی ہیں جو میرے نام ہیں۔

مولانا عاشق حسین سیماب اکبر آبادی جن کی پیدائش ۱۸۸۰ء میں اور انتقال جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوا، میرے محبوب شاعر تھے۔ میں ان سے نیازمندانہ آگرہ جا کر ملا بھی تھا۔ پھر جب علامہ تاجور نجیب آبادی نے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب لاہور کے سرمایہ کی مدد سے ''اردو مرکز'' کی بنیاد رکھی، تو ہندوستان کی متعدد ادبی شخصیتوں اصغر گونڈوی، یاس یگانہ عظیم آبادی، جگر مراد آبادی اور علامہ سیماب اکبر آبادی کو لاہور بلا لیا۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں مولانا کے نامور شاگرد ساغر نظامی نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ دفتر ''پیمانہ'' آگرہ سے مستقلاً لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس خبر سے مجھے بے حد مسرت ہوئی اور میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ وہ لاہور کے کی دروازے کے اندر ایک مکان میں مقیم تھے۔ یہ مکان منشی محمد الدین فوق کے مکان سے کچھ فاصلے پر اس حویلی کے بالکل قریب تھا، جہاں کسی زمانے میں منشی ہرسکھ رائے پنجاب کا سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار کوہ نور (۱۸۵۰ء-۱۹۰۳ء) شائع کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے علامہ سیماب، ساغر نظامی اور منظر صدیقی کے اعزاز میں پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں چودھری خوشی محمد ناظر، پروفیسر محمد دین تاثیر (جو ابھی ڈاکٹر نہیں ہوئے تھے) پروفیسر محمد علم الدین سالک، حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال لاہور اور منشی محمد الدین فوق شریک تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر جی بھر کر باتیں ہوئیں۔ سب نے اپنا کلام سنایا۔ علامہ نے لاہور، آگرہ، دہلی اور کراچی میں جہاں بھی قیام کیا، مجھے یاد رکھا۔ اپریل ۱۹۳۳ء میں جب میری شادی ہوئی تو علامہ نے جو نظم کہی، اس کی ایک نقل ان کی یادگار کے طور پر میں آپ کو بھیجتا ہوں۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جموں و کشمیر میں ماسٹر صادق علی خان اور منشی نور الدین عنبر دو پختہ گو شاعر تھے۔ ان شاعروں کے نغموں سے کشمیر کی فضائیں مسحور رہتی تھیں۔ ان کا کلام ''مخزن'' کے دور اول میں بڑے اہتمام اور پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ چودھری خوشی محمد ناظر اس وقت سرخیل شعرائے کشمیر تھے۔ منشی صادق علی خان ملازمت کے سلسلے میں کشمیر آئے اور ساری عمر انہوں نے اس وادی رنگ

وبو میں گزاردی۔ کشمیر نے ان کی شاعری کو رنگین اور دلآویز بنادیا۔ نیچرل شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اسی لئے غزل سے زیادہ انہوں نے نظم پر توجہ دی۔ بعض انگریزی نظموں کے کامیاب ترجمے بھی کئے۔ سرینگر کی انجمن نصرت اسلام کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے۔ کچھ عرصہ جموں کے محکمہ تعلیم میں بھی رہے اور پونچھ میں بھی۔ ایڈیٹر مخزن کی طرف سے ان کی اکثر نظموں پر تعارفی نوٹ بھی درج ہوتے تھے۔ مخزن مارچ ۱۹۰۳ء، اگست ۱۹۰۷ء، مارچ ۱۹۱۲ء میں ان کے کلام کے اچھے نمونے مل سکتے ہیں۔ مخزن کے علاوہ زمانہ کانپور میں بھی ان کا کلام بکھرا پڑا ہے۔ خمخانہ جاوید جلد پنجم صفحہ ۲۴۹ میں ان کے کچھ حالات مل جائیں گے۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہوسکی۔ منشی محمد الدین فوق نے ''سرگذشت فوق'' میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔

منشی نورالدین عنبر بھی اس زمانے کی ادبی محفلوں کا سنگھار تھے۔ وہ جموں کے رہنے والے تھے اپنے خاندان میں وہ پہلے نوجوان تھے جنہوں نے میٹرک پاس کیا۔ اپنی ملازمت کی ابتداء ہی میں وہ سرراجہ امر سنگھ کی جاگیر بدرواہ میں نائب تحصیلدار ہو گئے۔ لیکن تھوڑا ہی عرصہ بعد ۳۵-۳۶ سال کی عمر میں پیغام اجل آگیا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی شاعری کی ابتداء کس طرح ہوئی اور انہوں نے اصلاح سخن کس سے لی۔ البتہ ان کا کلام اپنی جولانی طبع اور انداز سخن کی وجہ سے اس دور کے ادب میں ایک خاص مقام رکھتا تھا اور علامہ اقبال، سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، حبیب کنتوری، اعجاز، نیرنگ، ناظر، طالب بنارسی، آغا شاعر، اکبرالہ آبادی، عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، رضا علی، وحشت کلکتوی، شفق عمادپوری کے ساتھ مخزن میں شائع ہوتا تھا۔ مگر افسوس کہ لوگوں نے انہیں بہت جلد بھلا دیا۔ مخزن ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۲ء تک ان کا کلام چھپتا رہا۔ پھر نظر نہیں آیا۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ کلام فوق میں منشی محمد الدین فوق نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔

آپ نے اخبار چودھویں صدی کے کسی مضمون کا حوالہ دیا ہے، جس میں نورالدین عنبر نے اپنے آپ کو شاگرد ناظم (؟) کہا ہے۔ یہ درست ہی ہوگا۔ ناظم صاحب میر ناظم حسین ناظم لکھنوی تھے۔ سادات بارہ سے تھے۔ لاہور میں ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ ان کے مقابلے کے شاعر مرزا ارشد گورگانی دہلوی تھے۔ ان ہی کی معاصرانہ چشمک کو دیکھ کر اقبال نے کہا تھا۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

کرنل مجید ملک ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب اور علی گڈھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ سب سے پہلے انگریزی روزنامہ مسلم اوٹ لک (Muslim

(OutLook) سے کیا۔ پھر عالمی خراسان ایجنسی رائٹر اور ایسوی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۴۰ء میں انہیں نئی دہلی میں مسلح ہندوستانی افواج کے جنرل ہیڈ کوارٹر میں اسٹاف افسر مقرر کیا گیا۔ یہاں انہیں کرنل کے عہدے پر ترقی دے کر انٹر سروس پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ میں ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ترقی اردو بورڈ لاہور کے ڈائرکٹر اور اس کے بعد پاکستان ٹائمز اور امروز گروپ آف نیوز پیپرز لاہور کے منیجر ڈائرکٹر مقرر رہوئے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

وہ اردو کے بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ سالنامہ کاروان جو مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے جاری کیا تھا، اس کا دوسرا پرچہ انہوں نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔

حکیم یوسف حسن مدیر نیرنگ خیال کوئی آٹھ سال ہوئے فوت ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں محمد طفیل مرحوم نے ایک پوری کتاب لکھی تھی۔ وہ مرحوم کے لڑکوں سے اب بھی مل سکتی ہے۔ اس میں ان کے تفصیلی حالات ہیں۔ نیرنگ خیال اب بھی راولپنڈی سے نکلتا ہے۔ وہ ان کی موجودگی ہی میں سلطان رشک مرتب کرنے لگے تھے۔ نیرنگ خیال نے حکیم صاحب کی یاد میں جو نمبر شائع کیا تھا، وہ میرے پاس تو نہیں ہے۔ مگر کوشش کی جائے تو مل سکتا ہے۔

ایبٹ آباد کے صابر کلوروی صاحب جو ''باقیاتِ شعر اقبال'' پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ آپ کا پتا میں نے ہی بتایا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں کچھ نئی چیزیں ان کو مل جائیں گی۔ انکا مقالہ اب آخری مراحل میں ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ اپنی ''باقیات'' مجھے ہی بھجوا دیں۔ صابر کلوروی کے ساتھ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ آپ کو نیکی سے یاد کروں گا۔

میں نے اب سے بیس سال پہلے ادبی دنیا لاہور کا ''کشمیر نمبر'' شائع کیا جو بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر میں نے اس کا نام ''آئینہ کشمیر'' رکھا تھا۔ وہ حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے وہ نمبر گزرا ہے۔ دیدنی ہے۔ میرے پاس شاید اس کی کوئی کاپی نکل آئے۔ اس میں بارہ تیرہ مضمون تو میرے اپنے ہی ہیں۔ میرے چند مضامین کی وجہ سے بعد میں کتاب ''ایران کبیر و ایران صغیر'' شائع کی گئی۔ وہ کتاب بھی شاید مل سکے۔

ع دل ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

آپ سے ملاقات ہونی چاہیے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کبھی لکھنؤ کی بجائے لاہور تشریف لے آئیں۔ کچھ عرصہ ہوا، یوسف ٹینگ صاحب یہاں آئے تھے۔ میں نے ان سے باحسرت و یاس کہا تھا۔

بار ہا دیکھ چکا پھر بھی تمنا ہے یہی
ایک بار اور دکھا دے کوئی کشمیر مجھے

ان کے کئی پیغام آچکے ہیں کہ میں آجاؤں۔ مگر اب میں اسی اکیاسی سے زیادہ اوپر ہو چکا ہوں۔ عزم کمزور ہوگیا ہے۔ چاہوں بھی تو اتنا لمبا سفر اختیار نہیں کرسکتا۔

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

آپ ہی کوئی مشکل آسان کیجئے۔ کبھی موقعہ ملا تو میں اپنے حالات بھی آپ کو سناؤں گا۔

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

---

(۴) از محمد عبداللہ قریشی

1031-آئی، کوچہ کماں گراں، رنگ محل، لاہور (پاکستان)

محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب! السلام علیکم

گزشتہ چھ ماہ سے ہم ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں۔ آپ کا ایک خط لکھنؤ سے آیا بھی تھا، مگر میں بروقت جواب نہ دے سکا۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل[۵] لکھنوی کے ذریعہ سے آپ نے جو کتاب تحقیقات حیدری بھیجی تھی وہ مولانا کی بیماری کی وجہ سے بہت دنوں کے بعد ملی، اس لئے بھی کہ وہ اگر چہ بیمار تھے مگر وہ آپ کی اور میری عزت افزائی کے لئے کتاب لے کر خود میرے پاس تشریف لائے۔ کتاب میں نے جستہ جستہ دیکھی اور آپ کی تحقیقات سے بہت خوش ہوا۔ ضعف بصارت کی وجہ سے پوری کتاب یک لخت دیکھنا میرے بس میں نہیں۔

آپ نے یونیورسٹی میگزین ''بازیافت'' دو دفعہ بھجوانے کے لکھا۔ مگر ایک دفعہ بھی ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اس لئے کسری[۶] منہاس صاحب بھی اور میں بھی دونوں اب تک اس سے محروم ہیں۔ اپنی اس محرومی پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے میری کتاب ''اقبال بنام شاد'' پر تبصرہ فرمانے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا وہ تبصرہ کہیں شائع ہوا۔ ہو چکا ہو تو اس کی ایک نقل مجھے بھیج کر ممنون فرمائیے، تا کہ میں آپ کی رائے سے مستفیض ہوسکوں۔

آپ نے بمبئی کے رسالہ ''شاعر'' میں میرے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر فرمایا تھا۔ مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کیا بنا۔ میں اس کی ایک نقل بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۷ء کے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں پروفیسر محمد عثمان صاحب نے میرا ایک

انٹرویو شائع کیا تھا۔ میں اس کی کاپی آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ مل جائے تو اطلاع دیجئے۔ شاید اس سے آپ کو کوئی کام کی چیز مل جائے۔

علامہ اقبال کو اگرچہ تاریخ گوئی سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی انہوں نے چند تاریخیں کہی ہیں جو تیس چالیس سے زیادہ نہیں۔ میں نے یہ ایک جگہ جمع کر کے ان کی بنیاد پر ایک مختصری کتاب لکھی ہے۔ اس مہینے کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہوگی، مگر اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی ہوگی۔ کیا عجب ہے کہ اس کتاب کی تحریک سے چند نئی تاریخیں مل جائیں۔

میں نے ایک اور کتاب کا ڈول بھی ڈالا ہے۔ اس کا نام ''تذکار اقبال'' ہوگا۔ منشی محمد الدین فوق اقبال کے سب سے پہلے سوانح نگار تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ان کی وفات یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک جو کچھ اقبال کے متعلق اپنے مختلف اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں لکھا وہ یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی پریس میں جا چکی ہے۔

اب میری سب سے اہم کتاب ''معرکۂ اسرار خودی'' رہ گئی ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔ اس مضمون کو چونکہ میں کتاب بنانا چاہتا تھا، اس لئے ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' میں شامل نہیں کیا تھا۔ یہ اقبال کے متعلق میرا سب سے پہلا مضمون تھا جو مجھے اقبالیات میں صف اول میں لے آیا تھا۔

ماسٹر صادق علی خان اور منشی نور الدین عنبر کے متعلق آپ کے استفسارات کا جواب میں نے علیحدہ لکھ دیا ہے۔ شاید کسی کام آسکے۔

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

---

(۵) اعلیٰ اقدار کا قدیم ترین ماہنامہ
پوسٹ بکس نمبر ۳۳۱

ادبی دنیا

بیادگار مولانا صلاح الدین احمد مرحوم
مدیر۔محمد عبداللہ قریشی
۱۰۳۱۔آئی، کوچہ کماں گراں
رنگ محل۔لاہور

۲۰ جولائی ۱۹۸۷ء

محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب۔السلام علیکم

آپ کا ۹ جولائی ۱۹۸۷ء کا خط ملا۔ رجسٹری بھی وصول ہوگئی۔ جس میں ''بازیافت'' کے تین تراشے اور آپ کے تین غیر مطبوعہ مضامین کے مسودے بھی موجود تھے۔ (۱) اردو کے ایک خوددار شاعر میرزا یاس چنگیزی (۲) باغ و بہار کے قدیم نسخے (۳) ''گنجینۂ نوادر کا ایک ورق'' یہ تینوں مضامین

نہایت کام کے ہیں۔ میں نے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے حوالے کر دئے ہیں۔ مرزا یگانہ کسی زمانہ میں ایک مجلّہ ''صحیفہ'' بھی نکالا کرتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ دوست نے اس کو بنیاد بنا کے ایک مضمون لکھا ہے۔ وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے سہ ماہی مجلّہ ''صحیفہ'' میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مرزا صاحب نے غالبؔ کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے چند اشعار کی شرح بھی کی ہے۔ وہ مضمون جب شائع ہوگا تو میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ اس کے بعد خیال ہے کہ آپ کا مضمون بھی شائع ہو جائے۔ مگر وہ بہت طویل ہے۔ اگر مناسب سمجھا گیا تو اس کی دو قسطیں کی جا سکتی ہیں۔ گنجینۂ نوادر کی گنجائش بھی نکالی جائے گی اور باغ و بہار کے قدیم نسخوں کی بھی۔ مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اچھے ادبی رسالے بہت کم ہو گئے ہیں۔ خود ہمارا فنون بھی سات آٹھ ماہ سے چھپنے کی راہ تک رہا ہے اور ابھی ستمبر کے آخر میں شائع ہوگا۔ دو تین ہفتوں کے لئے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب انگلستان اور جرمنی جا رہے ہیں۔ گنجینۂ نوادر میں آپ نے حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط کی روشنی میں جو مرزا سلطان احمد اور خواجہ حسن نظامی کے نام ہیں جو کچھ دیا ہے اس کا بہت سا حصہ میرے مضمون ''معرکۂ اسرارِ خودی'' میں آ چکا ہے۔ مگر خیر کوئی بات نہیں۔ ایسی چیزیں بار بار آنی چاہئیں۔ اگر میرا مضمون جو ۱۹۵۲-۱۹۵۳ء کے مجلّہ اقبال میں شائع ہوا تھا آپ کو کہیں سے مل جائے تو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں اقبال کے وہ مضامین بھی مل جائیں گے جو اخبار ''وکیل'' امرتسر میں شائع ہوئے تھے۔ میں اسی مضمون میں اضافہ کر کے کتاب بنانا چاہتا ہوں۔ اس سے مجھے بھی فائدہ پہنچے گا اور میرے مضمون میں جو کوئی کسر رہ گئی ہے وہ بھی نکل جائے گی۔ کیا میرا وہ مضمون آپ کو کہیں سے دستیاب ہو جائے گا؟

میں اپنی تازہ کتاب ''حیاتِ جاوداں'' (اقبال کی تاریخ گوئی) اور اپنے انٹرویو کی ایک نقل آپ کو رجسٹری کے ذریعہ بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ میرے متعلق جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ آپ کا خط جب بھی آتا ہے کشمیر کے متعلق میری یادوں کا گویا دبستان کھل جاتا ہے۔ اپنے آخری خط میں آپ نے مرزا کمال الدین شیدا[۸] کا ذکر چھیڑا ہے۔ میری ان سے ملاقات اب سے ساٹھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اب تو شاید میری شکل بھی بھول چکے ہوں گے۔ وہ اس وقت غالباً میونسپل کمیٹی کے سکرٹری تھے۔ میری اور پروفیسر محمد علم الدین سالک کی دوستی دراصل شیدا صاحب کے ایک بزرگ اور عزیز مرزا غلام مصطفیٰ ریٹائرڈ وزیر وزارت سے تھی۔ وہ فتح کدل میں دریا کے کنارے رہتے تھے۔ ہم پہروں وہاں بیٹھ کر دریا کا لطف اٹھاتے اور ان کی تصانیف سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ ان کی آخری زیارت کا فخر مجھے لاہور میں حاصل ہوا تھا جب وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر وطن واپس آ رہے تھے۔ اس بات کو بھی اب مدتیں بیت چکی ہیں۔ اور نہیں معلوم مرزا غلام مصطفیٰ صاحب اب جنت آباد ہیں۔ باذوق آدمی تھے۔

آپ نے مرزا کمال الدین شیدا کا موجودہ پتہ لکھ کر میری عمر رفتہ کو آواز دے کر مجھے بھی نٹمیں باغ پہنچا دیا۔ جولائی ۱۹۴۵ء کے دن تھے۔ منشی محمد الدین فوق سرینگر میں بیمار پڑے تھے۔ ان کے حقیقی چچا منشی غلام محمد خادم کے داماد علی محمد خان رجسٹرار کواپریٹیو سوسائٹیز نے انہیں تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے نٹمیں باغ میں جہاں ان کا وسیع مکان اور باغ تھا آنے کی دعوت دی۔ ہم وہاں کئی روز رہے۔ میں تو وہاں سے پیدل حضرت بل اور نسیم باغ چلا جاتا تھا۔ کبھی شکارے میں بیٹھ کر نشاط، شالامار اور ہارون کی سیر کرتا تھا۔ وہاں سے ہم فوق صاحب کے آبائی گاؤں سم پورہ نزیل سوپور چلے گئے۔ یہاں سے جھیل ولر ہوتے ہوئے دریا کے راستے سرینگر اور پھر لاہور پہنچ گئے۔ جہاں ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

دیکھئے بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ یہ دراصل میرے بس کی بات نہیں۔

والہانہ عشق ہے کشمیر سے
روح زخمی ہے وطن کے تیر سے

یہ کشمیر کی شخصیات سے محبت ہی کا اثر ہے کہ جب کسی محبت کرنے والے کا ذکر آجاتا ہے تو دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

اب مجھے اپنی کتابوں کے بارے میں آپ کے تبصرے کا انتظار ہے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ نورالدین عنبر واقعی ناظم کے نہیں ناظر ہی کے شاگرد تھے۔ اس اصلاح کے لئے شکر گذار ہوں۔

انٹرویو رجسٹری کے ذریعے کتاب کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ افسوس کہ انٹرویو لینے والے پروفیسر محمد عثمان کا گزشتہ ماہ حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

---

(۶) لاہور۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۷ء

محترم ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم

بہت دن ہوئے میں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک علیحدہ رجسٹرڈ پیکٹ میں اپنی کتاب ''حیات جاوداں'' کی جلد، روزنامہ نوائے وقت کا انٹرویو اور اپنی آپ بیتی کا ایک ورق ارسال کئے تھے۔ مجھے ان میں سے کسی چیز کی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ چیزیں آپ تک پہنچ گئی ہیں یا نہیں۔ میں نگراں ہوں۔ اطلاع دے کر ممنون فرمایئے۔ اس عرصے میں مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا انتقال ہو گیا۔ جو بے حد افسوس ناک واقعہ ہے۔

میری دو کتابوں کا تبصرہ آپ کی طرف سے قرض ہے۔ پہلی ''اقبال بنام شاد'' اور دوسری

''حیات جاوداں'' (اقبال کی تاریخوں کا مجموعہ) رسالہ شاعر آگرہ (صحیح بمبئی) میں آپ نے میرے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کی نقل بھی ابھی تک نہیں ملی۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص/محمد عبداللہ قریشی

---

(۷) رنگ محل، لاہور

4-10-87

محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب، سلام مسنون

کئی دنوں سے میرا ماتھا ٹھنک رہا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی مجبوری ایسی ہے جس کی بنا پر آپ خط نہیں لکھ سکے۔ ''رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت''۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی آنکھ کا آپریشن کامیاب رہا۔ اب انشاء اللہ عینک بھی بن کر آ گئی ہوگی۔ مگر ابھی کچھ آنکھ پر زیادہ زور نہ ڈالئے گا۔

میں خوش ہوں کہ آپ میری ناچیز نگارشات کا ایک ایک حرف پڑھتے ہیں۔ آپ خود ہنرمند ہیں، ہنر دیکھ لیتے ہیں۔ 'ورنہ من آنم کہ من دانم' البتہ آپ کی حوصلہ افزائی سے مجھے تقویت ملتی ہے۔ اور میں کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے ہونے کا کوئی رنگ نکال لیتا ہوں۔ نقوش نے ادبی معرکوں کے متعلق جو نمبر نکالا تھا، میرا ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء میں لکھا ہوا ''معرکۂ اسرار خودی'' والا مضمون بھی اس میں موجود ہے۔ یہ نمبر آپ کے پاس موجود ہوگا۔ تلاش کے بعد اس کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیے۔ کتاب مرتب کرتے وقت اس میں بہت کچھ اضافہ ہو جائے گا۔

آئینہ کشمیر، آئینہ اقبال، مقالات اقبال، ایران کبیر و ایران صغیر وغیرہ کتابوں میں سے بیشتر آئینہ ادب چوک مینار، انارکلی لاہور سے مل سکتی ہیں۔ ''شاعر کشمیر'' سے مراد منشی محمد الدین فوق ہیں۔ یہ کتابچہ میں آپ کو بھیج دوں گا۔

تاریخ اقوام کشمیر کی تین جلدوں میں سے کوئی بھی اب موجود نہیں۔ تاریخ کشمیر کی بھی تین ہی جلدیں تھیں۔ یہ کشمیر کی عام تاریخ تھی۔ اب یہ بھی نایاب ہے۔ مگر یہ تاریخ اقوام کشمیر سے مختلف ہے۔ اور اس کی ابتداء ۱۹۱۱ء میں ہوئی تھی۔ پہلی جلد راجگان کشمیر کے متعلق تھی۔ دوسری سلاطین کشمیر کے متعلق اور تیسری سکھوں اور ڈوگروں کے متعلق۔ میں نے اپنے انٹرویو میں یہی کہا ہے۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ کا انتقال ۸۷۵ ہجری میں ہوا۔ اس وقت تک وہ اپنی اصلاحات کر چکا تھا اور دارالتصانیف اور دارالترجمہ کی بنیاد رکھ چکا تھا۔ اکبر اعظم نے اسی کی تقلید کی۔ اب یہ آپ خود

اندازہ کر لیجئے کہ اس فصل کو کتنے سال کا عرصہ لگا۔ اسی کا یا زیادہ۔ کیونکہ اس کے بعد تو کشمیر اکبر نے فتح کر لیا۔

منشی محمد الدین فوق نے اقبال کے متعلق ۱۹۰۱ء ہی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اور اقبال کے سب سے پہلے سوانح نگار وہی تھے۔ میرے خیال میں سر عبدالقادر کو اولیت حاصل نہ تھی۔ میں نے اس پر بحث کی ہے۔ اپنا مضمون میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ مخزن اور خدنگ نظر کے پرچے مجھ سے مختص نہیں۔

میں نے جس گدی نشین کا ذکر کیا ہے ان کا نام پیر سیف الدین تھا۔ وہ موضع وندہامہ کے رہنے والے تھے جو گاندربل سے ذرا آگے لار میں واقع ہے۔ ان کے بے شمار مرید تھے جو پن چکیوں کے مالک تھے۔ میں نے اور پھر پروفیسر محمد علم الدین سالک نے انہیں اشاعت تعلیم کی طرف راغب کیا۔ انہوں نے کئی پرائمری سکول کھولے اور خاص گاندربل میں ایک مڈل سکول بھی جاری کیا۔ اس وقت نرنجن داس انسپکٹر آف سکولز تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ سکول حکومت نے اپنی تحویل میں لے لئے۔

ترانۂ ہندی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ وزن کے لحاظ سے

ع پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا

درست معلوم ہوتا ہے۔ میں دو دفعہ آنکھوں کا آپریشن کرا چکا ہوں۔ چھ چھ ماہ کے وقفے کے بعد۔ اب پھر زیادہ لکھنے کی وجہ سے بینائی میں کچھ کمی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن چار روز ہوئے ایک ماہر چشم کو دکھایا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ اب تو صرف دواؤں کا سہارا لینا پڑے گا۔ خدا کرے آپ کی بینائی بالکل درست ہو جائے اور آپ کا قلم رواں دواں رہے۔

مخلص / محمد عبداللہ قریشی

---

(۸) لاہور۔ ۱۶-۲-۱۹۸۸ء

محترمی۔ سلام مسنون!

پچھلے دنوں آپ کا ایک خط ملا، جس پر پانچ دسمبر ۱۹۸۷ء کی تاریخ درج تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ ۲۶ دسمبر کو آپ لکھنؤ چلے جائیں گے۔ اب تو لکھنؤ پہنچ چکے ہوں گے اور آپ کی صحت بحال ہو چکی ہوگی۔ خدا کرے آپ آشوب چشم سے نجات پا کر پہلے کی طرح اپنے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف ہو گئے ہوں گے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ میری کتابوں پر تبصرے کے ساتھ مجھ پر بھی کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ آپ کی محبت ہے اور میں اس لئے شکر گزار ہوں۔ اگر آپ اس جائزے میں میری کتاب "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" بھی شامل کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں اپنی تصویر بھیج دوں گا۔ "ہماری

زبان'' چونکہ عام طور پر یہاں نہیں آتا اس لئے آپ بھجوادیں گے تو کرم ہوگا۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل مرحوم کے بارے میں آپ نے اپنے مضمون میں میرا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مرحوم کے صاحبزادوں نے اس کی نقل مجھے بھی ارسال فرمائی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ وہ اپنے والد محترم کی طرح ان کے چاہنے والوں کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ اس ماہ کی چوبیس تاریخ کو اراکین بزم فاضل مرحوم کی یاد میں ایک نشست کا اہتمام کر رہے ہیں جس میں مرحوم کی علمی اور ادبی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا ہے جس میں مولانائے مرحوم کے تعارف کے ساتھ ان کے چند ہمعصر دانشوروں کی رائے بھی پیش کی گئی ہے۔ ان رایوں میں چند سطریں آپ کی بھی ہیں۔

آغا شاعر کے بارے میں آپ کے مضمون کی نقل میں نے کسریٰ منہاس صاحب کو دے دی تھی۔ وہ گذشتہ چند ماہ سے کچھ علیل ہیں۔ ان کے پاؤں میں درد رہتا ہے۔ ملاقات بھی کم ہی ہوتی ہے۔ میں خود ان کے گھر جا کر دو ایک مرتبہ ملا ہوں۔ آغا شاعر مرحوم کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ان کے فرزندوں سے بھی صاحب سلامت تھی۔ دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی موجود ہیں۔ چند روز ہوئے ان کے صاحبزادے آفتاب قزلباش کا خط مجھے آیا تھا۔ دیکھئے کس محبت سے لکھتے ہیں:۔

''مخدومی و معظمی قریشی صاحب! چند روز ہوئے میں ٹیلی وژن کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ وقت شام کا تھا، جب عموماً ہم لوگ ٹیلی وژن نہیں دیکھتے۔ فیض صاحب کے بقول۔

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے چپکے سے گلستاں میں بہار آجائے

سچ مچ آپ مجسم طور پر نمایاں آنکھوں کے سامنے تھے۔ ایسا جی خوش ہوا۔ چند لمحوں کے بعد بجلی چلی گئی۔ بجلی آئی تو آپ کا انٹرویو کہاں تک جا چکا تھا۔ بہر حال بہت خوشی ہوئی کہ عرصے کے بعد آپ کی زیارت ہوئی اور زیادہ خوشی اس امر کی کہ بالآخر ٹیلی وژن والوں کو خیال تو آیا کہ آپ ایسے یگانۂ روزگار محقق کا انہوں نے نوٹس لیا۔''

یہ دراصل ٹی وی والوں نے ''رواں دواں'' پروگرام کے تحت میرا ایک انٹرویو لیا تھا۔ اس ڈوکومنٹری کو دور دور تک دیکھا گیا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ آغا صاحب نے اسی کا ذکر کیا ہے۔ کچھ اسی قسم کی بات جگن ناتھ آزاد نے جموں میں میری تصویر دیکھ کر لکھی ہے کہ ''پانچ سات روز کی بات ہے کہ آپ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ ڈوکیومنٹری دیکھکر جی خوش ہوگیا۔ لیکن آپ کچھ کمزور نظر آئے۔ خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔''

فنون کا تازہ شمارہ آپ کو رجسٹری کے ذریعہ لکھنؤ کے پتے پر بھیجا گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد مل

جائے گا اور آپ اس کے مطالعہ سے بہت خوش ہوں گے۔ اپنی خیریت مزاج سے آگاہ فرمائیے۔ مخلص
محمد عبداللہ قریشی

---

(۹) رنگ محل- لاہور
۷ مئی ۱۹۸۸ء محترم ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب السلام علیکم

لکھنؤ سے کشمیر آ کر ۱۱ راپریل ۱۹۸۸ء کو آپ نے جو خط لکھا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ میرا ۱۴ فروری ۱۹۸۸ء کا لکھا ہوا جو خط آپ کو لکھنؤ میں ملا تھا اس کے ساتھ فنون کا ایک پرچہ رجسٹری کے ذریعہ بھی میں نے روانہ کیا تھا۔ جس پر ۱۹ روپے ڈاک ٹکٹ کے صرف آئے تھے۔ اس کا آپ نے تذکرہ نہیں فرمایا کہ وہ بھی آپ کو موصول ہو گیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ آپ کو نہ ملتا تو مجھے واپس ضرور مل جاتا۔ یہ رجسٹرڈ پیکٹ آپ کو ۷ افروری کو بھیجا گیا تھا اور ڈاک خانے کا نمبر ۷ تھا۔ یہ بات میں صرف اپنی تسلی کے لئے لکھ رہا ہوں۔

ترانۂ ہندی کو سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اقبال کے انتقال کے بعد بخط اقبال شائع کیا تھا، وہ کوئی خاص بات نہیں۔ اخبار والوں کے پاس پہلے سے موجود ہوگا یا انہوں نے اقبال کے سوگواروں سے حاصل کیا ہوگا۔ اتنے بڑے واقعے کے بعد اخبار والے ایسی باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ البتہ ۱۰ راگست ۱۹۰۴ء کو اقبال نے ایبٹ آباد سے جو خط دیا نرائن نگم مدیر زمانہ کانپور کو بھیجا تھا وہ درست ہے۔ یہ نظم ستمبر ۱۹۰۴ء کے ''زمانہ'' میں شائع ہوگئی تھی۔ اس سے قبل اقبال نے یہ نظم گورنمنٹ کالج کے کسی حلقے میں سنائی تھی۔ صاحبزادہ محمد عمر (نورالٰہی ناٹک ساگر والے) ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے اقبال کی زبانی سن کر اسی وقت یہ نظم لکھ کر مولانا شرر کو بھیج دی جوان کے اخبار ''اتحاد'' میں شائع ہوگئی تھی۔ بعض لفظوں اور ترتیب میں فرق اسی وجہ سے ہے۔ محمد عمر نورالٰہی دو الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ کتاب ناٹک ساگر دونوں کے اشتراک سے لکھی گئی تھیں۔ صاحب زادہ محمد عمر ریاست کی وزارت قانون سے وابستہ تھے۔ مجسٹریٹ درجہ اول کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کا انتقال ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ صاحبزادہ محمد عمر کا ایک فرزند حسن شاہ معروف محقق اور اہل قلم ہے۔ دوسرا محمود احمد سرینگر کے امر سنگھ کالج میں پروفیسر تھا۔ وہیں فوت ہوا۔ نورالٰہی لاہور کے رہنے والے تھے۔ اور ریاست میں ڈپٹی کمشنر (وزیر وزارت) تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء میں لاہور میں ہوا۔

پچھلے دنوں میری ایک کتاب ''تذکار اقبال'' شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ تمام مضامین جمع کردئے گئے ہیں جو منشی محمد الدین فوق نے ۱۹۰۱ء سے لے کر اپنی وفات (۱۴/ اگست ۱۹۴۵ء تک) اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے تھے۔ ایک جلد آپ کو بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔
کسری منہاس صاحب خیریت سے ہیں۔ سلام کہتے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون صحیفہ میں شائع ہوگیا تھا۔ پرچہ بھیجا جا رہا ہے۔

مخلص/ محمد عبداللہ قریشی

---

(۱۰) لاہور

۴ جون ۱۹۹۰ء محترم جناب اکبر حیدری صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط ملا، ممنون فرمایا۔ میں کئی ماہ سے بیمار ہوں اس لئے خط نہیں لکھ سکا۔ آنکھوں میں تکلیف ہے، لکھنا پڑھنا موقوف ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ یاد فرما لیتے ہیں۔ کشمیر کے حالات سن کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ خدا یہ حالات سازگار کرے۔ مرزا یگانہ کے بارے میں آپ نے احمد ندیم قاسمی صاحب کو جو لکھ کے دیا تھا، وہ ان کے پاس محفوظ ہے، شائع نہیں ہوا۔ بہت طویل ہے۔ اقبال کا غیر مدون کلام اگر ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے شائع کردیا تو دیکھنے میں مل جائے گا۔
امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے جو لکھا ہے۔ اپنی بچی سے لکھوا کر لکھا ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع کیجئے۔

والسلام

محمد عبداللہ قریشی

---

(۱۱) کمان گران سٹریٹ

رنگ محل لاہور

۱۶ اگست ۱۹۹۰ء محترم اکبر حیدری صاحب

السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ہر قسم کی آفات سے بچائے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ سوچتا ہی رہا کہ اب کروں گا اور اب کروں گا۔ مگر اب حالات نے مہلت نہ دی۔ میں نے

۱۹۴۶ء میں جو کتاب تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد لکھی تھی وہ فنون کے دفتر کے الٹ پلٹ سے ضائع ہو گئی۔ اب اس کی کاپیاں کسی جگہ ملنا محال ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے اس کا کہیں سے فوٹو اسٹیٹ کاپی کرا دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ میری تو عمر کا حاصل ہے۔ پچھلے دنوں شیرازہ والوں نے اس کی ایک نقل حاصل کی تھی۔ اگر وہ انہی سے مستعار مل جائے تو بڑا کرم ہوگا۔ آپ نے پچھلے دنوں اقبال کے متعلق جو کام کیا تھا وہ ڈاکٹر فرخی کی طرف سے اب تک نظر نہیں آیا۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

محمد عبداللہ قریشی

(نوٹ) یہ خط بھی قریشی صاحب نے بچی سے لکھوایا۔ لیکن دستخط خود کئے تھے۔

حواشی

۱ خط پر تاریخ مرقوم نہیں ہے۔ البتہ لفافے پر پوسٹ کرنے کی تاریخ ۱۵ مئی ۱۹۸۶ء کی ہے۔

۲ سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ کا ٹکڑا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہی نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرے۔

۳ یہ مقالہ ''کلیات باقیات شعر اقبال'' کے عنوان سے ابھی کچھ دن ہوئے اقبال اکادمی پاکستان سے زیور طبع ہو کر ڈائرکٹر صاحب نے ایک جلد مجھے بھیجی۔ کتاب ۲۰۰۴ میں چھپی تھی۔

۴ باقیات سے مراد میری وہ کتاب ہے جو ''کلام اقبال نادر و نایاب رسالوں میں'' کے نام سے جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے ۲۰۰۲ء میں شائع کی۔ اس میں مستند حوالوں سے اقبال کا غیر مدون کلام شامل کیا گیا۔ افسوس کہ کتاب اشاعت سے پہلے ہی قریشی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

۵ مشہور عالم دین، ماہر غالبیات، انیسیات اور دبیریات سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے نام گرامی سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ ان سے میری ملاقات لکھنؤ میں ڈاکٹر کلب صادق کے دولت کدے پر اس وقت ہوئی تھی جب وہ مولانا کلب عابد صاحب قبلہ کی چالیسویں کی مجلس میں جنوری ۱۹۸۷ء میں تشریف لائے تھے۔

۶ کسریٰ منہاس۔ اردو کے مشہور ادیب اور فن تاریخ گوئی کے ماہر تھے۔ لاہور میں رہتے تھے۔ عرصۂ دراز تک محمد طفیل صاحب مرحوم کے مشہور رسالہ نقوش کے ادارہ سے وابستہ تھے۔ راقم حروف کے ساتھ مدت تک خط و کتابت رہی۔ مرحوم مجھ کو بہت مانتے تھے اور کتابیں بھی بھیجتے تھے۔

ے ''گنجینۂ انوار'' دراصل میرا تحقیقی مقالہ اکبر آلہ بادی کے عنوان سے صحیفۂ لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اکبر کے ان خطوط پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی اور مرزا سلطان احمد کے نام لکھے تھے۔ یہ خطوط خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۲ء میں دہلی سے کتابی صورت میں شائع کیے تھے۔ ان خطوط میں اقبال نے اکبر کو لکھا تھا کہ انہوں نے مسئلہ امامت کو تسلیم کیا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی صاحب نے اپنے مضمون ''معرکۂ اسرار خودی'' مطبوعہ مجلۂ اقبال لاہور میں اس کتاب کا کہیں حوالہ نہیں دیا تھا۔ اور میں نے ان کا مضمون اس زمانے میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ ''معرکۂ اسرار خودی'' پر میری کتاب ادارہ یادگار غالب کراچی میں زیر طبع ہے۔ مسودہ مشفق خواجہ صاحب کو پسند آیا اور انہوں نے اسے اقبالیات میں ایک کارنامہ قرار دیا۔

۸۔ مرزا کمال الدین شیدا۔ حکومت جموں و کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ مدت تک میونسپل کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ آخر میں ریاست کی کلچرل اکادمی کے سکریٹری عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کا نادر و نایاب کتب خانہ بھی موجود تھا جس میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں نہایت ہی نایاب اخبارات بھی موجود تھے۔ اخبار چودھویں صدی راولپنڈی کے متعدد پرچے ۱۸۹۵ء کے میری نظر سے گزرے ہیں۔ شیدا صاحب کا انتقال چند سال پہلے سری نگر میں ہوا۔

ڈاکٹر اقبالؔ اور خواجہ غلام السیدین

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خواجہ غلام السیدین کے والد ماجد جناب خواجہ غلام الثقلین کی شخصیت کا تعارف مختصر الفاظ میں کیا جائے تا کہ اس سے سیدین صاحب کی تعلیم و تربیت پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

خواجہ غلام الثقلین کے والد بزرگوار خواجہ غلام عباس (۱۸۴۱۔۱۹۰۶ء) تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ حضرت ایوب کے خاندان میں اکثر اہل کمال و صوفیائے کرام گذرے ہیں۔ ازاں جملہ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات جن کا نام افغانستان، خراسان اور ایران میں بچے بچے کی زبان پر تھا بہت مشہور ہوئے۔ ان کی اولاد میں ایک بزرگ خواجہ ملک علی علم و فضل اور زہد و اتقا کے اعتبار سے اپنے زمانے میں مختار تھے۔ ۱۲۸۷عیسوی میں اپنے وطن مالوف یعنی شیراز کو چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے۔ اس وقت غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھے۔ ان کا دربار علماء و فضلاء کی قدر دانی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس لئے اکثر اہل کمال دور دراز ممالک سے آکر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ خواجہ ملک علی ان میں ممتاز تھے۔ اس زمانے میں حضرت امیر خسرو دہلوی جو غیاث الدیج بلبن کے بیٹے شاہزادہ محمد کے اتالیق تھے دربار شاہی کے رکن تھے۔ بلبن نے اپنی قدر دانی اور فیاضی کا ثبوت اس طرح دیا کہ قصبہ و پانی پت کے کل رقبے کا ایک چوتھا بطور معافی و داعی کے خواجہ ملک علی عطا کی اور فرمان شاہی میں اس امر کی صراحت کر دی گئی کہ یہ معافی خواجہ ملک علی کی اولاد کے لئے نسل بعد نسل قائم رہے اور جب تک خواجہ موصوف کی نسل سے کوئی متنفس زندہ رہے اس وقت تک یہ سلسلہ بحال رہے۔ اگر چہ سلطنت دہلی میں بڑے بڑے انقلاب پیش آئے مگر یہ معافی بدستور قائم رہی اور عہد سرکار انگلشیہ تک قائم تھی[1]

خواجہ غلام السیدین

خواجہ غلام عباس کا عقد پانی پت کی مشہور و ممتاز شخصیت سید محمد حسین کی صاحبزادی سے ہوا۔ خواجہ غلام الثقلین کی نانی حالی کی بہن تھیں۔ سیدین صاحب کی والدہ مولانا حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی بیٹی تھیں۔ خواجہ عباس کے تین بیٹے تھے۔ خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ غلام السبطین۔

خواجہ غلام الثقلین ۱۸۷۳ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں مولانا حالی کی نگرانی میں دہلی بھیجے گئے اور وہاں انگلو عربک اسکول میں داخل کیے گئے۔ انٹرنس کے بعد علی گڈھ میں داخلہ لیا۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء سے اپریل ۱۸۹۴ء تک وہاں رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ہی پروفیسر آرنلڈ (متوفی ۱۹۳۱ء) کو آمادہ کر کے ۱۸۹۰ء کی ابتدا میں علی گڈھ میں ''انجمن اخوان الصفا'' قائم کی تھی اور ہر دو ہفتے کے بعد اس میں ایک مضمون انگریزی میں پڑھا کرتے تھے۔ مارچ ۱۸۹۳ء میں ۲۰ سال کی عمر میں بی۔ اے کیا۔ دو سال بعد ۱۸۹۵ء میں ایل ایل بی کیا۔ علی گڈھ میں شبلی، سرسید اور سید محمود کی صحبت سے استفادہ کیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ہی نواب محسن الملک بہادر کے مترجم اور سکریٹری ہوئے تھے۔ قیام حیدر آباد میں رہا۔[۲]

خواجہ صاحب طالب علمی کے زمانے میں اپنے مطالعہ اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے اور تمام طالب علم اور اساتذہ انہیں عزت واحترام سے دیکھتے تھے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش فشانی اور ''اخوان الصفا'' میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی۔ ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ خود سرسید مرحوم انہیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ علی گڈھ کالج میں ان سے پہلے اور ان کے بعد غالباً کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا۔ جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسے وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا انتھک ہو۔ وہ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ ملک وقوم کی خدمت کرنا ان کا نصب العین تھا۔[۳]

خواجہ صاحب دوبارہ ۴ر جنوری ۱۸۹۶ء کو حیدر آباد گئے اور نواب سر وقار الملک کے اسٹاف میں مقرر ہو گئے۔ یہاں پانچ سال یعنی اپریل ۱۹۰۱ء تک سول جج اور انسپکٹر مدارس کے عہدوں پر فائز رہے۔ آخر کار ملازمت چھوڑ کر ۱۲ر مئی ۱۹۰۱ء سے میرٹھ میں وکالت شروع کی۔ جنوری ۱۹۰۳ء سے ایک اردو رسالہ ''عصر جدید'' کے نام سے شائع کیا۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء سے

نومبر ۱۹۰۵ء تک مالیر کوٹلہ میں چیف جج کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں لیجسلیٹو کونسل (یوپی) کے ممبر ہوئے۔ ۴۲ سال کی عمر میں ۳ ردسمبر ۱۹۱۵ء کی رات میں انتقال کیا۔[۴]

خواجہ غلام الثقلین اپنے وقت کے بہترین مقرر، اعلیٰ پایہ کے دانشور، مشہور و معروف صحافی اور قابل فخر سماجی کارکن تھے۔ پکے مسلمان تھے اور ملت اسلامیہ کے مختلف فرقوں میں اتحاد واتفاق کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسے میں انہوں نے ''اصلاح تمدن'' کی تحریک بھی چلائی تھی۔ اس کا دفتر علی گڈھ میں تھا اور وہ اس کے سکریٹری بھی تھے۔ اس کا پرچار ''عصر جدید'' کے صفحات میں بڑے زور و شور سے ہوتا تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے کئی مضامین ''حسن'' حیدر آباد اور ''چودھویں صدی'' اخبار راولپنڈی میں راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ موصوف کوئی پندرہ کتابوں کے مصنف تھے۔[۵]

''عصر جدید'' کے پرچوں سے بہت سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ یہ پرچے اب نہایت کمیاب ہیں۔ میری نظر سے بہت سے شمارے گزرے ہیں۔ کچھ پرچے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ''عصر جدید'' کی پہلی جلد کے بارہ اور دوسری جلد کے دس نمبر میرٹھ سے جنوری ۱۹۰۳ء میں نکلنے کے بعد اس کا پہلا نمبر یعنی نومبر ۱۹۰۴ء مالیر کوٹلہ میں شائع ہوا۔ خواجہ صاحب کی وفات تک یہ پرچہ کبھی بند ہوتا تھا اور کبھی چھپتا تھا۔ ''عصر جدید'' کے لکھنے والوں میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، سید امجد علی اشہری، مولوی یعقوب علی، نیاز احمد، سید سجاد حیدر، مولوی محمد حسین شوق، مولوی سعدالدین حیدر، خواجہ غلام الحسنین، سید علمدار واسطی، ہادی مچھلی شہری، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، مرزا سلطان احمد، منشی ذکاء اللہ، زہرا خانم قابل ذکر ہیں۔ [تفصیلات کے لئے میرا مضمون ''خواجہ غلام الثقلین اور رسالہ ''عصر جدید'' مطبوعہ شیرازہ سری نگر جلد ۳۶ شمارہ ۸۔۹ ملاحظہ ہو]

خواجہ غلام السیدین اسی عظیم المرتبت، روشن خیال اور مصلح قوم کے فرزند بلند اقبال اور خانوادۂ مولانا حالیؔ کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ گیارہ برس کی عمر تک اپنے والد اور نو دس برس کے سن تک حالیؔ کی تربیت میں رہے۔ کم سنی میں ہی انگریزی اور فارسی کے علاوہ عربی میں بھی اچھی خاصی استعداد رکھتے تھے۔ جس زمانے میں خواجہ غلام الحسنین حیدر آباد میں ملازمت کرتے تھے تو سیدین صاحب نے انہیں عربی میں ایک طویل خط مورخہ

۱۸؍ مارچ ۱۹۱۵ء کو لکھا تھا۔ اس زمانے میں ان کی عمر گیارہ برس کے لگ بھگ تھی[5] جب سرکار علامہ شیخ عبدالعلی ہروی[6] (متوفی ۱۹۲۲ء) دسمبر ۱۹۱۵ء میں خواجہ غلام الثقلین کی تعزیت کے لئے پانی پت تشریف لائے تو وہ بار بار سیدین صاحب سے مخاطب ہوتے تھے۔ انہوں نے سیدین صاحب کی موجودگی میں فارسی میں فرمایا کہ ''اس بچے کو ابتدائی قواعد پڑھا دیئے گئے ہیں اور عربی سمجھتا ہے۔ اب اس کو صرف میں شیخ بھائی کی کتاب ''تعدیل'' اور نحو میں ''صمدیہ'' اور ''شرح صمدیہ'' اور بعد از ان ''انموذج'' پڑھوانی چاہیئے۔ منطق میں ''رسالہ کبریٰ'' اور تعدیل المیزان کے سے عمدہ رسائل بھی پڑھوائے جائیں۔ ان کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود مختصر ہونے کے کامل ہیں[7]

سیدین صاحب طالب علمی کے زمانے میں بڑے ذہین تھے۔ میٹرک حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت سے اعزاز و امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ میٹرک کے بعد علی گڈھ میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات فرسٹ ڈیوژن میں کئے اور یونیورسٹی بھر میں اول آگئے۔ وہ اپنے والد بزرگوار کی طرح یونیورسٹی کے تمام طلباء میں بہترین مقرر سمجھے جاتے تھے۔ جو کیمبرج میڈل طالب علمی کے زمانے میں خواجہ غلام الثقلین نے حاصل کیا تھا وہی میڈل آپ نے بھی حاصل کیا تھا۔

علی گڈھ میں سیدین صاحب کا تعلیمی کردار درخشاں رہا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے میں یونیورسٹی کے بہترین اور قابل طالب علم کو جونیئر اسکالرشپ اور سینیئر اسکالرشپ کے اعزاز سے نوازا جاتا تھا۔ یہ علی گڈھ کی روایت تھی۔ یہ دونوں اعزاز یکے بعد دیگرے سیدین صاحب کو عطا کئے گئے۔ یونیورسٹی کے ماہوار رسالہ علی گڈھ منتھلی کا نام موصوف نے ہی علی گڈھ میگزین تجویز کیا جو اب تک اسی نام سے جاری ہے۔ سیدین صاحب علی گڈھ میگزین کے ایڈیٹر بنائے جاتے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ اردو اور انگریزی میں شائع ہوا تھا علی گڈھ میگزین کے ابتدائی شماروں میں آپ کے متعدد مضامین نظر سے گزرے ہیں۔

سیدین صاحب انگریزی اور اردو کے بہترین مقرر تھے۔ وہ علی گڈھ ڈبیٹنگ سوسائٹی کے سکریٹری اس وقت مقرر کئے گئے جبکہ وہ سیکنڈ ائر میں پڑھتے تھے۔ اس سوسائٹی کا خاص انعام

جو جونیئر پرائز Junior Speaking Prize کہلاتا تھا ان کو دیا گیا تھا۔ جب موصوف فورتھ ائر میں آئے تو علی گڈھ کا سب سے قابل قدر تقریری انعام جس کا نام ''ہیرلڈ کوس اور کیمبرج اسپیکنگ پرائز اور جو مدتوں سے خواجہ غلام الثقلین اور خواجہ سجاد حسین (نانا) کو مل چکا تھا وہی پرائز سیدین صاحب کو بھی ملا۔ ان کے لئے یہ بات قابل فخر تھی کہ ایک ہی اعزازی بورڈ پر ان کا نام درج تھا۔[8]

سیدین صاحب نے ۱۹۲۳ء میں حکومت ہند سے وظیفہ حاصل کر کے لیڈز یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں ڈپلوما ان ایجوکیشن کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ یونیورسٹی کے دوران قیام وہ کئی مرتبہ یونیورسٹی کے نمائندہ بنا کر دوسری یونیورسٹیوں میں بھیجے گئے۔ یونیورسٹی یونین پارلیمنٹ کے وزیر اعظم اور انٹرنیشنل سوسائٹی کے صدر کے فرائض موصوف نے انجام دیئے۔ متعدد اہم مباحثوں اور علمی انجمنوں میں حصہ لیا۔ ان کی تقریریں اور بحثیں دو سال تک انگلستان بلکہ دنیا کے سب سے مشہور اخبار ٹائمز میں شائع ہوتی رہیں۔[9]

۱۹۲۵ء میں سیدین صاحب ایم۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علی گڈھ واپس آ گئے۔ ان کی آمد پر بشیر احمد صدیقی جو علی گڈھ میگزین کے ایڈیٹر تھے لکھتے ہیں:-

''ہمارے مفتخر قوم خواجہ غلام الثقلین صاحب کے مایہ ناز فرزند خواجہ غلام السیدین صاحب ہماری یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے وطن معنوی علی گڈھ تشریف لائے ہیں۔ سیدین صاحب کی طالب علمانہ زندگی ہر حیثیت سے قابل ستائش رہی ہے۔ وہ ہر امتحان میں اول رہے اور یہ سب ''بدعت حسنہ'' انہوں نے انگلستان میں بھی ملحوظ رکھی۔ یہاں وہ ہماری یونیورسٹی کے امتحان بی۔ اے میں تو اول رہے تھے۔ انگلستان میں بھی انہوں نے اس وقار کو قائم رکھا۔ سیدین صاحب ایک جادو بیان مقرر ہیں۔ ہمارے خوشی محمد ناظر کو کالج کا ''لانگ فیلو'' کہا جاتا تھا۔ اس سنت کی پابندی میں بعض لوگ سیدین صاحب کو'' کالج کی سروجنی'' کہتے ہیں بہر حال اس مسئلہ میں ہم فریق بننا نہیں چاہتے۔ لیکن ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

سیدین صاحب ہمارے میگزین کے ایڈیٹر اور یونین کے وائس پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں اور اب وہ تعلیمات کے ماہر خصوصی ہو کر آئے ہیں۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ وہ ہم سے اب جدا بھی نہ رہیں۔ کیا یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد ہماری تمناؤں کا پاس کریں گے؟''[10]

سیدین صاحب کے ایم۔ایڈ کا نتیجہ ابھی نکلا ہی تھا کہ انہیں علی گڈھ کے وائس چانسلر آفتاب احمد خان کا تار ملا کہ یونیورسٹی علی گڈھ ٹریننگ کالج کی پرنسلی پیش کرتی ہے۔ منظوری سے مطلع کرو۔ وہ سیدین صاحب کے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم اور دوسرے بزرگوں سے بخوبی واقف تھے۔ لندن میں جب وہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر تھے تو ان سے چند مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے لئے مناسب لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ یہ پیش کش سیدین صاحب کے لئے عزت افزائی کا باعث تھی کیونکہ انہوں نے اس کے لئے درخواست نہیں دی تھی اور یہ ذمہ داری قبول کی۔!!

سیدین صاحب نے اپنے عہدے کا چارج ابھی نہیں سنبھالا تھا انہیں اطلاع ملی کہ علی گڈھ کالج کی پچاس سالہ جوبلی دسمبر ۱۹۲۵ء میں منائی جائے گی۔ جوبلی کی تقریبات میں ایک اہم مد یونین کی ڈبیٹ تھی۔ انہوں بحیثیت یونین کے سابق نائب صدر کے ایسی معرکہ آرا تقریر کی بحث کا آغاز کیا کہ بڑے بڑے لوگوں سے جن میں محمد علی جناح، سر آغا خان اور سر علی امام موجود تھے۔ اپنا لوہا منوالیا۔ ڈبیٹ کے اس جلسے میں سیدین صاحب کے چچازاد بھائی خواجہ احمد عباس بھی موجود تھے۔ موصوف نے سا واقعہ کے چالیس سال بعد ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا جو سیدین صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کی تہنیت کے موقعہ پر لکھا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:-

''میرے بچپن کا ایک یادگار واقعہ جس نے میرے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا وہ بحث ہے جو ایم-اے-او کالج علی گڈھ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر ہوئی تھی۔ یہ کالج اب یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے تمام نامور لیڈر وہاں موجود تھے۔ سیدین صاحب اس وقت اعلیٰ تعلیمی کامیابی حاصل کر کے انگلستان سے لوٹے تھے۔ ان کو اس موقعہ پر یہ اعزاز دیا گیا کہ وہ یونین میں اس بحث کا افتتاح کریں۔ اس لئے انہوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا تھا جو اب چالیس سال بعد بھی مسلمانوں کے لئے ایسی اہمیت رکھتا ہے۔ جس قدر اس وقت انہوں نے شروع میں ایک مختصر مگر مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد تقریروں کا ایک سیلاب شروع ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے اس وقت کے بڑے بڑے لیڈر شریک تھے۔ محمد علی جناح، آغا خان، سر علی امام وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ گویا ایک پہلوان تھا، انہوں نے زوردار تقریریں کیں اور نوجوان مقرر کی دلیلوں کو پرستانہ انداز میں یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ نوجوانی کی عین پسندی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ سیدین صاحب اس وقت ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تیزی

کے ساتھ نوٹ لے رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کی وزنی اور باوقار آوازوں سے کافی مرعوب ہیں۔ پھر وہ وقت آیا جب وہ بحث کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں اس وقت اتنا کم عمر تھا کہ ان کی دلیلوں کا پورا مطلب تو نہیں سمجھ سکا لیکن ایک گیارہ سالہ طالب علم بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ ان کی فصاحت اور زور بیان میں کس قدر خلوص اور جذبہ بھرا ہوا ہے۔ اس تقریر کی چوٹ غالباً میرے تحت الشعور پر بہت کاری لگی۔ کیونکہ اس کے بعد کبھی فرقہ پرستوں کے جذباتی دلائل نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ اگر زندگی کا سیکولر اور انسانیت دوستی کا نظریہ میرے عقیدہ کا ایک اٹل جز رہا ہے تو اس کی ذمہ داری سب سے پہلے اس تقریر پر ہے اور اس کے بعد چند سالوں پر جو میں نے بعد میں اپنے اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران میں سیدین کی نگرانی میں بسر کئے۔ شاید انہیں کے اثر سے میرا علمی تجسس بیدار ہوا اور میں نے ادب، ڈرامہ اور آرٹ میں دلچسپی لینی شروع کی... ہاں تو بحث کا انجام یہ ہوا کہ اپنے دلائل کی مضبوطی اور زور بیان کی ترغیب سے ان کے تمام مخالفین کو شکست ہوئی اور مجمع نے بہت بڑی اکثریت سے سیدین کی رائے سے اتفاق کیا۔"[۱۲۰]

جوبلی ڈبیٹ کی اس پر مغز تقریر سے سیدین صاحب کی بڑی شہرت ہوئی۔ الغرض انہوں نے علی گڈھ ٹریننگ کالج میں ریڈر کی حیثیت سے ۱۹۲۶ء میں کام کرنا شروع کیا اور اصول تعلیم و طریق تعلیم کا درس دینے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ اسی سال انہوں نے اردو کے مشہور و معروف ادیب محمد یحییٰ تنہا (مصنف سیر المصنفین) کی تقرری کے لئے ایک سفارشی خط جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب کو لکھا۔ چونکہ یہ خط سیدین صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا آج سے تقریباً پچہتر سال پرانا ہے اور میری تحویل میں ہے ذیل میں اس لئے درج کیا جاتا ہے کہ اس سے سیدین صاحب کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

ٹریننگ کالج۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے۔ جی۔ سیدین۔ بی۔ اے۔ (علیگ) ایم۔ ایڈ (لیڈز)

(بحروف انگریزی) پرنسپل (بحروف انگریزی)

تاریخ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۰ء

حبیب محترم۔ تسلیم

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ کچھ عرصہ معلوم ہوا تھا کہ آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر

ہوگئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی تھی لیکن خط لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ یہ کہنے کی بمشکل ہی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی نے آپ کی قدر شناسی کرکے اپنے حسن مذاق اور انصاف کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا۔ معلوم نہیں ہماری یونیورسٹی کا شعبۂ اردو کب اپنی کسمپرسی سے نکل سکے گا۔

میں اس وقت یہ خط اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ آپ کی اجازت سے آپ کو محمد یحییٰ تنہا کی طرف متوجہ کروں۔ میں بالعموم سفارش کرنے سے پرہیز کرتا ہوں۔ لیکن اگر میرا خیال ہو کہ اس سے کسی عمدہ انتخاب میں مدد ملے گی تو اس سے دریغ نہیں کرتا۔ تنہا صاحب کے نام اور کام سے آپ واقف ہوں گے۔ میں ان کو سالہا سال سے جانتا ہوں، اس زمانے سے جب میری عمر بہت چھوٹی تھی اور وہ والد مرحوم کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ انہوں نے باوجود نامساعد حالات کے محض اپنے شوق اور شغف ادبی کی وجہ سے جو کام اردو ادب کی خدمت کے لئے کیا ہے وہ ہمت افزائی کا مستحق ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غیر معمولی طور پر Brilliant آدمی ہیں۔ لیکن ایسا آدمی جو اس صفت کے ساتھ ساتھ پتا مار کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ آپ کو اپنے ہاں کی لکچرر شپ کے لئے شاید نہیں مل سکتا۔ اس لئے میں بہت زور کے ساتھ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان کے CLAIMS پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں اور اگر ممکن ہو تو کمیٹی میں ان کی سفارش کریں۔ وہ نہایت نیک نفس، بے شر اور شریف آدمی ہیں اور بحیثیت ایک شریک کار کے آپ ان کو بہت مفید اور دلچسپ پائیں گے۔ اور وہ ہمیشہ آپ کے مشورہ کے مطابق کام کریں گے۔

امید ہے کہ میری یہ ''سفارش'' آپ کو گراں نہ گزرے گی۔'' [۱۳۰]

زیادہ نیاز۔ خاکسار، غلام السیدین

سیدین صاحب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں بارہ سال تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست جموں و کشمیر میں وزیر اعظم گوپال سوامی اینگر کا دور دورہ تھا۔ وہ ایک مضبوط اور بیدار مغز منتظم تھے۔ انہیں یہ خیال ہوا کہ ریاست میں بھی تعلیمی تجربہ کیا جائے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو ناظم تعلیمات کے عہدہ پر آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ جامعہ اسلامیہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کچھ عرصے کے بعد وزیر اعظم موصوف نے سیدین صاحب کو کشمیر میں بلایا کشمیر آنے سے پہلے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملے۔ انہوں نے صورت حال سے

آگاہ کیا اور کہا کہ میں نے ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے مشورہ کر کے آپ کا نام تجویز کیا تھا۔[14]

قصہ کوتاہ کہ سیدین صاحب اسی سال یعنی ۱۹۳۸ء میں جموں و کشمیر کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی یہاں کے معیار تعلیم کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ دار وھار اسکیم، لیبر ویک اور تعلیم بالغاں کی اسکیمیں مرتب کر کے جاری کیں۔ ان دنوں یہاں مسلمان اکثریت کے باوجود تعلیمی میدان میں بہت پیچھے تھے۔ سیدین صاحب نے انہیں تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ مدرسوں کا جال بچھایا۔ غریب اور لاچار طلباء کے لئے وظیفے مقرر کیے۔ مدرسوں اور کالجوں میں آبادی کے تناسب اور قابلیت کی بنا پر مسلمان اساتذہ کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ یہ اقدامات کشمیری پنڈتوں کو پسند نہیں آئے اور وہ پریس کے ذریعہ ان پر تنقید کرنے لگے۔ سیدین صاحب کے خلاف ریاست اور بیرون ریاست کے اخبارات میں مراسلات چھپنے لگے۔ کشمیری پنڈتوں کا ترجمان اخبار ''مارتنڈ'' تھا۔ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ اور شری آئنگر سیدین صاحب کی کارکردگی اور اعلیٰ صلاحیتوں سے بخوبی مطمئن تھے۔ اس لئے وہ مارتنڈ میں ان کے خلاف چھپی ہوئی خبروں کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ حکومت نے سیدین صاحب کے حق میں پہلے صفحہ کے کالم پر سینسر کی پابندی عائد کی تھی۔ اخبار کی پیشانی پر X کا نشان نمایاں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ عبارت ہوتی تھی۔

''ڈاکٹر ایجوکیشن اور ہم''

ع۔ خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اس سلسلہ میں سیدین صاحب لکھتے ہیں ''جب میں کشمیر گیا تو اس وقت کی ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کا مطالبہ تھا کہ اس کو بڑھایا جائے۔ یہ مطالبہ جائز تھا لیکن اس کو جلدی میں پورا کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ اور دقتوں کے ایک دقت یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں میں اعلیٰ قابلیت کے امیدواروں کی تعداد کم تھی اور ان کے مقابلہ میں کشمیری پنڈت امیدواروں کی کثرت تھی۔ میں نہ مسلمانوں کے مطالبات کو مسترد کرنا چاہتا تھا نہ میری یہ خواہش تھی کہ تعلیمی مفاد کو ملازمتوں کی محض فرقہ وارانہ تقسیم کے اصولوں پر قربان کر دوں۔ میرا کہنا تھا کہ ایک نا قابل استاد طلباء کی نسلوں کی نسلوں کو خراب کر سکتا ہے اور یہ بہتر ہے کہ ایک مسلمان طالب علم اچھے ہندو استاد سے یا ہندو طالب علم اچھے

مسلمان استاد سے پڑھے، بجائے اس کے دونوں نالائق استادوں سے تعلیم پائیں۔ لیکن جن لوگوں کو محض فرقہ وارانہ نیابت درکار تھی وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ وہ محض ترازو میں تول کر اپنا حصہ مانگتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت آیا کہ جب بعض مسلمان محکمہ تعلیم کی پالیسی سے اس وجہ سے خفا ہو گئے کہ ڈائریکٹر مسلمانوں کو کافی اسامیاں نہیں دیتا اور بعض ہندو اس وجہ سے اب تک ان کی محکمہ میں جو اجارہ داری تھی وہ ٹوٹ گئی۔ چنانچہ دونوں جماعت کے انتہا پسند اخباروں میں میرے خلاف مضامین نکلنے لگے اور جیسا فرقہ وارانہ ذہنیت کا رویہ ہوتا ہے ایک طرف یہ الزام تھا کہ ڈائریکٹر نے ہندو حکومت کو خوش کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے اور دوسری طرف یہ کہ چونکہ ڈائریکٹر مسلمان ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ بے جا رعایت کرتا ہے۔''

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند [۱۵]

سیدین صاحب نے اپنے قیام کشمیر کے دوران میں وزیراعظم آئنگر کے علاوہ سر کیلاش ناتھ ہکسر مہاراج سنگھ اور پھر ان کے بعد سر بی۔ این راؤ وزرائے اعظم کا زمانہ دیکھا۔ اخبار مارتنڈ کی مخالفت کے باوجود ۱۹۴۵ء میں جب سیدین صاحب کی مدت کا ساتواں سال ختم ہونے کو آیا تو سر بی۔ این راؤ نے ان کے انکار کے باوجود انہیں مزید تین سال کی توسیع کے احکامات جاری کئے۔ اگر ۱۹۴۵ء کے بعد راؤ صاحب کشمیر میں رہتے تو سیدین صاحب بھی غالباً رہتے۔ راؤ کے بعد پنڈت رام چند کاک وزیراعظم ہوئے۔ سیدین صاحب کو یقین تھا کہ وہ ان کے زمانہ میں غیر جانب داری سے کام نہیں کر سکتے اس لئے واپس چلے گئے۔

سیدین صاحب ہر اس آدمی سے خوش رہتے تھے جو اپنے فرائض ایمانداری اور نیک نیتی سے انجام دیتا تھا اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ اس کی ادنیٰ مثال ایک چپراسی کی ہے جو ان کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا نام سنترام تھا۔ سیدین صاحب کے علاوہ وہ سید اسد اللہ کاظمی (الہ آباد) اور سید علی اکبر کاظمی (پٹنہ) کے بھی چپراسی رہے۔ میں بھی ان کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ جب ۱۹۴۵ء میں الوداعی پارٹی کا اہتمام ان کے اعزاز میں کیا گیا تو موصوف نے اپنی جوابی تقریر سنترام کی فرض شناسی پر ختم کی۔ فرماتے ہیں:-

''میں آپ کو بتاؤں کہ ریاست میں جس شخص نے مجھے اپنی فرض شناسی اور دیانتداری سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور یہ کہہ کر میں ذرا ٹھہرا (اور میرا خیال ہے کہ میں نے حاضرین میں سے بعض اعلیٰ افسروں کے چہرے پر اس توقع کے اعتراف کے آثار دیکھے) تو وہ جمعدار سنتر ام ہے جو آپ سب کے پیچھے آخری قطار میں کھڑا ہے۔ اس پر ایک سناٹا سا ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے سات سال تک میری منصبی اور ذاتی حیثیت میں ایسی خدمت کی تھی کہ میں اس کا پورا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔''[۱۶۰]

سیدین صاحب نے ریاست جموں و کشمیر میں ایک صاف ستھرا نظام تعلیم قائم کیا تھا۔ اپنے زمانۂ قیام میں موصوف نے یہاں کی ادبی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی صدارت میں مذہبی جلسے ہوتے تھے۔ ان میں اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر میں سیرت کے جلسے اور زڈی بل علی پارک میں مولود کعبہ حضرت علیؑ کے یوم ولادت کی تقریبات قابل ذکر ہیں۔ ان میں سر شیخ عبدالقادر چودھری، خوشی محمد ناظر اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ بھی تقریریں کرتے تھے۔ مذہبی تقریبات کے علاوہ سیدین صاحب مشاعروں میں بھی صدارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اردو کے مشہور شاعر اور صحافی محمد الدین فوقؔ (متوفی ۱۹۴۵ء) لکھتے ہیں کہ

''۷ ستمبر ۱۹۳۸ء کی شب کو نمائش گاہ سری نگر میں ایک مشاعرہ سیدین صاحب کی صدارت میں ہوا۔ انہیں ایام میں نیشنل کانفرنس کے کچھ رہنما بھی گرفتار کیے گئے تھے۔ مشاعرے کی طرح یہ تھی

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے''

سیدین صاحب کی تعلیم بالغاں کے فروغ کے لئے فوقؔ کا یہ شعر کافی ہے

گر یوں ہی ہمدرد تیرا ہے غلام السیدین
فوقؔ بھی فوقی بھی تو فائق بھی فوقستاں بھی تو

فوقؔ کی یہ نظم اخبار ''رہبر'' جموں کے تعلیم بالغان کے لئے ۱۵ شعر میں مخصوص کردی گئی تھی۔[۱۶۱]

انہیں دنوں اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر کے وسیع احاطہ میں لیبر ویک (صفائی کا ہفتہ) کے سلسلہ میں ایک یادگار تقریب سیدین صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس میں اچھے اچھے شاعروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان میں امامیہ ہائی اسکول زڈی بل سری نگر کے ہیڈ ماسٹر نواب سجاد

علی خان اور مولوی محمد حسین پرنسپل ٹریننگ کالج سری نگر نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ یہ مصرعے بچوں کی نوک زبان تھے۔

بغیر اپنی کمائی کے گذارا ہو نہیں سکتا
اگر فرزند ناکارہ نکما ہے اپاہج ہے
وہ بیٹا ہے مگر آنکھوں کا تارا ہو نہیں سکتا

کشمیر سے جانے کے بعد سیدین صاحب دو برس رام پور میں مشیر تعلیم رہے۔ یہاں سے بمبئی گئے اور تین سال تک وہاں مشیر تعلیم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک حکومت ہند میں وزارت تعلیم میں جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹریوں کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومت کشمیر نے دوبارہ ۱۹۶۱ء میں ان کی خدمات مشیر تعلیم کی حیثیت سے حاصل کیں۔ اس مرتبہ یہاں وہ صرف ایک سال رہے۔ پہلے جب آئے تھے تو وزیر اعظم سر آئینگر تھے اور وزیر تعلیم سر عبدالصمد اور ان کے بعد نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی تھے۔ اب کی بخشی غلام محمد وزیر اعظم اور میر غلام محمد راج پوری وزیر تعلیم تھے۔ یہ لوگ سیدین صاحب کی قدر و قیمت کیا جانتے۔ اس مختصر قیام کے دوران مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے میری کتاب ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' کا مسودہ دیکھا تھا۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۱ء کو مسودہ پر یہ مختصر تبصرہ کیا تھا:۔

''میں [illegible] مقالہ جستہ جستہ بڑی دلچسپی سے دیکھا واقعی یہ اردو تنقیدی ادب میں ایک سودمند اور گرانقدر [illegible]۔ جس محنت اور سلیقہ سے آپ نے اسے ترتیب دیا وہ یقیناً لائق صد آفریں ہے۔ آج تک انیس پر [illegible] حاصل مقالہ دیکھنے میں نہیں آیا۔''[۱۸]

دسمبر ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور (صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) نے ایک خط سیدین صاحب کو لکھا۔ اس میں حیدر آباد میں یوم سلطان قلی قطب شاہ کی تقریبات میں راقم کی شرکت کے لئے ایک ہفتہ کے ڈیپوٹیشن کی منظوری کی سفارش کی گئی تھی۔ چونکہ حکومت سیدین صاحب کی غیر جانب دارانہ پالیسی پسند نہیں کرتی تھی اس لئے ان کی سفارش رد کر دی گئی۔ مئی ۱۹۶۲ء میں سیدین صاحب سے میری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی اور پہلی بار بیگم صالحہ عابد حسین

سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اس موقعہ پر سیدین صاحب نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ حکومت کو میری ضرورت نہیں ہے اس لئے وہ واپس جا رہے ہیں۔

کشمیر میں میری آخری ملاقات سیدین صاحب سے جولائی ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی ان کی صحت اچھی نہیں تھی اس لئے تبدیلی آب وہوا کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ آخر کار ان کا انتقال ۱۹/دسمبر ۱۹۷۱ء کو دہلی میں ہوا۔

چالیسویں کی مجلس مولانا سید علی نقی مجتہد العصر لکھنؤ وڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے پڑھی تھی۔ مجلس میں بلا امتیاز مذہب وملت کثیر التعداد دانشوروں نے شرکت کی۔ ان میں فخر الدین علی احمد، شیخ عبداللہ، مرزا افضل بیگ اور مالک رام صاحب قابل ذکر ہیں۔

ایک معاصر شاعر جناب شمیم کرہانی مرحوم نے سیدین صاحب کی زندگی میں ایک نظم کہی جس کا عنوان ہے ''خواجہ غلام السیدین'' شاعر نے نظم میں نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ موصوف کی شخصیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

نکہت صبح چمن، نور شب ماہ بہشت
غازۂ حسن قمر، رنگ رخ مہر منیر

نرمئی جوئے شفق، گرمئی احساس بشر
لے کے فطرت نے بنایا، تری ہستی کا خمیر

نارسیدہ یہ زباں، حرف دل آرا تیرا
بوئے گل جیسے گل تازہ کے سینے میں ہو قید

تیرا پاکیزہ تصور روش تخیل
جیسے شفاف فضاؤں میں رواں ابر سفید

رونق محفل ہستی، ترے اخلاص کا دل
مشعل جادۂ ظلمت، تری دانش کا دماغ

دل ترا دولت عرفاں سے ضیا پاش ہے یوں
جیسے ضوبار ہو کاشانۂ منعم میں چراغ

شکل خورشید، منور ترے دل کا شیشہ
مثل آئینہ مصفا ترا شفاف ضمیر

تیری گفتار میں تنویر صداقت جیسے
جھلملاتی ہے مہک پر زر خالص کی لکیر

بکمال خرد وحکمت و فرہنگ و شعور
نوجوانوں کا جو ساتھی ہے تو بچوں کا ندیم

بذلہ سنجی کا یہ انداز یہ شوخی کا طریق
چھیڑ کر جیسے شگوفوں کو نکل جائے نسیم

تیری ہستی کو مشیت نے عطا کرکے ہمیں
دل ظلمت میں تمنائے ضیا رکھی ہے

جہل کے جادۂ تاریک سے بچنے کے لئے
وقت نے علم کی اک شمع جلا رکھی ہے

خواجہ غلام السیدین کثیر التعداد تصانیف کے مصنف تھے۔جو کتابیں دستیاب ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:۔

۱-روح تہذیب	۱۹۳۲ء
۲-علی گڈھ کی تعلیمی تحریک	۱۹۳۵ء
۳-شہید وفا	۱۹۳۴ء
۴-قومی سیرت کی تشکیل	۱۹۳۸ء
۵-اصول تعلیم	۱۹۴۹ء
۶-آندھی میں چراغ	۱۹۶۲ء
۷-ذہن انسانی کا ارتقا	۱۹۶۶ء
۸-زبان زندگی اور تعلیم	۱۹۷۱ء

سیدین صاحب کی بعض انگریزی کتابیں:

(1) Activity School(2)Education,Culture and the Social Order. (3) Education and the Art of Living (4) Faith of Education (5) Humanist Tradition in Indian Educational Thought (6) Iqbal The Man and his poetry (7) Presidential address AT ALL Rajasthan teachers Conference (8) Problems of Educational Reconstruction,(9)Man in the new WORLD (10)Iqbal's Educational Philosophy (11)School of the future (12) Significance of Gandhi as a man and thinker (13) Universities and the life of the mind (14) Access to higher Education in India (15) Compulsory Education in India(16) Language, Life of Education

سیدین صاحب بچپن سے ہی جینیس تھے۔ان کا حافظہ اور مطالعہ بے حد وسیع تھا۔موصوف کا ایک مبسوط ،مفید اور معلوماتی مقالہ ایک نایاب کتاب ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' مرتبہ محمد عمران خان ندوی (دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۱۹۴۶ء) میں صفحہ ۱۲۱ تا ۱۵۴ شامل کیا گیا۔سیدین صاحب مضمون کی ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

''جہاں تک یاد پڑتا ہے مجھے ۱۹۱۳ء سے مطالعہ کا باقاعدہ شوق پڑا۔ میں اس وقت پانی پت کے میونسپل اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں بسر کرنے کے لئے میرٹھ گیا تھا جہاں میرے والد خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم اس زمانے میں وکالت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اپنے کتب خانے کی ایک مکمل فہرست تیار کرنے کی فرمائش کی اور میں نے بہت خوشی سے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ ان کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم وفنون اور زبانوں کی کتابیں تھیں۔ مذہب، فلسفہ، منطق، تاریخ، فقہ، ناول، ادب، قانون، معاشیات غرض ہر قسم کی کتابیں انہوں نے جمع کی تھیں........ میں نے لائبریری کی فہرست تیار کرنی شروع کی۔ لیکن کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ منہ کالے ہونے ضروری ہیں۔ رجسٹر میں کتابوں کے نام درج کرنے اور ان پر کاغذ کی چٹیں لگانے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ میں گھنٹوں بجائے اپنا مفوضہ کام کرنے کے اپنا وقت کتابوں کے پڑھنے میں ''ضائع'' کرتا۔ والد مرحوم نے بہت دفعہ اس ''تضیع اوقات'' کو دیکھا لیکن کبھی اس پر نہیں ٹوکا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اس طرح مطالعہ کا سچا شوق پیدا ہو جائے تو وہ عمر بھر انسان کے لئے ایک بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ بعض والدین اور استادوں کی طرح ہمدردی اور تخیل سے محروم ہوتے اور بچوں کی نفسیات سے واقف نہ ہوتے تو یقیناً مجھے ٹوک دیتے اور میری ذہنی دلچسپیوں کی دنیا ہی مختلف ہوتی۔ لیکن انہوں نے بڑی محبت اور دوراندیشی کے ساتھ میری ہمت افزائی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دو ماہ ہزاروں کتابوں کی فہرست تیار کی اور ہزاروں صفحے پڑھ ڈالے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس وقت جتنا کچھ پڑھا وہ سب سمجھا نہیں۔ لیکن اس تجربے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ روانی اور تیزی کے ساتھ پڑھنے کی عادت پیدا ہوگئی اور میں بجائے ہونٹوں سے اور بہ آواز بلند پڑھنے کے آنکھوں سے پڑھنے لگا جو خاموش مطالعہ کے لئے ایک شرط لازم ہے۔''

مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدین صاحب نے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ کلام الٰہی کو زندگی کے لئے ایک شمع ہدایت اور اپنے اعمال وافکار کا سرچشمہ اسی میں تلاش کرتے تھے۔ انہوں نے بہت کمسنی کے ایام میں قرآنی تعلیم اپنے چچا مولوی غلام الحسنین سے حاصل کی تھی۔

سیدین صاحب جن مصنفین سے متاثر ہوئے تھے ان میں علامہ شیخ عبدالعلی ہروی، ڈاکٹر اقبال، میر انیس، مولانا حالی، پریم چند، سرسید، ٹیگور، مرزا فرحت اللہ بیگ، گوئٹے، برنارڈ شا،

ایچ ۔جی ویلز، برٹرنڈرسل، اناتول، رومان رولان، اپٹن سنکلر، ہنری فورڈ قابل ذکر ہیں۔

انیس، حالی اور اقبال سیدین صاحب کے محبوب شاعر تھے۔ ان تینوں پر ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل اور کتابوں میں میری نظر سے گذرے ہیں۔ انیس کے مرثیے وہ ایام عزا میں تحت اللفظ پڑھا کرتے تھے۔ سیرت کے جلسوں میں مسدس حالی سے کام لیتے تھے۔

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم ''انیس صدی'' کی تقریبات پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سیدین صاحب کو بھی مضمون لکھنے کے لئے کہا تھا۔

۸ جنوری ۱۹۷۱ء کے خط کے جواب میں سیدین صاحب ادیب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

مکرمی تسلیم نیاز

گرامی نامہ مورخہ ۱۸ ردسمبر وصول ہوا۔ تعمیل ارشاد کی کوشش کروں گا۔ لیکن یقین نہیں کہ کامیاب ہوں گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اب تک نہیں لکھا تو آپ بیگم صالحہ عابد حسین کو اس کتاب کے لئے ایک مضمون لکھنے کی دعوت دیں۔ انہوں نے انیس کے بارے میں کافی کام اور مطالعہ کیا ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی کوششیں انیس صدی کی تقریبات کے بارے میں کامیاب ہوں۔

یہ آپ کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ اور اس کی شایان شان تکمیل ثابت ہوگی۔

مخلص

غلام السیدین

سیدین اور اقبال

اقبال کو سیدین کے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے پرنانا مولانا حالی کے مداحوں میں تھے۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں حالی انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ ضعیف اور پیری کے سبب خود نظم نہ پڑھ سکتے تھے۔ اگر پڑھتے بھی تو مجمع زیادہ تھا اور حالی کی آواز دور تک نہ پہنچ سکتی۔ اقبال بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ نظم پڑھ کر سنائیں۔ اقبال نے نظم سنانے سے پہلے حالی کی مدح میں ذیل کی رباعی پڑھی ؂

مشہور زمانے میں ہے نام حالی معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی [19]

پانی پت میں ۱۹۳۵ء میں حالی کے جشن صد سالہ تقریبات نہایت دھوم دھام سے منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین[۲۰] نے اقبال کو بھی مدعو کیا تھا۔ اقبال ۲۱/ اگست ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:۔

''مولانا حالی کی سینٹری (صد سالہ سالگرہ) اکتوبر کے آخر میں ہوگی۔ ان پر ایک مضمون آپ کے پہلے نمبر میں ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ یا دوسرے نمبر بشرطیکہ یہ دوسرا نمبر ا اکتوبر کے وسط سے پہلے نکل جائے تاکہ آپ کا رسالہ سینٹری کے موقع پر تقسیم ہو سکے۔ سینٹری پانی پت میں ہوگی۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال صدر ہوں گے۔ میں بھی پانی پت اس موقع پر پہنچ جاؤں گا۔ میں انشاءاللہ ۲۸/ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ۲۹ کی صبح کو دہلی پہنچوں گا۔''[۲۱]

اقبال ۱۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کے نام ایک اور خط لکھتے ہیں:۔

''مولانا حالی کی سالگرہ کی تاریخ ۲۶-۲۷ اکتوبر مقرر ہوئی ہے۔ میں غالباً ۲۵ یا ۲۶ اکتوبر کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر ممکن ہو تو خود وہاں پہنچ جائیں۔ میں آپ کو سر راس مسعود سے بھی انٹروڈیوس (Introduce) کراؤں گا۔''[۲۲]

اقبال خواجہ سجاد حسین کو پانی پت پہنچنے کی تاریخ کے بارے میں ۱۲/ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مطلع کرتے تھے:۔

''مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے۔ اگر میری صحت اچھی رہی تو میں انشاءاللہ ۲۴/ یا ۲۵ اکتوبر کو حاضر ہوں گا۔ مسعود[۲۳] کا خط آپ کے ساتھ ہی ملا۔ میرے ساتھ لاہور کے ایک دو صاحب[۲۴] بھی غالباً اس مبارک تقریب میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ چند اشعار فارسی میں نے لکھے ہیں جو اعلیٰ حضرت (نواب صاحب بھوپال) کی تشریف آوری کے موقع پر جلسے کے آغاز سے پہلے پڑھ دئے جائیں گے تو خوب رہے گا۔ کاش میں خود پڑھ سکتا۔ گلے کی خرابی سے یہ بات ممکن نہیں۔ آپ انہیں کسی ایسے نوجوان کو یاد کرادیں جو فارسی درست پڑھ سکتا ہو۔ اور خوش الحان ہو۔ اشعار جب آپ کا ارشاد ہوگا ارسال خدمت کروں گا۔''[۲۵]

اقبال ایک اور خط میں سر راس مسعود کے نام ۱۸/ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لکھتے ہیں:۔

''انشاءاللہ ۲۴ یا ۲۵ اکتوبر کو پانی پت پہنچوں گا۔ جو چند اشعار فارسی کے لکھے تھے وہ میں نے

خواجہ سجاد حسین کی خدمت میں ان کی درخواست پر بھیج دیئے ہیں۔"(۲۶)

اردو کے ممتاز صحافی اور بے لوث خدمت گزار منشی دیا نرائن نگم (متوفی ۱۹۴۲ء) ایڈیٹر "زمانہ" کانپور حالی کے جشن صد سالہ کی تقریبات پر پانی پت میں موجود تھے۔ وہ اپنے مضمون "مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کے جشن میں رقمطراز ہیں:-

"جشن حالی کی صدارت کے لئے نواب حمید اللہ والی بھوپال منتخب ہوئے۔ اقبال ۲۴/اکتوبر کو پانی پت پہنچے تھے۔ ۲۶/اکتوبر ۹ بجکر ۵ منٹ پر نواب صاحب اسٹیشن پر پہنچے۔ اقبال اور دوسرے لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ نواب صاحب کے صدر نشین ہونے کے بعد حسب اعلان خواجہ غلام السیدین صاحب نے کلام پاک کی تلاوت فرمائی۔ نواب صاحب کی خدمت میں ایڈرس پیش کرنے کے بعد ماسٹر لئیق احمد صاحب ٹیچر حالی اسکول نے اقبال کے مندرجہ ذیل خیر مقدمی اشعار سنائے۔

چو محمل را گراں بینم حدیٰ را تیز تر خوانم — مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم

زالطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم — حمید اللہ خاں اے ملک وملت را فروغ از تو

نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم — طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم

تو برخاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

لنچ کے بعد خواجہ غلام السیدین نے معززین کے پیغامات پڑھ کر سنائے اور نواب صاحب کے ہاتھوں چند تمغے تقسیم کرائے۔"[۲۷]

منشی صاحب مزید لکھتے ہیں:-

"مسدس حالی اور مقدمہ شعر و شاعری نے شعراء کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستانی شاعری میں پیدا ہوگیا اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اور جس کی مثال میں دورِ حاضر کے سب سے بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔"[۲۸]

جشن حالی کے سلسلہ میں ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ مولانا حالی کی کل تصانیف صحت اور سلیقے کے ساتھ چھپوا کر شائع کی جائیں اور ادب کے اس خاص رنگ کو جو مولانا کی نظم و نثر میں جھلکتا ہے ملک میں رواج دیا جائے۔ مسدس حالی صدی ایڈیشن اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔ اس کام کے لئے دہلی میں حالی پبلشنگ ہاؤس قائم کیا گیا تھا۔ سیدین صاحب کے چھوٹے بھائی خواجہ

اظہر عباس (متوفی ۱۹۶۷ء) اس کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ اظہر صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے مسدس حالی کا صدی ایڈیشن ۱۶/۲۰x۳۰ تقطیع میں ۱۸۰ صفحات میں آرٹ پیپر میں ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ کتاب بہت عمدہ اور خوبصورت چھپی ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق، سر راس مسعود، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولوی عبدالماجد دریابادی کی نگارشات کے علاوہ سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمات بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے ''عرض مرتب'' کے بعد ''تقریبات'' کے تحت ''عکس خط سر سید مرحوم'' ہے جو انہوں نے ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء کو شملہ پارک ہوٹل سے حالی کو لکھا تھا۔ اس میں مسدس کی تعریف کی گئی تھی۔ پھر ''عکس قطعہ دستخطی علامہ اقبال بالقابہ'' کے تحت یہ شعر ہیں۔

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید بیفسرد	سید دگر او را نمی از اشک سحر داد
حالی زنوا ہائے جگر سوز نیاسود	تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد[۲۹]

قطعہ کے نیچے اقبال کے دستخط اور ۲۴ر جون ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔ جب مسدس حالی کا یہ شاندار ایڈیشن چھپ کر خواجہ اظہر عباس نے اقبال کی خدمت میں بھیجا تو انہیں بے حد پسند آیا۔ چنانچہ ۸ر نومبر ۱۹۳۵ء کے خط میں ان کو لکھتے ہیں:-

''ڈیر مسٹر اظہر عباس

''آپ کا خط مل گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک خط موصول ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ میں علالت کی وجہ سے خطوط کا جواب لکھنے میں بہت سست ہو گیا ہوں۔

مسدس حالی نہایت عمدہ چھپی ہے۔ اس کے متعدد دیباچے نہایت مفید ہیں۔ میں نے کئی سالوں کے بعد اسے کل اور پرسوں دوبارہ پڑھا اور نیا لطف اٹھایا۔ امید ہے کہ آپ مرحوم کا باقی کلام بھی اس قسم کی چھوٹی اور نفیس جلدوں میں شائع کر سکیں گے۔''[۳۰]

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:-

''خدا لگتی بات یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا اس میں وہ مدتیں گذریں۔ کامیاب ہو چکا۔ اکبر اور اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا۔''[۳۱]

مولانا حالی نے سب سے پہلے اس وقت اقبال کی حمایت کی تھی جب کہ حسرت موہانی اقبال کی زبان پر تنقیدی مضامین شائع کر رہے تھے۔ حالی نے روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور کے جاری

ہونے پر تار کے ذریعہ جو پیغام محبوب عالم صاحب (متوفی ۱۹۴۳ء) کو نومبر ۱۹۰۳ء میں بھیجا تھا۔ اس میں ذیل کی پیشین گوئی کی تھی۔

''جو لوگ پنجابی اردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جارہی ہے۔ اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی ہے۔ یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بجائے لاہور اردو کا گھر ہو جائے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا۔''[۳۲]

حسرت موہانی کے اردوئے معلّٰی میں تنقید ہمدرد (حکیم برہم) لکھتے ہیں کہ اس تار کے ذریعہ سے حالؔی نے اقبالؔ کی غلط تاویلوں کو صحیح قرار دیا تھا۔[۳۳] تنقید ہمدرد سے پہلے خواجہ غلام الثقلین کے رسالہ ''عصر جدید'' بابت جنوری ۱۹۰۴ء میں ارشاد نبی قریشی کا مضمون اقبال کی حمایت میں شائع ہوا تھا۔ جب یہ مضمون ''تنقید ہمدرد'' کی نظر سے گذرا تو اس نے ''اصلاح زبان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس کے آخر میں تنقیدی لہجے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:-

''تنقید ہمدرد کے جواب میں ایک اقبالؔ کا مضمون تھا یا منشی ارشاد نبی قریشی کا مضمون عصر جدید میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے لچر اور مہمل محض ہونے کے بارے میں ہمیں یقین کامل ہے کہ اقبالؔ وانبالوی صاحب کو (جن کی تائید میں مضمون لکھا گیا ہے) بھی شک ہوگا۔''[۳۴]

سیدین صاحب کے چچا خواجہ غلام الحسنین[۳۵] نے ۱۹۰۳ء میں ہربرٹ اسپنسر کی انگریزی کتاب ''ایجوکیشن'' کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ جب یہ کتاب اقبالؔ کی نظر سے گذری تو انہوں نے خواجہ صاحب کو ایک خط میں لکھا:-

''آپ کے ترجمے کی بے تکلف روانی بالکل حیرت انگیز ہے۔ اگر ہربرٹ ہندوستانی ہوتا تو وہ بھی (اردو میں) اس سے بہتر طرز اختیار نہ کرسکتا۔''[۳۶]

سیدین صاحب کی چھوٹی بہن صالحہ بیگم صاحبہ اردو کے مشہور ادیب اور ماہر تعلیم ڈاکٹر عابد حسین صاحب سے منسوب تھیں۔ اقبال کی راہ و رسم ڈاکٹر صاحب سے بھی تھی۔ ڈاکٹر موصوف رسالہ ''جامعہ'' دہلی کے ایڈیٹر تھے۔ وہ کلام اقبال سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے کئی مضامین اقبال پر شائع کئے جن میں ''عقل و عشق اقبال کی شاعری میں'' (مطبوعہ ''جوہر'' شمارہ خصوصی بیادگار علامہ اقبال صفحہ ۳۶) اور ''اقبال کا تصور خودی'' (مشمولہ مضامین عابد'' بہت ہی اہم

اور معلوماتی ہیں۔ عابد صاحب جامعہ کے ایک شمارے میں اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''علامہ اقبال جامعہ سے ہمدردی فرماتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جامعہ کی امداد کے لئے قوم سے جو کیا تھا اس پر صرف پانچ چھ بزرگوں کے دستخط تھے جن میں علامہ موصوف بھی شامل تھے۔ مگر ہم لوگوں کی بدقسمتی سے آپ کو ابھی تک جامعہ میں تشریف لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے مہینے کے آغاز میں آپ ایک دن چائے کی دعوت میں تشریف لائے اور اس کے بعد لاہور سے زحمت سفر اٹھا کر خاص اس غرض سے دلی آئے کہ رؤف بے صاحب کے دوسرے لکچر میں صدارت فرمادیں۔ اور چونکہ تیسرے لکچر کے صدر ڈاکٹر سپرو صاحب تشریف نہیں لا سکے اس لئے اس میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ اسی زمانے میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی التجا پر آپ نے وعدہ فرمایا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد پھر تشریف لا کر اہل جامعہ کو اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں گے۔

۵ اپریل وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے اس وعدے کا ایفا کیا۔ ۵ بجے شام کو آپ نے جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاس نامہ قبول فرمایا اور اس کے جواب میں محبت اور شفقت کے جو کلمے ارشاد کئے وہ ہم لوگوں کے دل سے کبھی محو نہ ہوں گے۔ اس کے بعد ۸:۳۰ بجے شب کو آپ نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر فرمائی جس کا عنوان آپ نے لندن سے غرناطہ تک قرار دیا تھا۔ اس کے سب سے دلچسپ حصے دو تھے۔ ایک وہ جس میں آپ نے فرانس کے مایہ ناز فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے۔ خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو آج کل اسلامی تمدن کی طرف ہے۔ آپ کے خیال میں جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسپین میں جا کر رہنا ناگزیر ہے اور انہیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد ملے گی۔'' ۳۷

ڈاکٹر عابد حسین ''جامعہ'' دہلی کے ایڈیٹر تھے انہوں نے جلد ۲۰ نمبر ۵ صفحہ ۴۴ بابت مئی ۱۹۳۳ء میں اقبال کے چند شعر ''الہام اقبال'' کے عنوان سے درج کئے ہیں۔

دیکھ چکا المنی کوشش اصلاح دیں ... جس نے نہ چھوڑے کہیں عہد کہن کے نشاں
حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت ... اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب ... جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر ... لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب ... راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

جامعہ دہلی جس کے ایڈیٹر سید عابد حسین تھے اس کے ایک شمارے میں اسلم جیراجپوری کا مضمون ''یوم اقبال'' چھپا ہے یوم اقبال لاہور میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو ''دی انٹر کالجٹ مسلم برورہڈ'' کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔

اس تقریب میں عابد علی عابد، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، علامہ عبداللہ یوسف علی، بیگم شہنواز اور خواجہ غلام السیدین صاحب وغیرہ موجود تھے۔ سیدین صاحب نے اقبال کے فکروفن پر مقالہ پڑھا تھا۔ اس کی صدارت سر شیخ عبدالقادر نے کی تھی۔ ''جامعہ'' جلد نمبر ۹ شمارہ ۶ بابت جون ۱۹۳۸ء (صفحہ ۵۲۳-۵۲۹) میں ڈاکٹر محمد مجیب کا ایک عالمانہ مضمون ''ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم'' چھپا ہے اسی شمارہ میں ڈاکٹر عابد حسین کا ''قطعہ تاریخ وفات علامہ اقبال مرحوم'' موجود ہے۔

لطفِ مجلس کیا رہا جب میر مجلس اٹھ گیا — وائے ناکامی کہ بزم اہل دل برہم ہے آج
تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش — ہے وہاں آہ مسلسل نالۂ پیہم ہے آج
سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق و امید — بے وفورِ یاس اس میں اور ہجوم غم ہے آج

فکر کی جب سال رحلت کی تو دل نے دی صدا
''ملتِ اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج'' =۱۳۵۷ ہجری (۱۹۳۸ء)

علامہ اقبال ڈاکٹر عابد حسین سے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں کروانا چاہتے تھے۔ اس کا ذکر اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۴ر اپریل ۱۹۳۰ء میں کیا ہے۔ یہ خط موصوف نے سید نذیر نیازی کو لکھا تھا۔[۳۸]

سیدین صاحب بھی ''جامعہ'' میں لکھتے تھے۔ ان کے کئی مضامین اقبال پر چھپ چکے ہیں۔ ''اقبال کا ابلیس'' مطبوعہ مئی ۱۹۴۷ء اور ''اقبال کی انساں دوستی'' اپریل ۱۹۶۱ء کے شماروں میں راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔

سیدین صاحب اقبال کے شیدائیوں میں تھے۔ انہوں نے گہری نظر سے اقبال کا مطالعہ کیا تھا۔ اور انہیں قریب سے دیکھا بھی تھا۔ دونوں میں مربوط تعلقات کے علاوہ مراسلت بھی

تھی۔ سیدین نے اقبال پر ایک مستقل کتاب انگیریزی میں بعنوان Iqbal's Educational Philosophy (اقبال کا فلسفہ تعلیم) لکھی تھی جو لیوپول وائس سے عرفات پبلی کیشنز کے اہتمام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن میں نے سیدین صاحب کے نام محمود آباد ہاؤس لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ موصوف اقبال کے فکروفن کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''اقبال کی شاعری سے مجھے طالب علمی کے زمانے ہی میں کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس وقت ان کے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا تھا یعنی بانگ درا۔ میں اس کی نظموں کو بہت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا اور ان کے خیالات اور جذبات کی چوٹ براہ راست میرے دل پر پڑتی تھی۔ اس عرصہ میں ان کے کچھ اور مجموعے اردو فارسی کے شائع ہوئے اور مجھے جو ان سے عقیدت تھی اور ان کی فکر کا جو مجھ پر اثر تھا وہ بڑھتا گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے اپنے خاص نقطۂ نظر سے شاعری میں جن فلسفیانہ اور اخلاقی اور عالمانہ خیالات اور اعلیٰ جذبات کا اظہار کیا ہے ان کی بہت تعلیمی اہمیت ہے اور میں نے جن نئے تعلیمی افکار اور تحریکوں کا مطالعہ کیا وہ بعض لحاظ سے ان کے خیالات سے بہت قریب ہیں چنانچہ میں نے پہلے ایک ذرا طویل مضمون لکھا اور اس میں ان کے بعض بنیادی خیالات سے بحث کی اور اسے اپنی یونیورسٹی (علی گڈھ) کے ایک جلسے میں پڑھا اور بعض دوسری یونیورسٹیوں میں بھی ان کا خاصا استقبال کیا گیا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر اقبال سے میری ملاقات ہوگئی تھی اور میرا جب کبھی لاہور جانا ہوتا یا وہ دہلی آتے تو میں کوشش کر کے ان سے ملتا اور ان کی شخصیت، ان کی فکر ونظر، ان کی ظرافت، ان کی ہمہ گیر انسانیت، ان کی رواداری اور وسیع المشربی مجھے مسحور کرتی۔ جب ان کی مشہور تصنیف ''فکر انسانی کی تنظیم جدید'' کے نام سے شائع ہوئی (جس کی بدولت مجھے مذہب اور سائنس اور فلسفے کے تعلق اور اسلام کی معنویت ہوئی) تو یونیورسٹی نے انہیں بلایا۔ انہوں نے دو لکچر علی گڈھ میں دیئے۔ ان کے نام کی کشش سے لوگ تو کافی تعداد میں لکچروں میں شریک ہوئے۔ لیکن میرا خیال ہے ان میں ان کی اہمیت کو سمجھنے والے کم تھے۔ اس موقعہ پر مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا جو ہمیشہ میرے لئے باعث افتخار رہے گا۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کے فکر اور شاعری کی جو اہمیت تعلیمی نقطۂ نظر سے ہے اس پر ایک کتاب لکھوں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ کتاب (اقبال کی فلسفۂ تعلیم) مکمل ہوگئی۔ میری بڑی آرزو تھی کہ وہ خود اس کتاب کو ایک نظر سے دیکھ لیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس زمانے میں بیمار ہو چکے تھے۔ جب میں آخری بار ان سے ملنے گیا تو میں نے کتاب کا ذکر کیا۔ کہنے لگے میں تو بہت شوق سے پڑھتا لیکن ڈاکٹروں کی اجازت نہیں۔ میں نے کہا اگر

میں اس کا خلاصہ چند صفحوں کا لکھ کر بھیج دوں تو آپ اس پر ایک نظر ڈال سکیں گے۔ انہوں نے بخوشی وعدہ کیا اور جب میں نے وہ خلاصہ ان کو بھیجا تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک خط لکھا جس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی۔''[۳۹]

اقبال کا خط انگریزی میں تھا۔ اس کا خلاصہ محمد عبداللہ قریشی صاحب نے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں دیا ہے:-

''آپ نے جو خلاصہ تیار کیا ہے، نہایت عمدہ ہے اور مجھے اس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ''ضرب کلیم'' میں ایک حصہ تعلیم وتربیت کے لئے وقف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ Leibnitz's Monadism کے تعلیمی نتائج سے واقف ہیں اس کے قیاس کے مطابق انسانی مونیڈ خارج سے کوئی اثر قبول کرنے سے عاری ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسانی مونیڈ زیادہ تر تاثیر پذیر نوعیت کا حامل ہے۔''[۴۰]

اقبال نے یہ خط ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا۔ سیدین صاحب کی کتاب کا اردو ترجمہ شیخ محمد اشرف پبلشر و بک سیلر کشمیری بازار لاہور کے یہاں دو روپیہ میں ملتا تھا۔ کتاب ۲۰۴ صفحوں کی ضخامت پر مشتمل تھی۔ اور غالباً ۱۹۴۰ میں چھپی تھی۔ اس کا عنوان ''اقبال کا تعلیمی فلسفہ'' ہے۔ مشہور ادیب اور صحافی دیانرائن نگم نے کتاب پر تبصرہ کیا جو ''زمانہ'' کانپور بابت جولائی ۱۹۴۰ میں تنقید کتب کے تحت یوں چھپا ہے:-

''علامہ اقبال کا کلام ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ جس کے مطالعہ میں مصروف ہو کر جب کوئی صاحب ذوق غوطہ لگاتا ہے تو اپنی پسند اور اپنے ظرف کے مطابق دامن مراد بھر لاتا ہے۔ کسی کا جال معرفت کے موتیوں سے بھرپور ہوتا ہے، کسی کا دامن تصوف کے جواہر پاروں سے معمور ہوتا ہے۔ کوئی اقبال کے کلام میں تسکین روح کے سامان کا جویا ہے، کوئی حقائق و معارف کا اور کوئی اس کے آئینہ میں پیغام عمل کی جھلک دیکھتا ہے۔ بہر حال اقبالؔ پر جتنی کتابیں یا جتنے مضامین علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوئے، ان میں مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ریاست جموں وکشمیر نے کلام اقبالؔ کو جدید نقطہ نظر سے دیکھا ہے اور انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھ کر ان کے فلسفہ تعلیم پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم سمجھنے سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ علامہ مذکور کے نزدیک علم کیا چیز ہے اور اس کا ماحصل کیا ہے۔ ''علم'' سے مطلب خود اقبال کی نظروں میں یہ ہے:-

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا ارادہ دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے۔ جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے، جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے۔

علم حق اول حواس آخر حضور
آخر او می نہ گنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا ہے اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامہ میں کئی اشعار ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں　　علم با عشق است از لاھوتیاں

مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان حاصل کرے۔'' بولہب را حیدرّ کرار کن''۔

اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے، تو نوع انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔'' (اقبال)

مندرجہ بالا عبارت سے ناظرین پر روشن ہو گیا ہوگا کہ اقبال کے نزدیک علم کیا چیز ہے اور اس کا مقصد و ماحصل کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مشرق خود علم و فضل کا گہوارہ ہے۔ اسے مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی رائے میں مغربی علوم اگرچہ بظاہر خوشنما اور خوش آئند ہیں مگر وہ روحانیت سے محروم ہیں اور ان کی بنیاد ریت پر قائم ہے۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں　　سفالِ ہند سے میناو جام پیدا کر

اس سے اقبال کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل مشرق مغرب کی خوبیوں سے بہرہ اندوز نہ ہوں۔ البتہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی تنقید کر کے کھرے کھوٹے کو پرکھیں اور اندھا دھند تقلید کی رَو میں نہ بہہ جائیں۔

شرق را از خود برد تقلید غرب　　باید ایں اقوام را تنقید غرب

دوسری خاص بات یہ ہے کہ اقبال کا فلسفۂ تعلیم افادی اصول پر مبنی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے

کہ علم وفن کو محض علم وفن کی حیثیت سے حاصل کرو۔ بلکہ ان کا مقصد حصول علم وفن سے حصول طاقت وتوانائی ہے کہتے ہیں۔

قوتِ افرنگ از علم و فن است   از ہمیں آتش چراغش روشن است

اقبال کے نزدیک ہر چیز جو کتابوں میں لکھی ہو خواہ مخواہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ حقیقت اشیاء کے متعلق فلسفیوں نے سیکڑوں نظریئے قائم کیے ہیں جو بعد میں مزید تفتیش وتحقیق پر غلط ثابت ہوئے۔ مثلاً آئینسٹین کا نظریۂ اضافیات Theory of Relativity اس معاملے میں آخری حکم سمجھا جاتا تھا۔ مگر آنریبل سر شاہ سلیمان کی تحقیقات کے بعد اس کی صحت بھی مشکوک ہوگئی۔ اسی لئے اقبال چاہتے ہیں کہ جو علم حاصل کیا جائے وہ تحقیق کی روشنی میں حاصل کیا جائے۔ اور ہر بات کو خواہ مخواہ صحیح نہ مان لیا جائے۔ چنانچہ اس کی ترکیب وہ یہ بتاتے ہیں۔

ہمائے علم تا افتد بدامت   یقیں کم کن گرفتار شکے باش

خواجہ غلام السیدین صاحب کی کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں سات باب ہیں اور اس میں تعلیم انفرادیت Education of Individuality سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے کے دو باب ہیں۔ اس کا تعلق ''تعلیم اور اسلام کے نظام معاشرت'' سے ہے۔ دونوں حصوں میں جن باتوں پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے متعلق اقبال کے کلام سے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ بانگ درا، جاوید نامہ، رموز بیخودی، ضرب کلیم، پیام مشرق وغیرہ کتابوں سے کثرت کے ساتھ اقتباسات دیئے گئے ہیں...... اقبال کا تمام فلسفۂ تعلیم ان دو شعروں پر مبنی ہے ۔

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا   اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں   جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سیدین صاحب کلام اقبال کے بہترین مفسّر اور ترجمان تھے۔ انہیں اسلامیات پر اچھا خاصا عبور تھا اور اسلامی تعلیم کے زیر اثر اقبال کا مطالعہ کیا تھا۔ موصوف اقبال کو روح اسلام کے مفسّر سمجھتے تھے۔ ذیل میں ان کا ایک اہم اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''حقیقت یہ ہے کہ روح اسلام کی سب سے بہتر تفسیر میں نے علامہ کی شاعری اور تصانیف میں پائی۔ بہ حیثیت شاعر کے میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں اور بعض اعتبار سے انہیں اردو زبان کا سب

سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ میں ان کی ذہانت اور قوت فکر کا بہت قائل ہوں۔ مغربی تہذیب کی جو جامع تنقید انہوں نے کی ہے اس کا میری نظر میں بہت بلند علمی مرتبہ ہے۔ مگر ان کی شاعری کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس نے اسلام کا ایک زندہ تصور میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس حقیقت سے روشناس کیا کہ مذہب گوشہ گیری یا محض ریاضت وعبادت کا نام نہیں بلکہ وہ بعض بنیادی اصولوں کے ماتحت زندگی کی تنظیم کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے بے اندازہ امکانات کو ظہور میں لانے کے لئے جدوجہد کرنا سکھاتا ہے۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　　شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات
یہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست　　وہ مذہب ملاّ و جمادات و نبادات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۔

اے مرد خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل　　جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید　　جس کا یہ تصوف وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اقبال کے کلام نے مجھے زندگی کے ایک نئے حرکت آفریں تصور سے روشناس کرایا اور دین اور دنیا کا حقیقی تعلق سمجھایا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دور حاضر کی ترقی اور سائنس کے کمالات اور معجزات کن شرائط کے اندر خدا کی نعمت ہیں اور کب عذاب الٰہی بن جاتے ہیں۔ دیکھئے دین اور دنیا کے تعلق پر کس قدر انوکھے لیکن فیصلہ کن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود
برزمیں رفتن چہ دشوارش بود

یعنی جو شخص یا قوم اپنی دنیاوی زندگی کو نہ سنوار سکے اور اس میں حسن اور عظمت کی شان پیدا نہ کر سکے اس کا دین داری اور عبادت گزاری کا دعویٰ کرنا یا تو خود فریبی ہے یا عالم فریبی۔ جو جماعت خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لیتی ہے اس کو نہ پل صراط پر سے گزرنے میں مشکل ہونی چاہئے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ نہ سیاسی اور معاشرتی الجھنوں کو سلجھانے میں لیکن ان مشکلات سے عقل بغیر عشق کی روشنی اور سوز کے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ عقل چراغ راہ ہے۔ لیکن ''عشق'' (جن میں عشق الٰہی اور انسانوں کی پر خلوص خدمت کا ولولہ دونوں شامل ہیں) منزل کا تعین کرتا ہے اور مذہب ان دونوں میں

توازن قائم رکھتا ہے۔ جب عقل وعشق کا یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جب عقل بے زمام ہو جاتی ہے اور مذہب کی تابع نہیں رہتی تو انسانی تہذیب، ظلم، ناانصافی اور تخریب کے دلدل میں پھنس کر تباہ ہونے لگتی ہے جیسا کہ آج کل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ''دورِ حاضر کے انسان''[۴۱] کے عنوان سے اقبال نے اسی المناک صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورت مار | عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال کی بعض نہایت اثر آفریں نظمیں اس کے پہلے مجموعۂ بانگ درا میں شامل ہیں۔ اس کے فارسی کلام کا سرور انگیز شباب پیام مشرق میں پایا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس کے تصورِ حیات کی تفسیر کے لئے ان دونوں مجموعوں سے زیادہ اہم اس کی مثنویاں ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی''، ''جاوید نامہ'' اور دو آخری اردو مجموعے ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ہیں۔ محض فنی اعتبار سے ضرب کلیم میں وہ خوبیاں نہیں جو بال جبریل اور بانگ درا کی بعض نظموں میں ہیں۔ کیونکہ اس مجموعہ میں فکر آرٹ پر غالب آگیا ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان بعد کی نظموں میں اقبالؔ محض وطنی اور قومی بلکہ اسلامی شاعری کی منزل سے بھی گزر کر عالم انسانیت کا شاعر بن گیا ہے اور دنیا کے سامنے بالعموم اور مسلمانوں کے سامنے بالخصوص وہ زندگی کا ایک ایسا بلند نصب العین پیش کرتا ہے جس سے رگوں میں خون تیز ہو جاتا ہے اور انسان کے غیر محدود امکانات کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ بال جبریل میں اس کا ساقی نامہ پڑھئے جس میں ان امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت | یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش | جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولین | مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں | جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر | طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار" [۴۲]

سیدین صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی میں جن مشاہیر سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں سے دو نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک ڈاکٹر اقبال اور دوسرے سر سید راس مسعود۔ ڈاکٹر اقبال سے مل کر انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کا دماغ حکمت وفراست کا ایک گہرا خزانہ ہے جس کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہیں یا روشنی کا ایک مینار ہے جو انسانی تقدیر اور امکانات کے چھپے ہوئے گوشوں کو منور کر دیتا ہے۔[۴۳]

سر راس مسعود علی گڈھ کی وائس چانسلری کے بعد بھوپال میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک وزیر تعلیم رہے۔ اس دوران ڈاکٹر اقبال اور سیدین صاحب بھوپال جاتے رہے اور دونوں کو "ریاض منزل" میں راس مسعود صاحب کی میزبانی کا شرف رہا۔ بقول سیدین صاحب ریاض منزل وہ مکان تھا جس کے دلکش پر فضا منظر اور ماحول نے اقبال کے تغزل کو باوجود ان کی علالت کے از سر نو بیدار کر دیا تھا۔ جہاں انہوں نے یہ شعر لکھے تھے[۴۴]

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی یہ بحر! یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں طلوع مہر وسکوتِ سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرتِ جمال و زیبائی

سیدین صاحب اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" (صفحہ ۱۳۳) میں علامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اقبال میں بہت سی غیر معمولی خوبیاں تھیں۔ لیکن میرے دل میں بڑی عقیدت ہے۔ اس شانِ فقیر کے لئے جن کی تفسیر انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی ،لیکن اس کا خطاب دراصل

عصر حاضر کے تمام نوجوانوں سے ہے۔

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ رہ فقیر — جس کی فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی

حاصل اس کا شکوہِ محمود — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری

اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال نے فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ ایمان کی دولت سے مالا مال تھے۔

اقبال سیدین صاحب کے قدردان اور ان کی علمی منزلت کے قائل تھے۔ سیدین صاحب اقبال کو عظیم شاعر اور علوم اسلامیہ کے ممتاز علماء میں شمار کرتے تھے۔ دونوں بزرگوں نے اک دوسرے کے خیالات کو سمجھا تھا۔ سیدین صاحب اقبال کے طرز فکر سے استفادہ کرتے تھے۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے راقم حروف سے کہا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کے بہت سے خطوط سیدین صاحب نے حفاظت سے رکھے تھے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تلف ہوگئے اور ان کا کتب خانہ بھی جاتا رہا۔ بہرحال اقبال کے جو خطوط سیدین صاحب کے نام شیخ عطاء اللہ نے اقبال نامہ[45] حصہ اول میں شامل کئے ہیں وہ صفحہ ۳۱۳ تا ۳۲۴ میں درج ہیں۔ ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) ڈیر سیدین صاحب — السلام علیکم

دو بچوں[46] کے لئے استانی کی ضرورت ہے۔ جس پر میں ان کی اخلاقی اور دینی تربیت کے لئے اعتبار کرسکوں۔ تہذیب نسواں[47] میں اشتہار دیا تھا جس کے جواب میں ایک خط علی گڈھ سے پھر آیا ہے۔ مہربانی کرکے اس خاتون کے متعلق حالات معلوم کرکے آگاہ کریئے۔ چونکہ بچوں کی والدہ کا گذشتہ مئی میں دفعۃً انتقال ہوگیا، اس واسطے گھر کا تمام انتظام بھی استانی صاحبہ کے سپرد ہوگا۔ ان کے فرائض مندرجہ ذیل ہوں گے:-

(۱) بچوں کی اخلاقی اور دینی تربیت اور نگہداشت۔ لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ اسکول جاتا ہے۔ لڑکی پانچ سال کی ہے۔

(۲) گھر کا انتظام اور نگہداشت۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ سب گھر کا چارج انہیں کو دیا جائے اور زنان خانے کے تمام اخراجات انہیں کے ہاتھ سے ہوں گے۔

مندرجہ ذیل باتیں ضروری ہیں:-

(۱) بیوہ اور بے اولاد (۲) عمر میں کسی قدر مُسن ہوں تو بہتر ہے۔ (۳) کسی شریف گھر کی ہو جو گردشِ زمانہ سے اس قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو گئی ہو۔ (۴) دینی اور اخلاقی تعلیم دے سکتی ہو۔یعنی قرآن اور اردو پڑھا سکتی ہو۔عربی اور فارسی بھی جانے تو اور بہتر ہے۔ (۵) سینا پرونا وغیرہ بھی جانتی ہو (۶) کھانا پکانا جانتی ہو۔اس سے میری مراد یہ نہیں کہ اس سے باورچی کا کام لیا جائے گا۔

غرضکہ آپ خود ماہر تعلیم ہیں اور میرے موجودہ حالات سے بھی باخبر۔مندرجہ بالا امور کو ملحوظ رکھ کر حالات دریافت کیجئے۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا اور آپ سے پانی پت میں ملاقات ہوگی۔

محمد اقبال۔۸/ا کتوبر ۱۹۳۵ء

(پس نوشت) جو خط علی گڈھ سے آیا ہے وہ اس خط میں ملفوف ہے۔اس پر ان کا پتہ بھی لکھ دیا ہے۔

(۲) لاہور۔۲۱/جون ۱۹۳۶ء (انگریزی)

مائی ڈیر سیدین

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔آپ نے جو خلاصہ تیار کیا ہے نہایت ہی عمدہ ہے اور مجھے اس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ضرب کلیم امید ہے جون کے آخر تک شائع ہو جائے گی اور میں آپ کو ایک نسخہ پیشگی بھیج سکوں گا۔اس مجموعہ میں ایک حصہ تعلیم و تربیت کے لئے وقف ہے۔ممکن ہے آپ کو اس میں کوئی نئی بات نظر نہ آئے۔تاہم اگر کتاب آپ کو بروقت مل جائے تو محولہ بالا حصہ ضرور مطالعہ فرمائیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ Leibnitz's monadism کے تعلیمی نتائج سے واقف ہیں۔اس کے قیاس کے مطابق انسانی، مونیڈ، خارج سے کوئی اثر قبول کرنے سے عاری ہے۔میرا خیال یہ ہے کہ انسان مونیڈ زیادہ تر تاثر پذیر نوعیت کا حامل ہے۔زمانہ ایک بڑی ہی برکت و نعمت ہے۔(لا تسبو ان الدھر ھو اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف وقت ہی آبادی و شادابی کا منبع ہے۔ یہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور ساکھ ہے۔

مخلص محمد اقبال

(پس نوشت) میری عام صحت بہت بہتر ہے۔آواز میں ترقی کی رفتار نہایت سست ہے۔

(۳) لاہور ۱۸/اپریل ۱۹۳۶ء

ڈیر سیدین صاحب السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جس کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔ میں خدا کے فضل سے بہ نسبت سابق تندرست ہوں۔ آواز میں بھی اب کے نمایاں فرق ہے۔ اخباروں نے میری صحت کے متعلق غلط فہمی دی تھی جس کی وجہ سے احباب کو تشویش لاحق ہوئی۔ بہر حال خدا کا شکر ہے۔

ضرب کلیم کے پروف دیکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ مئی کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی۔ تصویر ابھی تک نہ بن سکی۔

کیونکہ میں لاہور سے باہر رہا۔ آئندہ موسم میں انشاءاللہ بنواؤں گا۔ جاوید اچھا ہے۔

اپنے بیوی بچوں سے میری طرف سے دعا کہئے۔ سیدراس مسعود سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے بہنوئی[۲۸] دفعۃً انتقال فرما گئے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴) لاہور۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی کتاب شائع ہو گئی ہوگی۔ بہر حال جب شائع ہو جائے تو اس کی ایک کاپی بھیج دیجئے گا۔

اب تو سردی کا موسم آ گیا ہے۔ ضرور کبھی لاہور آیئے گا۔ میں ابھی تک سفر کرنے سے ڈرتا ہوں۔ ممکن ہے ایک ماہ کے بعد اس قابل ہو سکوں۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھکر اس فارسی مثنوی[۲۹] میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(۵) از لاہور۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۳۷ء

ڈیر خواجہ سیدین

مہربانی کر کے فوراً اطلاع دیجئے کہ آیا آپ اس وقت علی گڈھ میں ہیں یا علی گڈھ سے باہر۔ زیادہ کیا لکھوں۔ سیدراس مسعود کے ناگہانی انتقال نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ والسلام

محمد اقبال

(۶) لاہور۔ ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ جس کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کیجئے۔ میری صحت پہلے سے اچھی ہے۔ آواز میں فرق ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ میری خط وکتابت احباب کرتے ہیں۔ یا کبھی جاوید میاں سے خطوط کے جواب لکھوالیتا ہوں۔

اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا، لیکن اب یہ امید موہوم معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ؎ ہے کہ میں آپ کا مضمون نہ پڑھ سکوں گا۔ البتہ اگر آپ لاہور تشریف لائیں تو اس کے بعض مقامات مجھکو سنا سکتے ہیں۔ اسلامک کلچر کا مطبع بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ایک اور بھی انگریزی مطبع ہے جہاں کی چھپائی بہت اچھی ہے۔ اگر رسالہ بہت طویل نہیں ہے تو اسلامک کلچر میں بھی چھپ سکتا ہے۔ اس کے متعلق آپ ایڈیٹر اسلامک کلچر ماڈل ٹاؤن لاہور سے خط وکتابت کریں۔

مسٹر نکلسن کا ترجمہ غلط ہے ؎ مصرع میں لفظ ''نے'' ہے جس کا انگریزی ترجمہ ''Reed'' ہے۔ میں نے ان کی توجہ اس غلطی کی طرف دلائی تھی۔ مگر معلوم نہیں کہ ان سے کس طرح نظر انداز ہوگئی۔ ایک جگہ اور بھی ترجمے میں اغلاط ہیں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ عابد صاحب سے سلام کہیے۔

محمد اقبال

(۷) لاہور۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۳۷ء

ڈیر سیدین صاحب

آپ کا خط ابھی ملا ہے، جس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔ میں نے مسعود مرحوم کے کتبۂ مزار کے لئے ایک رباعی رباعیات میں سے انتخاب کر کے مرحوم کے سکرٹری ممنون حسن خان کو بھوپال بھیجی۔ یہ حقیقت میں میں نے اپنے کتبۂ مزار کے لئے لکھی تھی۔ میں ابھی ممنون حسن صاحب کو ایک خط لکھ کر

دریافت کرتا ہوں۔ چند اشعار مرحوم کی وفات پر بھی لکھے تھے جو رسالہ اردو کے مسعود نمبر[۵۲] میں شائع ہوں گے۔ اگر وہ رباعی جو میں نے بھوپال لکھ کر بھیجی تھی پسند آ گئی تو بہتر ورنہ اور فکر کروں گا۔ میری طرف سے مسعود مرحوم کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کیجئے۔ ذرا موسم اچھا ہو جائے تو میں خود بھی تعزیت کے لئے اور مرحوم کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے علی گڈھ حاضر ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وائس چانسلر M.L.A.Darling Financial Commissioner ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ گو گذشتہ تین سال سے بوجہ علالت ان سے نہیں مل سکا۔ آپ ان سے اس بارے میں خط و کتابت کریں[۵۳] اس کے علاوہ آپ مسٹر عبدالحی وزیر تعلیم کو لکھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اور انتظام بھی ہو سکتا ہے۔

باقی سب خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال

(۸) ڈیر سیدین صاحب

آپ کے خط کا جواب لکھ کر ابھی ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر ڈارلنگ یا مسٹر عبدالحی کو آپ کا لکھنا مناسب نہیں[۵۴] یونیورسٹی کو چاہیئے کہ وہ خود آپ کو دعوت دے۔ اس کے متعلق میں کچھ دنوں بعد بعض بے تکلف احباب سے گفتگو کروں گا۔ مقامی کالج کھلنے کے بعد یہ گفتگو ممکن ہو سکے گی۔ جس طرح آپ کا تحریر کرنا نامناسب ہے اسی طرح میرا تحریر کرنا بھی نامناسب ہے۔ کیا آپ اس کو پسند کریں گے کہ یہ لیکچر اسلامیہ کالج یا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن یا مسلم انٹر کالجیٹ برادرہڈ کی دعوت پر دئے جائیں۔ والسلام

محمد اقبال

خواجہ غلام السیدین بے مثال اقبال شناس تھے۔ انہوں نے اقبال کا مطالعہ گہری فکر اور وسعت نظر سے کیا اور کلام اقبال کے عقدے ایسے وا کئے کہ انسانی ذہن ششدر سا رہ گیا ہے۔ موصوف نے حیاتِ اقبال میں اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر ایسی جامع کتاب لکھی جو ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے کتاب کا خلاصہ پڑھا اور اسے پسند کیا۔ مصنف نے علمی نقطۂ نظر سے کلام اقبال کے بعض گوشوں کو ایسا اجاگر کیا جو صرف سیدین کا ہی کام تھا۔

سیدین صاحب کے نزدیک کلام اقبال کی بنیاد تہذیب انسانی اور فرد وملت کی اعلیٰ قدروں اور بہترین صلاحیتوں پر قائم ہے۔ یہی انسانیت کی دلیل ہے

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

موصوف نے اقبال کے افکار وخیالات کے بحر زخار کو گویا قطرے میں بند کر دیا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ صالح انسانی تہذیب اور اخلاق کی بنیاد اس مرکزی جذبے پر قائم ہے کہ ہر انسان ایک انمول شخصیت کا امین ہے اور اس کی نشوونما اور پوشیدہ صلاحیتوں کی تربیت کرنا فرد اور جماعت دونوں کا فرض ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی اصل دولت نہ روپیہ ہے، نہ کارخانے، نہ مکان، نہ ساز وسامان۔ نہ تمدن کے مادی اور مشینی آلات۔ اس کی اصل دولت افراد ہیں اور افراد کی دولت ان کے دل و دماغ کی جولانی، ان کے دل کا گداز، ان کی حسن آفرینی، ان کی قدرشناسی، ان کا سماجی احساس، ان کی خوب تر کی جستجو، ان کا جذبۂ تلاش وتحقیق۔ اقبال نے اس دولت کی تفسیر اپنے ساقی نامے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے اور یہی وہ متاع فقیر ہے جس نے اس شاعر کو فقیری میں امیر بنا دیا تھا۔ جو ہر شخص کو امیر بنا سکتا ہے۔ اگر اس میں اس متاع بے بہا کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا گداز مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل، مری رزم گاہ حیات گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹادے اسے
لٹادے ٹھکانے لگادے اسے

اس متاع فقیر کا پیغام محبت، رواداری، مساوات، عدل وانصاف، شرافت اور انسانیت ہے۔ ان ہی اجتماعی صفات کا نام اقبال کی اصطلاح میں "عشق" ہے

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تاب ناک عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ　　عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود　　عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سال اقبال ۱۹۷۷ء برصغیر میں بڑے جوش وخروش سے منایا گیا اور اقبالیات میں بہت سے غیر معروف کے تذکرے کئے گئے۔ حیرت کی بات ہے کہ ''ماہرین اقبالیات'' نے سب سے عظیم ماہر اقبالیات خواجہ غلام السیدین کو یکسر فراموش کیا۔ راقم حروف نے سیدین صاحب کے ان بلند پایہ اقبالی مضامین کو ترتیب دیا ہے جو وقتاً فوقتاً پرانے اور کمیاب رسالوں کی زینت بن چکے ہیں سردست ایک عالمانہ مضمون ''دانائے راز ڈاکٹر اقبال'' یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دانائے راز ڈاکٹر اقبالؔ

''اقبال سے آشنائی تو ان کے کلام کے ذریعہ اس وقت تھی جب اس کو پوری طرح سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا شعور تک نہ تھا۔ لیکن جب تھوڑا بہت ادبی ذوق اور ان کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو بہت جلد سعادت ملی۔ کچھ خط وکتابت بھی رہی۔ ایک مرتبہ علی گڈھ میں ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا جب وہ یونیورسٹی کی دعوت پر ''اسلامی فکر کی تعمیر نو'' پر اپنے خطبات دینے وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ بھوپال میں سر راس مسعود کے ہاں مقیم تھے ان کے ساتھ چند روز گذارنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کتنی مختصر تھیں یہ ملاقاتیں جن سے ایک طرف حافظہ تک روشن اور لطف اندوز ہے اور دوسری طرف اس محرومی کی خلش کھٹکتی ہے کہ سمندر کی ہم عصری نصیب ہوئی اور چن پائے چند خزف ریزے! لیکن پھر سوچتا ہوں کہ شخصیت، علم وفضل، عظمت وکمال کے سرچشموں سے نیاز مندی ایسی چیز نہیں جن کو وقت کے گز سے ناپا جائے۔ اس لئے ذاتی صحبت اور ملاقات میں کسب فیض کے جو موقعے ملے اس کے لئے شکر کرنا چاہیے۔ پھر ان کے فکر وکلام کی دولت، جو زمان ومکان کی پابندیوں سے آزاد ہے، گذشتہ چالیس سال سے میرے مطالعہ میں رہی ہے۔ اور جوں جوں اس پر غور کیا اس کی معنویت اور اس کے حیات بخش پیغام کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔

فاسد مادے کو خارج کرتا۔ کبھی اہل سیاست کے بلند آہنگ دعووں اور ریا کاریوں کا پول کھولتا۔ لیکن اس تنقید میں نہ مردم بیزاری تھی نہ مردم آزاری۔ ہاں شوخی اور ظرافت ہوتی، برتر فکر اور بہتر زندگی کی ترجمانی ہوتی اور گداز قلب کی دھڑکنیں، اور یہی جذبہ ان کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔ جب کوئی صاحب ذوق یا باعلم شخص ان کی صحبت سے اٹھتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ذہن اور زندگی میں ایک نئی گہرائی اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کی طبیعت میں فقر اور بے نیازی کا ایک خاص انداز تھا جو صرف انہیں لوگوں کے حصے میں آتا ہے جو دراصل بڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کبھی یہ فکر نہ ہوئی کہ دوسروں پر اپنی عظمت کا نقش قائم کریں، اور فکر کیوں ہوتی؟ ہمالہ پہاڑ کبھی خود اپنی بلندی کا اعلان نہیں کرتا۔ ان کی نہ سربلندوں سے انکسار تھا نہ خاکساروں سے سربلندی۔ بلکہ میں نے کبھی کبھی یہ دیکھا کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ گرم جوشی اور آمادگی سے ملتے اور جن لوگوں کو دولت اور منصب کی وجہ سے دنیا بڑا سمجھتی ہے ان سے ملنے میں تامل کرتے۔ انتقال سے کوئی دو سال پہلے جب وہ بھوپال میں مقیم تھے سر راس مسعود کے مقامی دوست اور بیرونی عمائدین برابر ان کے ہاں آتے رہتے تھے اور جب آتے قدرتاً اقبال سے ملنے کی خواہش کرتے۔ اقبال اکثر یہ کہتے "کیوں بھئی مسعود کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو کسی طرح ٹال دو!" برخلاف اس کے جب وہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو اکثر وہاں سے معمولی حیثیت کے غریب مسلمانوں کو ساتھ لے آتے اور ان سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور باتیں کرتے۔ یہ وہی اقبال تھے جنہوں نے کہا ہے۔

خیر وخوبی برخواص آمد حرام
دیدہ ام صدق و صفا اندر عوام

دراصل اقبال کو جو زبردست شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ ان کی غیر معمولی قابلیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف ہے جو خلاف معمول انہیں اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوا۔ ورنہ دنیا میں نام حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے ان سے وہ بیگانہ تھے۔ دنیاوی ترقی مصلحت پسندی چاہتی ہے اور ان کا اصول تھا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

دنیاوی ترقی کا مطالبہ یہ ہے کہ جو صاحبانِ قوت اور اختیار ہیں ان کی ہمنوائی کرو اور ان کے

خوان کرم سے جو ریزے گریں ان کو شکریہ کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن یہاں حق گوئی اور بے باکی کی بدولت اپنوں اور بیگانوں سب کو ناراض کرنے کا حوصلہ تھا اور زہر ہلاہل کو قند کہنے سے انکار۔ انہوں نے کبھی مصلحت اندیشی کے خیال سے اپنی بچی اور بے امان تنقید کی تلوار کو میان نہیں کیا اور کس کس پر تنقید نہیں کی۔ حکومت برطانیہ، حکومت ہند، اور حکومت پنجاب پر، ہندوؤں اور مسلمانوں پر، غلامی کی ذہنیت اور آزادی کی بے راہ روی پر مشرقی تصوف اور مغربی تہذیب پر، سرمایہ داری اور سوشلزم پر، جمہوریت اور فاشزم پر، شاعری پر جو افیون کی طرح خواب آور ہو، عقل پر جس کی مہار عشق کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی ان تمام بتوں پر جو افراد اور جماعتوں نے اپنے دل و دماغ میں بٹھا رکھے ہیں اور جن کی پوجا وہ اکثر بنیادی صداقتوں کو بھول جاتے ہیں۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں ، لاالہ الاّ اللہ

اگر وہ زبان نثر میں یہ سب باتیں کہتے تو حکومت کو ان کی زباں بندی لازم ہو جاتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ حکومتوں میں ادبی ذوق اور شعر سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

مگر بت شکنی کتنی ہی ضرورت ہو وہ بت شکن کو ہر دلعزیز نہیں بناتی۔ یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہے کہ باوجود عمر بھر اس ناگوار فرض کو انجام دینے کے انہوں نے، ان کے فکر نے، ان کے کلام نے، ہماری نسل کے دلوں میں گھر لیا ہے اور وہ ہماری ذہنی، جذباتی اور روحانی میراث کا ایک جزو عزیز بن گئی ہے۔

آخری عمر میں ان کا فقر اور بے نیازی کا انداز اور بڑھ گیا تھا جس نے ان کو دنیا کی اوچھی اور مصنوعی عزتوں کی طرف سے نیاز کر دیا تھا اور خود شناسی اور انسان دوستی کے راستے خدا شناسی کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ جب وہ خلوص کے ساتھ کہہ سکتے تھے۔

مرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر
مرا نشیمن بھی تو ، شاخ نشیمن بھی تو

اس شان فقر کے ایک دو دلچسپ واقعات قابل ذکر ہیں۔ سر راس مسعود کی خواہش تھی کہ اقبال کو آخری عمر میں اطمینان کے ساتھ ادبی اور علمی کام کرنے کا موقع ملے اور کسی طرح فکرِ معاش سے آزادی حاصل ہو جائے۔ ان کے توجہ دلانے سے نواب صاحب بھوپال اور ایک دوسرے دولت مند رئیس نے یہ سعادت حاصل کرنی چاہی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں۔ اقبال بہ مشکل بھوپال کی کم تر رقم کو اس سے دوچند رقم کے مقابلے میں قبول کرنے پر راضی ہوئے اور وجہ یہ بیان کی کہ اول تو اتنی رقم میری

ضروریات کے لئے کافی ہے۔ میں زیادہ کیوں لوں۔ دوسرے جب تک میرے دل میں کسی شخص کی کوئی خاص وقعت نہ ہو اس کی امداد قبول نہیں کر سکتا! یہ تھا غیرت فقر کا تقاضا۔ ایک ایسے زمانے میں جب روپے کے بازار میں تقریباً ہر شخص کی قیمت لگائی جا سکتی ہے اور بڑے بڑے مشاہیر منصب و جاہ و دولت کی خاطر ہر قسم کا ''ایثار'' کرنے کو تیار ہیں۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ انہیں سر اکبر حیدری کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ جانا بوجھا لیکن قابل ذکر ہے۔ انہوں نے یوم اقبال پر ''توشہ خانہ حضور نظام'' کی طرف سے ایک ہزار روپے کی ''حقیر'' رقم بطور ''تواضع'' کے پیش کی۔ جب وہ چک اس تمہید کے ساتھ اس قلندر کے پاس پہنچا تو اس نے اسے ان اشعار کے ساتھ واپس کر دیا جو بعد میں ارمغان حجاز میں شائع ہوئے۔

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہ پر ویز | دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر | حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش | کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

اقبال میں بہت سی غیر معمولی ذاتی خوبیاں تھیں۔ لیکن میرے دل میں بڑی عقیدت ہے اس شان فقر کے لئے جس کی تفسیر انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کی تھی۔ لیکن اس کا خطاب دراصل عصر حاضر کے تمام جوانوں سے ہے۔

ہمت ہے اگر تو ڈھونڈ وہ فقر | جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا | اللہ کی شان بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا | بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبال نے اس فقیری کو اللہ سے مانگا تھا اور اس کی بدولت وہ ایمان کی دولت سے مالا مال تھے۔

اقبال کی فکرِ روشن کے بہت سے پہلو ہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن موجودہ زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سب سے اہم پہلو اس کی انسانیت اور انسان دوستی ہے اور اسی پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ اقبال اس بارے میں نہ صرف اسلام کی تعلیم کی علمبرداری کرتا ہے بلکہ انسانی ضمیر کا ترجمان بھی ہے۔

ہماری بدنصیب نسل جو بیسویں صدی میں پیدا ہوئی یا اس میں جوان ہوئی تاریخ کے ایک ایسے نامبارک دور میں سے گزری ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ سائنس اور انسان کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے ملکوں اور قوموں کو ایسے رشتوں میں جکڑ دیا ہے کہ ہمارا مرنا اور جینا، ہمارا دکھ اور سکھ، ہماری خوشی اور بدحالی سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہیں۔ اور دوسری طرف دلوں اور دماغوں میں ایسی گتھیاں پڑگئی ہیں کہ مشترک انسانیت کا احساس کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور ہماری بہترین ذہانیت تباہی اور ہلاکت کے لئے استعمال ہورہی ہے۔ شیطان نے اٹم بم اور اس کی ذریات کے جو تحفے انسان کو دیئے ہیں ان کی بدولت اس کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آگئی ہے کہ اگر وہ نسلی خودکشی پر آمادہ ہوتو آسانی سے دنیا کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ میں تو سائنس داں نہیں ہوں۔ لیکن ایک ماہر سائنس داں کا بیان ہے کہ ایک ہائیڈروجن بم نوے لاکھ انسانوں کو عذاب کی بے پناہ گھائی کے راستے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور جس جگہ یہ بم گرایا جائے اس کا ٹمپریچر دس لاکھ ڈگری تک پہنچ سکتا ہے۔ اس حرارت کا تصور شاید آپ کو اس بات سے ہوسکے کہ سورج کے ٹمپریچر کا اندازہ چھ لاکھ ڈگری کیا گیا ہے۔ گویا اب روز قیامت اور سورج کو سوا نیزے پر لانے کے لئے مشیت الٰہی کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام اختیار میں آگیا ہے۔ انسان کے اقبال نے اسی حالت کی پیش بینی کر کے تیس بتیس سال پہلے کہا تھا۔

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہر یاری ہے	قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی	یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا	جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونی میں تیغ کارزاری ہے

اس نازک وقت میں جب انسانیت موت اور زندگی کے فیصلہ کن دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایسی قدروں کی یاد تازہ کرنا جو انسانی ایکتا اور امن، شرافت اور رواداری کا پیغام سناتی ہیں، صرف دلوں ہی میں ٹھنڈک پیدا نہیں کرتا، صرف دماغوں کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کو نہیں بجھاتا بلکہ انسان کی نجات کے لئے لازم ہوگیا ہے۔

اقبال اسی قسم کے ایک بلند پایہ اور روشن دماغ پیامبر تھے۔ ان کی ذات اور شاعری دونوں میں ان قدروں کی جوت نظر آتی ہے۔ دیر و حرم اور کفر و دین کے جھگڑوں نے ہمیشہ زندگی کو تلخ اور ذلیل کیا ہے اور اہل دل اہل نظر نے ان کے اختلاف پر احتجاج کیا ہے۔ اس احتجاج میں بہت سے شاعر بھی شامل

ہیں۔لیکن ان میں اور اقبال میں ایک خاص فرق ہے۔اکثر شاعروں نے اس جذبے کو آرائش محفل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ان کا کوئی خاص مذہبی عقیدہ نہیں ہوتا۔ان میں یقین کی تپش نہیں ہوتی۔وہ نہ رسوم دیر سے واقف ہیں نہ آداب حرم سے۔نہ کفر کی چاشنی سے نہ دینداری کے کیف سے۔اس لئے وہ بغیر کسی خاص سنجیدگی فکر کے دونوں سے بے تعلقی کا اظہار کر سکتے ہیں۔لیکن اقبال شاعر بھی ہے اور فلسفی بھی۔اس نے مذہب کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور اسلام کے بنیادی اصولوں میں نظر پیدا کی۔وہ کسی خیال یا جذبے کو محض گرمی سخن یا کلام کی سجاوٹ کے لئے استعمال نہیں کرتا۔بلکہ اس کے تصور حیات میں ہر ایک کا ایک خاص مقام ہے۔اس لئے اس کا پیغام ایک فرد کی ذاتی رائے نہیں بلکہ ایک ملت کا ایک تہذیب کا پیغام بھی ہے۔اس پیغام کو بار ہا خود اس مذہب اور ملت کے افراد نے بھی بھلایا ہے اور وہ بتائے ہوئے راستے سے دور بھٹک گئے ہیں۔لیکن جب تک وہ اس کو مانتے اور پہچانتے ہیں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتے ہیں اور اس آدرش کی طرف بڑھنے کی آرزو رکھتے ہیں، امید کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔میں اقبال کے پیغام کی اس امید آفریں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ سب انسانوں کے لئے قابل احترام ہے۔

اقبال کے ''تصور انسانیت'' کی نقاب کشائی کے لئے اس کے مندرجہ ذیل شعروں پر غور کیجئے جو مجھے بہت محبوب ہیں اور جن میں اس نے بڑی سادگی اور صفائی سے ''آدمیت'' کا مطلب سمجھایا ہے۔اس کے نزدیک آدمیت کی صرف ایک کسوٹی ہے۔آدمی کی عزت کرنا، ہر آدمی کی، بلا لحاظ نسل وملت، کیونکہ اس میں نور الٰہی کا جلوہ ہے۔خواہ کتنا ہی مدھم کیوں نہ ہو۔جو عشق کا بندہ ہوتا ہے وہ خدا کے راستے پر چلتا ہے اور کفر و دین کا فرق بھلا کر کافر اور مومن کے لئے اپنے دل کے دروازے یکساں طور پر کھول دیتا ہے۔

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہائش عشق و آغازش ادب

حرف بد را برلب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خداست

آدمیت، احترام آدمی — باخبر شو از مقام آدمی

کفر و دیں را گیر در پنہائے دل

دل اگر بگریزد از دل وائے دل

کفر و دین کے ضمن ایک دلچسپ نکتہ قابل ذکر ہے۔عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''مومن'' سے مراد ہے مسلمان اور ''کافر'' سے غیر مسلم۔اس غلط فہمی میں غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بہت سے مسلمان بھی شریک ہیں جن کی خوش فہمی ان کی مذہبی بصیرت سے بڑھی ہوئی ہے۔اقبال نے اس بارے میں ایک

بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس کے نزدیک کافر اور مسلمان کا اصلی فرق رسمی عقاید کا نہیں بلکہ دل و دماغ کی ساخت کا ہے۔ زندگی کے بنیادی تصور اور آدرش کا ہے۔ ان سہاروں کا ہے جن کے بل بوتے وہ زندگی کو بنانا اور سنوارنا چاہتے ہیں۔ اقبال کی دنیا میں مسلمان کافر ہو سکتا ہے اور کافر مسلمان۔ فرق لیبل کا نہیں بلکہ اس شراب کا ہے جو ان کے ساغر دل میں چھلکتی ہے۔

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری — مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جب کبھی میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو گاندھی جی کی زندگی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

ایمان کی کسوٹی عشق ہے اور اس کی پہچان خدا سے لو لگانا اور اس کے بندوں کی محبت اور خدمت کا دم بھرنا۔ جس نے دل میں عشق کی شمع روشن کرنے کے بجائے، اس میں نفرت کے دھوئیں کو جگہ دی اور خدا کے سوا ما سوا سے امید باندھی وہ مومن نہیں کافر ہے۔ چاہے وہ خود کو کسی نام سے پکارے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی — مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

یہاں کوئی بیچ کا راستہ نہیں ہے۔ انسان خدا کا بندہ بن سکتا ہے یا ابن الوقت۔ دونوں طرف پانسا پھینکنا، چھ دن شیطان کی بندگی اور ساتویں دن خدا کی رضا جوئی خود کو دھوکا دینا ہے۔

اقبال دل و دماغ کی گہرائیوں سے مسلمان ہے اور باوجود اس کے نہیں بلکہ اسی وجہ سے وہ بار بار انسانوں کی مشترک قدروں پر، ان کے اٹوٹ رشتوں پر ان کی فطری اخوت اور محبت پر زور دیتا ہے۔ اس کی نظر میں سچی انسانیت اور سچے اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ لوگ اپنے دلوں اور دماغوں کو تنگ نظری کی لعنت سے پاک کر دیں اور سب انسانوں کے لئے محبت کے جذبے کو بیدار کریں اور اسی کی روشنی میں زندگی کے کٹھن راستے کو پار کریں۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی جہانبانی

بتان رنگ و بو کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

اور ایک دوسری جگہ اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی و تورانی　　　شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اقبال کی شاعری اور فلسفے کا ایک مرکزی خیال یہ ہے کہ قوم، نسل، رنگ، ذات پات اور ملک کے تصور نے انسانوں کے درمیان مخالفت کی دیواریں کھڑی کر کے زندگی کے حسین نقشے کو بگاڑ دیا ہے۔ اس کا کلام ان تمام تبان بے فیض کے خلاف ایک مسلسل جہاد ہے۔ جیسے رنگ، نسل، کلیسا، جن کو ابتدا میں تاریخ کی تحریکوں نے تراشا اور بعد میں قوت اختیار کے ناپاک پجاریوں نے اپنے ذلیل مقصدوں کے لئے استعمال کیا۔ اس نے اپنی مثنوی اسرار خودی کے دیباچے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ

''میری فارسی مثنوی کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میں دراصل ایک بہتر انسانی سماج کی تلاش میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ لیکن اس تلاش میں ایک ایسے سماجی نظام کو کیسے نظر انداز کروں جس کا خاص مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نسل، ذات پات اور رنگ کے فرق کو یک قلم مٹا دے۔''

اقبال نے بڑے دل کش پیرائے میں جا بجا اس دل و دماغ کے انسان کی تصویر کشی کی ہے جو ان مصنوعی اختلافات کو رد کر کے انسانی وحدت کو دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ ان شعروں میں بظاہر شاعر نے اپنے مزاج کی تصویر کھینچی ہے لیکن دراصل ان میں ہر شریف رواداروفراخ دل انسان دوست کے خد و خال نظر آتے ہیں۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد　　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
فقیہ شہر کی تحقیر، کیا مجال مری　　　مگر یہ بات کہ میں چاہتا ہوں دل کی کشاد
نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو　　　یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد
کئے ہیں فاش رموز قلندری میں نے
کہ فکر مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

اقبال قلندری کو، جو تصوف کی مہر پرور نگاہ سے سارے عالم کو دیکھتی ہے، مدرسے اور خانقاہ کے اس روایتی فکر پر ترجیح دیتا ہے جو عقل یا مذہب کی سطحی پابندیوں میں اسیر ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ باوجود فکر کی عظمت کا قائل ہونے کے باوجود سائنس کی اہمیت تسلیم کرنے کے، دل کی دولت کو ہر قسم کی دولت سے برتر جانتا ہے اور عشق کے جادو کو عقل کی تلوار پر ترجیح دیتا ہے۔ صرف علم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر انسان اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں زندگی سچی مسرت، اطمینان اور شرافت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ وہ راستہ تو اسے ہیروشیما اور ناگاساکی کی دوزخ تک بھی پہنچا سکتا ہے۔

اقبال کے انگریزی خطبات میں ایک چھوٹا سا معنی خیز جملہ ہے جو اس بارے میں اس کی

بنیادی پوزیشن کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے اور افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کے لئے ایک صحیح بنیاد اور ایک صالح اصول کا تعین کرتا ہے......اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو قائم کرنے کے لئے ہم جو کام بھی کریں اس میں ایک اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔یعنی ہم اپنی خودی کا بھی احترام کریں اور دوسروں کی خودی کا بھی۔''اپنی خودی کا احترام'' یہ ایک ایسا سر ہے جو اقبال کے کلام میں شروع سے آخر تک سنائی دیتا ہے۔اس عقیدے کی روشنی میں اقبال کے انسان کے بلند مقام کو پہنچانا،اسے ایک امید پرور اور حوصلہ آفریں پیغام دیا اور ان راستوں کی جھلک دکھائی جو اس کو ہمدوش ثریا کر سکتے ہیں۔جس وقت فرشتوں نے آدم،یعنی اس انسان خاکی کو،جس کے اندر خیر وشر کے امکانات کا ایک اتھاہ سمندر پوشیدہ ہے جنت سے رخصت کیا تو ان کا الوداعی گیت اقبال کے لفظوں میں یہ تھا۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی — اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی

اس دولت بے بہا کو دامن میں لئے انسان اس دنیا میں آیا،لیکن اس نے اپنی بے بصری اور بدتدبیری سے اپنے لوبھ اور انیائے سے اپنی تنگ نظری اور خودغرضی سے دکھ اور محرومی سے بھر دیا۔ہزاروں برس تک عالم بالا اس المیہ کا تماشا کرنے کے بعد فرشتے اپنا تبصرہ بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں۔اس تبصرہ میں ہلکا سا مودبانہ طنز بھی پنہاں ہے کہ اے انسان کے خالق،تو نے اس انسان کو ہم پر ترجیح دے کر دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ اسے عدل،صبر اور حسن سے بھر دے۔لیکن ذرا دیکھ تو سہی!

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گر ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہ گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی،خواجہ بلند مقام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق،جوہر عشق ہے خودی — آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

اور یہ المیہ کیوں وجود میں آیا؟اس لئے کہ ایک صالح زندگی کی تعمیر کے لئے اقبال نے جو دوسری شرط قرار دی تھی اس کو ہم نے نہیں اپنایا۔یعنی دوسروں کی خودی کا احترام۔جب تک ہم دوسروں کی خودی کا سچا احترام کرنا نہ سیکھیں گے،ان کے لئے خیالات،عقائد اور اعمال کی

(خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں) وہی آزادی نہیں چاہیں گے جو اپنے لئے چاہتے ہیں ۔ جب تک ہم رواداری کو اپنی کشتی کا بادبان نہیں بنائیں گے ہماری اپنی خودی بھی پھل پھول نہیں سکتی ۔لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایک اوچھی اور بے معنی سی رواداری نہ ہو جو عقیدے کی کمزوری یا تشکیک یا محض بے اعتنائی سے پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ سچی اور گہری رواداری ہو جو میں اور تو کے فرق کو بھلا کر دوسروں کے لئے بھی وہی اچھی چیزیں چاہتی ہے جو اپنے لئے ،جو اختلاف کے بجائے ایکتا کی تلاش کرتی ہے۔ جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتی ہے۔ جب انسان میں ایک طرف دل و دماغ کی فراخی پیدا ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنی خودی کا احترام کرنا سیکھ لے ،جس سے مراد جھوٹا غرور اور انانیت نہیں بلکہ یہ جذبہ اور عقیدہ کہ خودی ایک ایسی دولت ،ایسی امانت ہے جسے کسی داموں بیچا نہیں جا سکتا۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

جب یہ دونوں چیزیں کسی فرد میں جمع ہو جائیں تو اس میں خودداری ،صداقت ،دیانتداری ،اور جرأت کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور وہ جماعت کے رکن کی ہمدردی ،رواداری اور فراخ دلی سے کام لینا سیکھتا ہے۔ یہ چند پیش پا افتادہ روزمرہ کی بول چال کے لفظ ہیں ۔لیکن درحقیقت انہیں میں اچھی زندگی کا بھید پوشیدہ ہے۔آج کی دنیا میں جس کے اوپر پستی کے بادل منڈلا رہے ہیں جس کی بیخ کنی کے لئے اس کے قابل ترین دماغ اس طرح جدوجہد کر رہے ہیں جیسے خودکشی زندگی کی سب سے اعلیٰ قدر ہو،کوئی سبق ،کوئی پیغام فکر کی کوئی یاترا ،مذہب کا کوئی اصول اس قدر اہم نہیں جتنا یہ سیدھا سادا ،پہاڑوں جیسا پرانا ،سمندر جیسا گہرا ،سورج جیسا روشن ،گلاب جیسا شگفتہ پیغام کہ اپنے دل اور دماغ کے دروازوں کو کھول دو ،تاکہ تعصب اور تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف ہو جائیں ،تاکہ انسان انسان کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے ،تاکہ محبت کی دھیمی روشنی اور ٹھنڈک ہوا بند غنچوں کو پھول بنا دے ،تاکہ انسان ایک دوسرے کا خون پینے کے بجائے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بننا سیکھیں ،تاکہ علم اور سائنس کی فتح مندیوں نے انسان کو جو بے اندازہ قوت بخشی ہے وہ انسان کی سیوا کے لئے ،تخلیقی جدوجہد کے لئے ،زندگی کی گود کو فراغت اور خوش حالی اور اطمینان سے بھرنے کے لئے استعمال ہو سکے...اور یہی اقبال کا مرکزی پیغام ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں بہت سی باتیں کہی ہیں ۔بہت سے الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔اس نے مشرق و مغرب پر ،مسلم اور غیر مسلم پر ،علم کی عیاری اور قوت کی خطرناکی پر تنقید کی ہے۔لیکن محبت اور رواداری اور انسان دوستی کا سُر اس کی ساری شاعری میں اس طرح گھلا ملا ہے جس

طرح دل کی دھڑکن زندگی کے اندر بسی ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ہر انسان ایک ''بندۂ مومن'' بن جائے۔ بندۂ مومن جس کی تصویر اس نے ان دل کش الفاظ میں کھینچی ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ | غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات | ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل | اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اقبال کا یہ پیغام نیا نہیں ہے انوکھا نہیں ہے۔ خدا کے ہر نیک بندے نے، ہر نبی اور ولی نے، ہر رشی اور منی نے، ہر مُصلح اور فلسفی نے اپنے انداز میں اسے دہرایا ہے۔ مہاتما بدھ نے ہزاروں برس ہوئے کہا تھا: ''تم دشمنی کو کبھی دشمنی کے ذریعہ زیر نہیں کر سکتے۔ صرف محبت اور دوستی کے ذریعہ اسے فتح کر سکتے ہو۔'' یہ ایک ابدی قانون ہے۔ مسیح علیہ السلام نے سکھایا تھا کہ ''اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے بھی محبت کرو اور برائی کا بدلہ نیکی سے دو۔'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''اگر خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اس کے بندوں کی خدمت کر کے دکھاؤ۔'' تو پیغام نیا نہیں، انوکھا نہیں، صرف سچا ہے اور ضروری اور اس قابل ہے کہ اسے نشر و اشاعت کے تمام ذریعوں سے عام کیا جائے۔ انہیں ذریعوں میں ایک شاعری ہے، کسی خلاق فن کار کی شاعری جو لفظوں میں جادو پھونک سکتی ہے اور معنی کی رگوں کا خون دوڑا سکتی ہے۔

اقبال کو دنیا کے سامنے اس انسانی پیغام کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس دل و دماغ کے انسان، اس کمال کے شاعر، اس بصیرت کے فلسفی آئے دن پیدا نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ملک اور زمانے کے لئے ایک برکت ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے ملک اور زمانے کی ملکیت نہیں ہوتے۔ جس طرح طلوع آفتاب کا جمال اور غروب آفتاب کا جلال، چاند کی روپہلی روشنی اور کہکشاں کا حسن، بہتے پانی کا ترانہ اور سربفلک پہاڑوں کی عظمت ہر انسان کی دولت ہے جو ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گوئٹے اور شیکسپیر، کالی داس اور حافظ، ٹیگور اور اقبال، افلاطون اور سقراط، لنکن اور مہاتما گاندھی ان سب کی ملکیت ہیں جن کے دل کے تار ان کی حکمت یا شاعری کے زیر و بم کے ساتھ لرزش کرتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں اور انسان کا دل ان کا ابدی نشیمن ہے ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی | گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق | نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
پُر سوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر قند

یہ ہے اقبالؔ جس کو ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنا شاعر مانتے ہیں، جوان کا یقیناً ہے لیکن صرف ان کا نہیں۔ اس کا پیام محبت تو ساری دنیا کے لئے ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کاش اس پیام کی گرمی اور گداز ان دونوں دیسوں میں دوستی اور محبت کا اٹوٹ رشتہ قائم کر دے اور دلوں کے کھوٹ کپٹ اس طرح دور ہو جائیں جس طرح اجالے کے سامنے اندھیرا بھاگ جاتا ہے۔''

حواشی

۱؎ رسالہ عصر جدید (ضمیمہ) مطبوعہ مارچ ۱۹۰۶ء مرتبہ خواجہ غلام الحسنین۔ مقام اشاعت گولہ گنج لکھنؤ

۲؎ عصر جدید (ضمیمہ) مطبوعہ جنوری ۱۹۰۸ء مرتبہ خواجہ غلام الثقلین

۳؎ چند ہم عصر صفحہ ۹۳۔۱۹۸ از مولوی عبدالحق ۴؎ تعزیت نامہ صفحہ ۶ تا ۷ مطبوعہ ۱۹۱۵ء مرتبہ محمد احسان الحق

۵؎ تعزیت نامہ صفحہ ۱۲۵ ۶؎ علامہ ہروی کے لئے تفصیلات کتاب میں درج ہیں۔

۷؎ تعزیت نامہ صفحہ ۳۶ ۸؎ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' صفحہ ۱۳ مرتبہ خواجہ غلام السیدین

۹؎ اردو ادب علی گڈھ، سیدین نمبر مطبوعہ ۱۹۷۲ء ۱۰؎ علی گڈھ میگزین (جبلی نمبر) مطبوعہ ۱۹۲۵

۱۱؎ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' صفحہ ۱۷۴، ۱۲؎ ایضاً صفحہ ۱۸۳

۱۳؎ یہ خط اور اس کے ساتھ مشاہیر کے دوسرے اصل خطوط ڈاکٹر نیر مسعود نے راقم کو مطالعہ کے لئے عنایت کئے تھے۔ یہ بھی خطوط انجمن ترقی اردو (ہند) کے آرکاوز میں محفوظ کر دیئے گئے۔ (ا۔ح)

۱۴؎ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' صفحہ ۲۱۵۔۲۱۶، ۱۵؎ ایضاً صفحہ ۲۲۸، ۱۶؎ ایضاً صفحہ ۲۷۴

۱۷؎ نغمۂ گلزار (مجموعہ کلام فوق) مطبوعہ ۱۹۴۱ء ۱۸؎ سیدین صاحب نے یہ مختصر تبصرہ میری تصنیف ''میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر'' مطبوعہ ۱۹۶۴ء پر لکھا تھا (ا۔ح)

۱۹ باقیات اقبال طبع سوم ۱۹۷۸ مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، ۲۰ خواجہ سجاد حسین بڑے روشن دماغ اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ علی گڈھ کالج کے پہلے گریجویٹ تھے۔ علی گڈھ کے پہلے کرکٹ کپتان، یونین کے پہلے صدر اور ایک نامور مقرر تھے۔ انہوں نے اپنے والد گرامی مولانا حالی کے نام پانی پت میں ایک مدرسۂ حالی مسلم ہائی اسکول قائم کیا تھا۔ اس وقت تک پانی پت میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا۔ خواجہ صاحب موصوف برسوں تک صوبۂ سرحد میں انسپکٹر جنرل تعلیمات رہے۔ اپنے نواسے خواجہ غلام السیدین سے بہت پیار کرتے تھے۔ ۲۱ روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔ مطبوعہ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء (صفحہ ۵۷۱) ۲۲ ایضاً صفحہ ۵۷۴ ۲۳ مسعود سے مراد سر سید راس مسعود ۲۴ یہ احباب سید نذیر نیازی، راجہ حسن اختر اور چودھری محمد حسین تھے۔ جاوید اقبال بھی ہمراہ اقبال تھے۔

۲۵ روح مکاتیب اقبال صفحہ ۵۷۵ و اقبال نامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸ ۲۶ ایضاً صفحہ ۳۶۷

۲۷ ''زمانہ'' کانپور بابت نومبر ۱۹۳۵ صفحہ ۳۲۲ تا ۳۲۴۔ (اقبال کے یہ اشعار فارسی غالباً پہلی مرتبہ ''زمانہ'' میں شائع ہوئے تھے۔ یہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں نہیں ہیں۔ (ا۔ح)

۲۸ ایضاً صفحہ ۳۲۶، ۲۹ مسدس حالی کا یہ ایڈیشن نایاب ہے۔ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ قطعہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں موجود نہیں ہے۔ اسے پہلی مرتبہ مسدس حالی کے صدی ایڈیشن (۱۹۳۵ء) میں خواجہ اظہر عباس نے شائع کیا تھا۔ ۳۰ مصنفین اردو، از سید زوار حسین مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب نگر دہلی ۳۱ مسدس حالی یہی ایڈیشن صفحہ ۳۲۔

۳۲ اخبار ''وکیل'' امرتسر صفحہ ۸ جلد ۹ نمبر ۶۶ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء، ۳۳ اردوئے معلّٰی علی گڈھ صفحہ ۳۸ بابت فروری ۱۹۰۴ مرتبہ حسرت موہانی ۳۴ اردوئے معلّٰی صفحہ ۳۷ بابت مارچ ۱۹۰۴ء

۳۵ خواجہ غلام الحسنین ایک غیر معمولی صاحب کردار تھے۔ اردو، عربی اور فارسی میں عبور حاصل تھا۔ انگریزی دانی کا یہ عالم تھا کہ ہربرٹ اسپنسر کے فلسفۂ تعلیم کا ترجمہ اردو میں کیا۔ یہ کتاب رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی اور علی گڈھ کے ڈیوٹی شاپ سے ملتی تھی۔ اس پر زمانہ کانپور بابت مئی ۱۹۰۵ صفحہ ۳۰۳ تا ۳۰۶ ''تنقید'' کے تحت طویل تبصرہ شائع ہوا تھا۔ چنانچہ درج ہے کہ ''خواجہ صاحب کی کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اس کے شروع میں مضامین کتاب کی ایک مفصل فہرست تذکرہ ہربرٹ اسپنسر اور مطالب کتاب کا ایک مختصر و موزون خلاصہ درج کیا ہے۔ ہم انجمن ترقی اردو کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کو ہربرٹ اسپنسر ایسے حکیم کی تصانیف کے ترجمہ کے لئے خواجہ غلام الحسنین سا قابل مترجم مل گیا اور امید کرتے ہیں کہ خواجہ صاحب موصوف کو حامیانِ اردو سے اپنی محنت اور جانفشانی

کی خاطر خواہ داد ملے گی۔''

خواجہ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کی تقریروں کا ترجمہ اردو میں فی البدیہہ کرتے تھے۔۲۱ویں ماہ رمضان ۱۹۳۷ء کو انتقال کیا۔خواجہ صاحب کے متعدد مضامین ''عصر جدید''میں میری نظر سے گذرے ہیں۔اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ایک غزل چودہ شعر میں ''مخزن''لاہور بابت نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۴ میں ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کے درج ذیل تمہید کے ساتھ چھپی تھی ۔اگست کے مخزن (سال مذکور) میں جو غزل مولانا حالی مدظلہ کی حضرت داغ کی مشہور غزل کی طرح پر شائع ہوئی تھی اسے دیکھکر ان کے شاگرد رشید چودھری خوشی محمد ناظر صاحب بی۔اے اور ان کے نواسے خواجہ غلام الحسنین صاحب انسپکٹر مدارس گلبرگہ نے بھی اسی طرح طبع آزمائی کی ہے۔''....خواجہ صاحب موصوف کے چند شعر یہ ہیں۔

کیا پوچھتا ہے حال دل اس بدنصیب کا — ہٹ جا خدا کے واسطے ناصح قریب سے
دنیا کے مخمصوں نے وطن کو چھڑا دیا — ہے چرخ سے گلہ نہ ہے شکوہ نصیب سے
بندش غلط ،ردیف غلط ،قافیہ غلط — اس کے سوا کبھی نہ سنا کچھ ادیب سے

کافی ہے ان کا خط بھی تسلی کے واسطے
ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

۳۶؎ روح مکاتیب اقبال صفحہ ۲۷۰، ۳۷؎ ''جامعہ'' جلد ۲۰ نمبر ۴ ، ۳۸۳ بابت اپریل ۱۹۳۳ء

۳۸؎ روح مکاتیب اقبال صفحہ ۳۹۷، ۳۹؎ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' صفحہ ۲۰۶ تا ۲۰۸

۴۰؎ روح روح مکاتیب اقبال ۲۰۸ (مفصل خط آگے درج ہے)

۴۲؎ ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۹ مرتبہ محمد عمران خان ندوی ،دارالعلوم ندوہ لکھنؤ ۱۹۴۶ء، ۴۳؎ آندھی میں چراغ صفحہ ۱۱۱۔مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی از خواجہ غلام السیدین

۴۴؎ کلیات اقبال (ضرب کلیم) صفحہ ۵۶۶ ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۷۵ء

۴۵؎ اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال)۔کتاب ۱۹۴۵ میں شائع ہوئی۔شائع ہوتے ہی اقبال کے بعض ''شیدائیوں'' نے جن میں چودھری محمد حسین قابل ذکر ہیں اس کی اشاعت روک دی۔انہوں نے اقبال کے متعدد خطوط میں تحریفیں کیں اور صفحوں کے صفحے بدل دیئے۔صفحہ ۳۸۷ میں بقول صاحب ''اقبال نامے'' اقبال نے اپنے بچوں کی گارڈین شپ میں لکھا تھا کہ چونکہ میرا بھتیجا شیخ اعجاز احمد قادیانی ہے اس لئے وہ شرعاً گارڈین نہیں ہوسکتا۔یہ پورا صفحہ بدل دیا گیا ہے۔میرے پاس اس کا ایک نسخہ

موجود ہے۔ اس کے تحریف شدہ صفحات جو بدل دیئے گئے ہیں۔ یہ ہیں:-

۴۷، ۴۸، ۱۰۵، ۱۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴،

۳۷۳، ۳۷۴، ۳۸۷

کتاب میں اقبال کے جو خطوط سیدین صاحب کے نام موجود ہیں ان کے دو صفحے ۳۱۷ اور ۳۱۸ بدل دیئے گئے ہیں۔ اقبال نامہ شیخ عطاء اللہ نے مرتب کیا اور شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے اسے شائع کیا۔

۴۶ مراد جاوید اقبال اور ان کی ہمشیرہ منیزہ

۴۷ تہذیب نسواں لاہور کا مشہور و معروف اخبار تھا جو خواتین کی تعلیم و ترقی کا ترجمان تھا۔ اس کی ایڈیٹر نامور ڈراما نگار اور صحافی سید امتیاز علی تاج کی بڑی بہن محمدی بیگم تھیں۔ وہ مولوی ممتاز علی ایڈیٹر تالیف و اشاعت لاہور کی صاحبزادی تھیں۔ محمدی بیگم ناول نگار بھی تھیں۔ ان کا ابتدائی ناول صفیہ بیگم ہے جس کا تفصیلی اشتہار مخزن لاہور جلد ۴ نمبر ۳ صفحہ ۳۹ بابت دسمبر ۱۹۰۲ میں چھپا تھا۔

۴۸ ان کا نام سید محمد مستحسن زیدی تھا۔ میرٹھ کے مشہور بیرسٹر تھے

۴۹ اس کا نام ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق''

۵۰ ''افسوس کہ یہ اندیشہ پورا ہوا۔ علامہ کتاب کی اشاعت سے پہلے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ البتہ کتاب کا خلاصہ جو میں نے ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا انہوں نے پڑھ لیا تھا اور اس کو پسند فرمایا تھا۔'' (سیدین)

۵۱ ''میں نے علامہ مرحوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ نکلسن نے اسرار خودی کے ترجمے میں ''صورت طفلاں زنے مرکب کنی'' کو غلط پڑھکر بجائے ''نے'' کا ترجمہ ''Reed'' کرنے کے ''ز'' کو اس کے ساتھ ملا کر ''زنے'' پڑھا تھا اور اس کا ترجمہ ''Woman'' کیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے بہترین مستشرقین'' (سیدین)

۵۲ سید راس مسعود۔ ۱۸۸۹ء میں علی گڈھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ میں میٹرک کیا اور سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور نیو کالج اکسفورڈ سے ۱۹۱۰ء میں بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ ضمیر نے یہ پیشہ گوارا نہیں کیا۔ ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں نظام حیدر آباد کے ناظم تعلیمات ہوئے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک بھوپال کے وزیر تعلیم

تھے۔ آپ سرسید کے پوتے اور سید محمود کے صاحبزادے تھے۔ راس مسعود مرحوم اقبال اور سیدین کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ ان کا انتقال ۳۰ رجولائی ۱۹۳۷ء کو علی گڈھ میں ہوا۔ اقبال نے اپنے کتبۂ مزار کے لئے ایک رباعی کہی تھی۔ لیکن ان سے پہلے ہی اچانک سرراس مسعود کا انتقال ہوگیا تو اقبال نے وہی رباعی ان کے کتبۂ مزار کے لئے مخصوص کی۔ رباعی یہ ہے۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل — زبند این وآں آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمِ چند — گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

اقبال نے مرحوم کے سکریٹری ممنون حسن خان صاحب کو یہ رباعی بھیجی تھی۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر صرف ایک ہی مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل شعر میرے خیال میں بہتر ہوگا۔

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں — خواب رامرگ سبک داں، مرگ راخوب گراں

اردو سہ ماہی جلد ۱۷ حصہ ۶۸ بابت اکتوبر ۱۹۳۷ (انجمن ترقی اردو ہند) مسعود نمبر پر مشتمل تھا رسالے کی ابتداء میں ''ڈاکٹر اقبال مدظلہ کی نظم'' (مسعود مرحوم) تین حصوں میں ۲۱ شعر میں چھپی ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگار کمالات احمد و محمود
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بیداری — فغانِ مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست — نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

''دے کہ عاشق وصابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است''

۵۳ ''اقبال کے فلسفۂ تعلیم'' کے متعلق ''توسیعی خطبات'' دیئے جانے کی تجویز بعض احباب نے پیش کی تھی۔'' (سیدین)

۵۴ ''تجویز یہ تھی کہ اقبال کے فلسفۂ تعلیم کے بارے میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ''توسیعی خطبات'' دیئے جائیں۔'' (سیدین)

طارق مطالعہ اقبال میں

اقبال شناس - طارق لاہوری

عرصہ ہوا کہ میں نے شیخ عبدالرحمٰن طارق لاہوری کی ایک کتاب ''پیام اقبال'' کا اشتہار اردو کے مشہور و معروف رسالہ ''زمانہ'' کانپور کے فروری ۱۹۳۸ء کے شمارے میں دیکھا تھا۔ جب سے میری خواہش رہی کہ اس کتاب کا مطالعہ کروں۔ ہمارے یہاں علم و ادب کا فقدان ہے اور کتب خانے اچھی اور مفید کتابوں سے خالی ہیں، اس لئے میں نے اقبال اکادمی اور دوسرے پاکستانی اداروں سے رجوع کیا کہ وہ طارق لاہوری کی اہم کتابیں فراہم کر کے دست تعاون بڑھا دیں۔ کئی لوگوں کو بھی لکھا، لیکن کہیں سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ مل سکا۔ انجام کار پاپڑ بیلتے بیلتے میں نے لکھنؤ کے کتب خانے چھان ڈالے اور یہاں میری امیدوں کے خلاف مجھے کامیابیاں نظر آنے لگیں۔ کیٹلاگ میں طارق کی متعدد کتابیں درج تو تھیں لیکن کچھ ضروری کتابیں میری دسترس سے باہر ہو چکی تھیں۔ اس لئے چند سال کے لئے یہ کام معرض التواء میں پڑا رہا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر ''پیام اقبال'' کے علاوہ مجھے طارق کی متعدد کتابیں لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری اور علامہ شبلی نعمانی کے بے نظیر کتب خانے سے دستیاب ہو سکیں۔

اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں طارق ایک جواں سال ماہر اقبالیات کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسا بلند شعور، بے مثال قوت فکر اور گوناگوں علمی سرمایہ سے مالا مال کیا تھا جس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ طارق کو عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ جس زمانے میں انہوں نے اقبال پر لکھنا شروع کیا اس وقت ان پر معدودے چند کتابیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن جس انداز فکر سے طارق نے اقبال پر تصانیف مرتب کیں ہیں وہ نرالا اور صبر آزما ہے۔ ان کا مطالعہ لامحدود اور قابل رشک تھا۔ انہوں نے اقبال کی جملہ تصانیف کو بالغ نظری سے دیکھا اور ایسے ایسے گوشے نکالے جو نہایت حیرت انگیز اور معلومات افزا ہیں۔ ان کی

تحریریں ولولہ انگیز، جوشیلی اور شعلہ بردوش ہیں۔ میری ناقص رائے میں طارق لاہوری پہلے ماہر اقبالیات ہیں جنہوں نے اقبالیات کے بحرِ بے کراں سے ایسے گوہر نایاب ڈھونڈ کر نکالے ہیں جن کا عملی تعلق دیکھنے اور پرکھنے سے ہے۔ طارق کثیر التعداد تصانیف کے مصنف ہیں۔ جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:-

(۱) پیام اقبال، مطبوعہ تاج کمپنی لمٹڈ لاہور ۱۹۳۸ء (۲) تفسیر خودی، مکتبہ یادگار اقبال لاہور ۱۹۴۰ء (۳) فلسفۂ خودی، مکتبہ یادگار اقبال لاہور ۱۹۴۰ء (۴) اقبال اور دختران ملت، مکتبہ یادگار اقبال لاہور ۱۹۴۰ء (۵) جہان اقبال، مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل بل روڈ لاہور ۱۹۴۵ء (۶) روح مشرق منظوم اردو ترجمہ پیام مشرق، اشاعت منزل بل روڈ لاہور (۷) حدیقۂ روم اردو منظوم ترجمہ زبور عجم، اشاعت منزل لاہور (۸) رموز فطرت منظوم اردو ترجمہ ارمغان حجاز، اشاعت منزل لاہور ۱۹۵۰ء (۹) معارف اقبال، اشاعت منزل لاہور (۱۰) جوہر اقبال، کتاب خانہ ملی لاہور ۱۹۵۵ء (۱۱) نکات اقبال (۱۲) تبرکات اقبال (۱۳) اقبال اور خدمت قرآن (۱۴) یادگار اقبال (۱۵) اشارات اقبال، کتاب منزل لاہور (۱۶) تقاریر و بیانات اقبال شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۲ء لاہور (۱۷) مثنویات اقبال، بزم اقبال لاہور (۱۸) اقبال کی طویل نظمیں

اگر چہ طارق کی آتش بیانی میں جذبات کی طغیانی بھی شامل ہے تاہم ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ابھی تک لوگوں نے ان کا پیغام سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

طارق کی سبھی کتابوں پر میرے لئے رائے زنی کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ذیل میں چند کتابوں کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

(۱) **پیام اقبال** ـــــ کتاب نہایت اہم ہے۔ اس کی ابتداء میں ماہر ریاضیات اور اردو کے باکمال اور علامہ اقبال کے پرانے دوست خواجہ دل محمد[1] تخلص دل پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

---

[1] خواجہ صاحب نے علامہ اقبال کی تاریخ وفات اس طرح کہی تھی

کون لائے گا اب پیام سروش — اے دلؔ! اقبال ہوگیا خاموش
شمع خاموش سال ہجری ہے — عیسوی "شمع شاعری خاموش"

۱۳۵۷ھ — ۱۹۳۸ء

کا دیباچہ ۳۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ خواجہ کے چند اقتباسات یہ ہیں:-

''اقبال دور حاضر کا با کمال شاعر ہے۔ جس کی شاعری صنف شاعری نہیں بلکہ ایک مقصد عظیم کی حامل ہے۔ وہ شاعر ہے۔ اس کے حرف حرف میں رنگینیاں مسکراتی ہیں اور لفظ لفظ میں رعنائیاں جھلکتی ہیں۔ کہیں اس کی حساس طبیعت حسن کی پیامبری کرتی ہے۔ کہیں اس کا پاکیزہ تخیل فطرت کے اسرار تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ فلسفی ہے جو راز نہاں ہستی کی جھلک دکھا کر تجلی خانۂ دل کو منور کرتا ہے اور تخیلات کی لامحدود جالانیوں سے عالم بالا کی پرواز دکھاتا ہے۔ فنا و بقا کے معمے، حیات و ممات کے کرشمے، نیرنگ شہود، جلوہ ہائے شاہد و مشہود، اس کی طبع روشن کے سامنے آئینہ ہیں۔ وہ مصلح ہے، اس کی صدا نوا ریز اور نوا دردانگیز ہے۔ اس کا پیام پیام حیات ہے۔ اس کے اشک، جگر زاد، وہ تابدار موتی ہیں، جن کی قیمت گوہر شناسان عالم کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ شاعر انقلاب ہے، جو الفاظ کی دل نشینی اور معانی کی جگر تابی سے گولہ بارود کا کام لے کر طبائع میں ایسا ہیجان پیدا کرنا چاہتا ہے، جو غلاموں کو آزاد اور خاکساروں کو تاجور بنا دے۔ وہ قرون اولیٰ کی سادگی اور صدق خلوص کا فریفتہ ہے اور نوجوانوں کو فریب مغرب کی تباہ کاریوں سے بچانا اور تصنع سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔

شیخ عبدالرحمن صاحب طارق ملک کے وہ نوجوان اور ہونہار فرزند ہیں جنہوں نے صانع ازل سے کسب فیض اور ادراک معانی کے لئے قابل دماغ پایا ہے۔ ان کی موجودہ تصنیف یعنی ''پیام اقبال'' کو میں نے جستہ جستہ دیکھا ہے۔ شاعر نے اپنے کلام میں لامحدود ذخائر کو ڈھیر کر دیا ہے لیکن جناب طارق نے ان ذخائر کو ایک ضابطہ اور دعوت عمل، فلسفۂ ہجر، تجدید آرزو، وطنیت، اخوت اسلامیہ، مساوات، تہذیب حاضر اور حقیقت موت و حیات وغیرہ اس قسم کے عنوانات ہیں جن کے متعلق اقبال نے اپنی فارسی اور اردو تصانیف میں مختلف مقامات پر مختلف اشعار کہے۔ لیکن یہ مہم قابل صد تحسین ہے کہ ان اشعار تابدار کو مسلسل غور و خوض کے بعد عنوانات مختلفہ قائم کرتے ہوئے جناب طارق نے ایک باضابطہ اور منظم شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے لئے محنت شاقہ اور کاوش کی ضرورت تھی، یہی ایسا طریقہ ہے جس سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اقبال کے وہ کون کون سے مخصوص اور معرکتہ الآرا جذبات و احساسات ہیں جن کا اظہار اس نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں کیا ہے اور جنہیں وہ قوم کے فکری، عملی یا معاشرتی پہلوؤں کی اصلاح کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال جیسے مشکل پسند اور دقت نگار فلسفی کو سمجھ کر اس کے کلام کا ایسا بصیرت افروز تعارف باشندگان ہند کے سامنے پیش کرنا بجائے خود غیر معمولی ہمت کا کام ہے۔ ان کا جدید رنگ اور تشریحی مثالوں کی موزونیت اور برجستگی واقعی اس قابل ہے کہ اسے

بہ نظر استحسان دیکھا جائے۔''

دیباچۂ دل کے بعد انیس مضامین کی فہرست ہے۔ پھر صفحہ ۱ اور ۲ میں طارق ''خالق موجودات کو فکر تھی'' کے تحت لکھتے ہیں:-

''روز ازل خالق موجودات کو یہ فکر تھی کہ کائنات کا اتنا عظیم الشان سلسلہ قائم کرنے کے بعد اگر کوئی شے وجود میں نہ لائی گئی جو میری تمام صفات کی ترجمان ہونے کے علاوہ روح میں فرحت، طبیعت میں جودت، مزاج میں گرمی، احساس میں صداقت، نظر میں تنویر اور باہمی تعلقات میں محبت والفت پیدا کرنے کا باعث ہو۔ تو بیچارے انسان زندگی کی حقیقی لطافت سے محروم رہ جائیں گے۔ چنانچہ اسی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے شعاع آفتاب سے حرارت لی، چاند سے خنکی اور تنویر کا عنصر مہیا کیا۔ برق سے تڑپ اور بے قراری مانگی، ستاروں سے تبسم حاصل کیا، آبشاروں سے موسیقی پائی، زلف سے پیچیدگی اور لچک حاصل کی، باغ ارم کے شگفتہ چمن سے تازہ بتازہ کھلے ہوئے پھولوں کی نکہت اخذ کی۔ شفق سے رنگینی لی، لالے سے داغ جگر مانگا، شبنم سے رفعت پرواز کا اشارہ پایا۔ شباب سے امنگ، اور کسی حسین کے پیکر جمال سے شعریت حاصل کی، خرام ناز سے ارتعاش اور حیرت کے ضروری تاثرات پیدا کیے اور ان تمام چیزوں کے اجزائے ترکیبی سے جو شے تیار ہوئی اسے ''شعر'' کا برگزیدہ خطاب عطا کیا گیا۔

شعر آدم کے حق میں خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ شعر نہ ہوتا، تو حیات انسانی کیف و وجداں سے بالکل عاری ہوتی، پھول مرجھا جاتے، سبزہ زار جل کر راکھ ہو جاتے، پرندوں کو نغمہ سرائی کی بجائے اداسی لگی رہتی۔ آبادیاں ویران و برباد دکھائی دیتیں اور انسان اس کے بغیر بجائے خود وحشت و بربریت کی زندگی بسر کرتے، شعر آدم کے حق میں خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔''

صفحہ ۳ سے ۱۴ تک طارق کا ایک پر مغز مضمون ''حمد و ثنا'' کے عنوان سے ہے۔ حاشیہ میں یہ عبارت ہے:-

''یہ حمد و ثنا ایک ایسے انوکھے انداز میں لکھی گئی ہے کہ ناظرین اسے دیکھکر شاید متعجب ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ لیکن آپ حضرات کو یاد رہے کہ اس میں تعجب کے ساتھ صداقت اور واقعیت کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا گیا۔ بنی آدم کی غیر متناہی قوتوں کا ذکر ہے اور اس میں مبالغہ کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ اکثر جگہ بیان گو شکایت آمیز ہے، لیکن اس شکایت میں بھی انس والفت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جرأت اور حوصلہ افزائی کی رو سے بھی تلقین و تادیب کا اس سے بہتر پیرایہ ناممکن تھا۔''

ذیل میں ہم ''حمد و ثنا'' کے چند جملے طارق کی زبان سے درج کرتے ہیں:-

''اے آسمانی بادشاہ! میں تیرا شکریہ کیونکر بجالاؤں کہ تو نے اپنی ہیبت اور جلال سے ہمیں

زندگی کی حقیقت بخشی!

اے خدا! رحم بے شک ایک اچھی شے ہوگا۔ لیکن میں تو تیرے قہر کو اس سے بھی کہیں زیادہ مفید پاتا ہوں! لوگ تیری طرف سے نرمی اور محبت کی تلاش کرتے پھرتے ہیں لیکن میں سختی اور تشدد کا خواہاں ہوں! میرے نزدیک تیرا غصہ اور غضب تیری شفقت سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔

لوگ بجلی کی کڑک سے سہم جاتے ہیں، حالانکہ میں اس وقت بے اختیار ہنس دیتا ہوں اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ایک گم گشتہ شے پھر سے میرے ہاتھ لگی ہے۔

لوگ ہلال عید کو دیکھکر مسرت سے پھولے نہیں سماتے لیکن میں جس چیز کو دیکھکر مطمئن ہوتا ہوں وہ تیرا اعریاں اور غضبناک "خنجر"۔

میرے حال پر مہربانی فرما، اور ان بھیڑیئے کے بچوں سے مجھے محفوظ رکھ۔ گیدڑوں کو مجھ سے دور لے جا، جو چیز میرے دل کو زندہ اور بیدار رکھتی ہے، وہ بھرے شیروں کی لرزا دینے والی گرج ہے۔ اس لئے میری کھیل کود کے لئے تو فقط شیروں کی ٹولیاں فراہم کر۔

پہاڑوں کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ تیری تمام پیدا کردہ مخلوق، یہ زمین، یہ آسمان، یہ دریا اور یہ فضا، ان میں آباد رہنے والی جملہ اشیا اور ایسی ایسی سیکڑوں دنیائیں میرے گوشۂ دل میں ایک نقطہ پرکار کی طرف "محو" ہوگئی ہیں!

پس اے خدا! اے مرے محسن اور مہربان آقا! اگر تو زندہ ہے تو فقط میرے خون کی حرارت سے اور اگر تیری ہستی کو تسلیم کیا جاتا ہے تو وہ بھی میرے یقین اور استقلال سے

اس لئے میری آخری فریاد کو سن اور وہ یہ ہے کہ تو ہر دوسری چیز کو فراموش کردے، بنی آدم کو اسی شوق اور اسی وقار کے ساتھ دیکھ جو اس کے لئے سزاوار ہے، فرشتوں میں بھی اس کی عظمت اور اسی کی ناقابل تسخیر قوت کا اعلان۔ یہ ناز تیرے لئے سب سے اچھا ہے، اسی سے تیری زیبائش ہوگی۔ حوروں کے دل اور شہدا کی روحیں اس نغمے کو سن کر سیراب ہوجائیں گے۔ میری بن آئے گی اور تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

کتاب کا شاندار دیباچہ (صفحہ ۱۵-۳۰) آتش بیانی کا مظہر ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اقبال کی شاعری کو آج تک پڑھا تو بہتوں نے ہوگا۔ اس کی جا بجا تعریف بھی ہوئی ہوگی اور اس کی عظمت کو جلسوں اور محفلوں میں بڑی گرم جوشی سے تسلیم بھی کیا ہوگا۔ لیکن یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ لوگ اقبال کی مصلحانہ اور پیغمبرانہ شان سے اب تک بے خبر ہیں۔ نہ صرف بے خبر ہیں بلکہ وہ اس تعلیم کے عملی اور اخلاقی مقاصد کا تجزیہ بھی نہیں کرسکے۔

اقبال حقیقت میں ''دنیا'' کا شاعر ہے۔ اس کا وطن صرف ہندستان ہی نہیں، بلکہ تمام روئے زمین ہے۔ وہ اپنی تعلیم اور اپنے فیض کے لئے کسی خاص قوم کو ہرگز مخصوص نہیں کرتا، بلکہ اس کا خطاب بنی نوع انسان کی طرف ہے۔ وہ ایک ایسا معدن، ایک ایسا دریا ہے، جسے کوئی بھی کھودے، یا کوئی بھی اس میں غوطہ زن ہو، وہ بے تکلف اپنے موتی اور جواہرات اس کی جھولی میں اگل دے گا۔ وہ ایک ایسا آفتاب ہے جس کی روشنی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی قسم یا کسی گروہ کا امتیاز نہیں کرتی۔ وہ ایک ایسا چشمہ ہے جو سب کو یکساں طور پر سیراب کرتا ہے۔ الغرض وہ بخیل اور تنگ دل نہیں، بلکہ سخی اور فیاض ہے۔ چنانچہ اس کے تاثرات کا ایران، توران، افغانستان، ترکی اور روس وغیرہ سے گذر کر انگلستان، جرمنی اور فرانس تک پہنچ جانا اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس کی تعلیم اپنے عملی اور اخلاقی فوائد کے پیش نظر بنی نوع انسان کے لئے مشترکہ طور پر مفید اور سود مند ہونے کی کس قدر صلاحیت رکھتی ہے۔

لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ محض اس وجہ سے ہے کہ اقبال فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالاتر رہتے ہوئے، فطرت ہی کو اپنے تمام بیانات کا واحد معیار قرار دیئے ہوئے ہے۔ اور فطرت ایک ایسی من بھاتی شے ہے، جس سے دنیا کے کسی فرد کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑ پڑنا اور ان جھگڑوں کو طول دے کر قیامت سے جاملانا، آج کل کے ملاؤں، جاہل صوفیوں، پنڈتوں اور غیر ذمہ دارانہ پادریوں کو مبارک ہو، جو شخص دنیا والوں کو فلاح و بہبود کا راستہ بجھانے والا ہو، اس کی شایان شان نہیں کہ وہ ان بیہودہ اور پست چیزوں میں حصہ لیتا پھرے۔

اقبال تو یہ کہتا ہے کہ بجائے نرمی اور گوسفندی کے مضبوطی اور استحکام کا سبق سیکھو۔ جو مزا شیر کی طرح سینہ سپر ہونے میں ہے وہ مزا لومڑی کی طرح سر نیوڑھا کر بیٹھ رہنے یا گیدڑ کی طرح دم دبا کر بھاگ جانے میں نہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری ست
دلبری با قاہری پیغمبری ست

وہ ہمیشہ رومی کے اس فرمان کو پیش نظر رکھے ہوئے ہے کہ۔

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

وہ ہمیں سکھلاتا ہے کہ دنیا میں ترقی اور کامیابی ہمیشہ محنت اور کوشش سے حاصل ہوتی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے رہنے سے نہ آج تک کچھ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس کی نظر کتاب مقدس کے اس زرین اصول پر

ہے"لیس للانسان الا ما سعیٰ" یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جسے وہ اپنی محنت سے پیدا کرے۔ اس کی تعلیم ہر جگہ اپنی یہی جگمگاہٹ اور یہی صدائے حیات پیدا کرتی ہے کہ"لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین" نہ ست ہو اور نہ کسی طرح کا خوف کھاؤ، کیونکہ اگر تمہارے یقین و ایمان میں قوت اور مضبوطی ہے تو تم ہمیشہ کے لئے سرفراز اور کامران رہو گے۔ پس یہی ہے وہ حیات افروز پیغام جسے اقبال نے جگہ بہ جگہ بیان کیا، جس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔

اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ میں اقبال کو آج ایک سرسری نظر کے بعد آپ حضرات کی خدمت میں پیش نہیں کر رہا، بلکہ یہ گذشتہ دس سال کے مسلسل غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے، جو"پیام اقبال" کے نام سے مزین ہو کر آپ کے سامنے آیا ہے۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ بغیر کسی بصیرت اور مطالعہ کے جو چیز پیش کی جائے، وہ ہمیشہ ناقص اور ناکارہ ثابت ہوتی ہے اور اس سے اس کا پیش نہ کرنا بدرجہا اچھا ہے۔"

---

(۲) روحِ مشرق ـــــ یہ علامہ اقبال کی مشہور کتاب"پیام مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ کتاب پر کہیں سال اشاعت درج نہیں ہے۔ کتاب کا پیش لفظ نشتر جالندھری کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مترجم کا دیباچہ بارہ صفحوں (ہ تا غ) پر مشتمل ہے۔ طارق صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"شاعر مشرق نے"پیام مشرق" کی بنیاد اس احساس کے تحت رکھی تھی کہ مغرب کی"سرد روحانیت" کو مشرق کے"سینۂ گرم" سے کچھ پرسوز نالے اور نغمے عطا کئے جائیں تاکہ وہ محض مادی پرستی سے اجتناب کر کے اپنی روحانی زندگی کی تجدید و اصلاح بھی کر سکے۔ علامہ اقبال کو یورپ کی اس بڑھتی ہوئی روحانی تشنگی کا اندازہ یوں تو وہاں کے متعدد صاحب بصیرت مصنفین کی تحریروں سے ہوا۔ لیکن ان کی خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز گوئٹے بالخصوص عالم پیری میں جب گوئٹے کی عمر ۶۵ سال کی تھی اور اس کے افکار و احساسات زندگی کی معنوی ضروریات کے متعلق بہت پختہ ہو چکے تھے، اسے دیوان حافظ کا مکمل ترجمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ حافظ کا کلام چونکہ تصوف و معرفت کے عناصر سے وجد انگیز حد تک معمور ہے، لہٰذا گوئٹے مشرق کی روحانی عظمت و فوقیت کا تہہ دل سے قائل ہو گیا۔ چنانچہ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل سوشکی لکھتا ہے:-

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی، اسے کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری ہی روح حافظؔ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعت مشرب، وہی

کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرض ہر بات میں ہم اسے حافظؔ کا مثیل پاتے ہیں جس طرح حافظؔ ''لسان الغیب'' و ''ترجمان اسرار'' ہے۔ اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراج تحسین وصول کیا، دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (حافظؔ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی و بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھکر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔''

پس یہ کلام حافظ کا پیدا کردہ ذوق تھا، جس کے تقاضے سے گوئٹے نے فارسی کے بعض بعض دیگر ممتاز اساتذہ شعر کے کلام کا بھی مطالعہ کیا۔ چنانچہ ایک مقام پر اپنے آپ کو عالم خیال میں ایک ایرانی شاعر تصور کرتے ہوئے جسے جرمنی میں جلاوطن کر دیا گیا ہو، وہ رقمطراز ہے:۔

''اے فردوسیؔ! اے جامیؔ! اے سعدیؔ! تمہارا بھائی زندان غم میں اسیر شیراز کے پھولوں کے لئے تڑپ رہا ہے۔''

گوئٹے کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ وہ آخری عمر میں قرآن مجید کے جرمن ترجمے کو بکثرت مطالعہ کیا کرتا تھا اور اس کتاب مقدس کی روحانی، اخلاقی اور تعمیری عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ آخر ان چیزوں کی عقیدت و محبت نے ایسی نظموں کی صورت اختیار کی جن میں گوئٹے فی الواقع مشرق کے سینے سے روحانی حرارت کا متلاشی دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس مبارک تقاضے کی قدر و منزلت کو کماحقہ سمجھا اور ''پیام مشرق'' کے عنوان سے ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جس میں یورپ کی روحانی پیاس کو بجھانے کا موثر ترین اور موزوں ترین مواد موجود ہے! اگر ایسی تمام نظموں کا حاصل و جوہر نکالا جائے جو علامہ مرحوم نے خصوصاً اہل یورپ سے خطاب فرما کر تحریر کی ہیں، تو وہ مختصراً یہ ہوگا کہ محض ''عقل'' کی غلامی سے نجات پا کر ''عشق'' سے باطنی فیوض حاصل کرو۔ عقل صرف مادیات میں محصور ہے، ظواہر کی پرستار ہے۔ تنقید اور منطقی استدلال کی خوگر ہے۔ حالانکہ عشق (بمعنی ''ایمان'') اپنے یقین و اذعان کی قوت سے افکار و اعمال میں ''مرکزیت'' پیدا کر کے دل کو کامل اطمینان عطا کرتا ہے اور انسان میں استقلال کی ناقابل تسخیر صفات پیدا کر دیتا ہے۔ جن سے اس کی ''جرأت رندانہ'' ایسے ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیتی ہے جو اوراق تاریخ کے لئے باعث فخر و مباہات ہیں۔ چنانچہ عشق و عقل کے متعلق جملہ مباحث کا خلاصہ ''پیام مشرق'' کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو۔

دانش اندوختۂ، دل ز کف انداختۂ ‏ ‏ ‏ آہ! زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختۂ

چارہ این است کہ عشق کشادے طلبیم | پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دوعالم با اوست | نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

پس اقبال کے نزدیک یورپ کی روحانی اور اخلاقی تجدید صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی عقل غلام ہوا وہوس کی بجائے ''ادب خوردۂ دل'' ہو۔ اور اقبال دل کو ''دل'' تسلیم ہی نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ سوز عشق (جذبۂ ایمان) سے کلی طور پر معمور نہ ہو۔ اسی بنا پر محروم عشق ''مسلمان'' تک کا لحاظ نہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو، تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

پس میں نے امت مسلمہ کے لئے ''پیام مشرق'' کی چند در چند تعمیری خصوصیات کو مدنظر رکھکر اسے اردو نظم میں منتقل کرنا نہایت ضروری سمجھا۔ یوں تو اس کتاب کی ہر چھوٹی سے چھوٹی نظم ایک عظیم الشان روحانی یا اخلاقی پیغام کی حامل ہے۔ تاہم میرے نزدیک ''رباعیات'' کا حصہ افادی و اصلاحی لحاظ سے نہایت ضروری حصہ ہے۔ ہر رباعی میں حکمت و موعظت کے انقلاب انگیز دریا موجزن ہیں، جو ہر گام پر ہمیں بھی دعوت دیتے چلے جاتے ہیں کہ۔

ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور

مگو کہ زورق ما آشنائے دریا نیست

باقی رہی نفس ترجمہ کی بحث، تو اس کے متعلق اساتذۂ فن نے چند بنیادی اصول وضع کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) ترجمے میں مصنف کا حقیقی مفہوم و مقصد بالکل فوت نہ ہو۔

(۲) ترجمے کے الفاظ میں ایسی افراط و تفریط نہ ہو جس سے اصل مفہوم کہیں مسخ ہوتا ہوا دکھائی دے۔

(۳) ترجمے میں اصل تصنیف کا زور واثر پایا جائے اور وہ کہیں سے بھی غیر فصیح، پھسپھسا اور بے جان معلوم نہ ہو

(۴) اور سب سے بڑھکر یہ کہ ترجمہ اپنی چستی، بندش، موزونی الفاظ، حسن ترتیب اور نغمۂ صوتی کی بنا پر ''ترجمہ'' نہیں بلکہ ایک اصلی تخلیق۔

قارئین اس ترجمے کو ایک ''تحت اللفظ'' ترجمہ ہرگز تصور نہ فرمائیں۔ یہاں مکھی پر مکھی مار کر مطالب و معانی کو محض طلسم الفاظ پر قربان نہیں کیا گیا۔ یہ ایک ''آزاد'' ترجمہ ہے جس میں شاعر کے اصل مفہوم و مدعا کو زیادہ واضح اور بسیط صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

بالآخر مجھے سب سے زیادہ خوشی اس چیز کی ہے کہ میں نے فارسی زبان سے ناواقف حضرات کے لئے "پیام مشرق" کو اپنی ملکی زبان یعنی اردو کا لباس جمیل پہنا کر روح اقبال کو ایک بڑی حد تک مسرور کیا ہے اور یہی چیز میری محنت و کاوش کا عظیم ترین صلہ ہے۔"

(۳) جہان اقبال —— کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں لاہور میں شائع ہوئی تھی اور اقبالیات میں نہایت مفید کتاب کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مصنف کتاب کی ابتداء میں "دوام" کے تحت لکھتا ہے:۔

"اقبال کو کسی ایک دور کا شاعر سمجھنا غلط ہے۔ اقبال کا کلام دائمی اور ابدی چیز ہے۔ جب تک انسانی تسکین باقی ہے تب تک انسان کی عظمت و قوت بنانے والا یہ سرمدی پیغام بھی باقی ہے۔ جس طرح خدا کی فطرت غیر فانی ہے اسی طرح اقبال کا کلام بھی غیر فانی ہے۔ کیونکہ وہ "فطرت" کے اسرار کو بے نقاب کرنا اور نسلی تعصب سے پاک رہ کر آدمی کو آدمی کا احترام سکھاتا ہے۔"

کتاب میں درج ذیل مضامین ہیں:۔

اقبال اور نطشے، اقبال اور رومی، اقبال کا مقام خودی، اقبال کا نظریہ فقر، اقبال کا معیار ایمان و مومن، اقبال اور دین وسیاست، اقبال کا تصور زمان و مکان، اقبال اور فنون لطیفہ، اقبال اور سیاست عالیہ، اقبال کا تصور ابلیس، اقبال کا فلسفۂ شاہین، اقبال کی نظر میں عورت کا مقام، اقبال اور مسئلہ تقدیر، اقبال بحیثیت ایک ادبی مصور، اقبال کی غزل گوئی، نظریات اقبال، اقبال کی پیشین گوئی، اقبال کا غیر مطبوعہ کلام۔

بہت لوگوں نے "جہان اقبال" سے اپنی کتابوں میں استفادہ کیا لیکن طارق کا کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا۔ غالباً طارق پہلے شخص تھے جنھوں نے اقبال کے غیر مطبوعہ کلام کو دریافت کیا تھا۔ بعد میں جن لوگوں نے کلام اقبال جمع کیا اور پھر اس کو "باقیات اقبال" یا دوسری کتابوں کے نام سے شائع کیا انھوں نے طارق کا حوالہ نہیں دیا۔ ذیل میں "جہان اقبال" کے حوالے سے اقبال کا کچھ نایاب کلام درج کیا جاتا ہے۔

قصیدۂ معراجیہ

ہر دو جہاں میں ذکر حبیب خدا ہے آج
ہر ذرے کی زباں پہ صل علیٰ ہے آج

معراج مصطفیٰ سے کھلا عقدۂ حیات
روح نبیؐ میں جلوۂ روح خدا ہے آج

"قوسین" میں ثبوت ہے اس جذب و شوق کا
ہر لمحہ ذکر و فکر میں درس بقا ہے آج

وہ بزم ناز وہ گل و بلبل کی خلوتیں
الفت میں امتیاز من و تو فنا ہے آج

اک جست ہی میں طے ہیں وہ عالم کی وسعتیں
اور رشتۂ زمان و مکاں کٹ گیا ہے آج

طائر حریم قدس کے سب نغمہ سنج ہیں
روح الامیں بھی شوق میں مدحت سرا ہے آج

جو منتظر ازل سے تھا اس قدوم کا
بہر نبیؐ وہ گنبد پے در کھلا ہے آج

حوریں خوش آمدید پکاریں بہشت میں
از فرش تا بہ عرش صدا مرحبا ہے آج

یہ رات وہ ہے جس پہ کرے رشک دن کا نور
سایہ ہر ایک سایۂ بال ہما ہے آج

عشق نبی میں قبلہ نما سے ہوں بے نیاز
نور یقیں سے قلب ہی قبلہ نما ہے آج

اقبال آ کہ پھر اسی چوکھٹ پہ جھک پڑیں
آغوش رحمت اس کی اسی طرح وا ہے آج

غزلیات

چشم باطل پہ عیاں جوہر ایماں کر دے
دے کے ذروں کو جلا مہر درخشاں کر دے

دور پھر آیا ہے مسلم کی جہانبانی کا
دفتر کفر کو دنیا میں پریشاں کر دے

عام کی عقل نے یاں وہم و گماں کی ظلمت
شمع ایماں کو سینوں میں فروزاں کر دے

ہے محبت میں وہ قوت کہ بنے سنگ بھی موم
حسن اخلاق سے کافر کو مسلماں کر دے

ذرے ذرے کو بنا وسعت صحرا کا امیں
جوش توحید سے ہر قطرے کو طوفاں کر دے

پردۂ جہل اٹھا اپنی خودی سے غافل
اس کی پوشیدہ خدائی کو نمایاں کر دے

عہد حاضر ہے جہنم تو مسلماں ہے خلیل
نور ایقان سے آتش کو گلستاں کر دے

خوف شر کیوں ہو اگر خیر ہے مقصد تیرا
تیری تسخیر تو ابلیس کو لرزاں کر دے

دل کو مایوس نہ کر رحمت حق سے اقبال
مرغ افسردہ کو پھر اپنے غزل خواں کر دے

دل ترے شوق میں جب درد سے بیتاب ہوا
اشک جو آنکھ سے ٹپکا در نایاب ہوا

جوش ایماں دکھاؤں تو الٹ دوں یہ جہاں
دل نہ سینے میں ہوا قطرۂ سیماب ہوا

عقل کی فوج نے ہر جنگ میں منہ کی کھائی
عشق میداں میں، آیا تو ظفریاب ہوا

کر نہ تقدیر کے شکوؤں سے خودی کو رسوا
بہر تدبیر عیاں عالم اسباب ہوا

تیرے پرتو سے ہے ہر چیز میں نور عرفاں
گلشن دہر تیرے حسن سے شاداب ہوا

قلب انساں سے چلی آتی ہے فطرت کی صدا — خود کو جو جان گیا، سمجھو خدا یاب ہوا
اس کی اک ضرب سے ہو زلزلہ طاری ہر سو — زور مسلم نہ ہوا خیال ہوا خواب ہوا
کون جانے کہ قلندر ہے شہنشاہ جہاں — فرش خاکی بھی مجھے فقر میں کمخواب ہوا

جو ضرورت ہوئی بس کہہ لی خدا سے اقبالؔ
میں نہ تکلیف میں شرمندۂ احباب ہوا

جہاں زندگی ہے وہاں آرزو ہے — جہاں آرزو ہے وہاں جستجو ہے
نہ ہو جستجو تو ہے ویرانہ عالم — تری جستجو ہی تری آبرو ہے
نظر جب سے تیری نظر سے ملی ہے — جسے دیکھتا ہوں وہی خوبرو ہے
مٹاتے ہیں الفاظ معنی کی شوکت — مرے بے زبانی مری گفتگو ہے
تری آرزو سے ملی وہ قناعت — نہ کوئی ہوس ہے نہ کچھ آرزو ہے
خودی نے عطا کی مجھے خود شناسی — مرا حسن دائم مرے روبرو ہے
نمایاں ہے کثرت میں وحدت کا جلوہ — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

وہ کیا شے ہے اقبالؔ سینے میں تیرے
فرشتوں میں ہر دم تری گفتگو ہے

نور توحید سے گر قوت بیدار ہے تو — اپنی قسمت کا یہاں آپ ہی مختار ہے تو
حق کے ہوتے ہوئے باطل سے ہراساں کیوں ہے — گردن کفر پہ چلتی ہوئی تلوار ہے تو
تری ہستی ہی پہ موقوف ہے نظم عالم — دست قدرت کا بنایا ہوا شہکار ہے تو
ذرے ذرے میں جلا ہے تری تکبیروں سے — ظلمت دہر میں اک مطلع انوار ہے تو
ہو یقیں مردہ تو سگ تجھ سے ہے بہتر سو بار — ہو یقیں زندہ تو پھر حیدر کرار ہے تو

حق ہی کہہ حق ہی نے قوموں کو ابھارا اقبال
حق ہے سینے میں ترے مخزن اسرار ہے تو

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام — سیر اس باغ کو کر باد سحر کی صورت
نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام — زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت

یہ تو بتلا دے موذن کہ تری آنکھوں سے — کیا مروت بھی گئی خواب سحر کی صورت
جوش زن بحر محبت تھا مگر دل اپنا — صاف نکلا نگہ دیدۂ تر کی صورت
دہر میں ذوق سکوں تجھکو ہے پیغام فنا — تازہ رکھ جوش سفر شمس و قمر کی صورت
ضرب شمشیر حوادث سے نہ کھو قوت ضبط — سخت و خوددار ہو دنیا میں سپر کی صورت
ہے گل و لالہ کی ہیئت تو انہیں سی لیکن — ان میں پر سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدف دل سے گہر کی صورت

حقیقت میں روح ابد ہے زمانہ — یہ امروز فردا ہیں تیرا فسانہ
نہ ہو جب تلک دل میں ایمان کامل — تو خود بھی فسانہ، خدا بھی فسانہ
خودی کی حفاظت کوئی مجھ سے سیکھے — غریبی میں انداز ہیں خسروانہ
فرنگی کی دنیا فسوں سامری کی — ادا دلبرانہ، عمل شاطرانہ
سزا پانے والی ہے یورپ کی غفلت — کہ فطرت بھی رکھتی ہے اک تازیانہ
نہ ہو گر یقیں دیکھ لے سر جھکا کر — ترے دل میں ہے دفن تیرا خزانہ
سفر میں نہ منزل کا رکھ کچھ تخیل — جلا دے کسی برق سے آشیانہ
کوئی مرد مومن جگا دے یہ بستی — طریقے ہیں مشرق کے سب راہبانہ
پتنگے ہیں نابود اور شمع گریاں — ہوئی ختم حسرت یہ بزم شبانہ

سکھاؤ اب اقبال کچھ قاہری بھی
بہت کہہ چکے قصۂ عاشقانہ

مکافات عمل

ہر عمل کے لئے ہے رد عمل — دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شہر سے آسمان لیتا ہے — انتقام غزال و اشتر و میش
سرگذشت جہاں کا سرِ خفی — کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش

"شمع پروانہ را بسوخت ولے"
زود بریاں شود بروغن خویش"

(۴) **جوہر اقبال** ـــــ طارق لاہوری کی یہ کتاب بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کی مجھے عرصے سے تلاش تھی اور آخر کار اتفاق سے اس وقت دستیاب ہو سکی جب مضمون پایۂ تکمیل ہو چکا تھا۔ کتاب میں بقول مصنف حکیم الامت علامہ اقبال کے چند ایسے رفیع الشان اور معرکۃ الآرا موضوعات فکر و نظم کی تفصیل سے تشریح و توضیح کی گئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح میں ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب میں درج ذیل مضامین ہیں:-

۱-اقبال کا درس توحید ۲-اقبال اور عشق رسولؐ ۳-اقبال اور مذمت تقلید ۴-اقبال کی حکمت یقین ۵-اقبال اور سرمایہ ومحنت ۶-اقبال کا درس حریت ۷-اقبال کی حکمت آرزو ۸-اقبال کا فلسفۂ ہجر و فراق ۹-اقبال کا فلسفۂ خطر ۱۰-اقبال کا فلسفۂ تخریب و تعمیر ۱۱-اقبال کی حکمت "لا و الاّ" ۱۲-اقبال کا فلسفۂ سخت کوشی۔

جوہر اقبال کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد و اعمال کی اصلاح و رہنمائی کے لئے نہایت اہم موضوعات منتخب کرتے ہوئے علامہ اقبال کے فارسی و اردو کلام سے بہترین اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور ہر موضوع پر ایسی مدلل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ اقبالیات کا طالب علم ورطۂ حیرت میں پڑ تا ہے۔ بقول مرتب کتاب اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ مفہوم حریت، عظمت حریت اور مفادات حریت کی وضاحت میں وقف ہو رہا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو روز ازل سے جو عقائد و اصول اور جذبات و احساسات مقدسہ عطا کئے گئے ہیں ان کے پیش نظر "آزادی" ان کا فطری حق ہے "جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے۔ بالفاظ دیگر "مسلمان" اور "غلامی" اجتماع الضدین کا حکم رکھتے ہیں۔ جو کسی طرح ممکن ہی نہیں، جس طرح آگ اور پانی، نور اور ظلمت، رات اور دن، حق اور باطل، خیر اور شر، تقویٰ اور فسق، توحید اور شرک، سچ اور جھوٹ، عدل اور ظلم، نیکی و بدی، اخلاص و نفاق، محبت اور نفرت ایک جگہ نہیں ہو سکتے۔ عین اسی طرح "مومن" اور "غلامی" کا اجتماع بھی ایک امر محال ہے۔ "مومن" ہی کا دوسرا نام "انسان" ہے۔ جو "انسان" نہیں ہے اسے "مومن" کہنا انتہائی حماقت ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی نسل اور انسانی شکل و ہیئت میں پیدا ہو کر بھی "مومن" نہ ہونا مقام انسانیت کی بدترین تذلیل و تحقیر ہے۔ پس صحیح انسانی صفات و اخلاق مجموعہ ہی "مومن" کہلانے کا مستحق ہوگا۔ حسب آیات قرآنی اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ" یا "نائب" اپنے ہم جنسوں یا اپنے سے بدتر لوگوں کی غلامی

ومحکومی میں زندگی بسر کیوں کرے؟ کیا ''اشرف المخلوقات'' کا مرتبہ ومقام یہی ہے کہ وہ بہائم کی مانند چند ظالم ومستبد لوگوں کے جوئے تلے اپنی گردن کو زخمی کرتا رہے۔ کیا امانتدار دستور الٰہی ہوا و ہوس گروہ کے خود ساختہ چنگیزی قوانین کا پابند ہو؟ کیا وہ خلاصۂ کائنات وہستی جو صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے ''احسن تقویم'' (آیت ''ہم نے انسان کو ظاہری و باطنی وجسمانی وروحانی ہر دو لحاظ سے بہترین شکل وہیئت میں پیدا کیا۔ لیکن صحیح صفات انسان کھو دینے پر، پھر ہم اسے پست ترین گڑھوں میں گرا دیتے ہیں۔'') کا مقام بلند رکھتی ہے۔ ایک مجمع شیاطین کی قربان گاہ اغراض پر خود کو بھینٹ چڑھا کر ''اسفل سافلین'' کے قعر مذلت میں جا پڑے؟ نہیں نہیں بلکہ وہ ''مومن'' یا وہ ''انسان کامل'' جس نے کارزار حیات کے تمام خطرات وخدشات اور مصائب وحوادث سے بے نیاز و بے خوف رہ کر عین اس وقت امانت الٰہی (تلمیح بہ آیہ شریفہ۔ مراد ہے دستور شریعت، احکام الٰہی) کو اٹھایا جبکہ کائنات کی دیگر اشیاء تو درکنار آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں جیسی جسیم ومہیب چیزوں نے بھی اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی عملی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہوگئی تھیں۔ مومن فطری اور روایتی طور پر یہ منصب ومقام رکھتا ہے کہ اپنے دستور زندگی اور حقوق زندگی کا مکمل طور پر مختار ومجاز ہو۔ کرۂ ارضی کی وہ ناظم ومدبر ہستی جو آغاز آفرینش ہی میں مسجود ملائکہ رہ چکی ہے اور جس کی خدمت واطاعت کے لئے بر وبحر کی مخلوقات تو درکنار شمس وقمر تک مسخر کر دئے گئے ہیں، کم ازکم اتنا حق تو رکھتی ہے کہ وہ قدرت کے سمجھائے ہوئے سیدھی سادے قوانین حیات کے مطابق ایک آزاد ومختار زندگی بسر کرے۔

علامہ اقبال نے اکثر جگہ شہنشاہیت، آمریت اور جبر واستبداد کی شدید مذمت کرتے ہوئے جمہور کو بار بار آزادی وحریت، حقوق خود اختیاری اور غزوہ وجہاد کی تلقین کی ہے۔ اسلامی جہاد کی حقیقی غرض وغایت یہ ہے کہ انسانیت کو ظلم وتشدد، جبر واستبداد اور لعنت آمریت سے نجات دلا کر اس کے غصب شدہ حقوق اسے دوبارہ دلائے جائیں، جہاد کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ فرعون و یزید جیسی متکبر اور ظالم بادشاہوں کی حکومتوں کو پاش پاش کر کے مظلوم وگمراہ بندوں کو رب واحد کے آستانہ جلال پر جھکایا جائے، جہاں غلامی کی تمام زنجیریں آناً فاناً ازخود کٹ کر پراگندہ ہو جاتی ہیں اور حق کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جاتا ہے۔

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید	ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری استؓ است	باطل آخر داغ حسرت میری است

غرضیکہ حریت و آزادی کے علمبردار حضرت امام حسینؓ نے وقت کے سب سے بڑے شہنشاہ کی حکومت کو پاش پاش کر کے اسلام کو تاقیامت طاغوتی قوتوں سے بچالیا۔ کیا خوب کہا گیا۔

مرد مومن ہے جہاں میں ربِّ واحد کا غلام
اس غلامی سے وہ بن جاتا ہے دنیا کا امام

کلام اقبال کا درس حریت ۔ طارق لاہوری نے درس حریت کے بارے میں کلام اقبال کی خوب نشر و اشاعت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال جہاں حریت و آزادی کے محاسن و محامد کا تذکرہ کرتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ ''مردِ حُر'' (آزاد شخص) کی روحانی و عملی ممکنات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ علامہ نے اپنی تصانیف میں ''مرد حر'' کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے۔ انہوں نے حریت و آزادی کے جس مرد حر کی اعلیٰ صفات بیان کی ہیں وہ مجھے تاریخ اسلام میں حر بن یزید ریاحی کے کردار میں نظر آتی ہیں۔ تفصیلات کے لئے حاشیہ نمبر 9 ملاحظہ ہو۔

علامہ نے مرد حر کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ محض اللہ سے ڈرتا ہے اور طاغوتی قوتوں سے کبھی خوف نہیں کھاتا ہے۔ اس کے لئے ارشاد ربانی ہوتا ہے کہ ''لا تخف انک انت الاعلیٰ'' (اہل باطل سے خوف نہ کھا۔ فتح تیری ہی ہوگی۔) ذیل میں طارق لاہوری کے حوالے سے علامہ اقبال کے چند اشعار مع ترجمہ پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں مرد حر کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔

مرد حر محکم ز ورد لا تخف	ما بہ میداں سر بہ جیب او سر بکف
مرد آزاد لا تخف کے ورد سے توانا ہے	ہم میدان جہاد میں سر بجیب اور وہ سر بکف
مرد حر از لا الہ روشن ضمیر	می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
مرد حر یعنی خداترس توحید سے روشن دل ہے	وہ بادشاہ یا امیر کا غلام ہرگز نہیں بنتا
مرد حر چوں اشتراں بارے برد	مرد حر بارے برد خارے خورد
مرد حر اونٹوں کی طرح بوجھ اٹھاتا ہے	مرد آزاد کانٹے کھا کر بھی بڑے بڑے بوجھ اٹھاتا ہے
جان او پائندہ تر گردد ز موت	بانگ تکبیرش بروں از حرف و صوت
اس کی روح موت سے اور بھی پائدار ہو جاتی ہے	اور اس کی آواز تکبیر لفظ و صدا سے نیاز ہے

پادشاہاں در قبابائے حریر
وہ بادشاہ جو ریشم کے لباس پہنے ہوئے ہے
زرد رُو از سہم آں عریاں فقیر
اس برہنہ تن فقیر کے خوف سے زرد رُو رہتے ہیں

سرّ دیں ما را خبر او را نظر
دین کا راز ہمارے لئے تو صرف خبر ہے اور اسکا مشاہدہ
او درون خانہ، ما بیرون در
وہ تو گھر کے اندر ہے اور ہم بیرون در بیٹھے ہیں

ما کلیسا دوست و ما مسجد فروش
ہم کبھی کلیسا کے مرید ہیں اور کبھی مسجد فروش
او ز دست مصطفیٰؐ پیمانہ نوش
مگر وہ دست رسولؐ سے پیمانہ توحید نوش کئے ہے

چہرۂ گل از نم او احمر است
پھول کا چہرہ اس کی طراوت سے سرخ ہے
ز آتش ما دود او روشن تر است
ہماری آگ سے اس کا دھواں زیادہ روشن ہے

دارد اندر سینہ تکبیر امم
وہ اپنے سینے میں قوموں کی تکبیر پوشیدہ کئے ہوئے ہے
در جبین اوست تقدیر امم
اور اس کے ماتھے میں امتوں کی تقدیر منقوش ہے

در جہان بے ثبات او را ثبات
دنیائے فانی میں اس کو دوام حاصل ہے
مرگِ او را از مقامات حیات
اس کی موت زندۂ جاوید ہے

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست
ہم فقرا کوچہ گرد اور فاقہ مست ہیں
فقر او از لا الہ تیغ بدست
لیکن اس کا فقر تیغ توحید ہاتھ میں لئے ہوئے ہے

ما پرِ کاہے اسیر گرد باد
ہم گھاس کا تنکا ہیں اور ایک بگولے میں قید
ضربش از کوہ گراں جوئے کشاد
لیکن اس کی ایک ضرب نے پہاڑ سے نہر جاری کردی

محرم او شو ز ما بیگانہ شو
تو اسی مرد آزاد کا راز دار ہو اور ہم سے کنارہ کر
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو
خانہ غلامی برباد کر اور دنیائے آزاد میں صاحب خانہ ہو

صحبت از علم کتابی خوشتر است
علم کتابی سے صحبت صالح بہت زیادہ مفید ہے
صحبت مردان حر آدم گر است
اور مردان آزاد کی صحبت انسان کو انسان بنادیتی ہے

مرد حر دریائے ژرف و بیکراں
مرد آزاد ایک نہایت گہرا اور بے کنار دریا ہے
آب گیر از بحر و نے از ناو داں
وہ اپنا پانی سمندر سے لیتا ہے نہ کہ پرنالوں سے

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ
اس مرد آزاد کا سینہ دیگ کی طرح جوش کھاتا ہے
پیش او کوہ گراں یک تودہ ریگ
اس کے سامنے کوہ گراں بھی ریت کا تودہ ہے

روز صلح آں برگ و ساز انجمن
ہمچو باد فرو دیں اندر چمن

روز امن وہ مجلس کی رونق و روح — ایسے ہے جیسے چمن میں باد بہار
اے سرت گردم گریز از ما چو تیر — دامن اُو گیر و بے تابانہ گیر
میں تیرے قربان ہم سے تیر کی طرح بھاگ — اور اس کا دامن پکڑ اور بے تابی سے پکڑ

اندریں عالم نیرزی باخسے
تو اس دنیا میں ایک تنکے کی قیمت بھی نہیں رکھتا

تا نیاویزی بداماں کسے
جب تک کسی مردحر کے دامن کو نہ پکڑے

علامہ کو تاریخ اسلام میں جو اولوالعزم ہستیاں نظر آئیں جنہوں نے بقائے اسلام کی خاطر ہمیشہ اپنے کو سپر بنادیا اور دین اسلام کو اپنے خون پاک سے سینچا، سرسبز و شاداب کیا وہ آل محمدؐ ہیں۔ اگر جانشین رسولؐ امام حسینؑ خانوادۂ رسولؐ کی عظیم قربانیاں معرکۂ حق و باطل میں پیش نہ کرتے تو دنیا میں اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ طارق لاہوری نے جوہر اقبال میں اس عظیم ترین واقعہ کو ''نشان حریت'' کے زیرعنوان بزبان اقبال اس طرح قلمبند کیا ہے ؎

عشق را آرام جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
عشق کے لئے آرام روح صرف آزادی ہے — اور اس کی اونٹنی کا ساربان صرف آزادی ہے
آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد — عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد
کیا تو نے سنا ہے کہ میدان کارزار میں — عشق نے عقل ہوس پرست سے کیا سلوک کیا
آں امام عاشقاں پور بتولؑ — سرو آزادے ز بستان رسولؐ
وہ امام عشاق فاطمہؑ کا بیٹا حسینؑ — جو گلستان رسولؐ کا سرو آزاد تھا
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر
سبحان اللہ بسم کی با تو والد محترم تھا — لیکن بیٹا ذبح عظیم کی مجسم تفسیر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوش ختم المرسلیں نعم الجمل ؎
دنیا کی بہترین امت اس شہزادے کے لئے — آنحضرتؐ کا کندھا بہترین اونٹ تھا

؎ حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ بچپن میں اکثر آنحضرتؐ کے دوش مبارک پر سوار ہوجایا کرتے تھے۔ میرانیس نے اس واقعہ کے پیش نظر رسولؐ خدا کی زبانی ایک جگہ کیا خوب کہا ؎

جب روٹھتے ہیں آپ تو مشکل سے منتے ہیں
لیجئے سوار ہوجیئے ہم اونٹ بنتے ہیں

سرخرو عشق غیور از خون او
عشق غیرت منداس کے خون سے معزز و ذی وقار ہے
درمیان امت آں کیواں جناب
اس عالی جناب کی ہستی امت میں وہی شان رکھتی ہے
موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
موسیٰ اور فرعون، حسینؑ اور یزید
زندہ حق از قوت شبیری است
مگر حق ہمیشہ قوت حسینیؑ ہی سے زندہ ہے
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
جب خلافت نے قرآن سے تعلق منقطع کرلیا
خاست آن سر جلوۂ خیرالامم
بہترین امت کا وہ بہترین برگزیدہ فرد
بر زمین کربلا بارید و رفت
اور پھر زمین کربلا پر خوب برسا او چلا گیا
تا قیامت قطع استبداد کرد
اس نے قیامت تک کے لئے جبر واستبداد کو فنا کردیا
بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
وہ صرف قیام واستحکام حق کے لئے شہید ہوا ہے
مدعایش سلطنت بودے اگر
اگر اس کا مقصد و مدعا سلطنت ہوتی
دشمناں چوں ریگ صحرا لا تعد
دشمن تو ریگ صحرا کی طرح بے شمار تھے
سرّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود
وہ سیرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا راز تھا

شوخی ایں مصرع از مضمون او
اور مصرع عشق کی شوخی اسی کے مضمون سے ہے
ہمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب
جو سورۂ اخلاص قرآن مجید میں رکھتی ہے
ایں قوت از حیات آید پدید
حق وباطل کی یہ دو قوتیں زندگی سے رونما ہوتی رہی ہیں
باطل آخر کار داغ حسرت میری است
اور باطل آخر کار داغ حسرت لے کر مر جاتا ہے
حریت را زہر اندر کام ریخت
تو گویا روح آزادی کے منہ میں زہر ٹپکا دیا
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
قبلہ سے اٹھنے والے بادل کی طرح چاروں طرف چھا گیا
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
جنگل میں لالہ زار بودئے اور خود چلا گیا
موج خون او چمن ایجاد کرد
اس کے خون کی ایک موج نے گلستان پیدا کردئے
پس بنائے لا الہ گردیدہ است
اور اس لئے اس کی ہستی توحید کی بنیاد ہوگئی
خود نہ کردے باچنیں سامان سفر
تو وہ اس بے سروسامانی کا سفر اختیار نہ کرتا
دوستان او بہ یزداںؑ ہم عدد
لیکن اس کے دوست لفظ یزداں کے ہم عدد تھے
یعنی آں اجمال را تفصیل بود
یعنی وہ اس اجمال کی تفصیل واقع ہوا تھا

ؔ سورۂ اخلاص قرآن مجید کی جان اور ایمان کی بنیاد ہے اور اسے ثلث قرآن کا درجہ دیا گیا ہے۔

عزم او چوں کہساراں استوار
اس کا ارادہ پہاڑوں کی طرح مضبوط تھا

پائدار و تند سیر و کامگار
محکم تھا، تیز رفتار تھا اور کامیاب تھا

تیغ بہر عزت دین است و بس
ثابت ہوا کہ تلوار تو صرف عزت دین کے لئے ہے

مقصد او حفظ آئین است و بس
اور اس کا مقصد آئین اسلامی کی نگہداشت ہے

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
مسلمان غیر اللہ کا بندہ (غلام) ہرگز نہیں ہوسکتا

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
اور اس کا سر فرعون کے سامنے کبھی نہیں جھک سکتا

خون او تفسیر ایں اسرار کرد
خون حسین نے اسی راز کی تفسیر وتشریح کی ہے

ملت خوابیدہ را بیدار کرد
اور ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا ہے

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
جب اس نے اپنے میان سے تیغ لا کھینچی

از رگ ارباب باطل خوں کشید
تو اہل باطل کی رگ سے خون فاسد کھینچ لیا

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
اس نے سینۂ صحرا پر توحید کا نقش ثبت کیا

سطر عنوان نجات ما نوشت
اور گویا ہماری بخشش ونجات کی سطر لکھ دی

رمز قرآں از حسین آموختیم
ہم نے مفہوم قرآن حقیقتاً حسین سے سمجھا ہے

ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
اور اسی کی آگ سے دل میں شعلۂ توحید مشتعل کیا ہے

شوکت شام و فر بغداد رفت
شام اور بغداد کی شان وشوکت فنا ہوگئی

سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
اور غرناطہ کی عظمت وسطوت بھی فراموش ہوگئی

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
لیکن ہمارا تار اس کے مضراب سے آج بھی مرتعش ہے

تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اور اس کی تکبیر سے ایمان اب بھی تر وتازہ ہے

اے صبا! اے پیک دور افتادگاں
اے صبا! اے دور افتادہ لوگوں کی قاصد

اشک ما برخاک پاک او رساں
میرے آنسو اس کی خاک پاک تک تو پہونچا دے

(۵) **تفسیر خودی** ــــــ یہ کتاب علامہ اقبال کی اولین تصنیف ''اسرار خودی'' کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ طارق نے اس شاہکار کو مستند ماخذ سے آراستہ کر کے پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں شائع

سلسلۂ اشاعت نمبر ۳

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
اقبال

تفسیرِ خودی

جس میں
علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق مثنوی 'اسرار خودی' کے حقائق و مقاصد
بیان کرنے کے علاوہ لفظ "خودی" کی نہایت جامع، مانع اور عام فہم
تشریح پیش کی گئی ہے

از
عبدالرحمٰن طارق بی۔اے
مصنف: جواہر عجم، صحیفۂ ادب و پیام اقبال وغیرہ

ناشر
مکتبہ یادگار اقبال لاہور

بار اول ۱۰۰۰ جلد سنہ ۱۹۴۰ء قیمت ایک روپیہ ۴ر

تا کہ حق پائے شانِ زندگی
آشکارا دل میں ہو سوزِ خودی

نیابتِ الٰہی

ہے اگر اللہ کے در کا فقیر　　دو جہاں کو کرے تو اپنا اسیر
تو مسلماں ہے جہانبانی بھی کر　　زیبِ سر تاجِ سلیمانی بھی کر
علم تیرا یاں جہاں آرا ہوا ۱　　تاجدارِ ملک لا یبلیٰ ہوا
نائبِ حق ہے جہاں کا حکمراں ۲　　آنکھ اس کی ہے ازل کی راز داں
نائبِ حق دنیا کا مختار ہے　　سب میں عاجز وہ فقط قہار ہے
ہے رموزِ جزو و کل کا راز دار　　ہر دو عالم سے بڑا اس کا وقار

---

۱ و اٰتیناہم ملکٗ لا یبلیٰ (آیۂ قرآنی)

۲ اقبال نے "نائبِ حق" کا جہاں کہیں بھی ذکر کیا ہے، اس سے مراد ان کا مہدیٔ آخر الزماں ہیں۔

کیا۔ کتاب کا اعلان ''زمانہ'' کانپور جلد ۵ ے نمبر ۶ بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں درج ذیل الفاظ میں چھپا تھا:

''مصنف پیام اقبال'' کے دیگر جدید ترین اور ہنگامہ خیز کارنامے''

تفسیر خودی

''یہ کتاب تمام وکمال اردو نظم میں لکھی گئی ہے۔ انداز بیان نہایت دلکش اور زوردار واقع ہوا ہے۔ اس میں علامہ ڈاکٹر سید محمد اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی اور ''اسرار خودی'' کے حقائق و مقاصد بیان کرنے کے علاوہ لفظ ''خودی'' پر اس قدر جامع اور بصیرت افروز بحث کی گئی اور آپ یقیناً اسے اردو زبان کا پہلا معجزہ تسلیم کریں گے۔ حیات اقبال اور کلام اقبال کا لب لباب معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

تفسیر خودی کا ایک مکمل دستور العمل، عزت وبقا کا ایک ایسا راز اور آزادی، سرفرازی کی ایک ایسی روشن شاہراہ ہے جس سے ہندوستان کا کوئی خوددار انسان بے نیاز نہیں رہ سکتا۔''

''تفسیر خودی'' نہایت کمیاب ہے۔ اس کا اور ''فلسفہ بیخودی'' کے دو نسخے عرصہ پہلے مجھے لکھنؤ کے امیر الدولہ پبلک لائبریری میں استفادہ کے لئے دستیاب ہوئے تھے۔

تفسیر خودی چھوٹی تقطیع میں ۶ ے ابواب میں ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق کی عبارت اس طرح درج ہے:-

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تفسیر خودی / جس میں

علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق مثنوی 'اسرار خودی' کے حقائق و مقاصد بیان کرنے کے علاوہ لفظ 'خودی' کی نہایت جامع و مانع اور عام فہم تشریح پیش کی گئی ہے۔

از عبدالرحمٰن طارق بی-اے

ابتدا میں یہ اشعار طارق کے درج ہیں۔

مرد مومن سے۔ جہاں کو نعرۂ حق سے ہلا دے — لحد میں سوتے مردوں کو جگا دے
زمانہ گر ترا یاور نہیں ہے — ستارے توڑ دے گردوں جلا دے

مقام خودی۔ خودی سے میں بہشت جاوداں ہوں — خودی سے قدسیوں کا ہمزباں ہوں
حیات و موت کے عقدے تو کیا ہیں — خط لوح و قلم کا راز داں ہوں

مطمح نظر خودی کے ضبط میں شانِ خلیل پیدا کر اوچھل کے شعلوں میں صدق دلیل پیدا کر
جوت موت آئے بھی خائف نہ ہو خدا کے لئے منا کے موت کو ذکر جمیل پیدا کر

صفحہ ۹-۱۰ میں کتاب کے ماخذ دیے گئے ہیں۔ یعنی ان کتابوں کی فہرست ہے جن سے دونوں مثنویوں ''تفسیر خودی'' اور ''فلسفۂ بیخودی'' کے تشریح ومطالب میں براہ راست استفادہ کیا گیا۔

۱-قرآن حکیم ۲-حدیث نبوی ۳-تذکرۃ الاولیاء از مولوی ظہور احمد ۴-تاریخ اسلام از غلام قادر فصیح ۵-تاریخ حریت اسلام از منشی محمد الدین فوق ۶-تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی ۷-الفاروق از شبلی ۸-کیمیائے سعادت، امام غزالی ۹-روح الاجتماع از موسیو لیبان ۱۰-انقلاب امم از موسیو لیبان ۱۱-الہلال (دور قدیم) ابوالکلام آزاد ۱۲- Thus spake Zarthushtra Nietzsche

۱۳- Self Mastery Through Auto-Suggestion emile coue

۱۴- Mind as a force by Charles F. Harford

۱۵- The inner life by C.W. Leader beater

۱۶- Super Human Men by Annie Besant

صفحہ ۱۲-۷ اتک ''دیباچہ'' مصنف ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

''آج اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ علامہ اقبال کی تمام شاعرانہ کارگزاری کا لب لباب یا ماحصل کیا ہے تو ہر ذی شعور انسان کی طرف جواب یہی ملے گا کہ ''تلقین خودی''

اب خودی کے موضوع پر علامہ مرحوم کی تصنیفات میں ہم کسی مستقل اور مخصوص چیز کی تلاش کرنا چاہیں تو وہ ''اسرار خودی'' کے سوا اور کوئی کتاب نہیں۔ اقبال مرحوم نے جب پہلے پہل ''اسرار خودی'' کا تخیل اپنے دماغ میں قائم کیا تھا تو فارسی زبان میں اسے تحریر کرنے کا بڑا مقصد ان کے نزدیک یہ تھا کہ اس کا فیضان زیادہ سے زیادہ وسیع و بسیط صورت اختیار کر لے۔ کیونکہ اس طرح سے نہ صرف اسلامی دنیا کے دیگر ممالک مثلاً ایران، افغانستان اور مصر وغیرہ اس کے حقائق سے آگاہ ہوسکیں گے۔ بلکہ یورپ بھی مشرق کی ''روحانی'' عظمت کا اندازہ کر سکے گا۔ میں سر دست اس بحث میں جانا نہیں چاہتا کہ دیگر ممالک کے باشندے ''اسرار خودی'' سے کس حد تک مستفید ہوئے۔ بلکہ میرے پیش نظر اس وقت خاص طور پر ہندوستان ہے جہاں علامہ اقبال نے ولادت و پرورش پائی، جہاں کے ماحول سے وہ متاثر ہوئے، شعر و شاعری کا آغاز کیا اور بالآخر شہرت کے آسمان پر آفتاب نصف النہار بن کر چمکے۔ لیکن بایں ہمہ کمال کیا اہل ہند اقبال کے حقیقی نصب العین یعنی ''خودی'' کے حقائق و مقاصد کا خاطر خواہ طور پر ادراک کر سکے

ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ جب اس کی وجوہات پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے زبان کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسرار خودی کی زبان فارسی ہے اور فارسی بھی فاضلانہ پائے کی۔ پھر انداز بیاں بجائے خود فلسفیانہ اور دقیق ہے۔ پس یہی چیزیں زیادہ تر تحدید و بندش کا باعث ہوئیں۔ آج اکثر لوگ علامہ مرحوم کے اردو کلام کے اسرار و غوامض اور نکات و حکم معلوم کرنے سے قاصر ہیں۔ فارسی تو بھلا بعد کی چیز ہے۔ اور میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ فارسی زبان پر مکمل اور فاضلانہ دسترس رکھنے والوں کی ہندوستان میں تعداد کتنی ہے؟ پس ہمیں افسوس کے ساتھ اس حقیقت صادقہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ''اسرار خودی'' کا مفاد معدودے چند حضرات تک محدود رہ گیا اور دوسرے لوگ تو اکثر حالات میں محض اس کتاب کی تعریف سن کر ہی خوش ہو لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معانی و مطالب کا ادراک کئے بغیر صرف ایک شے کی روایتی عظمت پر خوش ہو لینا قوم کے لئے کوئی تعمیری فائدہ نہیں رکھتا۔

انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ اب مسلمانوں میں پہلے کی سی غفلت اور بے حسی باقی نہیں رہی۔ ملک میں ہر طرف بیداری اور ذوق اصلاح کی ایک مسلسل آرزو پائی جاتی ہے۔ نوجوانوں کا ذہنی ماحول بالکل تبدیل ہو چکا ہے، اب وہ افیون اور کوکنار کی بجائے جوش شباب اور جذبۂ غیرت ملی پیدا کرنے والی وہ آتش سیال طلب کرتے ہیں، جسے ''خودی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ان جذبات کی تخلیق علامہ مرحوم کے ان دو اشعار کی رہین منت ہے جو بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم میں ایک قلیل تعداد کے اندر کہیں نہ کہیں بکھرے پڑے ہیں اور جو خودی اور اس کے لوازمات کا کوئی باضابطہ اندازہ کرانے کے لئے قطعاً ناکافی ہیں۔

افراد نے جب اردو کلام میں کچھ ایسے انقلاب انگیز شعر پائے جوان کی عملی دنیا میں ایک ہیجان عظیم پیدا کرنے کا باعث ہوئے تو اسرار خودی جیسی مستقل کتاب میں کچھ نہ ہوگا۔ پس اس اشد ضرورت کے ماتحت میں نے ارادہ کیا کہ خودی کی خاطر خواہ تبلیغ و اشاعت کے لئے ملک کے اردو خوان طبقہ کے سامنے مثنوی کی صورت میں ایک جامع و مانع چیز پیش کردوں۔ چنانچہ اسی تمنا کا نتیجہ ''تفسیر خودی'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ہر عنصر مکمل اور مستند ہو۔ خودی اور حفظ ذات پر اردو و فارسی یا انگریزی میں جتنی عمدہ کتابیں مجھے دستیاب ہو سکتی تھیں، میں نے مطالعہ کر لیں۔ اب ان تمام کتب کا جوہر اس ایک جلد میں فراہم کر دیا گیا ہے۔ توفیق و تائید خدا کی طرف سے تھی، لیکن عملی طور پر اس کی قدر کرنا ملت اسلامیہ کا فرض ہے۔

چونکہ علامہ اقبال نے ''خودی'' کو زیادہ تر قرآنی اور اسلامی ماحول میں دکھلایا ہے۔ لہٰذا میں

نے بھی اس مقدس اصول کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے تمام مضامین اور مطالب کی بنا قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام پر رکھی ہے اور یہی میرے نزدیک فطرت کا اقتضا اور مطالب کی بنا قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام پر رکھی ہے اور یہی میرے نزدیک فطرت کا اقتضا اور روح اقبال کی بہترین خدمت گزاری ہے۔

آپ اس کتاب میں کئی جگہ نفسیاتی عناصر (Psychological Elements) بھی موجود پائیں گے۔ مثلاً تصور کا تمام تر تذکرہ نفسیاتی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے خودی پر بحث کرنا میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ انسانی جذبات واحساسات سے زیادہ حقیقی، زیادہ موثر اور زیادہ موجود ومشہور شے کائنات میں شاید اور کوئی نہیں۔

تیرے ہی اسرار باطن کو کیا میں نے عیاں
دل کے آئینہ میں جھک کر اپنی ہی تصویر دیکھ (طارق)

(۱) ذیل میں ''تفسیر خودی'' میں سے چند اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔

خود شناسی سے خودی ہے برقرار
اپنی عزت سے تو پائے گا وقار

یاد ہے تجھکو اگر عہد الست
رہ خودی کے کیف سے ہر دم تو مست

نفس کی پستی ہے ذلت کی دلیل
نفس کی رفعت ہے سطوت کی دلیل

جس کے احساسات ہوں جتنے بلند
اتنا ہی دنیا میں ہے وہ ارجمند

قطرہ جب حرف خودی ازبر کرے
ہستی بے مایہ کو گوہر کرے

ضعف سے یہ ایسی بے پیکر ہوئی
اس کی ہستی قیدی ساغر ہوئی

چھوڑ دیں اپنی خودی جب کوہسار
ریگ بن کر چھائے ان پر انتشار

آنکھ تیری مرکز تنویر ہے
روشنی کے ضبط کی تعمیر ہے

سبزے میں اگنے کی ہو جب آرزو
چیر کر مٹی کو پائے رنگ و بو

شمع کیا ہے موم کی زنجیر ہے
منجمد ذروں کی اک تصویر ہے

خود گدازی پر عمل جب وہ کرے
اشک بن کر چشم سے اپنی بہے

ہوتا فطرت میں اگر پختہ یقیں
رکھتا کیوں نشتر پہ وہ اپنی جبیں

ہوگیا سرمایہ دار نام غیر
دوش ہے مجروح بار نام غیر

مرکزیت سے زمیں ہے بہرہ مند
طوف اس کا کرتا ہے ماہ بلند

ہے مگر محکم زمیں سے آفتاب
رہتی ہے اس کے اثر سے مست خواب

ہے خودی میں ایسی شان زندگی
قطرہ سے بڑھ بڑھ کے یہ قلزم ہوئی

ساز دل کے تار کو بیدا کر
بازو اپنا درخور پیکار کر

جس کی طاقت کو نہیں حاصل ثبات
چھاتی ہے اک لمحہ میں اس پہ ممات

حفظ ذاتی حفظ ملت کا نشاں
جذبۂ غیرت خودی کا ترجماں

ہو کے غافل قوم ہوتی ہے ذلیل
فرد کی طاقت تو ہے پھر بھی قلیل

قلب زندہ حافظ ناموس ہے
قلب مردہ پاس میں محبوس ہے

ہے بنی آدم مثال زندگی
خودشناسی خودگری خودقاہری

ہے خودی اک نقطہ تو پرکار ہو
پختہ طینت صورت کہسار ہو

باطن ہر ذرہ ہے ورد انا
اس ''انا'' سے گر کے ہر شے ہے فنا

میں، کا آوازہ ہے فطرت کی صدا
''میں'' کو زندہ رکھ کے پائے گا بقا

کردے لرزاں کارگاہ ہست و بود
ضرب محکم سے منا اپنا وجود

دنیا میں درکار ہے بس روح شیر
قاہر و غالب ہیں مردان دلیر

زندگی تسخیر سے ہے پائدار
خود شناسی ہے ترے دل کا قرار

اقبالؔ نے آل رسولؐ اور معصومینؑ کو ''اولی الامر منکم'' قرار دیا ہے اور یہی حضرات نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہیں۔ دروازۂ شہر علوم یعنی علی ابن ابیطالب اور مہدی آخرالزماں کو نائب حق تسلیم کیا گیا۔ طارقؔ نے بھی اقبال کے موقف کی تائید کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

(۱) ہے اگر اللہ کے در کا فقیر
دوجہاں کو کرلے تو اپنا اسیر

تو مسلماں ہے جہانبانی بھی کر
زیب سر تاج سلیمانی بھی کر

علم تیرا یاں جہاں آرا ہوا
تاجدار ملک لا یبلیٰ ہوا

نائب[۱] حق ہے جہاں کا حکمراں
آنکھ اس کی ہے ازل کی رازداں

نائب حق دنیا کا مختار ہے
سب ہیں عاجز وہ فقط قہار ہے

ہے رموز جز و کل کا رازدار
ہر دوعالم سے بڑا اس کا وقار

پختہ کرتا ہے وہ یاں ہر خام کو
توڑتا ہے کعبہ میں اصنام[۲] کو

ساز دل بیدار اس مضراب سے
مخترز ہے وہ سکون و خواب سے

فتح و نصرت کے لئے ہر دم بشیر
پنجے میں اس کے عناصر سب اسیر
مدعائے علم الاسمیٰ[۳] ہوا
سر سبحٰن[۴] الذی اسریٰ ہوا
کردے وہ ذروں کو خورشید آشنا
مردے اٹھکر ہوتے ہیں جنگ آزما
سینہ اس کا جوش میں مانند دیگ
ضرب[۵] سے کہسار اس کی ریگ ریگ
مت کرا اے نائب حق انتظار[۹]
پیدا کر اس خاک سے اپنا شرار

کر خودی میں پیدا وہ روح شباب
شرح ''انی جاعل[۷]'' ہو بے حجاب

خوف مرگ

اٹھ گیا خود نفس کا جب اعتبار
پائے گا دنیا میں کیا جی کر وقار
بزدلوں پر حاوی ہے خوف ممات[۸]
اور جری کا ہو نفس سوز حیات
ایک نکتہ کرتا ہوں اس جا بیاں
امتیاز عبد و حر جس سے عیاں
حر ولے خود قہر کی تصویر ہے
ہر نظر یاں پرتو تسخیر ہے
خوف کو حاصل نہیں اس دل میں جا
موت بھی ہے اس کے ہاتھوں سے فنا
عبد کے جملہ عناصر ہیں زیاں
حر سے ظاہر ہے نیا ہر دم جہاں
عبد قسمت سے بڑا معذور ہے
حر سے خود تقدیر بھی مقہور ہے
عبد کو ہے نقش باطل کائنات
حر کی ہے ہر ضرب بنیاد حیات
عبد کو دنیا ہے اک جائے نفس
حر کی ہے تعمیر اس کا ہر نفس
عبد کا مسلک ہے عجز و انفعال
حر مگر جرأت سے سر تا پا جلال
عبد ہے بس قیدی لیل و نہار
حر کی گردش میں ہے سارا روزگار
عبد کو ایام ہیں گور و کفن
حر ہے لیکن فقر میں شاہ زمن
عبد ہے خود موت سے پہلے ہلاک
حر کا دل خطرات سے رہتا ہے پاک
عبد پر شیطان کا چھایا جنوں
حر کو لیکن ہے وہ اک صید زبوں
ایک کو یاں مرگ پر اصرار ہے
ایک خوف مرگ سے بیزار ہے
آستانہ پر خودی کے رکھ جبیں
خوف تیری شان کے لائق نہیں

خوف[۱۰] و غم سے جو رہے دائم بری
ہے حقیقت میں وہ اللہ کا ولی

شرح اسمائے حضرت علی مرتضیٰؓ

مسلم اول شہہ مرداں علیؓ
عشق کا سرمایۂ ایماں علیؓ

ہم اسی کے اسوہ سے یاں زندہ ہیں
دنیا میں مثل گہر تابندہ ہیں

ہر عمل سے اس کے پیدا نور حق
تیغ جوہردار تھی دستور حق

برق سوزاں ہے عیاں شمشیر سے
کوہ مثل کاہ ہیں تسخیر سے

غیرت اس کی قوت دین مبیں
دوجہاں سے بے نیاز اس کی جبیں

اک حُسام اور اک ذرہ سامان جنگ
ہوگئی جن سے زمیں باطل پہ تنگ

ذات اس کی تھی در شہر علوم
اہل بینش جس پہ کرتے تھے ہجوم

نام اس کے ہیں خودی کے ترجماں
کھول کر کرتا ہوں میں جن کو بیاں

جب کہا جاتا ہے اس کو یاں اسد
خوف و وحشت کا ہے پیدا اس سے درد

شیر حق مخلوق سے ترساں نہیں
لشکر کفار سے لرزاں نہیں

چھاتا ہے جب چہرہ پر اس کے جلال
دم دبا کر بھاگتے ہیں سب شغال

موت سے وہ مرد حق ڈرتا نہیں
چاپلوسی غیر کی کرتا نہیں

شیر ہے خطرات میں گھر کر بھی شیر
کرتا ہے دشمن کو اک حملہ میں زیر

جان دے کر بھی ہے وہ محو ستیز
کفر ہے بس اس کے مذہب میں گریز

اور کا مارا کبھی کھاتا نہیں
بن کے سائل دربدر جاتا نہیں

ہوتے ہیں جرأت سے اس کی سب نہال
فیض پیہم سے نہیں کھاتا ملال

رعد کی ہے ترجماں اس کی صدا
نعرہ سے کرتا ہے باطل کو فنا

ایک کافر دین کا منکر ہوا
زہر حجت کے لئے اس کو دیا

یعنی سچا ہے تو اس کو نوش کر
دیکھوں میں بھی تیرے مذہب کا اثر

پی گیا اس زہر کو شیر خدا
وہم باطل کو دیا دل سے مٹا

جرأت و ایماں میں ایسا طاق تھا
مرد حق کو زہر بھی تریاق تھا

کرتا ہوں اب شرح رمز بوتراب
روح اس کی پیر میں لائے شباب

یعنی تھا اس خاک پر قادر علیؓ
حکم سب پر کرتا تھا صادر علیؓ

جسم جس کی ہے بنا خاک سیاہ | ہے ہوس کی چیرہ دستی سے تباہ
یاس کے حملوں سے افسردہ ہے یہ | وہم کے ماحول میں مردہ ہے یہ
ذوق عشرت سے ہے ایسا بے لگام | پیروی سے اس کی قومیں ہیں غلام
بے یقینی سے ہے کمزور و ضعیف | روح اس کی اپنی ذلت سے کثیف
پر علی اس بند سے آزاد تھا | حاکمی سے جسم کی دل شاد تھا
تھے عناصر گویا سب اس کے پسر | قوت تسخیر سے خود تھا پدر
بے نیاز دہر تھا خوددار تھا | ضبط سے وہ مرجع احرار تھا
خاک کے گھوڑے کا تھا وہ شہسوار | ضرب سے اڑتے تھے اس کی کوہسار
قبضہ میں حیدرؓ کے تھا کار زمیں | قلب جبر و سطوت کا تھا امیں
حریت تھی اس کی طینت میں نہاں | جذبہ اخلاص تھا ہر جا عیاں
اب ذرا اخلاص کی تصویر دیکھ | صدق کی اس کے ذرا تاثیر دیکھ
ایک دن وہ محو تھا پیکار[11] میں | کفر تھا اس حملہ سے ادبار میں
''ناگہاں ہاتھ آیا اس کے اک شکار | ہو گیا وہ سینہ پر اس کے سوار
چاہتا تھا ختم کر دوں زندگی | تھوک بیٹھا اس کے منہہ پر وہ شقی
ہوگیا الٹا اثر بیداد کا | اٹھ کے کافر کو بری ہی کر دیا
ایک مسلم نے وجہ دریافت کی | بولا تھی اب نفس ہی کی پیروی
اتباع نفس ہے شرک خفی | جذبہ توحید کی ظاہر نفی
پہلے تھا میں ذات باری کا غلام | لیکن اب شامل تھا اپنا انتقام
اس سے جائز مجھ پہ ناجائز ہوا | چھوڑ کر اس کو بہت فائز ہوا''

جو بھی ہو دنیا میں ایسا بوتراب
اس کی گردش میں ہے ہر دم آفتاب[12]

ذرہ ذرہ اس سے یاں مرعوب ہے | بجز اس کے دین میں محبوب ہے
خاک پر اپنی ہو تو بھی حکمراں | مہر عالمتاب ہو تیرا نشاں
خاک ہونا مذہب پروانگی | باپ ہونا خاک کی مردانگی
سنگ ہو دنیا میں اے نازک بدن | تاکہ ہو بنیاد دیوار چمن

اس بنا سے اک جہاں تعمیر کر　　بڑھ کے پھر نہ آسمان تسخیر کر
ہے ستم پر چرخ کے تو نوحہ خواں　　کیوں نہیں کرتا ارادوں کو جواں
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا　　سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
ہے عمل میں سر مضمون حیات　　لذت تخلیق قانون حیات
سینہ میں پیدا کر اب سوز خلیلؑ　　جو ہے خود آذر کی نکبت پر دلیل
نامساعد وقت سے عہد وفا　　جنگ سے بھاگوں کو پیغام فنا
جو بھی یاں قعر مذلت میں رہا　　ناتوانی کو قناعت کہہ گیا
ناتوانی سے ہے خود تیری ہلاک　　روح جسم مردہ میں اندوہناک
آتی ہے یہ مختلف اطوار میں　　شر ہی شر ہے اس کے سب آثار میں
کرتے ہیں اہل نظر اس سے گریز　　ہوتے ہیں ابلیس سے گرم ستیز
ہے کبھی یہ رحم کی یاں پردہ دار　　ہے کبھی یہ نقش عجز و انکسار
پھر جو دیکھو حلم و مجبوری ہے یہ　　پھر کبھی قسمت کی معذوری ہے یہ
چہرہ سے لیکن ہٹاؤ جب نقاب　　ہے تن آساں کی یہ زہریلی شراب
زندگی پاتی ہے قوت سے صعود　　اس سے قائم کارگاہ ہست و بود
ہو توانا مدعی تیرا اگر　　ہے تری سب حیل و حجت بے اثر
ہوگا آخر کامیابی سے وہ شاد　　تو فقط کمزوریوں سے نامراد
کر نہ اپنے دل کو جرأت سے تہی　　ہاں اٹھا ہمت سے بنیاد خودی
منفعل کیوں ہے تو حب جاہ سے　　پاک رہ اب خوف غیر اللہ سے

ہیں عیاں اب تجھ پہ اسرار علیؑ[14]
رہنما تیرا ہے کردار علیؑ

(۵) **تفسیر خودی** ـــــ یہ کتاب ۸۸ صفحوں میں ۲۲ باب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ''خودی کی غایت بیخودی'' پر بحث ہے۔ آخری باب کا عنوان ہے ''فاطمۃ الزہرا نسائے عالم کے لئے ایک اسوۂ کاملہ ہیں'' ذیل میں چند اہم اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔

خودی کی غایت بیخودی

فرد محکم کرلے جب اپنی خودی　　بیخودی ہے اس کی شان زندگی

بے خودی؟ شان و شکوہ اجتماع
افتراق و بغض و نخوت کا دفاع

بے خودی میں جب ہوا قطرہ فنا
امتزاج بحر سے پائی بقا

بے خودی سے پھول ہے گویا چمن
نکہت بے پایاں کا ہر جا وطن

بے خودی سے ہیں ارادے استوار
فرد کو ملتا ہے ملت کا وقار

بے خودی زندہ کرے بے جان کو
تازہ کردے جوہر ایمان کو

منفرد طاقت ہو کتنی ہی مہیب
دین و دنیا کا اثر جس کو نصیب

ہے جدا ملت سے گر اس کا نظام
پا نہیں سکتی کبھی سوز دوام

وہ عناصر سے کرے کتنی ہی جنگ
عارضی ہے اس کا ہر اک رنگ ڈھنگ

منتشر ہیں اس کے اجزائے حیات
اس کی تخلیق ہنر سب بے ثبات

مرکزیت ہی نہیں افکار میں
رعب کیا ہو، دیدۂ بیدار میں

بے خودی جان جہان آرزو
بے خودی سے کامراں ہے جستجو

محو کر ملت میں احساسات کو
منضبط الفت سے کر جذبات کو

ذوق ملت ہے حیات جاوداں
ہے جماعت کا خدا بھی پاسباں

جذب باہم سے ہے حاصل انگبیں
نحل ہو جب منفرد کبھی نہیں

فرد کو ملت ہے اک پختہ حصار
ربط ملت سے ہے وہ گردوں وقار

حادثۂ کربلا احساس حریت کا بہترین نمونہ ہے

حریت کی پیدا ہو جب آرزو
اسوۂ کامل کی ہو گر جستجو

دیکھ پھر تاریخ میں شان حسینؓ
ہیچ ہیں یاں غزوۂ بدر و حنین

روح اخلاص و عمل جان حسینؓ
معنی توحید ایمان حسینؓ

لوح کے اسرا کی حکمت حسینؓ
عرش اعظم کے لئے زینت حسینؓ

اس کے خوں سے ضوفشاں ریگ حجاز
اس سعادت پر ہے ہر ذرہ کو ناز

وہ امام عاشقاں پور بتولؓ
جس سے ہے سر سبز بستان رسولؐ

شوکت دین ہدیٰ تھا خود پدر
معنی ذبح عظیم[۱۴] اس کا پسر

کب مٹا سکتی ہے اس شہ کو اجل
دوش نبوی جس کا ہو نعم الجمل[15]

عشق اس کے خون سے ہے سرخرو
پایا ہے ضبط وفا سے رنگ و بو

قلب ملت کے لئے تاب و تواں
جسم قومی کی ہے وہ روح رواں

اس کا دل قرآن کی تفسیر[16] ہے
حریت کے خواب کی تعبیر ہے

حق ہے خود باطل کی نکبت پر دلیل
ہوگیا فرعون موسیٰ سے ذلیل

ہیں اسی کا نقش شبیرؓ و یزید
معرکہ ہے جس کا فطرت کا نوید

حق کو ہے شبیر سے حاصل بقا
کر دے جور و جفا جس نے فنا

جب خلافت ہوگئی قرآں سے دور
ضعف و اضمحلال آنا تھا ضرور

اٹھا آخر رحمت حق کا سحاب
جس سے چھایا چپے چپے پر شباب

سرزمین کربلا سیراب ہے
روح مسلم درد سے بیتاب ہے

تاقیامت قطع استبداد کی
سطوت شاہنشہی برباد کی

سر کٹانے کو ہے وہ گردوں تاب
انقلاب و انقلاب و انقلاب

جب اچھالا خون کو سوئے فلک
لرزہ برتن ہوگئے سارے ملک

زلزلہ میں آگئے ہفت آسماں
حوریں جنت میں ہوئی سب نوحہ خواں

بھڑکی دوزخ عرش چکر کھا گیا
رہ گئے شیطان اپنا منہ چھپا

دل میں ہو گر عشق شبیریؓ نہاں
تجھ پہ یہ راز شہادت ہو عیاں

یعنی ''دیکھ اے خالق ہر دوسرا
جان سے محبوب ہے تیری رضا

نام کو کر میرے دنیا میں بلند
میری نسبت سے ہو ملت ارجمند''

ہوتا اس کا گر حکومت مدعا
جاں نہ دیتا دشت میں بے دست و پا

دوست اس ماحول میں مفقود تھے
دشمن اس کے لاتعد موجود تھے

سر ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ تھا
یعنی اس اجمال کی تفصیل تھا

عشق سلماں، صبر ایوبیؑ بھی دیکھ
بے کسی میں ضبط یعقوبی بھی دیکھ

عزم و غیرت اس قدر تھے استوار
عرق ہو جس کے اثر سے کوہسار

حفظ عزت اس کا بس مقصود تھا
مشرکوں کے سامنے محمود تھا

اک خدا کا مان کر اس جا وجود
پیش فرعوں کیوں کرے مسلم سجود

تیغ لا سے کردے سرکش کو فنا
خود پہن لی اک شہادت کی قبا

نقش الا اللہ ہے صحرا کا نور
اس سے پایا شوکت حق نے وفور

گرچہ وہ مینا نہیں ساقی نہیں
فال و فر اسلام کی باقی نہیں

سطوت غرناطہ اب افسانہ ہے
خود یزیدی قصر اک ویرانہ ہے

دل پہ ہے منقوش پر یاد حسینؑ
ہے مرا ہر سانس فریاد حسینؑ

نبض امکاں اس سے ہے رقصاں ہنوز
تازہ اس کے ذکر سے ایماں ہنوز

اے صبا کر خاک پر اس کی گذر
پیش کر یہ ہدیۂ خون جگر

ہے یہی خوں میری آنکھوں کی ضیا
ہے اسی سے روح کو حاصل بقا

جب سے اس کے عشق میں رنجور ہوں
حریت کے جوش سے معمور ہوں

فاطمۃ الزہراؑ نسائے عالم کے لئے ایک اسوۂ کاملہ ہیں

ایک نسبت سے تھا مریم کا وقار
مادر عیسیٰ سے ہے وہ آشکار

نسبتیں ہیں تین زہراؑ کی مگر
زندہ جن سے حشر تک اس کا اثر

نور چشم رحمۃ للعالمین
ہیں منور جس سے یہ چرخ و زمیں

ذات میں جس کی خدا پرتو فگن
عرش تھا پرواز میں جس کا وطن

نعرہ جس کا نعرۂ خیبر شکن
قیصر و کسریٰ کی درہم انجمن

اک حسام اور اک زرہ زیر نگیں
حرص و مال و جاہ یاں مطلق نہیں

تیسرے وہ مادر انوار عشق
باقی جس کے دم سے ہے پیکار عشق

مقتدی جس کے ہیں احرار جہاں
نام جس کا رہتا ہے ورد زباں

وہ حسینؑ پاکباز و پاک زاد
رو حق کی زندگی جس کا مفاد

جرأت و سطوت کی خالق امہات
تربیت سے ان کی ہے کامل حیات

کشت صبر و شکر کا حاصل بتولؑ
ذکر و فکر و صدق کی حامل بتولؑ

ہاتھ میں چکی تو لب قرآں سرا
خالق و شوہر سے یکساں باوفا

دل میں اس کے اس قدر رحم و غنا — بہر سائل بیچ دی اپنی ردا
رات کو سوتے تھے سب روتی تھی وہ — محو ذکر کبریا ہوتی تھی وہ
اشک اس کے لولوِ لائے قوم — لحہ لحہ بسکہ شان افزائے قوم
ملت اسلامیہ کا دل ہے وہ — ماؤں کو اک اسوۂ کامل ہے وہ

طبقۂ نسواں کی ہے روح رواں
حسن سیرت اس کا کرتو بھی عیاں

حواشی

۱ نائب حق: اسرار خودی وغیرہ میں علی ابن ابی طالب سے مطلب ہے۔ طارق ''تفسیر خودی'' کے صفحہ ۶۹ میں لکھتے ہیں کہ اقبال امام مہدی آخرالزماں کو نائب حق کہتے ہیں۔

۲ اس شعر سے بت شکنی کی تلمیح ہے۔ مفکر اعظم سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''المرتضیٰ'' کے صفحہ ۵۶ میں فضائل علیؓ میں لکھتے ہیں:۔

''علی فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم اور رسولؐ گھر سے نکلے اور کعبہ کے در پر آئے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ اور میرے کاندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ جب ایسا کیا گیا اور آنحضرتؐ مجھے لئے ہوئے کھڑے ہوئے تو مجھے ایسا لگا کہ اتنا اونچا ہو رہا ہوں کہ آسمان کی بلندی تک پہنچ جاؤں گا۔ میں اس طرح کعبے کی چھت پر پہنچ گیا اور وہاں جو پیتل یا تانبے کا بت بنا ہوا رکھا تھا اس کو اپنے قابو میں لے آیا۔ رسولؐ نے فرمایا گرادو۔ میں نے گرادیا اور وہ ایسا چور ہو گیا جیسے شیشے کے بنے ہوئے برتن''

۳ آیت قرآنی ہے۔ و علم آدم الاسماء کلھا. یعنی آدم کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھادئے۔

۴ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے جو واقعۂ معراج کے بارے میں ہے۔ یعنی وہ خدا ہر عیب سے پاک و پاکیزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (آسمانی مسجد) کی سیر کرائی۔

۵ مشہور عالم دین شیخ عبدالحق دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوت میں لکھتے ہیں کہ خندق کی لڑائی میں حضرت علی مرتضیٰ سے ایسی شجاعت اور بہادری ظاہر ہوئی جو حد قیاس سے باہر ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ علی ابن ابیطالب کی ایک ضربت قیامت تک کے ثقلین کی عبادت سے افضل ہے۔

۷ حضرت مہدیؑ پردۂ غیب میں ہیں۔ امت مسلمہ کو ان کے ظہور کا انتظار ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔
دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت ہو جس کی نظر زلزلۂ عالم افکار
۷ سورۂ بقرہ کی تیسویں آیت ہے۔ میں ایک نائب زمین پر بنانے والا ہوں۔

۸ "Death overtake the Coward but never the brave untill his hour is Come."

۹ اقبال نے اپنے مجموعہ کلام (فارسی، اردو) میں اکثر و بیشتر حر اور حریت آزادی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے حیدر کرار، حسینؑ، حر، کربلا اور بتولؑ کو مسلمانوں کی بیداری، عمل صالح اور تربیت کے لئے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسرار خودی میں حر اور احساس حریت کا درس دیا۔ پیام مشرق میں ''مردِ حر'' کے عنوان سے ایک مستقل نظم شامل کی جس میں مرد حر اور حریت و آزادی کا فلسفہ پیش کیا۔ تاریخ اسلام میں حر کا کردار نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حر بن یزید الریاحی عرب کے ماہر فنون جنگ اور فوج یزید کے افسر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے کوفہ جاتے وقت امام حسینؑ کا راستہ روکا تھا۔ اگر وہ راستہ نہ روکتے تو واقعۂ کربلا کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی۔ حر نے ہی دوران گفتگو لجام فرس پر ہاتھ ڈالا۔ جب امام نے اعتراض کیا کہ تو حر نے خاموشی سے سر جھکا دیا اور کہا کہ میں پابند حکم ہوں۔ ۷ محرم سے آل محمدؐ پر پانی بند ہوا۔ حر خاموشی سے دیکھ رہے تھے ۹ محرم سہ پہر کو لشکر اعدا نے خوف و دہشت پھیلائی، حر مشاہدہ کر رہے تھے۔ امام نے عبادت کے لئے دشمن سے ایک رات کی مہلت مانگی، حر رات بھر اپنے ضمیر کا جائزہ لے رہے تھے۔ دسویں محرم کی صبح کو امام نے اتمام حجت کی۔ حر سوچ رہے تھے کہ حق کا ساتھ دیا جائے یا باطل کا۔ بالآخر حر نے باطل کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے سپہ سالار اور صفوف اعدا کے سامنے فوج حسینی میں شامل ہو گئے۔ امام سے جنگ کی اجازت لی اور مصروف جہاد ہوئے۔ لڑتے لڑتے زخمی ہوئے، سر سے خون کی چادریں بہنے لگیں، امام نے سر پر رومال فاطمہ باندھا، پھر میدان میں گئے سب سے پہلے شہید ہوئے۔

امیر تیمور ۷۹۵ ہجری (مطابق ۱۳۹۳ء) میں بغداد فتح کر کے کربلا میں روضۂ امام حسینؑ کی زیارت کرنے گئے، وہاں اس آیت قرآن کے مصداق کہ شہید مرتا نہیں، اللہ کے یہاں رزق پاتا ہے امام حسینؑ کی قبر کھلوانا چاہی۔ وہاں کے ذمہ دار لوگوں نے منع کیا، امام کی طرف سے بشارت ہوئی کہ حر کی قبر کھلوا کر دیکھو۔ جب قبر کھولی تو دیکھا کہ حر کے سر پر رومال فاطمہ بندھا ہوا تھا۔ اس پر تازہ خون کے دھبے تھے، رومال کا تھوڑا سا حصہ اپنے ساتھ لیا، بادشاہ جب ہندوستان آیا تو تبرک ساتھ تھا۔ آخر کار یہ اورنگ زیب کے پاس پہنچا۔ اس نے اس کے بارے ۱۷ شوال ۱۰۶۹ ہجری کو ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان حر

کے تبرک کے ساتھ عاشور خانہ خلوت مبارک حیدرآباد میں بحفاظت رکھا گیا ہے۔اس کی تفصیلات میری کتاب میر انیس کا شاہکار مرثیہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۱۰؎ صوفیائے کرام حضرت علیؑ کو تصوف کا موجد اور اللہ کا ولی کہتے ہیں۔علیؑ عالم اسلام کے ایک نڈر اور بہادر سپاہی تھے،ان کا قول تھا کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں میدان جنگ میں موت پر چھا جاتا ہوں یا موت مجھ پر واقع ہوتی ہے۔شب ہجرت بستر رسولؐ پر آرام کی نیند سوئے اور آیت ''و من الناس'' نازل ہوئی اور ایک آیت اللہ کے ولی کے بارے میں ہے۔''الا اِنَّ اَوْلِیاءَ اللّٰہِ لاَ خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلاَ ھُمْ یَحْزَنُوْن''

۱۱؎ علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی بنیاد حضرت علیؑ کی اس حدیث پر قائم ہے۔جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرار خودی و رموز بیخودی کے آغاز میں رومیؒ کے چند شعر درج کیے ہیں۔جن میں ذیل کا شعر قابل ذکر ہے۔

زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت　　　شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اقبال جاوید نامہ میں ''حکومت الٰہی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام　　　نے غلام او را نہ اوکس را غلام
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف　　　وصل و فصلش لاَ یَرْعیٰ لاَ یَخاف

یعنی نائب حق میدان جہاد میں بغیر کسی خوف وخطر کے عدل وانصاف سے کام لیتا ہے۔اس کی مثال حضرت علیؑ کے عدل کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ عرب کا ایک قوی ہیکل پہلوان جو توانائی میں ایک ہزار پہلوانوں کی طاقت رکھتا تھا،جہاد میں علیؑ سے نبرد آزما ہوا۔علیؑ نے اس کو مغلوب کیا،اس کے سینے پر چڑھے اور تلوار چلانے ہی والے تھے کہ اس نے انتہائی بدتمیزی کی۔علیؑ نے اس کو چھوڑ دیا،اس نے پوچھا کہ پہلے میں نے کوئی بے ادبی نہیں کی،آپ مجھے قتل کرنے والے تھے۔اب گستاخی کی تو آپ نے چھوڑ دیا۔علیؑ نے فرمایا ''پہلے مارتا تو اللہ کی راہ میں جہاد ہوتا۔اب مارتا تو اس میں انتقام کا جذبہ کارفرما ہوتا۔'' مولانا رومی نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔چند شعر یہ ہیں۔

از علی آموز اخلاص عمل　　　شیر حق را داں منزہ از دغل
چوں تو با بے آں مدینہ علم را　　　چوں شعاعی آفتاب حلم را
در عزا بر پہلوانے دست یافت　　　زود شمشیرے بر آورد و شتافت
او خدو انداخت بر روئے علی　　　افتخار ہر نبی و ہر ولی
در زماں انداخت شمشیر آں علی　　　کرد او اندر غزایش کاہلی

گشت حیراں آں مبارز در عمل — از نمود عفو و رحم بے محل
گفت بر من تیغ تیز افراشتی — از چہ افگندی مرا بگذاشتی
گفت تیغ از پئے حق می زنم — بندۂ حقم نہ مامور تنم
شیر حقم، نیستم شیر ہوا — فعل من بر دین من باشد گوا
زیں سبب پیغمبرؐ با جتہاد — نام خود دان علی مولا نہاد

گفت ہر کس را منم مولا و دوست
ابن عم من علی مولائے اوست

۱۲؎ کتب تاریخ میں حضرت علیؑ کا معجزہ ''رجعت آفتاب'' مشہور ہے۔ مدارج النبوت میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام خیبر کی لڑائی سے واپس آ کر منزل صہبا میں وارد ہوئے تو بعد فراغ نماز عصر حضرت علی کے زانو پر سر رکھکر سو گئے۔ اسی حال میں آثار وحی ظاہر ہونا شروع ہوئے اور علی عصر کی نماز نہ پڑھ سکے۔ وحی کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ جب حالت نزول وحی ختم ہوئی تو رسولؐ نے پوچھا کہ تم نے نماز عصر پڑھی؟ عرض کیا نہیں۔ جناب رسالت مآب نے بارگاہ احدیت میں دعا فرمائی کہ خداوندا! علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مصروف تھا۔ آفتاب کو اس کے لئے پھر طالع فرما تا کہ وہ عصر کی نماز پڑھ لے۔ قادر مطلق نے اپنے حبیب کی دعا قبول فرمائی۔ آفتاب پھر نمودار ہوا اور علی نے نماز ادا کی۔''

۱۳؎ مولانا علی میاں المرتضٰی میں ''اسرار علی'' کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''حضرت عمر فرماتے تھے اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ علی مشکل مسائل کے حل اور گتھیوں کے سلجھانے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتے تھے۔ علی کے زندہ جاوید کارناموں میں ایک ایسا کام ہے جو اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اسلام اور امت اسلامیہ دنیا میں باقی ہے، وہ اسلامی تقویم (کلنڈر) کی بنیاد مقرر کرنا ہے۔ رسولؐ کے بعد علی سے زیادہ کوئی فصیح البیان نہ تھا۔ خطابت میں تنہا و یکتا تھے۔ بڑے زبان آور قادر الکلام اور حکیم تھے۔ حکمت کے سوتے ان کے بیان سے پھوٹتے تھے۔ وہ خطیب تھے، بلاغت کا دریا ان کی زبان سے رواں تھا۔ واعظ تھے، قلب و نگاہ پر چھا جانے والے، روان و شاداب قلم جن کے دلائل بڑے قوی و عمیق ہوتے تھے۔ کلام و بیان پر اس درجہ قدرت تھی کہ جس بات کو چاہتے اور جس طرح چاہتے ادا کرتے۔ اس پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے کہ آپ مسلمانوں کے سب سے بڑے خطیب اور انشاء پردازوں کے امام تھے۔ اس کی مثال نہج البلاغہ پیش کی جا سکتی ہے۔ علیؑ روئے

زمین پر بسنے والے انسانوں میں سب سے اعلیٰ وافضل تھے۔ سب سے زیادہ دنیا سے بے غرض اور بے رغبت۔ سب سے زیادہ علم وفضل کے حامل۔ سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والے انسان تھے۔ علی کعبے میں پیدا ہوئے، مسجد میں شہید۔ جب ملجم نے سجدے میں زہر آلود تلوار چلائی تو فرمایا "فزت برب کعبہ" رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا ہوں۔" یہ ہیں اقبال کے نائب حق کے چند اوصاف۔

۱۴۱ اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں۔ اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "و فدیناہ بذبح عظیم" کہکر امام حسینؑ کو ذبح عظیم کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ حضرت علی فرماتے ہیں "اگر خواستمی از تفسیر باء بسم اللہ ہفتاد شتر بار کردمی" یعنی اگر میں چاہوں تو ستر اونٹ سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے بار کر سکتا ہوں۔ علی کے علم کی نسبت ابن عباس کہتے ہیں کہ نہیں ہے میرا علم اور تمام اصحاب کا علم علی کے مقابلے میں مگر اس قطرہ کی مثل جس کو ساتوں دریاؤں کے سامنے رکھا جائے۔ جس کا ارشاد ہے کہ آسمان کی تمام کتاب کے کل اسرار قرآن مبین میں ودیعت ہیں۔ اور جو کچھ قرآن میں ہے وہ سب سورۂ حمد میں ہے اور جو کچھ سورۂ حمد میں ہے وہ بسم اللہ میں موجود ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے، وہ بائے بسم اللہ میں رونما ہے اور جو کچھ بائے بسم اللہ میں ہے وہ بے (ب) کے نقطے میں ہے۔ اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھکر فرمایا "و انا النقطة تحت الباء" یعنی بائے بسم اللہ کا نقطہ میں ہوں۔ مزید تفصیلات کے لئے اقبال کی نظم بعنوان "سپاس جناب امیر" مطبوعہ مخزن بابت جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴۷-۴۸ دیکھی جاسکتی ہے۔ اقبال یہ نظم نماز فجر کے بعد بطور دعا پڑھا کرتے تھے۔

اقبال اور مہاراجہ کشن پرساد شاد حیدرآبادی

مہاراجہ کشن پرساد شاد یمین السلطنت اور مدار المہام (۱۸۶۴ء-۱۹۴۰ء) اردو کے ایک قادر الکلام شاعر، ممتاز نثر نگار اور اردو ادب کے مربی تھے۔ ان کی آغوش رفاقت میں شعراء اور ادباء کی ایک بڑی تعداد پروان چڑھی۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور عربی سے کما حقہ واقف تھے۔

مولانا حالی نے ان کو اپنا مسدس سنایا۔ مولانا شبلی نے ''شعر العجم'' کا تحفہ پیش کیا۔ علامہ اقبال نے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' سمجھائے اکبر الہ آبادی نے ان کو حکیمانہ شعر سنائے۔ پیارے صاحب رشید اور دولھا صاحب عروج نے ان سے اپنی مرثیہ گوئی کی داد پائی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ان کی ڈیوڑھی پر برسوں براجمان رہے۔ علامہ نظم طباطبائی ان کے ممنون تھے تو جلیل مانکپوری ان کے شکر گذار۔ اختر مینائی انہی کے فیض سے چمکے۔ ترک علی شاہ ترکی اور مولانا گرامی نے یہیں نام پایا۔ غبار انہی کے خوان کرم کے زلہ بار تھے۔ ثاقب نے یہیں اپنی خوش کلامی اور شاعری کے داؤ پیچ کے جوہر دکھائے۔ دتو رام کوثری نے انہی کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا تھا

گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

جوش کی رندانہ شاعری کی انہوں نے قیمت ادا کی۔ فانی کو ان کی قدر دانیوں سے بقا نصیب ہوئی۔ غرض دکن کے شاعر ہوں یا باہر کے وہ اپنے کلام کی داد حضرت شاد ہی سے پاتے تھے۔ بقول اقبال:-

''خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خرقہ پوش امیروں کی ہم بزمی میسر ہے۔ امارت، عزت، آبرو، جاہ و حشمت عام ہے۔ مگر دل ایک ایسی چیز ہے کہ ہر امیر کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔''

شاد صوفیانہ مشرب رکھتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے انہیں ''خماری شاہ'' کے لقب سے نوازا تھا۔ مندروں میں قشقہ لگاتے، مسجدوں میں نماز پڑھتے، مجالس عزا میں اشک بہاتے اور حال وقال کی محفلوں میں سر دھنتے تھے۔ نعتیں، منقبتیں، مرثیے لکھ کر انہوں نے اپنی عقیدت و

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر (حیدرآبادی)

ارادت اور دل گدازی کا ثبوت دیا۔ مثنوی ''جلوۂ کرشن'' میں بانسری کے نغمے سنائے۔ اپنے مسلک کے بارے میں کہتے ہیں۔

میں ہوں ہندو، میں ہوں مسلماں	ہر مذہب ہے ایماں میرا
شآد کا مذہب شاد ہی جانے	آزادی آزاد ہی جانے

شآد اپنے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کو ۲۴ فروری ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''کیا آپ نے بھی اب تک اس فقیر ''کشن پرشاد'' کے نام ہی کو اپنے دائرۂ خیال کا مرکز قائم کر رکھا ہے؟ غالباً ایسا نہ ہوگا۔ میرے مفہوم میں غلطی ہوگی۔ مگر مولانا! دنیا کے یہ ڈھکوسلے برائے نام ہیں۔ بشر وہی ہے جس نے اپنی ظاہری نام و نشان کے مٹانے کی کوشش کی۔ مادّوں کے گرد و غبار سے ہمیشہ دامن دل کو پاک رکھا، افتراق و تفریق کے بدنما داغوں سے بچاتا رہا۔ ہر مذہب کو اپنا مذہب، ہر ملت کو اپنی ملت سمجھا اور اس امر کو باور کرلیا کہ جس قدر راہ رو ہیں، سب کی منزل ایک ہی ہے۔ شارع عام سے جائیں یا پگڈنڈی سے۔

ہوئے ایک دیر و حرم کے مسافر
کچھ اس راہ چل کر کچھ اس راہ چل کر

اور اگر اس منظر خاص و عام پر ذرا بھی تحقیق کی گہری نظر ڈالی جائے تو شارع عام ہے نہ پگڈنڈی ہے۔ نہ یہ کٹے ہوئے پتھر کی ہموار سڑک ہے، نہ وہ کانٹوں بھرا ناہموار راستہ۔ وہی ایک جادۂ توحید ہے جس پر سالکان راہ حقیقت ازل سے چلے آرہے ہیں۔ اور خضر طریقت بن کر ہر قافلے کو منزل مقصود کا نشان بتا رہے ہیں۔ خواہ وہ کسی قوم، کسی ملک، کسی بعثت کے کیوں نہ ہوں۔ ''لکل قوم ھاد'' ان کا مرکز اصلی ہے۔ راہ ہفت خواں بلکہ ہفتاد خواں ہی کیوں نہ ہو۔ ان کا قدم کبھی ڈگمگا نہیں سکتا۔ نہ کوئی سر بہ فلک کشیدہ پہاڑ، عام اس کے کہ ہمالیہ کی چوٹی ہو یا فاران کی۔ ان کے لئے سد راہ ہوسکتا ہے نہ کسی دریائے ناپیدا کنارہ کا طوفان خیز سیلاب، بحیرۂ ہند کا ہو یا بحیرۂ عرب کا۔ ان کے لئے سد سکندری

بے شک خدا کے سچے رسول حقیقی نائب ہیں جو شمع وحدت ہاتھ میں لئے ہوئے گم کردگان راہ حقیقت کو شرک و جہل کی تیرہ و تاریک غار سے نکال کر سلوک و عرفان الٰہی کے روشن اور وسیع میدان میں لا رہے ہیں اور ''یومنون بالغیب'' کا مژدۂ دل کش سنا رہے ہیں۔ مجاز سے حقیقت کی طرف لانا ان کا نصب العین ہے۔ علمائے ظاہر کسی مذہب کے کیوں نہ ہوں، بہ مصداق ''العلماء ورثۃ الانبیاء'' انہیں

قدم بقدم چل کر جادۂ اطاعت پر ثابت قدم رہنے کی ہدایت میں مصروف ہیں۔

علمائے باطن کا اصل مقصود محض عشق حقیقی ہے جو بادی النظر میں شرائط ظاہری سے آزاد اور ترک سواء و ماسوا اس کی بنیاد۔

عاشقاں را ملت و مشرب خداست مذہب عشق از مذہب ہائے جداست

ہیچ ناید در نظر جز ذات او ما و تو جملہ بود آیا او

اوست خواجہ اوست بندہ اوست شاؔد اوست پیرو او مرید و او مراد

کائنات ہر دو عالم یک ہوس

ایں ہوس تا چند، بس اللہ بس

لیکن فی الحقیقت طریقت و شریعت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مہربان آپ کا خیال درست ہے کہ ہر شخص اپنی قوم کو سراہتا ہے اور اپنے مذہب کی تعریف کرتا ہے۔ مگر افسوس ہے ایسے مذہب والے پر کہ ''خذ ما صفا و دع ما کدر'' کو چھوڑ دے۔ وحدت الوجود کے مسئلے کو مجھ جیسے نادان نے بہت آسان سمجھا۔ دو چار مرید ہو گئے اور گیروا لباس پہنا اور بھنگ کا پیالہ اڑایا۔ پس نعوذ باللہ ہمہ اوست کا نعرہ لگایا اور ادھر کفر و شرک، تو تو، میں میں، میرا تیرا کے پھیر میں ایسے مبتلا کہ دنیا دار بھی نہ ہوں گے۔ جب توحید حق ہے، تو اب آپ ہی فرمائیں کہ عارف کے لئے کس قدر مقام نازک ہے کہ بجز سکوت کے نہ وہ کسی کو برا کہہ سکتا ہے نہ کسی کو اپنا دشمن سمجھ سکتا ہے۔ اگر ایک قطرے کے وجود کو بھی وہ غیر سمجھے اور ایک خار سے بھی خار دکھائے تو اس کی موحدی رفو چکر۔ پس بجز سکوت اور حیرت کے کیا کہہ سکتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ ہدایت کے لئے پیدا ہوئے اور مامور من اللہ تھے۔ انہوں نے تعلیماً اور تفہیماً شب کے مقابل دن، دن کے مقابل شب بتائی اور برے کے مقابل نیک، نیک کے مقابل بد بتلایا۔ مگر ہدایت پر ان کی غور کیجیے تو کسی میں انہوں نے اسلام کو یہ تعلیم نہیں دی جس کو آج لوگ تعلیم سمجھ کر اس پر چل رہے ہیں۔ بتلائے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی کیسی کیسی رعایتیں ہوتی تھیں۔ چوٹ آئی ہے، خون بہہ رہا ہے، سخت تکلیف ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حق میں آپ بد دعا کریں۔ تصدق اس برزخ کبریٰ کے اور حقیقت الوجود کے کہ رحیم کا مظہر ہے۔ فرمایا کہ نہیں۔ درستی پر آ جائیں گے اگر یہ زندہ رہیں گے تو ان سے جو اولاد ہوگی وہ خدا کو پوجے گی اور مانے گی۔ الغرض مخالفین نے کیا کیا بے ادبیاں نہیں کیں اور آپ نے کیا کیا رحم نہیں کیا۔ اس تعلیم اور روشنی کو اور آج کی روشنی اور تعلیم کو دیکھیے ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' یار کے دو زلف، کس کو برا کہیں اور کس کو بھلا۔

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہ لا شریک لہ گویاں

شادان ہی جھگڑوں سے گھبرا کر اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر آزاد ہو گیا۔ اگر دیکھا تو صرف صوفیان باصفا کے ایک گروہ کو پیارا اور بے لوث پایا۔ اس لئے اسی کو اختیار کیا اور دعا کرتا ہوں کہ خدا اپنی وحدت پر رکھے اور اپنی محبت اور توحید پر چلائے اور آخری سانس بھی اقرار توحید پر یار کے درشن کرتے ہوئے نکلے۔ ....قید ما و من اور کفر و اسلام سے بری ہوں اور خدا بری رکھے۔ بغض سے بچائے۔''

علامہ اقبال کی طرح شاد بھی محمدؐ و آل محمدؐ کے سچے فدائیوں میں تھے۔ شاد کا ایک سفر نامہ نظر سے گذرا۔ اس کا نام ہے ''سیر و سفر''۔ اسے ½۹×۶ میں سید نظیر الحسن جوش بلگرامی (م-۱۹۵۵ء) نے ۳۳۴ صفحوں میں ۱۹۱۷ء میں شائع کیا تھا۔ دوران سفر میں کسی انجمن کے اراکین جلسہ نے شاد کو میلاد میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے فی البدیہہ ۱۳۰ اشعار کا ایک قصیدہ کہا جو سفر نامہ میں درج ہے۔ چند شعر محمد علیہ السلام کی تعریف میں ملاحظہ ہو۔

تم پر صلوٰۃ وسلام اے شہ ہر دوسرا ۔۔۔ احمدؐ طٰہٰ لقب مہبط وحی خدا
ذرے کو بھی آپ نے دم میں کیا آفتاب ۔۔۔ کیسی نوازش ہے یہ کیسا لطف آپ کا
مجھکو کہاں سے کہاں کھینچ کے لایا یہاں ۔۔۔ ابر کرم فیض بخش بحر سخا و عطا
محفل میلاد میں ہو گئی جب حاضری ۔۔۔ بڑھ گئی عزت مری بڑھ گیا رتبہ مرا
ہوں میں اک ادنیٰ فقیر کہتے ہیں گو سب امیر ۔۔۔ ہے وہی مالک مرا بندہ ہوں میں باوفا

مومن اگر وہ نہیں تو نہیں کافر بھی شاد
صوفیوں نے فیصلہ اس کا کبھی تو کر دیا

شاد کو ہندو ہونے کے باوجود رسولؐ اور اہلبیت رسالت سے والہانہ عقیدت تھی۔ حضرت علیؑ، جناب فاطمۃ الزہراؑ اور حضرت امام حسینؑ کی مدح میں انہوں نے بہت کچھ کہا۔ اور جو کچھ کہا خلوص سے کہا۔ اس میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی یا ریا کاری کو ہرگز دخل نہیں تھا۔ انہوں نے مرثیے بھی کہے۔ علامہ اقبال کی تعلیمات کے زیر اثر شاد نے عثمانیہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر کہا تھا:-

''حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام جیسی مقدس ہستی، عارف باللہ اور محقق کا عارفانہ قول ہے کہ علم تین چیزیں سکھاتا ہے۔ یعنی حق شناسی، عالم شناسی اور خود شناسی۔ حق شناسی کے ساتھ خود

شناسی پیدا ہوتی ہے۔''

علیؑ کی منقبت میں یہ رباعی قابل ذکر ہے۔

معلوم ہوئے علیؑ سے اسرار خدا
اور سرّ فکان قاب قوسین کھلا
اے شاؔد یہ مسئلہ بھی حل نہ ہو سکا
اللہ علی ہے یا علی ہے مولا

''جام جہاں نما'' ایک اور سفر نامہ ۱۳۳۵ ہجری (۱۹۱۸ء) میں محبوب پریس علاقہ پیشکاری حیدر آباد میں شائع ہوا تھا۔ مہاراجہ نومبر ۱۹۱۶ء سے مارچ ۱۹۱۷ء تک بمبئی کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ دوران سفر میں موصوف کو حضرت علیؑ کا دیوان زیر مطالعہ رہا۔ انہوں نے ۱۳ قطعات کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا۔ صفحہ ۷۰ میں لکھتے ہیں:۔

''میں خورد سالی سے ایک آزد منش سپاہی آدمی ہوں۔ میرا مشرب بالکل صلح کل رہا۔ اور انشاء اللہ تادم زیست رہے گا اور میرا دین توحید ذات باری ہے اور میں موحدوں کا دل سے بندہ، صوفیوں کا خادم عارفوں کا دست گرفتہ، محققوں کا نظر کردہ ہوں۔ اگر ہر سانس پر خدا مجھے مار کر زندہ کرے تو میری یہ دعا ہے خدا مجھے موحد رکھے۔ صلح کل کے ساتھ ہر شخص کا معاملہ دین وایمان کا اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ جو وحدہ لاشریک ہے۔''

تمام صوفیاء کرام حضرت علیؑ کی ذات کو علم تصوف کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور فخر سے اپنے کو ان کے نسب سے وابستہ کرتے ہیں۔ شاؔد نے ایک رسالہ ''اقوال حضرت علیؑ'' کے نام سے لکھا جو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ رسالے سے حضرت امیرؑ کے بارے میں شاؔد کی والہانہ محبت ٹپکتی ہے عرصہ ہوا کہ اس کا ایک نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد کی مطبوعات میں نظر سے گذرا تھا۔ یہاں شاؔد کے دستخط سے ان کی تصانیف کا ایک انبار موجود ہے۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں میری نظر سے شاؔد کی چھوٹی بڑی کتابیں جو گزری ہیں ان کی تعداد نوے اور سو کے درمیان تھی۔ شاؔد کی غالباً سب سے پہلی کتاب ''تاریخ گلبن'' مجموعہ کلام مطبع برہانیہ حیدر آباد دکن سے ۱۳۱۳ ہجری (مطابق ۱۸۹۵ء) میں چھپی تھی۔ شاؔد نے خود اس کی تاریخ طبع کہی تھی۔

گر شود مطبوع طبع شاہ شاد
نیک گرد جملہ قیل و قال او
در زمان میمنت چوں گشت طبع
''گلبن تاریخ'' گفتم سال او
۱۳۱۳ھ

خواجہ حسن نظامی نے محرم نامہ شائع کیا۔ اس کے آخر میں شاؔد کا ایک پر مغز مقالہ امام حسینؑ کے کردار وعمل اور واقعۂ کربلا میں ان کی شہادت سے متعلق شامل کیا گیا۔ خواجہ صاحب اس

بارے میں لکھتے ہیں:-

''مجھے تعجب ہے کہ ایک ہندو شاعر، دانشور، رئیس ابن رئیس اور وزیر اعظم کے قلم سے امام مظلوم کے بارے میں ایسے لاجواب اور تابناک جملے کیوں کر نکلے۔ یہ جملے ایک مسلمان سے نکلتے تو کوئی حیرانی نہ ہوتی۔ امام حسینؑ امت مسلمہ کے پیشوائے دین اور پیغمبر اسلامؐ کے نواسے ہیں۔''

خواجہ صاحب نے محرم نامہ پر شادؔ کی رائے طلب کی تھی۔ شادؔ نے ''دین حسینؑ'' کے عنوان سے ایک معرکہ آرا مقالہ ۶×۶ ½ کے سائز کا ۳۹ صفحوں میں لکھا۔ جسے احمد حسین جعفر علی نے احمد یہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ شادؔ نے اس میں امام حسینؑ کی شہادت اور کربلا کے واقعات بیان کئے۔ ابتداء ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

خود شاہ ہے حسینؑ خلافت کا ذکر کیا
اسلام سچ پوچھو تو دین حسینؑ ہے

شادؔ نے دین حسینؑ کا مقالہ خواجہ صاحب کی فرمائش سے لکھا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کو محرم نامہ کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۸ء میں شامل کر کے شائع کیا۔ شادؔ کے درج ذیل الفاظ سے اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ الٰہی فلسفہ شہادت حسینؑ کا کس قدر گہرا مطالعہ اوران کے دل میں امام عالی مقام کی عقیدت کتنی بے پناہ تھی:-

''حسینؑ پر فدا ہو۔ حسینؑ کے نام پر جان نثار کرو۔ دشت کربلا کی خاک کو خاک شفا مانو۔ ناروا کوششوں سے باز آؤ۔ آپس کی کدورتوں میں آگ لگا کر اسے خاک میں ملاؤ۔ حسینؑ کا نام جپو۔ حسینؑ کا کلمہ پڑھو۔ حسینؑ نے راہ خدا میں خون بہا کر شہنشاہی حاصل کی اور خدائی کے مختار بن بیٹھے اور تم خلافت کو لئے بیٹھے ہو''؟

شاد کا ایک معرکہ آرا مضمون ''شہید اعظم'' کے عنوان سے سرفراز لکھنؤ کے محرم نمبر بابت ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۵ء) میں میری نظر سے گذرا ہے۔ مضمون خاصا طویل ہے۔ یہ بھی اقبالؔ سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ابتدائی جملے درج کئے جاتے ہیں:-

''نہ فقط دنیائے اسلام بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعہ روح فرسا ارض نے نوا ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہوسکتا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس سے بنی نوع انسان انسانی تکمیل کے واسطے ہر قسم کی نصیحت اور سبق حاصل کر سکتا ہے۔''

شادؔ نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب ''ہندو مرثیہ گو شعراء'' دیکھی جاسکتی ہے۔

شادؔ کے دور اقتدار میں عظیم الشان مشاعرے ہوتے تھے۔ آغا شاعرؔ قزلباش دہلوی

داغ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۰ء کے ایک مشاعرے کا چشم دید واقعہ اپنے مضمون ''بزم داغ کے چشم دید نقوش'' ماہنامہ ''آفتاب'' (جھالرواڈ ریاست راجپوتانہ) بابت ستمبر ۱۹۲۱ء اور بعد کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع کیا۔ لکھتے ہیں کہ

''جب میں حیدرآباد پہنچا...... تو سب سے پہلے دیوان چندو لال سرگباش کی بارہ دری میں بصدارت مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ایک مشاعرے میں استاد (داغ) مرحوم و مغفور کی زیارت سے مشرف ہوا..... ایک بلند و بالا وسیع عمارت قالینوں کے فرش سے آراستہ تھی۔ عین شہ نشیں میں تین حلقے تھے۔ پہلا امراء و روساء کا، دوسرا شعراء کا اور تیسرا حصہ معزز سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام شہر کے اہل ذوق اور نمودار لوگ درباری پوشاک سے آراستہ، سنہری پٹیاں لگائے دستار بند دونوں زانو صف بستہ تھے۔ باوصفیکہ شیشہ آلات، جھاڑ فانوس جگمگا رہے تھے۔ مگر اس پر بھی نور محفل شمع کافوری سنہری گلدان میں بے پردہ حلقۂ شعراء میں گردش کرنے کے لئے لائی گئی۔ بیرون حلقہ چوبدار، نقیب، حاجب اور خدام جھلا جھل کی وردیاں پہنے زریں کمر استادہ، بارہ نبی تلواروں کا پہرہ تھا جو سیاہ فام، قد آور حبشی تلنگوں کی طرح دے رہے تھے، جن کی متوحش صورتیں ہی دیکھکر اکثر مضامین خبط ہو جاتے ہیں۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے شب کے یہ بھری پری انجمن اپنے صدر کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوئی۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد جو اس وقت مدار المہام بھی تھے ایک صوفیانہ پوشاک پہنے اراکین کے جھرمٹ میں خراماں خراماں رونق افروز ہوئے۔ جلسے کی صفیں قد آدم دیوار کی طرح باادب استادہ ہو گئیں اور جناب شاد بہادر نیک تپاک سے دورویہ سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے مقام صدر پر آئے۔ بیٹھے تو اسی طرح دوزانو جس طرح تمام حاضرین کی نشست تھی۔ میر مشاعرہ نے مصرعہ مطروحہ پڑھکر گلدان آگے بڑھا دیا۔ شمع گردش میں آئی، مبتدی غزل سرائی کرنے لگے اور حاضرین مہذبانہ طور پر داد سخن دینے لگے۔''

شاد بسیار نویس تھے۔ ان کی منظومات اور نثری مضامین اکثر و بیشتر رسالوں میں میری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں حسن حیدرآباد، ادیب حیدرآباد، دکن پنچ، مخزن لاہور، زمانہ کانپور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اگر یہ مضامین یکجا کر کے ترتیب دئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔

شاد نے متعدد شعراء کے انتقال پر تاریخیں کہیں۔ ان میں موصوف کے دلی جذبات کی گہرائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ۷ محرم ۱۳۳۲ء کو سید علی حیدر نظم کا انتقال ہوا۔ ان کی موت سے متاثر ہو کر

زمانہ کانپور جلد ۶۱ نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۵۸ میں شاد کا ایک مرثیہ بعنوان ''علامہ نظم طباطبائی کی یاد میں'' شائع ہوا۔ مرثیہ کے ساتھ درج ذیل عبارت بھی موجود ہے:۔

''۲۶ راگست ۱۹۳۳ء کی شام کو نظام کالج حیدرآباد میں زیر صدارت مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم باب حکومت دکن کالج کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے علامہ سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں حضرت شاد بالقابہ نے اپنے شفیق و محترم استاد کے واقعات زندگی کو دہراتے ہوئے علامہ مرحوم کی قومی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک ہزار روپے کی گراں قدر رقم عطا فرمائی اور حاضرین جلسہ کو ایک پرسوز و پردرد تاریخی مرثیہ سنایا جس کے چند بند ہدیہ ناظرین ہیں۔''

نمونے کے طور پر دو بند حاضر ہیں۔

موت ایسے باکمال کی ہے علم وفن کی موت | ہے انجمن نواز کی موت انجمن کی موت
بلبل نہیں تو گل کی ہے رحلت، چمن کی موت | ہاں جب سخن طراز نہ ہوئے سخن کی موت

مرنے سے نظم کے ہوا دل شق ہزار حیف
بزم ادب کی اٹھ گئی رونق ہزار حیف

ہندوستاں میں نظم کی ہستی تھی منتخب | تھی گرم ان کے فیض سے یہ محفل ادب
لکھی ہیں شاد تم نے یہ تاریخیں بھی غضب | بزم ادب جناں میں ہوئی پہونچے نظم جب

۱ ۵ ۳ ۱ ھ

صد حیف داغ رنج جگر کا ابھر گیا
۱۹ ۳ ۳

افسوس کیا ادیب جہاں سے گذر گیا
۶ ۴ ۳ ۱ ف

شاد اقبال کے دلدادہ تھے۔ تمام معاصر شعرائے اردو میں وہ کلام اقبال سے اتنا متاثر ہوئے تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ۱۹۰۴ء کا زمانہ تھا کہ اقبال کی ایک غزل ظفر علی خان نے اپنے ماہنامہ ''دکن ریویو'' بابت اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۲۴ میں ۱۹ شعر میں شائع کی تھی۔ مطلع یہ ہے۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے میں نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

اقبال کی غزل سے متاثر ہو کر شاد نے ۲۵ شعر کی ایک غزل اقبال کے تتبع میں لکھی جو ''دکن ریویو'' بابت

نومبر و دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰ میں شائع ہوئی۔ مطلع یہ ہے۔

یہ سب دیر و حرم کے لوگ اپنے دیکھے بھالے ہیں
عدم آباد اک بستی ہے واں کے رہنے والے ہیں

غزل کی تمہید میں ظفر علی خان (ایڈیٹر دکن ریویو-حیدر آباد) لکھتے ہیں:-

''اگست کے دکن ریویو میں ہمارے دوست مکرم پروفیسر اقبال کی جو غزل شائع ہوتی تھی اس کی بلاغت و لطافت ارباب ذوق پر ظاہر ہوئی ہوگی۔ پچھلے دنوں جب ہمیں ایوان وزارت میں حاضر ہو کر ہز ایکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد بالقابہم کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوا تو جناب وزارت مآب نے فرمایا کہ غزل اقبال جناب ممدوح کو اس قدر پسند آئی کہ آپ نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی۔ یہ غزل جو جناب وزارت مآب نے دکن ریویو کے لئے مرحمت فرمائی ہے نہایت مسرت و افتخار سے درج کی جاتی ہے۔''

شاد کی غزل کا ردعمل یہ ہوا کہ ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال جب حصول تعلیم کے لئے یورپ کا سفر کر رہے تھے تو بحیرۂ روم کے دلچسپ نظارے سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک غزل موزوں کی۔ مطلع یہ ہے۔

مثال پرتو مے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

اقبال نے غزل کے ۶ شعر بانگ درا سے حذف کئے۔ انہی میں ایک محذوف شعر میں اقبال نے وزیر نظام کی قدردانی کا تذکرہ یوں کیا۔

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیونکر
پسند ان کو وزیر نظام کرتے ہیں

وزیر نظام سے مراد مہاراجہ کشن پرشاد شاد ہے۔

غزل کے تقریباً پانچ سال کے بعد مارچ ۱۹۱۰ء میں جب اقبال پہلی مرتبہ حیدر آباد گئے تو مہاراجہ سے ملاقات ہوئی۔ اقبال موصوف کی مہمان نوازی اور اخلاق حمیدہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لاہور پہونچ کر ایک طویل قصیدہ ۳۹ شعر کا نظم کیا جو مخزن لاہور بابت جون ۱۹۱۰ء میں شیخ عبدالقادر کی تمہید سے شائع ہوا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں:-

''دکن کے علم دوست اور ہنر پرور وزیر اعظم کی اس خوبی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے

کہ اہل علم کی قدر دانی ان کا شیوہ اور مشاغل علمی سے انہیں شغف ہے۔ انہوں نے جو الطاف نامہ شیخ محمد اقبال صاحب کو لکھا اس سے نہ صرف شیخ صاحب موصوف کی قدر افزائی مقصود تھی بلکہ ان کی شاعری کے لیے ایک زبردست تحریک، جس کے لئے میں بھی غائبانہ طور پر مخزن کے ناظرین کی طرف سے ہز کسلنسی مہاراجہ صاحب بہادر کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اقبآل نے خود بھی اپنے ممدوح کے قصیدے کی ابتداء میں ذیل کا تمہیدی نوٹ بھی درج کیا ہے:-

"گذشتہ مارچ میں مجھے حیدر آباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانہ وزارت پر حاضر ہوئے اور عالی جناب ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد شاد بہادر جی، سی، آئی، ای یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شآد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز اکسلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میرے لوح دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اسی عنایت بے غایت کے شکریے میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے۔ انہیں زبان قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔"

قصیدہ کے ابتدائی نو شعر "نمود صبح" کے عنوان سے بانگ درا میں شامل کئے گئے۔ بقیہ تیس شعر حذف کئے گئے ہیں۔ ان ہی میں سے ذیل کے شعر حیدر آباد اور میر محبوب علی خان نظام دکن کی تعریف میں ہیں۔

خطۂ جنت فزا جس کا ہے دامنگیر دل — عظمت دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسم اعظم محبوب کی تاثیر سے — وسعت عالم میں پائی صورت گردوں وقار
نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں — آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

اقبال کے ذیل کے شعر مہاراجہ صاحب کی تعریف میں ملاحظہ ہوں۔

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر — بڑھ گیا جس سے مرا ملک سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت — آسماں اس آستانے کی ہے اک موج غبار
کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری — چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم — روشن اس کی رائے روشن سے نگاہ روزگار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستان شاعری — اس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار

ہے یہاں شان عمارت پردہ دار شان فقر — خرقہ درویشی کا ہے زیر قبائے روزگار

شکر یہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے

مدح پیرائی امیروں کی نہیں میر اشعار

اقبال نے ایک اور نظم ''گورستان شاہی'' کے عنوان سے حیدرآباد کے متعلق کہی تھی جو مخزن کے اسی شمارے (جون ۱۹۱۰ء) میں ایڈیٹر مخزن کی اس تمہید سے شائع ہوئی۔

''یہ ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے۔ اس کا ایک ایک مصرعہ درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے واہ نکلتی ہے۔ اس نظم کے میسر آنے کے لئے ہم اپنے قدیم عنایت فرما مسٹر حیدری کے ممنون ہیں، جن کے صحیح مذاق علمی نے شیخ محمد اقبال صاحب کو حیدرآباد میں وہ چیزیں دکھائیں جو ایک خلاق شاعر کے دل پر قدرتی طور پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ سلاطین قطب شاہیہ کے مزار، ان کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شب ماہ مگر ایسی شب جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور وظلمت میں لڑائی ٹھنی رہی تھی۔ سچے شاعرانہ جذبات کے نشو ونما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اتارا ہے، انہی کا حصہ ہے۔''

خود اقبال نے اس نظم کا تعارف مخزن میں یوں کرایا تھا:۔

''حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی-اے معتمد محکمۂ فینانس، جن کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربے سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے، مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آئی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور اس کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدرآباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔''

تین سال کے بعد جولائی ۱۹۱۳ء میں جب مہاراجہ بہادر پنجاب کی سیر کرنے لاہور پہنچے تھے تو دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شاد اپنی کتاب سیر پنجاب (ص ۹۱ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ ۱۹۲۳ء) میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''پانچ بجے شام کے میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء آئے۔ بہت دیر تک لطف صحبت رہا۔ بڑے مزاج کے آدمی ہیں۔ خدا زندہ رکھے۔ برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہ کا مزاج اچھا نہیں ہے، اس لئے حسب مشورہ ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر محمد حسین کو جو لاہور کے نامی ڈاکٹر ہیں طلب کر کے دکھایا.....
نو بجے پھر ڈاکٹر محمد اقبال آئے اور ان کے اصرار سے معہ دو مصاحبوں کے آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں گیا۔''

اقبال کا دوسرا سفر حیدر آباد پھر اس وقت ہوا جبکہ مہاراجہ صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدے پر دوبارہ فائز ہو چکے تھے۔ موصوف اس سفر کے بارے میں میر سید غلام بھیک نیرنگ انبالوی کو ۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

''تین لکچر امسال لکھے گئے ہیں۔ تین آیندہ سال لکھوں گا۔ اور مدراس ہی میں دسمبر ۲۹ء یا جنوری ۳۰ء میں دوں گا۔ حیدر آباد دکن میں بھی ٹھہروں گا۔ کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لکچر وہاں بھی دئے جائیں۔''

''زمانہ'' کانپور جلد ۵۲ نمبر ۲ صفحہ ۱۲۷، بابت فروری ۱۹۲۹ء میں اقبال کے لکچروں کی تفصیلات اس طرح درج ہیں:۔

''ڈاکٹر سر اقبال نے ''الٰہیات اسلامیہ وفلسفہ جدیدہ'' پر مدراس میں چھ خطبے دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر علالت کی وجہ سے دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخر ہفتے میں آپ نے مندرجہ ذیل صرف تین عنوانات ہی پر خطبے دئے:۔
(۱) علم اور روحی والہام (۲) وحی والہام کی تصدیقات کا فلسفیانہ معیار (۳) ذات خدا کا اسلامی تصور اور دعا کا مفہوم ——— باقی تین عنوانات یعنی
۱۔ مسئلہ جبر وقدر وحیات بعد الموت ۲۔ علم النفس کی رو سے اسلامی تہذیب وتمدن کا حقیقی مفہوم اور ۳۔ ایک جماعت کی حیثیت سے اسلام کی تشکیل، آیندہ کے لئے ملتوی کر دئے گئے ہیں۔''

بقول ڈاکٹر زور اقبال جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس سے حیدر آباد آئے اور یہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو لکچر دئے۔ پہلا لکچر ۱۵ جنوری سال مذکور کو ٹاؤن ہال باغ عامہ (حیدر آباد) میں زیر صدارت مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ ہوا تھا۔ اس موقعہ پر مہاراجہ نے

ؔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں راقم حروف نے ادبیات اردو کے بے مثال کتب خانے میں شعبۂ میوزیم کے شلف نمبر ۳ سے علامہ اقبال کے ان خطوط کے عکس حاصل کئے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً شادؔ کو لکھے تھے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں
(۱) ۵ جنوری ۱۹۱۷ء، (۲) ۳۰ جون ۱۹۱۷ء، (۳) ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء، (۴) ۱۱۰ پریل ۱۹۱۸ء، (۵) ۲۶ جنوری ۱۹۱۹ء، (۶) ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء، (۷) ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء، (۸) ۲۵ اپریل ۱۹۱۹ء، (۹) ۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء، (۱۰) ۲۹ ستمبر ۱۹۱۹ء، (۱۱) ۱۲ کتوبر ۱۹۲۳ء، (۱۲) ۱۴ کتوبر ۱۹۲۳ء، (۱۳) ۱۷ کتوبر ۱۹۲۳ء، (۱۴) جنوری ۱۹۲۴ء، (۱۵) ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء، (۱۶) قطعہ تاریخ تقرر مہاراجہ بروزارت عظمیٰ دولت آصفیہ

حاضرین جلسہ سے اقبال کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:-

''جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر سر اقبال کی عالمانہ تقاریر کے سلسلے میں پہلے لکچر کی صدارت میرے لئے ایک نہایت خوشگوار فریضہ ہے۔ اس موقعہ پر صدارت کا فریضہ میرے لئے آسان یوں ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے تعارف کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس ملک کا ہر کہ و مہ آپ سے واقف اور آپ کے کلام سے اس مجمع کا ہر فرد اپنی استعداد اور ذوق کی مناسبت سے قدرداں ہے۔ آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستائش سے بالاتر ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے ساتھ ہی ان کے تصنیفات کے انمول نمونے اور وسیع گنجینوں کا ایک ایسا لامتناہی تصور پیش نظر ہو جاتا ہے کہ عرض کلام سے گزر کر جوہر بیاں میں فکر سخنور غلطاں و پیچاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال جس مقصد حیات کو اپنے علم و عمل سے پورا کر رہے ہیں وہ انسانی ترقی کو دنیا کے لئے سود مند بناتے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال تصوف اور عرفان کے آغوش میں پل کر حکیم ہوتے ہیں اور ان کے حکیمانہ خطبات سے ہم کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقع ملا جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس مجمع کا ہر برنا و پیر اپنے معلومات میں قابل قدر اضافہ حاصل کرے گا۔''

اقبال کی آمد حیدر آباد کی تقریب میں مہاراجہ نے ایک خاص مشاعرہ اپنی ڈیوڑھی میں منعقد کیا۔ مشاعروں کا انعقاد مہاراجہ کے لئے کوئی غیر معمولی کام نہ تھا۔ ان کے یہاں یوں بھی برسوں ماہوار شاعرے منعقد ہوتے رہے لیکن جب بیرون ریاست سے کوئی ممتاز شاعر آتا تو وہ خاص اہتمام سے بزم سخن مرتب کرتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی ہوا۔ چنانچہ مولوی مسعود علی محوؔی اپنے مضمون ''سر مہاراجہ یمین السلطنت آنجہانی کے مشاعرے'' (مطبوعہ مجلۂ عثمانیہ مہاراجہ نمبر) میں لکھتے ہیں کہ:-

''سر اقبال مرحوم کی تشریف آوری کے موقعہ پر جو مشاعرہ ہوا وہ بھی عجب مشاعرہ تھا۔ سر مہاراجہ نے اعلیٰ پیمانے پر دعوت اور مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ حیدر آباد کے تمام مشہور فارسی اور اردو کہنے والے شعراء مدعو تھے۔ چونکہ کوئی خاص طرح مقرر نہ تھی اس لئے حیدر یار جنگ طباطبائی مرحوم، نواب ضیاء یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی باغؔ، لبیبؔ سے مستعد اور شعراء نے اپنے خیال میں اپنا بہترین کلام سنایا، مگر سر اقبال ٹس سے مس تک نہ ہوئے۔ صرف محوی صاحب کے اس شعر پر۔

نگاہ کردن دزدیدہ ام بہ بزم بہ دید میان چیدن گل باغباں گرفت مرا

استنا ارشاد ہوا کہ پھر پڑھیئے۔ خدا جانے کسی نقص کی بنا پر تھا یا بطور قدر دانی کے۔ جب خود ان سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو بڑے اصرار کے بعد چار پانچ شعر ارشاد فرمائے۔"

۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ہندوستان کے طول و عرض میں یوم اقبال منایا گیا۔ اس دن حیدر آباد کے ٹاؤن ہال میں یوم اقبال نہایت ہی شایان شان پیمانے پر منایا گیا۔ اس موقعے پر دو اجلاس منعقد کیے گئے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے انجام دی۔ موصوف نے اقبال کی خدمت میں شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ اور فرمایا:

"حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ اس کا جائز حق ہے اور اس کا پیام فرزندان مشرق کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ آیندہ نسلیں اس کا فیصلہ کریں گی کہ ہندوستان کی ادبی ناہمواری کی اصلاح اور قومی ترقی میں اس زندۂ جاوید شاعر کا کس قدر حصہ ہے۔"

ظلم ہوتا اگر مشرق اس باکمال شاعر کو اس کی زندگی میں کم سے کم خراج تحسین بھی ادا نہ کرتا۔ اور مجھے مسرت ہے کہ ہمارے اہل ملک دوسرے اقطاع ہندوستان سے پیچھے نہیں رہے۔ اور کیونکر پیچھے رہتے جبکہ اہل علم و فن کی قدر ان کا روایاتی شیوہ رہا ہے۔ اور انہوں نے اقبال کا وہ فرض، جو علمی و ادبی حیثیت میں ان پر تھا، کسی حد تک ادا ہی کر دیا۔ میری دعا ہے کہ خدا سر اقبال کو بہت دن زندہ رکھے تا کہ ہندوستان ان کے نغمۂ بیداری سے زندگی اور کامیابی کا درس حاصل کرتا رہے۔"

اس واقعہ کے صرف ۳ ماہ بعد اقبال ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کر گئے۔ اس موقعہ پر تعزیت کا جو جلسہ حیدر آباد میں مسز سروجنی نائڈو کی صدارت میں ہوا، اس میں نواب بہادر یار جنگ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، نواب مہدی یار جنگ، راجہ پرتاپ گیر جی اور کیقباد جنگ نے تقریریں کیں۔ مگر مہاراجہ صدمے کی شدت کے باعث شریک نہ ہوئے۔ البتہ جب ماہنامہ "سب رس" اقبال نمبر یکم جون کو ڈاکٹر زور نے شائع کیا تو اس کے لئے مہاراجہ نے اپنے جذبات غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:-

"ڈاکٹر سر اقبال فقیر کے مخلص دوست تھے۔ ان کی بے وقت مفارقت سے شعر و سخن کا ایک درخشاں ستارہ غروب ہو گیا۔ مرحوم نے فلسفے کی گتھیوں کو نظم کے ذریعے آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ دنیا کی فضائیں ان کے منظوم نغموں سے گونجیں اور آنے والی نسلوں کے دلوں میں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ کرتی رہیں گی۔"

اقبالؔ اور شادؔ کے درمیان عرصۂ دراز تک مراسلت رہی۔ غالباً اس کا آغاز اقبال کے قیام یورپ

کے زمانہ (۱۹۰۵ء-۱۹۰۸ء) میں ہوا تھا۔ میرے خیال میں خط لکھنے کی پہل شادؔ نے کی تھی۔ افسوس کہ یہ خطوط اب دستیاب نہیں ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے بڑی محنت اور عرق فشانی سے اقبال اور شادؔ کی مراسلت پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں ''شاد اقبال'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کی۔ اس میں اقبال کا پہلا خط ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۶ء اور آخری ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اسی طرح شادؔ کا پہلا خط یکم نومبر ۱۹۱۶ء اور آخری ۴ر جنوری ۱۹۲۷ء کا ہے۔ ''شاد اقبال'' میں اقبالؔ کے ۴۹ اور شادؔ کے ۵۲ خط موجود ہیں۔

جناب محمد عبداللہ قریشی صاحب مرحوم نے نہ معلوم کہاں سے اور کس طرح سے اقبال کے مزید پچاس خط شادؔ کے نام دریافت کئے۔ انہوں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ خط انہیں کہاں سے دستیاب ہوئے تھے۔ موصوف نے شادؔ کے نام اقبال کے ۹۹ خطوط مرتب کر کے ''اقبال بنام شادؔ'' میں شائع کئے۔ کتاب جون ۱۹۸۶ء میں بزم اقبال لاہور نے شائع کی اور اس کا ایک نسخہ قریشی صاحب نے اپنے دستخط سے میرے نام ارسال کیا تھا۔ کتاب میں اقبال کا پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کا مرقومہ ہے۔ اس مجموعہ میں ''شاد اقبال'' والی مراسلت بھی شامل ہے۔ تفصیلات کے لئے کتاب ''اقبالؔ بنام شادؔ'' دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ایک دو خطوط کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ ان سے ظاہر ہوگا کہ دونوں بزرگوں میں کس قدر دوستانہ بے تکلفی اور خلوص کا جذبہ موجود تھا۔ خطوط سے دونوں کے نجی حالات پر بھی کماحقہ روشنی پڑتی ہے۔ اقبالؔ اور شادؔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور غمی و خوشی میں شریک رہتے تھے۔ اقبالؔ، شادؔ کے ایک خط (اکتوبر ۱۹۱۳ء جو دستیاب نہیں ہے) کے جواب میں ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:-

''آپ کا نوازش نامہ کئی روز سے آیا رکھا ہے، لیکن میں بوجہ عارضۂ درد گردہ ایک ہفتے تک صاحب فراش رہا۔ دو تین روز سے افاقہ ہے۔ خدا نے فضل کیا، مرض جاتا رہا، میں باقی رہ گیا۔

دونوں اشعار خوب ہیں۔ واللہ قبائے وزارت کے نیچے شاعری و درویشی، سپہگری اور خدا جانے کیا کیا کمالات آپ نے چھپائے رکھے۔ اللھم زد فزد

جو عنایت آپ اقبالؔ کے حال پر فرماتے ہیں، اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو۔ دوست پروری اور غریب نوازی آپ کے گھرانے کا خاصہ ہے۔ کیوں نہ ہو۔ جس درخت کی شاخ ہو، اس کے سائے سے ہندوستان بھر مستفیض ہو چکا ہے۔ الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لئے تو اس

قدر رقم کافی بلکہ اس سے زیادہ ہے۔ تاہم چونکہ میرے ذمہ اوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے ادھرادھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے۔ بڑے بھائی جنہوں نے ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا۔ اب پنشن پا گئے۔ ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمے ہیں۔ اور ہونے چاہییں۔ خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی۔ ضرورت نہ تھی، مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کے لئے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں، اسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔ غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔ آہ! اس وقت ہندوستان میں ہنر کا قدردان سوائے آپ کے کون ہے؟ میں تو بسا اوقات قحط خریدار سے تنگ آ جاتا ہوں۔

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

میں تو اپنا سامان یعنی قاش ہائے دلِ صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رخصت ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے کہ آپ کی جانب سے "بوئے کسے" آتی ہے۔ متاعِ گراں مایہ اپنے دامن میں چھپائے رکھتا ہوں۔ حالات ناگفتہ کا ایک متحرک مزار سمجھ لیجئے گا۔

آپ کی فیاضی کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے۔ مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے مگر یہ بات مروت اور دیانت سے دور ہے کہ جب اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرے کے ہو۔ خدا کو منظور تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اقبال جو ہمیشہ سے معنوی طور پر بھی آپ کے ہمراہ ہو گا۔ آپ نے جس وسعت قلب سے اقبال کو یاد فرمایا، مروت کی تاریخ میں یادگار رہنے کے قابل ہے اور بندۂ اقبال، جس کو آپ ازراہ کرم گستری لفظ "دوست" سے متشکر فرماتے ہیں، نہایت سپاس گذار ہے اور دوست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مہاراجہ بہادر کے دل کے مقاصد بر لائے اور ان کے اعدا کو ذلیل و خوار کرے۔ آمین!

بندۂ درگاہ۔ محمد اقبال

کیا سرکار نے اپنا اردو دیوان مرتب کر لیا؟ اسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔"

اقبال کے نام شاد کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد کی تین رانیاں اور چار بیگمیں تھیں۔ ہندو رانیوں کی اولاد ہندو اور مسلمات بیگمات کی اولاد مسلمان تھی۔ اسی مناسبت سے ان کی شادیاں کی گئیں اور رشتے جوڑے گئے۔ بعض رشتوں کے بارے میں اپنے دوست علامہ اقبال سے بھی مشورے کئے اور ان کو اعتماد میں لیا۔ ۱۹ نومبر ۱۹۲۲ء کے خط میں جو اقبال کو لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ:۔

''۷ ربیع الثانی ۴۱ (۱۳) ہجری (۱۹۲۲ء) کو ایک اور فقیر زادی کی شادی ہے۔ آج کل تو فقیر شاد اس بارے سبکدوش ہونے کی فکروں میں مصروف ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اور لڑکیوں کے فرض سے بھی اسی طرح سبکدوش فرمائے۔ بحق محمدؐ وآل محمدؐ

جس بیگم کا چار دن ہوئے انتقال ہوا، اس کے سات بچے ہیں۔ پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے۔ لڑکیاں سب شادی کے قابل ہیں اور یہاں کوئی لڑکے اچھے نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ ہیں تو مالی حالت اچھی نہیں۔ اگر مالی حیثیت اچھی ہے تو تعلیم ٹھیک نہیں۔ اسی فکر میں ہوں۔ خدا اس مشکل کو آسان کرے......''

شاد کثیر الاولاد تھے۔ ان میں لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس لئے ان کے کفو کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ اقبال کو اپنا مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لئے علامہ کو ۴ رجنوری ۱۹۲۳ء کے ایک طویل خط میں اپنی پریشانیوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں:۔

''آپ کا یہ خط (۲۹ ردسمبر ۱۹۲۲ء) میرے خط مورخہ ۱۹ رنومبر ۲۲ء کا جواب ہے۔ جس میں میں نے لکھا تھا: ''یہاں لڑکے اچھے نہیں ملتے۔ تعلیم یافتہ ہے تو مالی حیثیت اچھی نہیں۔ اگر مالی حیثیت اچھی ہے تو تعلیم ٹھیک نہیں۔'' آپ نے میرا منشا پالیا اور میرے حالات کا اندازہ کرلیا۔ موجودہ حالت اور تغیرات کی رفتار کا نتیجہ میرے پیش نظر ہے۔ یہاں کی آئے دن کی تبدیلیاں صیغۂ امارت وثروت کے مستقبل کو تاریک کرنے کا وعدہ کررہی ہیں۔ بڑے بڑے گھر تباہ حالت میں ہیں۔ ایسی حالت میں مآل اندیشی سے کام لینا ضروری ہے۔ اولاد کے متعلق اپنے فرائض کا تیز احساس میرا فرض ہے۔

حیدرآباد کی امارت وثروت کا وجود صرف احتیاط اور استقلال و عاقبت اندیشی کے تابع ہوگیا ہے۔ لڑکیوں کی شادی دوروز دیگ پر منحصر نہیں بلکہ ان کی آئندہ زندگی اطمینان وخوش حالی کے ساتھ گزرنے پر منحصر ہے۔ اس وقت بفضلہٖ پانچ لڑکیاں بیاہ شدہ ہیں۔ جن میں دو رانی زادیاں۔ ایک کا باپ پنجابی تھا۔ مگر لڑکا کم سنی سے حیدرآباد کے ایک جاگیردار کا متبنیٰ ہوا۔ اس کا نام تارا چند ہے۔ صرف خاص

جو خاص اعلیٰ حضرت کے خانگی مصارف کا صیغہ کہلاتا ہے۔ جس کی آمدنی ایک کروڑ ہے۔ وہاں کے ایک صیغے کا سررشتہ دار ہے۔ پانسو ماہوار پاتا ہے۔ بہر طور تہنیت اور ملازمت دونوں کے اتفاق نے اس کو فارغ البال کر دیا ہے۔ صاحب اولاد ہے۔ ایک لڑکی جوان ان بیاہی، ایک سال کے آگے والدین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔ اب پھر امید........ اس بارگاہ بے نیاز سے ہے۔ مگر لڑکا پہلے درجہ کا........ ہے۔ اس عیب نے سب خوبیوں کو خاک میں ملا دیا۔

دوسری اس کی ہمشیرا ایک پنجابی زادہ جو مہاراجہ کشمیر کے پاس خانگی ملازم تھا۔ اب پنشن پاتا ہے۔ اس کا لڑکا ہے۔ نام اس کا کچھ اور تھا۔ شادؔ نے اس کا نام اقبال چند رکھا۔ والد کی حالت فارغ البالیی کے پہلے سنی جاتی تھی۔ مگر بعد بیاہ کے معلوم ہوا کہ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ سارا بار پرورش کا میرے ذمے پڑا۔ مگر نوشت وخواندی میں کارگزاری کے قابل۔ پولیس اضلاع علاقۂ دیوانی میں ملازم بحکم حضور ہوا ہے۔ اڑھائی سو پاتا ہے۔ امید یہ تھی کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث مرضی کے موافق ہوگا۔ اور باپ کی ملنسار شریفانہ طبیعت سے بھی زیادہ توقع تھی۔ مگر..... راضی برضا، کیا کہا جائے۔ سنگ آمد وسخت آمد۔ لب اپنے، دانت اپنے، کیا کیا جائے۔ بہر حال گزر رہی ہے۔ ان اوصاف حمیدہ کے ساتھ احسان فراموش۔ سنگ درآتش

تیسرا بیگم زادی سے منسوب ہے۔ میر خورشید علی نام ہے ابن میر لیاقت علی۔ لیاقت جنگ سے مخاطب ہوا ہے۔ یہ لڑکا انگریزی میں اچھا ہے۔ اردو میں ترقی کی۔ صیغۂ مال گذاری پر ملازم ہے۔ تین ساڑھے تین سو کی اس وقت یافت ہے۔ باپ فارغ البال ہے۔ سالانہ چھ سات ہزار کی آمدنی ہے۔ تعلقدار اول تھا۔ اب پنشن خوار ہے۔ طبیعت میں دہریت زاید۔ چنانچہ فرزندار جمند میں بھی اثر آ چکا تھا۔ مگر شادؔ نے بہت زیادہ حصہ اس کے اس خیال کے رفع کرنے میں لیا۔ الحمد للہ کامیاب ہوا۔ اب وہی فرزند، جو باپ کی ہر بات کو فرض من السماء سمجھتا تھا، امتیاز کرتا ہے کہ دہریت سخت عیب ہے۔ نماز روزہ اور فرائض کا پابند، سپورٹس مین ہے۔ طبیعت میں شرافت دلی اور رکھ رکھاؤ کا بھی اچھا۔ مگر خیر الامور اوسطھا۔ کا حکم رکھتا ہے۔

چوتھا ایک جاگیردار کا لڑکا ہے۔ خورشید علی کی سالی حقیقی اس لڑکے سے منسوب ہے۔ نوشت و خواند بالکل معمولی.........

حال میں جو شادی ہوئی ہے وہ پانچویں ہے۔ لڑکا رائل فیملی میں شمار کیا جاتا ہے علم میں چوتھے نمبر کے برابر اور طبیعت چاروں سے بھی اس وقت اچھی اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مستقبل کی خبر خدا

جائے۔ مرفعہ الحال ہے۔

اب آپ ان سب کی ہسٹری پڑھکر جوڑائے دیں گے اور پتہ دیں گے کہ کون سے لڑکے ہیں اور کس حالت کے ہیں۔ ابھی دس لڑکیاں ہیں جن میں دورانی زادیاں ہیں۔ ایک بالغ وہوشیار، دوسری دو سال کی۔ آٹھ بیگم زادیاں ہیں، جن میں ایک پانچ سال کی ہے۔ دوسری آٹھ سال کی۔ باقی دس اور بارہ کے درمیان میں تین ہیں، جن میں ایک پانچ سال کی ہے۔ دوسری آٹھ سال کی۔ باقی دس اور بارہ کے درمیان میں تین ہیں اور چودہ اور انیس کے درمیان پانچ ہیں۔ مرحومہ بیگم کی بھی پانچ ہیں۔ جن میں چار چودہ اور اٹھارہ کے درمیان ہیں۔ اور ایک پانچ سات کے درمیان ہیں۔ دو کے متعلق حضور کا خیال ہے کہ اپنے صاحبزادوں سے منسوب کریں۔ واللہ اعلم۔ ابھی نقش بر آب ہے۔ اگر دو ہیں تو پھر تین کے لئے ضرورت ہے۔ غرض یہاں کے حالات کے لحاظ سے شاؔد ہر طرح مجبور اور بار گراں سے ہر طرح سبکدوش کس طرح ہو۔ اس فکر میں ہوں مگر بھروسہ مالک حقیقی ہی سے ہے۔''

شاؔد نے اقبال کے نام ۱۹ر نومبر ۱۹۲۲ء کو جو پرائیوٹ خط اپنی صاحبزادیوں کے بَر کے لئے لکھا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں دوستوں کے آپسی تعلقات کس قدر مربوط اور استوار تھے۔ شاؔد کو اقبال پر پورا اعتماد تھا۔ اقبال بھی ان کی قدر و منزلت اور فقیر منشی کی تعریفیں کرتے تھے۔ ذیل میں اقبال کا وہ خط ملاحظہ ہو جو انہوں نے ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو شاؔد کے نام لکھا تھا۔

''والا نامہ مل گیا تھا، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ الحمد للہ کہ سرکار عالی کو سرکار نے جو کچھ حیدرآباد کے لڑکوں کے متعلق ارشاد فرمایا بالکل بجا ہے۔ فی زمان شرفائے ہند کی لڑکیوں کے بر کا معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے۔ پنجاب کی حالت حیدرآباد سے نسبتاً بہتر ہے۔ گو دور دراز کے رشتوں میں دقتیں ہیں۔ صاحبزادیوں کے متعلق اگر ضروری کوائف سے مجھے آگاہی ہو جائے تو شاید میں کوئی مفید مشورہ عرض کر سکوں گا۔ ایک آدھ موقع میرے خیال میں ہے۔ لیکن چونکہ معاملہ اہم ہے، اس واسطے ہر قسم کی احتیاط ضروری ہے۔ جس مآل اندیشی سے سرکار اس قسم کے کاموں کو انجام دیتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کے متعلق اپنے فرائض کا اس قدر تیز احساس شاید کسی باپ کو نہ ہوگا۔ آپ کے علم، بزرگی، معاملہ فہمی اور روایات خاندانی کا اقتضا بھی یہی ہے۔ پنجاب میں سرکار کے پائے کے لوگ کہاں۔ ہاں لڑکوں کی تعلیم اور چال چلن کے متعلق حیدرآباد کی نسبت بہتر اطمینان ہو سکتا ہے۔ بہر حال سرکار عالی سے ضروری آگاہی حاصل کرنے کے بعد میں کچھ مزید اور عرض کروں گا۔ اس قسم کے معاملات میں نیز دیگر معاملات میں بے تکلفانہ خط و کتابت کرنی محض سرکار عالی کی وسعت خیالی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ کجا وزیر

نظام اور کجا اقبال ہیچ میرز اا قبال سرکار کی درویش منشی اور اپنی صاف باطنی پر بھروسہ کر کے بے تکلفانہ عرض ومعروض کرلیا کرتا ہے۔''

علامہ اقبال ایک اور خط میں ۲۴ رجنوری ۱۹۲۳ءکو شادؔ کے نام لکھتے ہیں:۔

''انشاء اللہ میں اس طرف پوری توجہ دوں گا۔ضروری کوائف سے آگاہی ہوگئی ہے۔بعض اور امور بھی دریافت طلب ہیں جو پھر دریافت کروں گا..... بعض باتیں شرعی نقطۂ نظر سے بھی پوچھی جاتی ہیں........میرے علم میں ایک موقع ہے اگر اس کے متعلق میرا اطمینان ہوگیا تو عرض کروں گا....''

اقبال کی کتاب ''پیام مشرق'' اوائل مئی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔انہوں نے چھپتے ہی اس کا ایک نسخہ شادؔ کو بھیجا۔انہیں کتاب پسند آئی اور اپنے تاثرات اقبال کے نام ۱۴رمئی ۱۹۲۳ء میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

''شمال سے جنوب میں پیام مشرق آیا۔کیوں ایسے پیام کو سلام نہ کروں۔پیام مشرق کے طرز ادا میں سنجیدگی، مضموں آفرینی پر آپ کی توجہ زیادہ مبذول ہوئی ہے۔اخلاق وروحانی معنویت کی آمیزش نے پیام کو نظر فریب رنگ میں رنگا ہے۔رنگ قادر الکلامی نکھرا ہوا ہے۔لطف زبان وحسن بیان کا سرشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

پیام مشرق کے سننے والے دور سے محفل کی دھوم سن کر دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور محفل کی رنگینیوں کے نقوش اپنے متخیلہ کو لبریز کئے ہوئے ہیں۔لیکن جلوہ کا جب پردہ اٹھتا ہے تو جنت نگاہ وفردوس گوش کا سارا تخیل وہم باطل ثابت ہوتا ہے۔نہ جنگ ہے نہ ساز، نہ غمزہ ہے نہ ناز۔محفل میں بجائے سوز کے ساز ہے۔آنکھیں نم ہیں۔چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ خشیت الٰہی سے ہیبت طاری ہے۔

بااین ہمہ اپنے اپنے مرتبۂ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے اور درجۂ استادی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔تقلید واخلاق نے بعض ممتاز شعراء کو برباد کر دیا ہے۔لیکن آپ کا گلستان ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے۔یہاں کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی نے زمین سخن کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے جتنا کہ تہذیب وشائستگی سے غافل ہوجائیں۔جانتے ہیں کہ کاروان سخن میں سب شامل ہیں۔بعض ایسے ہیں جو محض محمل کی وصفی خوش نمائی سے جی خوش کرلیں گے۔بعض ایسے ہیں کہ جو محمل نشیں کی زیارت کئے بغیر دم نہ لیں گے۔مگر سچ یہ ہے کہ آپ وہ اقبال مند ناقہ بان سخن ہیں کہ دونوں دلوں کی ڈوریں اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔''

پریم سنگم ـــــــ جب خواجہ حسن نظامی صاحب ۱۹۲۳ء میں دہلی سے حیدرآباد تشریف لے گئے تو

مہاراجہ صاحب سے بھی ملاقات کی۔ دونوں بزرگوں میں گہرے روابط عرصۂ دراز سے قائم تھے۔ مہاراجہ نے خواجہ صاحب کو "پیام مشرق" کے قطعات کے تتبع میں اپنے تصنیف کردہ قطعات خود لکھکر مسودہ کی صورت میں پیش کیے۔ اور "پیش کش" کی عبارت میں کمال انکسار سے لکھا کہ:۔

"میرے مہربان ڈاکٹر سر محمد اقبال لاہوری نے اپنا سرمایہ منظوم جو "پیام مشرق" کے نام سے موسوم کیا ہے درحقیقت مشرقیوں کا دوست رفیق اور مغربیوں کا ہمدم شفیق ہے۔ یہ پیام مشرق چند اقسام کے پھولوں کا زیبا گلدستہ ہے جس میں ایک حصہ قطعات کا ہے۔ یہ قطعات درحقیقت روحانی اور مادی اثرات کا جامع نسخہ ہے جو مریضان روحی اور مادی کے لئے زیادہ مفید اور مفرح قلوب ہے۔ اس فقرے نے صرف استفادے کی غرض سے طبع آزمائی کی ہے۔ اس سے جواب دینا یا نعوذ باللہ مقابلہ کرنا مقصود نہیں تھا اور نہ ہے۔ یہ فقیر اپنے علمی مواد و سواد کو خوب جانتا ہے اور سر اقبال کے علم و فضل اور قابلیت خداداد سے بخوبی واقف ہے۔ ارباب نظر کو فقیر کے کلام سے سر اقبال کے کلام کا موازنہ کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی چاہیے۔

ان دنوں مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی چشتی، دکن میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ یہ فقیر حسب عادت قدیم نظم یا نثر کبھی کبھی پیش کیا کرتا تھا۔ اس کے چند قطعات بھی حضرت کے ملاحظے میں پیش کئے۔ بعد معائنہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ یہ فقیر ان قطعات کو ختم کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کرے۔ ارشاد کی تعمیل مجھ پر واجب تھی۔ لہٰذا یہ فقیر ان چند قطعات کو خدمت میں پیش کرتا ہے۔ فقیر کا کلام فقیر ہی کے نام سے معنون ہو تا دنیا سازی کی نمائش سے بری کر سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس فقیر کے محب سر اقبال کے دل صفا منزل میں فقیر کی اس طبع آزمائی سے کوئی شبہ سوائے تتبع کے نہ گزرے گا کہ سلف سے ارباب مذاق کا یہی مشرب چلا آتا ہے۔ بمصداق "الانسان من الخطا والنسیان" اگر کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح کی نظر سے دریغ نہ فرمائیں۔"

فقیر حقیر شاد۔ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ جولائی ۱۹۲۳ء

معلوم ہوا ہے کہ یہ کتابچہ جس میں دونوں شہرۂ آفاق اہل علم کا ملا جلا فارسی کلام درج ہے۔ "پریم سنگم" یعنی محبت کا ملاپ، کے نام سے نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع کیا تھا۔ قطعات کا یہ مجموعہ میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ بہرحال نمونے کے طور پر چند قطعات درج کئے جاتے ہیں۔

اقبال

۱۔ نوائے عشق را ساز است آدم　　　کشاید راز و خود راز است آدم

جہان او آفرید ایں خوب تر خاست — مگر با ایزد انباز است آدم

شاؔد

نہ فہمیدی کہ چہ راز است آدم — ز سر نغمہ اش ساز است آدم
نیاز او قبول افتد اگر شاؔد — بدرگاہش سر افراز است آدم

اقباؔل

۲- ترا یک نکتۂ سر بستہ گویم — اگر درس حیات از من بگیری
بہ میری گر بہ تن جانے نہ داری — و گر نہ جانے بہ تن داری نمیری

شاؔد

زمن بشنو اگر تو عارفی شاؔد — بگویم نیک پندے یاد گیری
دگر شغلے بجز عشقش مفر ما — شوی باقی چو پیش از مرگ میری

اقباؔل

۳- تنے پیدا کن از مشت غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دل درد آشنائے — چو جوئے درکنارے کوہسارے

شاؔد

مخور رنج جہان نابکارے — مدہ دل باچنیں بے درد یارے
بجو تسکین دل از عارفاں شاؔد — بجان بے قرار آید قرارے

اقباؔل

۴- بہ یزداں روز محشر برہمن گفت — فروغ زندگی تاب شرر بود
و لیکن گر نہ رنجی باتو گویم — صنم از آدمی پایندہ تر بود

شاؔد

بتے با برہمن ایں گفتگو کرد — کہ از سنگے کہ ہستم بے اثر بود
پرستش چوں بسوز دل نمودی — فروزاں از تو شد پنہاں شرر بود

اقباؔل

۵- میارا بزم ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

شاد

بیا ساقی نثارم بر قدومت　　　بدہ جام مئے کز پرتگیز است
حباب و موج آب و ورطۂ بحر　　　نمی بینی ز کثرت در ستیز است

''بیاض شاد''۔ بیاض شاد ۱۹۲۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی۔ اس مجموعہ میں کچھ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ اور یہ مجموعہ ۸½×۵½ انچ میں ۲۰ اصفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۱۴۵ اردو اور ۳۸ فارسی غزلیں ہیں۔ ''بیاض شاد'' کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ساتھ تاریخ، سنہ، دن اور مقام کی وضاحت کی گئی ہے۔''

''پریم سنگم'' اور ''بیاض شاد'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً شاد کے دو الگ الگ مجموعے ہیں جن میں اقبال کے فارسی اردو کلام کے تتبع میں شاد نے طبع آزمائی کی تھی۔ مجھے ''بیاض شاد'' کا مطبوعہ نسخہ کہیں دستیاب نہ ہوسکا اس لئے اس کے بارے میں کوئی رائے زنی کرنا مناسب نہیں۔ البتہ کشمیر یونیورسٹی کے اقبال لائبریری میں ''بیاض شاد'' کا ایک خوش خط مخطوطہ ہے جو ۱۳۴۲ہجری میں مرتب کیا گیا ہے۔ بیاض میں شاد نے اقبال کے رنگ میں فارسی اور اردو کی کئی نظمیں موزون کی ہیں۔ کچھ قطعات بھی ہیں۔ ذیل میں نمونے کے طور پر دونوں بزرگ شعراء کا مختصر سا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

اقبال

۱۔ شنیدم کوہے با کوہے گفت　　　کہ در بحریم و پیدا ساحلے نیست
سفر اندر سرشت ما نہادند　　　ولے ایں کارواں را منزلے نیست

۲۔ اگر انجم ہمانستے کہ بود است　　　ازیں دیرینہ تابیہا چہ سود است
گرفتار کمند روزگاریم　　　خوشا آنکس کہ محروم وجود است

۳۔ کس ایں بار گراں را برنتابد　　　ز بود مانبود جاوداں بہ
فضائے نیلگونم خوش نیاید　　　ز اوجش پستی آں خاکداں بہ

۴۔ خنک انساں کہ جانش بیقرار است　　　سوار راہوار روزگار است
قبائے زندگی بر قامتش راست　　　کہ او نو آفریں و تازہ کار است

بیاض شاد۔صفحہ ۷ شاد

''افکارانجم بجواب اقبال از نتیجۂ فکر حضرت شاد صوفی مدظلہ بتاریخ ۲۹ محرم ۱۳۴۲ھ روز سہ شنبہ بمقام مسند مبارک''

۱- خرد را عشق یک شب ایں چنیں گفت منم بحرے کہ او را ساحلے نیست

شناور غرق می گردد بگرداب بگردابش مقام و منزلے نیست

۲- خنک آنکس کہ از عشقش نمود است وجود او ورائے ہر وجود است

گرفتار کمند زلف یار است زمام خود زبانش جملہ سود است

۳- ز عشق او بہ سر بار گراں بہ بزعم بوالہوس رازش نہاں بہ

بود پستی او از عشق اگر شاد بچشم عاشق از اوج نہاں بہ

۴- اگر عاشق ز عشق دوست خوار است ز عشقش شہرتش در روزگار است

بپرس از عاشقان کہنہ مشقی کہ کار عشق راست از پختہ کار است

فصل بہار

اقبال

۱

خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابر بہار

مست ترنم ہزار

طوطی و دراج و سار

بر طرف جوئبار

کشت گل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت، خیمہ زد ابر بہار

۲

خیز کہ در باغ وراغ، قافلۂ گل رسید

باد بہاراں وزید

مرغ نوا آفرید

لالہ گریباں درید
حسن گل تازہ چید
عشق غم نو خرید
خیز کہ در باغ وراغ قافلۂ گل رسید

۳

بلبلگاں در صفیر، صلصلگاں در خروش
خون چمن گرم جوش
اے کہ نشینی خموش
در شکن آئین ہوش
بادۂ معنی بنوش
نغمہ سرا، گل بپوش
بلبلگاں در صفیر، صلصلگاں در خروش

۴

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزیں
برلب جوئے نشیں
آب رواں را بہ بیں
نرگس ناز آفریں
لخت دل فرودیں
بوسہ زنش بر جبیں
حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزیں

۵

دیدۂ معنی کشا اے ز عیاں بے خبر
لالہ کمر در کمر
نیمۂ آتش بہ بر
می چکدش بر جگر

شبنم اشک سحر
در شفق انجم نگر
دیدۂ معنی کشا اے ز عیاں بے خبر

۶

خاک چمن وا نمود، راز دل کائنات
بود و نبود صفات
جلوہ گریہائے ذات
آنچہ تو دانی حیات
آنچہ تو خوانی ممات
ہیچ نہ دارد ثبات
خاک چمن وا نمود، راز دل کائنات

صفحہ ۳۔ ''فصل بہار بجواب اقبال از نتیجہ فکر حضرت شاہ صوفی مدظلہ بتاریخ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ روز پنجشنبہ بمقام مسند مبارک''

۱

در دل بے اختیار، عشق تو کردہ قرار
جان غمت سوگوار
درد تو شد سازگار
دل چو برآرد شرار
سینہ شود داغدار
رحم بکن اے نگار
در دل بے اختیار، عشق تو کردہ قرار

۲

عشق تو تا دل گزید، جاں ز غم او تپید
چوں تو بتے کس نہ دید
عشق ترا آفرید

شیخ حرم شد مرید

برہمن آسا دوید

ہوش و حواسش رمید

عشق تو تا دل گزید، جاں ز غم او تپید

۳

عاشق شیدائے تست، مست می و در خروش

خم کدہ آمد بجوش

لطف کند می فروش

کرد اشارت بنوش

بادہ ربودست ہوش

گفت سروشم بگوش

عاشق شیدائے تست مست می و در خروش

۴

شیوۂ زاہد گزار، جلوۂ دلدار بیں

پیش تو آں نازنیں

ہست چو ناز آفریں

پس گل حسنش بچیں

بوسہ بزن بر جبیں

جز رخ زیبا مبیں

شیوۂ زاہد گزار، جلوۂ دلدار بیں

۵

چشم نظارہ کشا صنعت قدرت نگر

ہست صنم جلوہ گر

کن بجمالش نظر

در برت آید اگر

بوسۂ از لعل تر
گیر چو شہد و شکر
چشم نظارہ کشا صنعت قدرت نگر

٦

چشم کشا وُ ببیں، چیست دریں کائنات
ہجر بود چوں ممات
وصل نگارم حیات
جلوۂ اسم و صفات
ہست ز انوار ذات
دہر نہ دارد ثبات
چشم کشا وُ ببیں، چیست دریں کائنات

پیامِ مشرق میں اقبالؔ کی ایک نظم بعنوان ''نغمۂ ساربان حجاز'' ۸ بند میں شامل ہے۔اس کے جواب میں شادؔ نے بھی بعنوان ''ترانۂ دلدادۂ حجاز'' ایک نظم اتنے ہی بند میں کہی ہے۔ یہ ۱۰رصفر۱۳۴۲ہجری کولکھی گئی تھی۔دونوں نظموں سے پہلا بند درج کیا جاتا ہے۔

اقبالؔ

نغمۂ ساربان حجاز

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست
ناقۂ سیّار من
آہوئے تاتار من
درہم و دینار من
اندک و بسیار من
دولت بیدار من
تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

شاد

ترانۂ دلدادۂ حجاز ۱۰صفر ۱۳۴۲ہجری

منزل ما پیش ما، دلبر ما درون ما

دلبر ذی وقار من

لطف بحال زار من

رفت ز دل قرار من

زود بیا نگار من

گرم بکن کنار من

منزل ما پیش ما، دلبر ما درون ما

اقبال نے "لالۂ طور" کے عنوان کے تحت بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔ یہ بیاض شاد میں ذیل کے عنوان سے درج ہیں:-

"رباعیات بجواب باقی از نتیجۂ فکر حضرت شاد، بتاریخ غرہ صفر ۱۳۴۲ روز پنجشنبہ بمقام مسند مبارک"

نمونے کے طور پر دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔

من شام وسحر گنم ترا از دل یار تا رحم کنی بحالم اے رب عباد

در شادی و غم چوں تو رفیقم ہستی زیبست کہ ہر وقت بدل ہستم شاد

اے شاد بجان خود خبر باید کرد یک روز ازیں راہ گزر باید کرد

واللہ کہ ایں جہاں سرائے فانیست از دار فنا یقیں سفر باید کرد

لاہور میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور فروغ تعلیم کے لئے ۱۸۸۵ء میں انجمن حمایت اسلام کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ اس کی نگرانی میں بے کس، یتیم اور لاوارث بچوں کے لئے ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ انجمن کے جلسوں میں یتیموں کی پرورش اور تربیت کے واسطے شعراء چندے کی ترغیب اور لوگوں کو محظوظ کرنے کے لئے اپنے کلام کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ ایک جلسے میں اقبال نے ۳۵ بند کا ایک دل خراش مسدس ڈاکٹر نذیر احمد کی صدارت میں سنایا۔ جو بعد میں انجمن کی طرف سے ۱۹۰۰ء کی ابتدا میں شائع ہوا تھا۔ نظم کا عنوان "نالۂ یتیم" ہے۔ اقبال نے اسے بانگ درا سے حذف کر دیا۔

شادؔ حیدرآبادی نے اقبال کے تتبع میں نظم ''نالۂ یتیم'' لکھی جو بیاض شاد (مخطوطہ) کے صفحہ ۲۹ میں اس عنوان کے تحت درج ہے۔

''نالۂ یتیم بجواب ڈاکٹر اقبال (از کتاب نالۂ یتیم مصنفہ اقبال) از نتیجۂ فکر حضرت شادؔ صوفی مدظلہ بتاریخ ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۲ ہجری روز جمعہ بمقام مسند مبارک۔''

ذیل میں نظم کے چند بند درج کیے جاتے ہیں۔

۱- آہ! جو دل پہلے تھا پہلو میں اب وہ دل نہیں — شمع مردہ رہ گئی جب درخور محفل نہیں
اور حیات جاودانی مرگ کے قابل نہیں — طالب حق حب دنیا پر کبھی مائل نہیں
میں ترا دیوانہ ہوں دنیا میں گو فرزانہ ہوں
ہاں ازل سے میں فدائے طلعت جانانہ ہوں

۲- عشق کیا آیا حواس و ہوش سب جانے لگے — خون دل پی پی کے ہم لخت جگر کھانے لگے
بادۂ توحید سے پھر نشے میں آنے لگے — کیفیت میں سارے راز معرفت پانے لگے
میرا یہ سینہ نہیں گنجینۂ اسرار ہے
اور دل پہلو میں جو ہے خانۂ دلدار ہے

۳- خلقت انساں ہوئی ہے عشق یزداں کے لئے — ہے میسّا ذات اس کی خاص درباں کے لئے
وحشت دل آج ہے چاک گریباں کے لئے — زلف و رخ دونوں بنے ہندو مسلماں کے لئے
رات دن ہنگامۂ ہستی میں ہیں مصروف ہم
زلف کے سودائیوں میں آج ہیں معروف ہم

۴- یہ دل خوباں طلب خو گردۂ حسرت نہیں — عاشق درد آشنا دلدادۂ راحت نہیں
دام الفت سے ہو چھٹکارا کوئی صورت نہیں — حق سے دل کو ہے تعلق غیر سے نسبت نہیں
ہے غبار خاطر عارف محبت غیر کی
کب موحد کو نظر آتی ہے صورت غیر کی

۵- کون ہے جس کو بتاؤں اپنا یہ درد نہاں — رنج و غم سے مجھکو ملتی ہی نہیں فرصت یہاں
حسرت و ارماں ہیں دل میں رات اور دن میہماں — ہے فلک آمادہ مجھ سے تا کہ خواب امتحاں
مجرم اظہار غم ہوں رحم کر مجھ پر خدا
عجز گویائی ہے گویا میرے دل کا مدعا

۶- باغ عالم میں نہیں چلتی مسرت کی ہوا　　دیکھ تو چشم بصیرت تو ذرا اب کر کے وا
اس فنا صورت جہاں کا ہوگیا نقشا نیا　　ایک اس کی ذات واحد ہے ہمارا رہنما
کوئی مغموم اس جہاں میں کوئی شر میں کام ہے
بر سر بیداد ہر دم چرخ نیلی فام ہے

۷- شعلۂ عشق اٹھ کے دل کی آگ کو بھڑکا گیا　　استخواں سب جل گئے منہ کو کلیجہ آگیا
آتش پنہاں کا جب سر پر دھواں سب چھا گیا　　ایک دم میں یہ کرشمے اپنے وہ دکھلا گیا
کردیا بے خانماں اور گھر سے بے گھر کردیا
سینہ پر داغ کو ہمرنگ مجمر کر دیا

اب اقبال کی نظم ''نالۂ یتیم'' کے ابتدائی چند بند ملاحظہ ہوں۔ یہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسہ میں ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو زیر صدارت ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی کی پڑھی گئی تھی۔ اقبال کی نظم کے تتبع میں کئی لوگوں نے اس موضوع پر نظمیں کہیں۔ ان میں آغا شاعر دہلوی قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے ایسی دل خراش نظم بانگ درا میں شامل نہیں کی۔ ذیل میں نظم کے ابتدائی چند بند جن سے شاد متاثر ہوئے اور اوپر کے بند اقبال کی تقلید میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں۔

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں اپنا دل نہیں　　بجھ گئی جب شمع روشن درخور محفل نہیں
اے مضاف نظم ہستی میں ترے قابل نہیں　　ناامیدی جس کو طے کرلے یہ وہ منزل نہیں
ہائے کس منہ سے شریک بزم میخانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہوجائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خار حسرت غیرت نوک سناں ہونے لگا　　یوسف غم زینت بازار جاں ہونے لگا
دل مرا شرمندۂ ضبط فغاں ہونے لگا　　نالۂ دل روشناس آسماں ہونے لگا
کیوں نہ وہ نغمہ سرائے رشک صد فریاد ہو
جو سرود عندلیب گلشن برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاک گریباں کے لئے　　اشک غم ڈھلنے لگے پابوس داماں کے لئے
مضطرب ہے یوں دل نالاں بیاباں کے لئے　　جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لئے
لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر
روئیے جاکر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابل عشرت دل خوکردۂ حسرت نہیں   در خور بزم طرب شمع سر تربت نہیں
زیر گردوں شاہد آرام کی صورت نہیں   غیر حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں
صبح عشرت بھی ہماری غیرت صد شام ہے
ہستی انساں غبار خاطر آرام ہے

ہے قیام بحر ہستی جذر و مد اسلام کا   گاہے گاہے آ نکلتی ہے مسرت کی ہوا
زندگی کو نور الفت سے ملی جس دم ضیا   لے کے طوفانِ ستم ابر تغیر آ گیا
ہے کسی کو کام دل حاصل کوئی ناکام ہے
اس نظارہ کا مگر خاک لحد انجام ہے

نطق کر سکتا نہیں کیفیت غم کو عیاں   اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں انداز بیاں
آنہیں سکتی زباں تک رنج وغم کی داستاں   خندہ زن میرے لب گویا پہ ہے درد نہاں
عجز گویائی ہے گویا حکم قید خامشی
مجرم اظہار غم کو یہ سزا ملنے لگی

یاد ایام سلف تو نے مجھے تڑپا دیا   آہ اے چشم تصور تو نے کیا دکھلا دیا
اے فراق رفتگاں یہ تو نے کیا دکھلا دیا   درد پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا
رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر
کچھ مداوا اس مرض کا اے دل ناکام کر

حواشی

(۱) اقبال بنام شاد، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، مطبوعہ بزم اقبال لاہور، جون ۱۹۸۶ء
(۲) باقیات اقبال، مطبوعہ آئینۂ ادب، انارکلی لاہور، طبع سوم ۱۹۷۸ء
(۳) ''زمانہ'' کانپور، جلد ۶۱، نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء
(۴) سیر پنجاب، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ ۱۹۲۳ء
(۵) مخزن لاہور، بابت جون ۱۹۱۰ء
(۶) دکن ریویو بابت اگست ۱۹۰۴ء، (ایڈیٹر: ظفر علی خان)

(۷) اقبال نامہ جلد اول مرتبہ شیخ عطا اللہ ۱۹۴۵ء

(۸) زمانہ کانپور جلد ۵۲ نمبر ۲ بابت فروری ۱۹۲۹ء

(۹) مخزن[ا] لاہور، سال گرہ نمبر بابت مارچ ۱۹۲۹ء

(۱۰) شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ اسٹیم پریس حیدر آباد ۱۹۴۲ء

(۱۱) پیام مشرق طبع اول مئی ۱۹۲۳ء

(۱۲) آفتاب جھالرواڑ راجپوتانہ، بابت ستمبر ۱۹۲۱ء

(۱۳) مخطوطہ بیاض شاد- اقبال لائبریری سری نگر

ا جب اقبال جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس سے حیدر آباد گئے تو انہوں نے انگریزی میں لکچر دیے۔ اردو کے مشہور ادیب اور گلابی اردو کے موجد ملا رموزی کو اقبال کا انگریزی لکچر دینا پسند نہیں آیا۔ وہ مخزن سالگرہ نمبر بابت مارچ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۸ میں ''شذرات و اشارات'' کے تحت اقبال پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:-

''پچھلے دنوں جب حضرت علامہ سر اقبال جنوبی ہند کے دورہ پر تھے اور ''اسلام و اسلامیات'' پر اپنے محققانہ خطبات پڑھ رہے تھے تو اسی عرصے میں حیدر آباد بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے باشندوں کو بھی ممدوح گرامی نے اپنے عالمانہ خیالات سے مستفید فرمایا۔ اس موقعہ پر حیدر آباد کے روشن خیال باشندوں نے حضرت علامہ سے درخواست کی کہ ممدوح اپنے عالمانہ اور گراں منزلت خیالات کو زبان اردو میں ظاہر فرمادیں۔ مگر حضرت ممدوح نے ایسا نہ کیا، بلکہ تمام خطبات کی زبان انگریزی رکھی۔ ممکن ہے یہ واقعہ حضرت علامہ کو کسی ''سخت مجبوری'' کے باعث ہوا ہو۔ لیکن حامیان اردو اور خود حضرت علامہ کے لئے یہ واقعہ نہایت سخت افسوسناک اور مایوس کن ہے جبکہ ممدوح کا شمار بھی انہیں چند برگزیدہ افراد میں ہے جن کے فیض خیال و قلم سے ادب اردو بہاریں پا رہا ہے۔ امید ہے کہ علامہ ایسے مواقع پر زبان اردو کو فراموش نہ فرمائیں گے۔''

اقبال اور عطیہ بیگم فیضی (لنڈن ۱۹۰۷ء)

اقبال اور عطیہ بیگم فیضی[1]

عطیہ بیگم فیضی کے بارے میں ''ماہرین اقبالیات'' نے یہ جاننے کی کبھی کوئی زحمت نہیں اٹھائی کہ آخر وہ کون اور کس خاندان کی فرد تھیں۔ان حضرات نے اپنا زورِ قلم اقبال اور عطیہ بیگم کے معاشقے پر صرف کر کے بات کو بتنگڑ بنا دیا۔ہم نے ان کے بارے میں برسوں خاک چھانی اور یہ نتیجہ مرتب کیا کہ عطیہ بیگم کے والد گرامی کا نام نذر علی تھا اور وہ ممتاز شخصیت سر اکبر حیدری کی چھوٹی اور سگی بہن تھیں۔ان سے بڑی دو اور بہنیں تھیں، نازلی رقیہ بیگم[2] اور زہرا بیگم[3]

عطیہ بیگم کی ولادت غالباً ۱۸۷۷ء بمبئی میں ہوئی۔جب ڈاکٹر جاوید اقبال (مصنف اپنا گریباں چاک) حصول تعلیم کے بعد ۱۹۶۲ء میں پاکستان واپس آئے تو موصوفہ کے خط سے ان کو معلوم ہوا کہ اس وقت ان کی عمر پچاسی سال تھی۔اس کے بعد وہ مزید پانچ سال زندہ رہیں اور بالآخر نوے سال کی عمر میں ۴؍جنوری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

عطیہ بیگم کی داستان حیات عجیب و غریب تھی۔وہ بمبئی کی اعلیٰ اور عظیم الشان خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔وہ بدرالدین طیب جی کی سگی بھانجی تھیں۔ان کے خاندان کے بارے میں جناب حافظی صاحب نے ایک طویل مضمون (سر اکبر حیدری) ''مسٹر حیدری[4]'' کے عنوان سے لکھا جس کو ''ادیب'' الٰہ آباد کے آخری ایڈیٹر حسین عظیم آبادی نے جون ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع کیا۔اس کے ابتدائی حصے کا خلاصہ حافظی صاحب کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے:-

''غربی ہند کے مسلمان چار فرقوں پر منقسم ہیں۔اول میمن، دوم خوجے، سوم بوہرے، چہارم دکھنی مسلمان۔ان میں سے پہلے تین فرقوں کی خصوصیت بخلاف شمالی ہند کے جنگی و حکمراں نسل مسلمانوں کی یہ ہے کہ صدہا سال سے نہایت پرامن تجارت پیشے چلے آتے ہیں۔مسٹر حیدری سلیمان بوہرہ فریق سے ہیں۔بوہرہ جماعت کی تاریخ اور ان کے خصائص پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع عربی

وایرانی الاصل ہیں اور اس میں شک نہیں کہ غربی ہند کے ساحلی مسلمانوں میں بخلاف شمالی ہند کے آرین خلط کے عربی وایرانی اثرات زیادہ ہیں۔ مذہباً ان کا سلسلہ مشہور اسماعیلی شیعہ فریق سے ہے۔''

اخبار چودھویں صدی راول پنڈی اردو کا ایک مشہور اور پرانا اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سراج الدین احمد تھے۔ منشی صاحب ایک اور اخبار ''سرموہن گزٹ نا ہن'' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اخبار چودھویں صدی جلد اول نمبر ۱۸ مورخہ ۸ جون ۱۸۹۵ء (صفحہ ۲) میں ''مسٹر بدرالدین طیب جی بیرسٹرایٹ لا'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:-

''مسٹر بدرالدین طیب جی بجائے آنریبل جسٹس مسٹر بیلی کے بمبئی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسلمان اس خبر کے سننے سے خوش ہوں گے۔ مسٹر بدرالدین طیب جی ایک نہایت مشہور ومعروف اور قابل بزرگ ہیں۔ ہندو اور مسلمان اور پارسی وغیرہ سب ان کی قابلیت اور لیاقت کے قائل ہیں۔ نیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس منعقدہ مدراس کے وہ پریسڈنٹ تھے۔ اس کے بعد ان کی برادری نے ان کو کانگریس میں شریک نہ ہونے دیا۔ انجمن اسلامیہ بمبئی کے وہ پریسڈنٹ تھے۔ وہ قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ پہلے ان کو ایک دفعہ ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ وہ ہائی کورٹ کے ایک نہایت مفید اور کامیاب جج ہوں گے۔''

اس وقت میرے پیش نظر اردو کا ایک مشہور رسالہ ''زمانہ'' کانپور بابت نومبر ۱۹۰۶ء کا شمارہ ہے۔ اس میں طیب جی کے ایک واقف کار جناب قاضی کبیرالدین بیرسٹرایٹ لا کا مقالہ ''بدرالدین طیب جی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ قاضی صاحب (صفحہ ۳۱۹) لکھتے ہیں:-

''جسٹس بدرالدین بمبئی میں ۸/ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں ۱۶ سال کی عمر میں لندن گئے اور وہیں میٹریکولیشن پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں بیرسٹری کی۔ اعلیٰ پایہ کے وکیل اور مقرر تھے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ مدراس کے انڈین نیشنل کانگریس کے پریسڈنٹ ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دو مرتبہ بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہے۔ ہمیشہ عربی لباس یعنی عمامہ اور عبا پہنتے تھے۔ ہائی کورٹ اور دوسرے جلسوں میں یہی لباس زیب تن کرتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی کے تعلیم یافتہ معزز مسلمان اکثر اسلامی لباس میں دیکھے جاتے تھے۔ موصوف اپنے اسلامی فرقہ کے ملا یعنی مذہبی رہنما تھے۔ انہوں نے ''انجمن اسلام'' بمبئی کے ذریعہ سے جس کے وہ پریسڈنٹ تھے مسلمانوں میں تعلیم پھیلائی۔ دسمبر ۱۹۰۳ء میں محمڈن علی گڈھ کانفرنس کا جلسہ بمبئی میں ہوا تو آپ اس کے

پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ آپ کے سرسید کے ساتھ سیاسی اختلاف ہمیشہ رہا.................. بدرالدین طیب جی کا انتقال ۱۹ راگست ۱۹۰۶ء کو یورپ میں ہوا۔''

زمانہ کا اسی شمارہ (صفحہ ۳۳۵) میں لکھا گیا ہے کہ:۔

''مسٹر بدرالدین کی تین بھانجیاں ہیں۔ نازلی رفیعہ بیگم، زہرا بیگم اور عطیہ بیگم۔ عطیہ بیگم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ بمبئی (دسمبر ۱۹۰۳ء) میں زنانہ صنعت کی نمائش کی آزمائش و درستی میں بڑی بیش قدر مدد کی تھی اور جنھوں نے کانفرنس کے جلسہ علی گڈھ میں اس نمائش کی درستی اور زیب و زینت کو ایک سے دوچند کردیا تھا اور جنھوں نے تعلیم نسواں کی توسیع اور اس کے لئے وصول چندہ میں مسٹر شیخ عبداللہ سکریٹری شعبۂ تعلیم نسواں کو حد سے زیادہ مدد دی ہے اور جواب بامداد گورنمنٹ لندن کو تعلیم پانے گئی ہے۔''

قاضی صاحب ایک اور جگہ مس عطیہ بیگم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:۔

''مسٹر بدرالدین حقوق نسواں کے بڑے زبردست وکیل تھے۔ اپنے خاندان کی لیڈیوں (Ladies) کو بہت سی وہ آزادیاں دے رکھی تھیں جو مسلمان پردہ نشین بیگمات کے لئے ممنوع سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی دو صاحبزادیاں انگلینڈ میں تعلیم پا رہی ہیں۔ مس عطیہ بیگم ان کی بھانجی گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے تعلیم پانے کے لئے ابھی حال میں انگلینڈ بھی گئی ہیں۔''

عطیہ بیگم کے والد کھمبایت اور بمبئی کے مشہور تاجروں میں تھے۔ ان کی تجارت کی کوٹھیاں ملک چین اور یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

عطیہ بیگم گذشتہ صدی کی ابتدا میں ہندوستانی مسلمانوں میں خاندانی روایت کے مطابق نہایت روشن خیال اور آزادانہ ماحول کی انتہائی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ مغرب میں ایک تابناک ستارہ کی طرح ضوفشاں تھیں اور کئی لوگوں کو مرعوب کیا تھا۔ ان کا عنفوان شباب تھا۔ اس پر حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ہندوستان کی دو عظیم شخصیتیں علامہ شبلی نعمانی اور شیخ محمد اقبال عطیہ بیگم کے چراغ حسن کے دو باوقار، متوازن اور محتاط پروانے تھے جو وادی عشق کے خارداں میدان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ چونکہ دونوں پروانے بلند مرتبوں پر فائز تھے اور قوم میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اس لئے اس راہ پُر خطر میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے کہ کہیں دامن محبت گرد آلود نہ ہونے پائے۔ عطیہ بیگم نہایت پرکشش اور جادو نظر تھیں۔ وہ جہاں نظر اٹھاتی

تھیں تو پروانے خاکستر ہو جاتے تھے اور اس مثل کی مصداق تھیں

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آقائے احمد سروش مرتب ''کلیات اشعار فارسی از مولانا اقبال لاہوری'' (طبع اول صفحہ ۴۸) میں اقبال اور عطیہ بیگم کی تصویر ہے۔ اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:۔

''اقبال و عطیہ بیگم در ہلیدبرگ ۱۹۰۷ء میلادی۔ عطیہ بیگم از نوادر بانوئے ہند و پاکستان بود کہ مورد توجہ سہ تن از بزرگ ترین شخصیتہائے شبہ قارۂ ہند و پاکستان یعنی شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اقبالؔ لاہوری قرار گرفت۔''

عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ شبلی، آزاد اور اقبال تینوں بزرگوار عطیہ بیگم کی زلف گرہ گیر میں اسیر تھے۔ راقم کو آزادؔ کے بارے میں کوئی ٹھوس شہادت بہ جز اس کے دستیاب نہ ہو سکی کہ جب وہ ۱۹۲۳ء میں رہا کر دئے گئے تھے تو عطیہ بیگم نے انہیں مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ شیخ محمد اکرام (شبلی نامہ صفحہ ۱۵۳) کے مطابق ''ستمبر ۱۹۰۶ء میں شبلی کو اس ماہ تمام کی فقط ایک جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن ۱۹۰۷ء کے اواخر اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں انہیں موقعہ ملا کہ وہ آرام و اطمینان سے اس کی ضیاباری سے حظ اٹھائیں۔'' تفصیلات کے لئے ''خطوط شبلیؔ'' مرتبہ مولوی محمد امین زبیری مارہروی مطبوعہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۵ء حواشی میں ملاحظہ ہوں۔ ذیل میں ''خطوط شبلی'' کے دیباچہ سے عطیہ بیگم کے بارے میں کچھ اہم اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

''بمبئی میں خاندان فیضی بڑا ممتاز تھا۔ عطیہ بیگم اس خاندان کی معزز خاتون تھیں۔ وہ تعلیم کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتی تھیں۔ تعلیم آزادانہ ماحول میں پائی تھی۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندانوں کی طرح معاشرے میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ یہ خاندان استنبول میں مقیم رہا تھا۔ عطیہ بیگم کے والد تاجر تھے اور بسلسلۂ تجارت وہاں مقیم تھے۔ عطیہ بیگم کو ٹرکی میں سلطان عبدالمجید خان مرحوم نے ''نشان شفقت'' عطا کیا تھا، جو طبقۂ نسواں کا مخصوص تمغہ تھا۔ غالباً ہز ہائنس نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ خلد مکاں سابق فرمانروائے بھوپال کے علاوہ یہ دونوں ہندوستانی خواتین محترم (عطیہ بیگم اور نازلی بیگم) ہیں جن کو سلطنت عثمانیہ نے اعزاز بخشا تھا۔ عطیہ بیگم انتہائی ذہین، تیز و طرار، سخن فہم، بذلہ سنج، رمز آشنا، حاضر جواب اور بے حجاب خاتون تھیں۔ ان کی دوسری بہنیں اگرچہ عطیہ کی طرح باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں لیکن نہایت قابل تھیں۔ ان کی مجلسوں میں علمی تذکرے رہتے تھے۔ زہرا بیگم کو واقع نگاری میں

خاص ملکہ حاصل تھا۔ عطیہ بیگم سب سے چھوٹی لیکن سب سے ذہین اور جینیس (Genious) تھیں۔ شبلی نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے جن سے ایک خاتون قابل رشک مرتبہ حاصل کرسکتی ہے۔ رفتہ رفتہ انہیں اس خاندان سے عزیزانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ پھر ندوہ کی امداد اور اتحاد خیال نے ان میں اور بھی مضبوطی پیدا کر دی۔

عطیہ بیگم اردو فارسی کے علاوہ عربی سے بھی بخوبی واقف تھیں۔ انگریزی گویا روزمرہ کی زبان تھی۔ ان خصوصیات کے علاوہ ان کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ خوش آواز تھیں اور آواز نہایت موثر تھی۔ بقول شبلی موصوفہ کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں تھی اس لئے بے سُر گا رہی تھیں۔ ٹکڑی اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔ شبلی نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ فن موسیقی پر مطبوعہ منشی نولکشور کی کتاب ''قانون موسیقی'' کا مطالعہ کریں۔ موصوف نے ایک مرتبہ عطیہ بیگم کی زبان سے حافظ شیرازی کے اشعار سنے اور چاہتے تھے کہ وہ فن موسیقی میں کمال حاصل کریں۔ بالآخر موصوفہ نے ہندوستانی موسیقی پر ایک نہایت دلچسپ اور پراز معلومات کتاب لکھی جو چھپ بھی چکی ہے۔

عطیہ بیگم نے گیارہ برس کی عمر میں اپنے خاندان کی لڑکیوں کے لئے ''عقد ثریا'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی جو عرصہ دراز تک قائم تھی۔ اس کا مقصد اپنے خاندان میں ادبی ذوق پیدا کرنا تھا۔ ان کی والدہ نواب بیگم صاحب امیر النساء بیگم (م-۱۹۰۸ء) بمبئی میں تعلیم نسواں کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس میں عطیہ بیگم لڑکیوں کو ڈرل (ورزش) سکھاتی تھیں۔ دونوں بہنیں (عطیہ بیگم اور زہرا بیگم) ممتاز مقررین تھیں۔''

یورپ کی واپسی کے چند سال بعد ۱۹۱۲ء میں عطیہ بیگم کی شادی مسٹر رحمین سے ہوئی جو یہودی مذہب رکھتے تھے۔ انہوں نے شادی سے قبل مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ وہ نہایت ممتاز و مشہور اور کامل الفن آرٹسٹ تھے جن کے آرٹ کی یورپ میں خاصی شہرت تھی۔ انہوں نے شبلی کی ایک تصویر بنائی تھی جو حقیقتاً ان کے کمال مصوری کا نمونہ تھی۔ فرانس کی ایک نمائش منعقدہ ۱۹۱۳ء کی آرٹ گیلری میں اس کی بے انتہا قدر کی گئی اور نہایت معقول قیمت لگی۔ لیکن عطیہ بیگم نے اس کا فروخت کرنا گوارا نہیں کیا۔ اور وہ ایوان رفعت (عطیہ بیگم کا محل واقع بمبئی) کی زینت بنائی گئی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ عطیہ بیگم کی شادی سے متاثر ہو کر علامہ شبلی نے ایک شعر اور ایک قطعہ موزون کیا تھا جو عطیہ بیگم کی بیاض سے مرتب ''خطوط شبلی'' یعنی مولوی زبیری صاحب نے دیباچۂ خطوط میں نقل کئے ہیں۔ یہ اشعار ''کلیات شبلی'' صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ

معارف پریس اعظم گڈھ میں موجود ہیں۔ میرے کتب خانہ میں کلیات شبلی کا وہ بیش بہا نسخہ موجود ہے جس پر علامہ اقبال کے جگری دوست منشی سراج احمد میر منشی رزیڈنٹ کشمیر کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ اشعار اس طرح درج ہیں ۔

شعر (بزبان عطیہ بیگم)

بتان کفر کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

قطعہ

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھکو کوئی اپنی طرف اس لئے ننگِ قرابت سے مجھے دوری تھی
آپ نقاش ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں آپ نے کھینچ لیا مجھکو تو مجبوری تھی

علامہ شبلی نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا۔ یہ اسی زمانے میں مشہور ہوگیا تھا جب علی گڈھ پہنچا تو ایک ذہین وظریف طالب علم اقبال احمد سہیل (م-۱۹۵۸ء) جو بعد میں اعظم گڈھ میں وکالت کرتے تھے اور فارسی و اردو کے نہایت صاحب کمال شاعر تھے، انہوں نے اس کے جواب میں ذیل کا قطعہ کہا ۔

کب یہودی سے عطیہ عقد زیبا تھا تمہیں بنت فیضی تم ہو یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمہیں
ہم نے یہ مانا وہ مانی ہے تو تم تصویر حسن تم کو کھنچنا تھا مصور نے جو کھینچا تھا تمہیں

اور شوہر عطیہ کی زبانی یہ شعر ۔

صفحۂ دل پر جو کھینچی آپ کی تصویر حسن
مستحق تھا جس ''عطیہ'' کا وہ میں نے پا لیا

شبلیؔ اور سہیلؔ کے قطعات اسی زمانے میں شاہ دلگیر اکبر آبادی (م-۱۹۳۶ء) کے رسالہ ''نقاد'' آگرہ میں شائع ہوئے تھے (داستان تاریخ اردو طبع سوم صفحہ ۷۲۵ از پروفیسر حامد حسن قادری مطبع آگرہ پریس ۱۹۶۷ء)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلیؔ کی زندگی میں عطیہ بیگم نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کسی جلسے میں شرکت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ان کی شرکت کے لئے علامہ بھی راضی ہوگئے تھے مگر مولویوں کی مخالفت کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ شبلی یہ بھی چاہتے تھے کہ ندوہ کی بورڈنگ ہاؤس کا سنگ بنیاد عطیہ بیگم کی والدہ کے ہاتھوں رکھا جائے۔ لیکن مخالفت کے سبب یہ بھی نہ ہوسکا۔

شبلی کے انتقال کے کئی سال بعد ۱۹۲۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڈھ میں منعقد ہوا۔ عطیہ بیگم اس میں شرکت کرنا چاہتی تھیں لیکن خواتین کے نام ٹکٹ کا اجراء کرنا ممنوع کر دیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء کے اجلاس میں جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جوبلی کے موقعہ پر کیا گیا خواتین کے شریک ہونے کی سخت مخالفت ومُزاحمت کی گئی جو بدتمیزی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس واقعہ کے چند سال بعد دونوں بہنوں یعنی عطیہ بیگم اور زہرا بیگم کی قیادت میں عورتیں فتح سے ہمکنار ہوئیں اور پردہ دار گیلری کو چھوڑ کر انہوں نے پلیٹ فارم پر تقریریں کیں۔ آنریری سکریٹری نواب صدر بہادر جنگ بطور احتجاج اجلاس سے چلے گئے۔ آخر کار وہ وقت آیا کہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس میں عطیہ بیگم کا آزادی سے خیر مقدم کیا گیا۔

اقبال اور عطیہ۔ بیگم عطیہ کے دوسرے پروانے ڈاکٹر اقبال تھے۔ وہ موصوفہ سے عمر میں تین چار سال بڑے تھے لیکن شبلی ان دونوں شمع پروانوں سے بہت سن دراز اور بزرگی کی مسند پر جلوہ افروز تھے۔ اقبال شبلی کے مقابلے میں بہت زیادہ سنجیدہ، متین اور محتاط تھے۔ دونوں بزرگوں کی آرزو یہ تھی کہ وہ اپنے شاہکاروں کو عطیہ کے نام منسوب کر کے ان کی خوشنودی حاصل کریں۔ اقبال جذبات کی طغیانی میں مغلوب ہو کر ادھر ادھر کی باتوں سے گریز کرتے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں نے اقبال اور عطیہ بیگم کے افسانۂ عشق کو خوامخواہ اتنا اچھالا کہ صفحوں کے صفحے بغیر کسی نتیجے کے سیاہ کر دیے۔ اقبال کوئی عالم دین یا کسی شرعی کرسی پر فائز نہیں تھے کہ فطری جذبات سے کنارہ کش ہوتے۔ کچھ لوگ اقبال کو عالم ارواح کی مخلوقات میں گردانتے ہیں، انہیں اقبال کو انسان کہنا بھی گوارا نہیں۔ اقبال انسان تھے نہ کہ فرشتہ۔ فرشتہ معصوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس سے کوئی غلطی یا خطا نہیں ہوتی ہے۔ اللہ نے انسان کو فرشتہ کے مقابل میں افضل بنا دیا ہے اس لئے کہ وہ اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے۔ انسان جذبات کا پتلا ہے۔ اس میں محبت، نفرت، غصہ، رنج و غم کی انواع اقسام کی کیفیات ہوتی ہیں۔ اس میں اپنے جذبات کو قابو میں کرنے کے لئے ہر قسم کی صلاحیت موجود ہے۔

عطیہ بیگم نے اقبال کے انتقال کے نو سال بعد "اقبال" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی جس میں اقبال کے ۲۲/اپریل ۱۹۰۷ء سے دسمبر 1911 تک کچھ نجی خطوط اور نظمیں شامل

کر کے اقبالیات میں قابل قدر اضافہ کیا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن (مترجم) ضیاء الدین برنی نے ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن (مترجم) عبدالعزیز خالد نے مطبع آئینۂ ادب لاہور سے ۱۹۷۷ء میں شائع کرایا۔ اقبال میں عطیہ بیگم نے اقبال کے متعدد خطوط شامل نہیں کیے۔ اگر وہ بھی شامل کرتیں تو اقبال کی لائف کے کچھ اور گوشے سامنے آجاتے۔ میری نگاہ میں ہر وہ کتاب اہم اور مفید ہوتی ہے جس میں اقبال کے بارے میں کسی نئی بات کا اضافہ کیا جاتا ہے چہ جائیکہ اس میں اقبال کی نئی تحریروں کی بہتات ہو۔ موصوفہ کتاب کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ:۔

''کتاب کی اشاعت کا مواد اتنے سال تک میرے پاس پڑا رہا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس وقت بھی میں یہ معلومات اپنی مرضی سے عامۃ الناس کے سامنے نہیں لا رہی کیونکہ میرے دماغ میں ایسا خیال کبھی نہ آتا۔ یہ بات نہیں کہ میں نے اس کو اتنا اہم نہیں سمجھا کہ یہ وسیع پیمانے پر پھیلے بلکہ میری طبیعت کی تشہیر سے بے رغبتی ایسے کام اور اقدام کی راہ میں حائل تھی۔ نتیجتاً یہ سارا مواد لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا۔ بہت سوں کو علم تھا کہ اقبال کی بعض اصلی نظمیں میرے قبضے میں ہیں اور مجھ تک ان کی اشاعت کی درخواستیں بھی پہنچی تھیں۔ لیکن میں نے ان درخواستوں کو قابل اعتنا نہ سمجھا (کیونکہ بہت سی تو محض تجسس کی پیداوار تھیں اور دوسروں کو ذاتی منفعت مقصود تھی) یہاں تک کہ ریاست حیدر آباد کے حالیہ سفر میں اتفاقیہ میری ملاقات امیر پائگاہ نواب حسن یار جنگ بہادر سے ہوئی۔

نواب حسن یار جنگ کی قائم کردہ ''مجلس اقبال'' میں مجھے شرکت کی دعوت ملی۔ جہاں فلسفۂ اقبال کی تعلیم و توضیح اس خلوص اور دلچسپی سے دی جاتی ہے کہ اپنے آپ کے باوصف (اپنی افتاد کے علی الرغم) میں نے ادارے کے قیام کی طاقت کو محسوس کیا اور جب میں نے دیکھا کہ کام کتنی دشواری، قربانی اور جانفشانی سے ہو رہا ہے تو میں لاشعوری طور پر اس کے اخلاص و مقصد سے متاثر ہوئی۔ میں نے نواب یار جنگ کو اس قرآنی نص کا مجسم نمونہ پایا کہ علم حاصل کرنا افضل ترین چیز ہے اور اس کے لئے آدمی کو دنیا کے دوسرے حصے تک بھی جانا پڑے تو جانا چاہیے۔ نواب حسن یار جنگ ہی نے اس خیال کی تحریک کی اور مجھے ان کی تجویز پر صاد کرتے ہی بنی۔''

''اقبال'' چھپ گئی تو بعض لوگوں کو اعتراض ہوا کہ عطیہ بیگم نے کتاب شائع کر کے اقبال کے راز درون کو طشت از بام کیا۔ بعضوں نے اس کی آڑ میں اقبال کی ہیجانی کیفیت پر زور قلم صرف کیا۔ خود اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے چند سال قبل علامہ پر ایک کتاب ''مظلوم اقبال''

کے نام سے لکھی جو ۱۹۸۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ مصنف کتاب نے ان لوگوں کو ظالم قرار دیا ہے جنہوں نے اقبال کے بارے میں حقیقت پسندانہ اظہار خیال کیا تھا۔ شیخ اعجاز نے عطیہ بیگم کو بھی ''اقبال'' کی اشاعت پر بڑا ظالم کہا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

''اقبال کی قلبی کیفیت اور بزرگوں کے رویے کے خلاف احتجاج کا اظہار ان دو ایک خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے جذبات کے ہیجان میں اپنے دل کا درد ایک دوست سے کہنے کے لئے عطیہ فیضی کو لکھے۔ افسوس کہ ان محترمہ نے ان خطوط کو شائع کر کے ایک مرحوم دوست پر بڑا ظلم کیا۔''

برعکس اس کے خود اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں متعدد مقامات پر عطیہ بیگم کی کتاب ''اقبال'' سے استفادہ کر کے کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ وہ اقبال کے ''جذباتی ہیجان'' کے بارے میں خاموش ہیں۔ وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں سے کسی صاحب کمال کے فن پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے کہ یہ اہل فن کا نجی معاملہ ہے۔ ہاں اگر اقبال کوئی عالم دین یا کسی درگاہ کے سجادہ نشین ہوتے تو اعتراض ہو سکتا تھا۔

عطیہ بیگم نے اقبال کے فن پر اپنی جچی تلی رائے کا اظہار ان الفاظ میں پیش کر کے اقبال کے تئیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میں موصوفہ کی رائے کو اس لئے اہم سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اقبال کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ فرماتی ہیں:۔

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اقبال کی فطانت بجائے ارتقاء پذیر ہونے کے دب گئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کے حالات جن میں انہیں رہنا پڑا اس بربادی کے ذمہ دار ہیں۔ فطرۃً اقبال ایک زبردست دماغی قابلیت کا انسان اور ایک غیر معمولی جینیس (Genious) تھا۔ اس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ جو کچھ اس نے ایک دفعہ پڑھا اس کے ذہن پر نقش تھا۔ عام گفتگو میں وہ بذلہ سنج تھا۔

اقبال کا اسلوب فکر دنیا کے باقی تمام معروف ادیبوں سے مختلف تھا اور میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اس امتیاز کی بنیادی جڑ اس علم میں تھی جو اس نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ اس نے قرآنی الفاظ کی تہہ میں جو معانی پنہاں ہیں، انہیں پورے طور پر اپنی طرف میں لے لیا تھا۔ لیکن یقیناً اس نے اپنے بہت سے افکار کو اس مقدس اور الہامی سانچے میں ڈھالا اور علم نے اُسے متموّل کیا۔ مثلاً اس کی اسرار خودی سے عیاں ہے کہ انسان کو زمین پر جو مکمل آزادی عطا کی گئی ہے اس کی عظمت کا اُسے پورا پورا احساس تھا۔ اس کی بدولت وہ خالق سے اس کی

طاقت کو چھیننا چاہتا ہے جو اسے اپنی مخلوقات پر حاصل ہے۔ جسے وہ اپنی سمجھتا، لیکن اسے پورے طور پر حاصل کرنے میں کوتاہ دست ہے۔ تب وہ اظہار وجود کا مطالبہ کرتا ہے جو کچھ کہ پردہ واخفاء میں ہے اسے بہ نفس نفیس جاننا چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کو بھی للکار اٹھتا ہے اور ان اسرار کائنات کے لئے جو اسے پوشیدہ ہیں اُسے مورد الزام ٹھہراتا ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ اقبال عطیہ بیگم کی تعلیمی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مداح تھے۔ وہ ان کے حسن مجسم، قد و قامت اور سراپا کے دلدادہ تھے، ان پر فریفتہ بھی تھے۔ اس کی ایک مثال میں پیش کرتا ہوں۔ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم اور اس کا عنوان ''سلیمی'' ہے۔ یہ غالباً ۱۹۰۷ء میں ہائڈل برگ میں عطیہ کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔ نظم پہلی مرتبہ خواجہ حسن نظامی کے ماہنامہ ''نظام المشائخ'' دہلی میں ''لامکان کا مکان'' کے عنوان سے چھپی تھی۔ نظم کا عنوان غالباً خواجہ صاحب نے خود ہی رکھا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ تین سال تک یہ شاہکار نظم اشاعت پذیر کیوں نہیں ہو سکی۔ بعض اوقات اقبال نظم کے عنوان کی بجائے کسی مصرعے کو پسند کر کے سرنامہ عنوان لکھتے تھے۔ کبھی کبھی سید سلیمان ندوی اور خواجہ صاحب اپنی طرف سے عنوان رکھتے تھے۔ یہ نظم ''زمانہ'' کانپور جلد ۲۷ شمارہ ۱۶۰ (صفحہ ۱۳) بابت جولائی ۱۹۱۶ء میں ''لامکان کا مکان'' کے عنوان سے ہی زینت پا چکی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نظم ''صوفی'' پنڈی بہاء الدین ضلع گجرات (پنجاب) جلد ۱۳ نمبر ۲ صفحہ ۶ بابت فروری ۱۹۱۵ء میں چھپی تھی۔ صوفی میں اس کا عنوان ''لامکان کا مکان'' نہیں تھا بلکہ ذیل کے مصرعے کے تحت شائع ہوئی تھی

آنکھوں میں ہے عطیہ تیری کمال اس کا

ہم نے اس مصرعہ کو غور سے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ اہل مطبع نے ''عطیہ'' کو کھرچ کر ''حسینہ'' بنا دیا تھا۔ ہم نے اس خوبصورت نظم کو ''اقبال اور عطیہ بیگم'' کے عنوان سے ''ہماری زبان'' دہلی میں شائع کیا۔ اسی مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بھی ''نگار'' کراچی میں شائع کیا۔ جب ''نگار'' کا مضمون ہمارے دوست پروفیسر صابر کلوری کی نظر سے گزرا تو انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ نظم کا عنوان اقبال نے ''لامکان کا مکان'' رکھا تھا۔ اس کے بعد کلوری صاحب نے اسی عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا جو غالباً ''صحیفہ'' لاہور میں اگست ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ صحیفہ کا وہ شمارہ اس وقت

سامنے نہیں ہے۔ موصوف نے اقبال میوزیم لاہور میں ''بیاض اقبال'' کے مخطوطے میں یہ نظم بخط اقبال دیکھی اور اس کا عنوان اقبال نے ''عطیہ'' ہی لکھا تھا۔ ہم یہ خوبصورت نظم اپنی Critical Appreciation کے ساتھ اسی عنوان سے ذیل میں درج کرتے ہیں:-

آنکھوں میں ہے ''عطیہ'' تیری کمال اس کا

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے — خورشید میں قمر میں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

جس کی چمک سے پیدا جس کی ہویدا — شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر — ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا

آنکھوں میں ہے ''عطیہ'' تیری کمال اس کا

تبصرہ سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کی پہلی ملاقات عطیہ بیگم کے ساتھ ۲۲ راپریل ۱۹۰۷ء کو ہائڈل برگ میں ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر دونوں کی جو تصویر اتاری گئی تھی وہ ''روزگار فقیر'' جلد دوم اور بعد میں کلیات اقبال مرتبہ احمد سروش میں بھی شائع ہوئی تھی۔ ہم نے اس تصویر کا بغور مطالعہ کیا اور اس کو رنگین بنوا کر شامل کتاب کیا ہے۔ عطیہ بیگم تصویر میں حسن کا پیکر نظر آتی ہے۔ ان کی نرگسی آنکھوں سے گویا شراب دوآتشہ ٹپکتی ہے۔ قدوقامت قیامت کے فتنے سے کم نہیں ہے۔

نظم بہت پیاری اور حسن ادا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ یہ بحر مضارع مثمن اخرب میں موزون کی گئی ہے۔ ارکان یہ ہیں: مفعول، فاعلاتن، مفعول، فاعلاتن۔ پہلے شعر میں الفاظ کی مناسبت سے ستارہ، خورشید اور قمر میں صنعت مراعات النظیر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور صنعت پائی جاتی ہے جس کو براعت الاستہلال کہتے ہیں کہ یعنی کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال میں لانا جو آیندہ معنی سے مناسبت رکھتے ہوں۔ دوسرا شعر اقبال کے فلسفۂ وحدت الوجود کا آئینہ دار ہے۔ تیسرے شعر میں صنعت لف ونشر مرتب ہے۔ اس کی نثر یوں ہے کہ جس کی چمک میں شبنم ہے اور جس کی مہک پھولوں میں بسی ہے۔ چوتھے شعر میں صحرا، چمن، سکوت اور ہنگامہ میں تضاد ہے۔ پانچواں شعر مطالب کے اعتبار سے پوری نظم کی وضاحت کرتا ہے۔ یعنی ہر نجومی اور انسان کو اپنے

اپنے خیال کے مطابق ہر شئے میں خدا کی خدائی نظر آتی ہے۔ آخر وہ کون سا حُسن ہے جس میں جمال الٰہی نظر نہیں آتا ہے۔ ہر حسن اسی کا مظہر ہے۔ خورشید میں اسی کا نور ہے، چاند میں اسی کا پرتو ہے اور ستاروں کی انجمن میں اسی کی جلوہ آرائی اور ہنگامہ پذیرائی ہے۔ صوفی اپنے باطن میں اسی کو دیکھتا ہے اور شاعر اپنے حسن بیاں میں اسی کی صناعی کی مالا جپتا ہے۔ شبنم کے موتیوں میں اسی کی آب و تاب اور پھولوں میں اسی کی بو باس رچی بسی ہے۔ صحرا کو دیکھئے تو اس کی خاموش فضاؤں میں اسی کا سکوت کارفرما ہے اور ہر کاشانۂ چمن میں اسی کی گہما گہمی ہے۔ بقول شاعر ؎

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے ۔ بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا ۔ جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

اقبال کو ذرے ذرے میں حسن ازل کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا کمال عطیہ کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ عطیہ کی نرگسی آنکھوں کو دیکھ کر کیوں نہ اس جمال الٰہی کی تعریف کروں جس نے تم کو نور کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھکر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

اقبال فقیرانہ اور قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے عطیہ کا پیکر حسن دیکھکر قرآنی الفاظ میں خالق کائنات کی آفرین وستائش کی۔ عطیہ بیگم کے پر حسن سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور بڑے بڑوں کا زہد و تقویٰ ٹوٹ جاتا تھا۔ ایک بزرگ نے یہاں تک ان کے حسن و جمال کی داد دی ہے ؎

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی

اب اس شخص کی زبان سے عطیہ کی نرگس شہلا اور قد و قامت کی تعریفیں سنئے جس نے عطیہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس وقت دیکھا تھا جبکہ موصوفہ کا سن ۵۸ سال کا ہو چکا تھا اور ان کا آفتاب حسن زوال پذیر ہو رہا تھا۔ یہ شخص ادبیات اردو اور دنیائے صحافت میں رئیس احمد جعفری ندوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ جب جعفری صاحب نے موصوفہ سے ملاقات کی تھی اس وقت وہ روزنامہ ''خلافت'' بمبئی کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اپنی کتاب ''دید و شنید'' (صفحہ ۵۷۰-۵۷۴)

میں عطیہ بیگم کے پیکر حسن کی تعریف غالب کے اس مصرعے کے زیرعنوان کرتے ہیں

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات

اس کے بعد جعفری صاحب کی زبان سے اس بت طناز سراپا ناز کی گل فشانی یوں ہوتی ہے :-

''۱۹۳۵ء کے موسم بہار میں میرے اور مولانا عرفان ندوی کے استقبال کے لئے سفید لباس میں ملبوس ایک کہن سالہ خاتون آگے بڑھیں۔ بال سفید، چہرہ ضعیفی کا آئینہ دار، لیکن اداؤں میں شوخی، انداز گفتگو میں بیباکی، حرکات وسکنات میں ایک خاص قسم کی انفرادیت۔ مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ خلافت کے ایڈیٹر ہیں۔ جعفری صاحب''! پھر مجھ سے فرمایا ''یہ ہیں عطیہ بیگم فیضی'' عطیہ بیگم! کتنا دل آویز نام! اور اس نام کے ساتھ کتنی رنگین حکایتیں اور کتنی ہوشربا کہانیاں اور کتنی دلچسپ داستانیں وابستہ تھیں۔ یہ بوڑھا مجسمہ جس میں آج نہ کوئی رعنائی ہے اور نہ زیبائی، نہ دلکشی ہے، نہ سحر طرازی، اپنے زمانے میں کیا کچھ نہ تھا۔ یہ بے رس آنکھیں جس طرف اٹھ جاتی تھیں، قتل عام شروع ہو جاتا تھا۔ میں اپنے حافظے میں تاریخ ماضی کے یہ اوراق الٹ رہا تھا کہ عطیہ بیگم نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا'' آپ تو آج پہلی بار ہمارے ہاں آئے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔ میں ساتھ ہولیا اور عطیہ بیگم نے اپنے شاندار اور یادگار محل (ایوان رفعت) کی سیر کرانا شروع کی۔ سنگ مرمر کی خوشنما جالیاں، نقرئی وطلائی ظروف، بیش قیمت قالین، نظروں کی تازگی بخشنے والا ساز و سامان۔ اس نظارہ سے فارغ ہو کر وہ اپنی آرٹ گیلری میں ہمیں لے گئیں۔ نگاہ شوق کی رہنمائی میں ہم اور آگے بڑھے۔ سامنے ایک قدم آدم تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کیا تھی؟ حسن و جمال اور رعنائی و زیبائی، دلکشی و فسوں طرازی کا ایک پیکر خاموش تھی۔

ع — بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

نرگس شہلا کی طرح بڑی بڑی آنکھیں، گل تر کی طرح شگفتہ اور رنگیں چہرہ، مار سیاہ کی طرح بڑی بڑی اور بڑے بڑے دلوں کو اسیر کرنے والی زلفیں۔ جوانی تھی کہ پھٹی پڑ رہی تھی۔ شباب تھا کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ نشہ تھا کہ سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ یہ تصویر کسی فانی ہستی کی نہ تھی۔ یہ تصویر تھی حسن کی، شباب کی، حسن عالم آشوب کی، شباب لازوال کی۔

عطیہ بیگم تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولیں ''پہچانئے کس کی تصویر ہے؟'' میں ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ مولانا عرفان نے لقمہ دیا'' آپ کے سوا کس کی ہوسکتی ہے؟'' وہ مسکرائیں اور کہا

ع — '' یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا''

ایوان رفعت میں مورخہ ۱۰ ر ستمبر ۱۹۳۱ء کے ورود اقبال کا تفصیلی ذکر پروفیسر صابر کلوروی نے بھی اپنی کتاب ''اقبال کے ہم نشیں'' (صفحہ ۶۹-۷۲) مطبوعہ مکتبہ خلیل لاہور ۱۹۸۵ء میں ضیاء الدین برنی صاحب کے حوالے سے کیا ہے۔ ذیل میں ان کی پوری تحریر درج کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

''ڈاکٹر (اقبال) سے میری (برنی) آخری ملاقات بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ جب کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس ہوئے تھے اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ ان ہی دنوں سہ پہر کو محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے دولت کدہ ''ایوان رفعت'' میں انہیں چائے پر مدعو کیا۔ اس موقعہ پر ہائی کورٹ کے جج مرزا علی اکبر خان، مولانا محمد عرفان، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اور بہت سے دوسرے اکابر و فضلاء موجود تھے۔ یہ ٹی پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دل آویزی پیدا ہوگئی تھی۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا تا کہ بیگم صاحب کا ہاتھ بٹاؤں۔ اتفاق سے یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ بیگم صاحب بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ ''موٹر لے جا کر جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ''۔ ابھی چند ہی فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آ رہے ہیں۔ میں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ ''آپ کا وہاں بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں''۔ میں نے کہا کہ ''یہ کام تو آپ پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں انہیں آپ کس مد میں ستا رہے ہیں''؟ بہر حال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضا مند ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم ''ایوان رفعت'' پہنچ گئے جہاں دروازہ پر بیگم صاحبہ اور فیضی رحمن (عطیہ بیگم کے شوہر) نے ان کا استقبال کیا۔ بیگم صاحب کے شکوہ و شکایت کے بعد ہم سب لان میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا اتنا کہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بیگم صاحبہ سے ہنس ہنس کر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مذاقیہ جملے بھی کستے جاتے تھے۔ مجھے ایک جملہ یاد رہ گیا ہے۔ دوران گفتگو میں عطیہ بیگم نے کہا ''اقبال! یاد رکھو، بچے کے لئے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے''۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر پوچھا ''اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے؟'' عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کر دیا۔

چائے نوشی سے فارغ ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے معزز مہمانوں کا تعارف کرایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ پیغام دیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے اور مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ہی اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ ''یہی میرا پیغام ہے''۔ وہ شعر یہ ہے۔

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا زکردۂ خود شرمسار تر گردد

جولوگ فارسی سمجھتے تھے وہ اس لافانی شعر سے اور پیغام کی عظمت سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔لیکن جو لوگ فارسی سے نابلد تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا اور اصرار کیا کہ وہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ لکھوادیں۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے اس کا ترجمہ لکھوادیا:۔

"Live so beautifully that if death is the end of all, God him self may be put to shame for having ended thy Career."

لان سے سب حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا، جہاں رقص و سرود کا انتظام تھا۔میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔تھوڑی دیر تک موسیقی ہوتی رہی اور اس کے بعد رقص ہوا۔ایک کالی کلوٹی عیسائی عورت نے اپنے ''کمالات'' دکھائے۔رقص کے دوران میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے اشعار لکھکر انہیں عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کئے۔

ترسم کہ قوی رانی زورق بہ سراب اندر   زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
برگشت و بیاباں ہیچ برکوہ و بیاں ہیچ   برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست   مہجور جناں حورے نالہ بہ رباب اندر

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا مزاحیہ شعر ایک کاغذ پر لکھکر عطیہ بیگم کو دیا۔

''پرائیویٹ''

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ   کہیئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں
محمد اقبال ۱۰ ستمبر ۳۱ء

تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہاتھ ملائے اور ایوان رفعت سے رخصت ہوگئے۔''

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم نے اقبال سے میر انیس کے بارے میں بھی کچھ پوچھا ہوگا۔ان کا خاندان میر انیس سے نہایت مانوس تھا اور اہل خانہ انیس کے مرثیے بھی پڑھتے تھے۔اس زمانے میں بھی مطبع اسلامی اور مطبع مخدومی سے انیس و دبیر کے مرثیے بھی چھپتے تھے۔خود بانی پاکستان محمد علی جناح کے دولت خانے سے جلوس عاشورہ اٹھایا جاتا اور جناح صاحب ذوالجناح کی لگام تھامتے تھے اس بنا پر وہ محمد علی ذوالجناح بھی کہلائے جاتے تھے۔بعد میں وہ جناح کے مخفف سے ہی مشہور

ہوئے۔ خود علامہ اقبال نے انیس کا مطالعہ کیا تھا۔ جب ۱۹۰۳ء میں ان کی زبان پر اعتراض ہونے لگے تھے تو انہوں نے اپنے دفاع میں انیسؔ کے شعر بطور استناد پیش کئے تھے۔ اقبال کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ انہوں نے عطیہ بیگم کی فرمائش پر میر انیس کے چند بند بیگم صاحبہ کو لکھکر دئے تھے۔ مرثیہ علی اکبر شبیہ پیغمبر کے حال کا ہے۔ ہم ذیل میں وہ بند درج کرتے ہیں۔

رخصت ہمیں ماں دیں نہ پھوپھی دیں نہ پدر دیں ۔۔۔ حیران ہیں کیوں کر رہ معبود میں سر دیں
فوجیں جو بڑھی آتی پسپا انہیں کردیں ۔۔۔ اک آن میں یہ دشت وغا لاشوں سے بھر دیں
آفت میں کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہوتا
اے کاش پھوپھی نے ہمیں پالا ہی نہ ہوتا

کیسی مصیبت فلک پیر نے ڈالی ۔۔۔ جائیں گے کہاں جب نہ رہے سید عالی
نہ دوست نہ غم خوار نہ مولا نہ موالی ۔۔۔ یہ آج کا جینا نہیں دو حال سے خالی
یا دشت میں یا کوہ کے داماں میں رہیں گے
یا بیڑیاں پہنے ہوئے زنداں میں رہیں گے

پھر خاک ہے گر عمر ملی لاکھ برس کی ۔۔۔ بلبل سے اب اٹھتی نہیں تکلیف قفس کی
واں پہروں کو آتی ہے یہ آواز جرس کی ۔۔۔ ایذا ہے مسافر کو فقط چند نفس کی
اس دن کے سوا توشۂ عقبیٰ نہ ملے گا
ڈھونڈے گا تو پھر قافلہ ایسا نہ ملے گا

اے سالک منہاج علی راہ دکھا دے ۔۔۔ دروازۂ رحمت مجھے اللہ دکھا دے
جس در کا ہوں مشتاق وہ درگاہ دکھا دے ۔۔۔ دربار شہنشاہ فلک جاہ دکھا دے
واں پہنچوں جہاں عرش بھی پایہ نہیں رکھتا
ہمسایہ میں اس کا ہوں جو سایہ نہیں رکھتا

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ لوگوں نے اقبال اور عطیہ بیگم کے معاشقے کا خوب ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ تمام باتیں اقبالیات میں جگہ پا چکی ہیں اس لئے اس کے بارے میں مزید کسی رائے زنی کو ہم درخور اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کی تحریروں سے ایک انتہائی تعلیم یافتہ کس قدر متاثر ہوگئی تھی۔ عطیہ اور ان کی دونوں بہنیں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے خوب آشنا

تھیں۔ دونوں تعلیم نسواں اور بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے رہن سہن کو عمدگی سے لوگوں کو آشنا کرانا چاہتی تھیں۔ اقبال کا ایک مضمون ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' کے عنوان سے مخزن لاہور جلد ۲ نمبر ۴ بابت جنوری ۱۹۰۲ء (صفحہ ۲۲-۳۰) میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں عطیہ بیگم کی والدہ نے بمبئی میں تعلیم نسواں کی درسگاہ قائم کی جس میں دونوں بہنیں پڑھاتی تھیں۔ عطیہ بیگم تعلیم نسواں کے فروغ اور قابل استانیوں کے بارے میں اقبال سے بھی مشورہ کرتی تھیں۔ زہرا بیگم کا ایک مضمون خواتین کی تعلیمی پالیسی کے بارے میں بعنوان ''ایک مبارک تجویز'' الناظر لکھنؤ (۵) بابت یکم اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر ظفر الملک علوی صاحب اس مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:-

''جب زہرا فیضی بیگم صاحبہ نے جنجرہ سے مضمون مندرجہ بالا روانہ فرمایا ہے۔ جو اس نمبر میں نہایت شکریہ کے ساتھ اس وجہ سے درج کیا جاتا ہے کہ اس مضمون میں محض اظہار رائے پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ جناب زہرا بیگم فیضی صاحبہ کی خدمت میں گزارش ہے کہ رسالہ ''الناظر'' میں (جب کہ ہم نے اپنے پہلے نمبر میں تمہید میں عرض کیا تھا) صرف ایک ثلث صفحات یعنی کم و بیش ایک جزو مستورات کی دلچسپی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تا کہ جو تعلیم یافتہ خواتین علمی ذوق رکھتی ہوں ان کے شغل کا سامان مہیا کیا جائے۔

حروف تہجی سے ابتدا کرنا اس بڑے کام کو اپنے سر لینا ہے کہ مستورات کو پڑھنا لکھنا بھی الناظر سکھادے اور عنوانات جو بیگم صاحبہ نے تحریر فرمائے ہیں ان پر مستقلاً ہر نمبر میں ترتیب کے ساتھ لکھتے رہنا اور گویا ان کی بیش قیمت تجویز کی مکمل تعمیل اس وقت ممکن ہوگی جب کہ ہم مستورات کے لئے علیحدہ پرچہ شائع کریں اور مستقل نسوانی امداد (ایڈیٹرس) حاصل ہو۔ ہم ایسے وقت کے منتظر ہیں اور اس وقت انشاء اللہ ان کی تجاویز پر کامل غور کیا جائے گا۔

باوجود اتفاق رائے ہم کو افسوس ہے کہ اس وقت ہم صرف اسی قدر کر سکتے ہیں کہ مستورات کی ہدایت کے واسطے اسی قسم کے مضامین شائع کریں جیسے کہ وہ فرماتی ہیں۔ پس جو خواتین ہمیں ان موضوعات پر مضامین بھیجیں گی جو زہرا بیگم فیضی صاحبہ نے تجویز کئے ہیں ہم ان کے نہایت شکر گزار ہوں گے...... آیندہ پرچے میں اس قسم کے مضامین کے چند نمونے جو جناب عطیہ فیضی صاحبہ نے کمال عنایت سے ہمیں بھیجے ہیں شائع کئے جائیں گے۔ اس مرتبہ بوجہ عدم گنجائش افسوس ہے کہ وہ درج نہ ہو سکے۔''

ذیل میں ہم وہ تین مضامین عطیہ بیگم کے درج کرتے ہیں جو نہایت اہم اور معیاری رسالوں میں آج سے

مدت دراز شائع ہوئے تھے۔ یہ رسالے اب عنقا کا حکم رکھتے ہیں:۔

(۱) الناظر لکھنؤ (۶) نمبر ۳ بابت یکم ستمبر ۱۹۰۹ء (صفحہ ۴۹)

مدرسۂ نسواں۔ از عطیہ بیگم

''تعلیم نسواں ان دو یا تین مسئلوں میں سے ہے جن سے ہندوستان کی آیندہ بہبود بہت کچھ متعلق ہے۔ اور بہتوں کے نزدیک تو زمانہ حال کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مضمون ہے۔ اس مضمون پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ اور بعض اوقات بہت قابل قدر رائیں بھی دی گئیں۔ کسی شور وشعب کے ساتھ جوش وانہماک بھی پیدا ہوا۔ لیکن محض وقتی ثابت ہوا۔ کیونکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ بالکل جاتا رہا۔ چند تجربات بھی اس کے متعلق کئے گئے اور کبھی کبھی ایک زنانہ مدرسہ بھی وجود میں آیا جس کا نصاب تعلیم حمایت الاسلام کے نصاب تک محدود رہا۔

اگر تعلیم کا حصہ کریکٹر (چال چلن، عادات واطوار) کا درست رکھنا ہے۔ اگر تعلیم اس لئے دی جاتی ہے کہ عورتیں اچھی بیوی اور ہوشیار ماں بنیں۔ ایسی بیوی جس میں اصلی اور سچے زنانہ خصوصیات ہوں جو اپنے گھر کی دلدادہ ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی دلچسپی محض اپنے گھر تک محدود نہ ہو بلکہ زندگی کے دوسرے مباحث میں بھی وہ دلچسپی رکھتی ہو جو صرف امتحان پاس شدہ اور نام کے آگے کسی ڈگری کے حروف کا دم چھلا ہی لگائے نہ ہو۔ تو مذکورالصدر قسم کے مدرسے کبھی حسب خواہش نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے۔

اس مضمون پر جس قدر زیادہ لکھا جائے کم ہے اور اس کے متعلق بہت بھی کہا جا چکا ہے۔ اس لئے میں پبلک کے روبرو ایک اعلیٰ درجے کی تعلیم گاہ کا خاکہ جو میری ہی فکر کا نتیجہ ہے۔ بہت مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ علمی کاروائی سے متعلق جس قدر تفصیلات ہیں وہ کبھی دوسرے موقعہ پر ظاہر کی جائیں گی۔

اگر پسند محض میری مرضی پر چھوڑ دی جائے تو میں یہ تجویز کروں گی کہ لازمی طور پر ایسا اسکول ہو جس کے ساتھ دارالاقامت (Hostel) بھی ہو۔ اسکول کی عمارت میں ان چیزوں کا ہونا ضروری ہے:۔

(۱) بڑے ہوادار روشن کمرے

(۲) لڑکیوں اور استانیوں کے لئے کتب خانے جن میں بہت اچھا علم وادب کا ہونا چاہیئے

(۳) ایک نمائش کا کمرہ جس میں طلباء کی بنائی ہوئی اشیا ''نمایشا'' رکھی جاسکیں

(۴) ایک ملاقات کا کمرہ، آنے جانے والوں کے ملاقات کے لئے

(۵) ایک بڑا کمرہ، جس میں اگر ضرورت ہو تو اسکول کے متعلق کوئی جلسہ وغیرہ ہو سکے

جرائد

الناظر

لکھنؤ

نمبر ۳	یکم ستمبر ۱۹۰۹ء	قیمت سالانہ عہ

فہرست مضامین

		صفحہ
قوت	مرزا سلطان احمد	۱
آب وہوا کا اثر تہذیب و شائستگی پر	ت - ک	۱۶
قصیدہ (نظم)	احسان علی احسان	۲۰
زنانہ لباس (نظم)	افتخار علی مخمور	۲۶
متفرق مضامین (یوگ کلاس - بونگ سنیلی پر ہدایات - بیمار کا کمرہ - شہید)	عطیہ بیگم فیضی	۲۸
تعلیم نسوان	مشیر حسین قدوائی	۳۲
مدرسۂ نسوان	عطیہ بیگم فیضی	۴۹
خبرین		۵۲

اڈیٹران

وصی الحسن علوی بی - اے   ظفر الملک علوی

بایمائے گرامی جناب منشی سخاوت علی صاحب علوی سکریٹری لکھنؤ فلاور مشن مالک سالم

مفید عام پریس راجہ بازار متصل ڈالی گنج لکھنؤ مین باہتمام محمد علی طبع ہوا

فی پرچہ   ۴ر

(۶) ایک بند کمرہ ورزش جسمانی کے لئے اور ایک قطعہ قواعد کے لئے

(۷) زمین کو خوبصورت باغ کی صورت میں تیار کرنا چاہیئے اور ورزشی کھیلوں کے لئے ایک حصہ مخصوص کر دینا چاہیئے

(۸) اس سے جداگانہ ایک عمارت دارالاقامۃ (Hostel) کے لئے ہونی چاہیئے۔ ہر لڑکی کو جس کی عمر آٹھ برس سے زائد ہو، ایک جداگانہ کمرہ دیا جائے۔ ورنہ دو یا چار ایک بڑے کمرے میں رہ سکتی ہیں۔ اس عمارت میں کم سے کم تیس طلباء اور ایک اتالیق کے رہنے کی گنجائش ہو۔ کل عمارتیں حفظانِ صحت کے موجودہ یوروپین طریقوں کے بالکل مطابق ہوں۔ لیکن ایسی کہ جو ہندوستانی ضروریات کی پوری طرح کفیل ہوں۔ اور یہ دونوں باتیں نہایت خوبصورتی اور مناسبت کے ساتھ بآسانی حاصل ہوسکتی ہیں۔ مکان کی آراستگی بھی اسی طرح پر ہونی چاہیئے۔ اگر عمارت قدیم اسلامی طریقہ پر بنے اور مشرقی سامانِ آرائش سے آراستہ کی جائے تو یوروپین وضع وقطع کا اس میں کہیں لگاؤ بھی معلوم نہ ہو۔ اور ہر چیز میں سادگی بدرجۂ غایت ملحوظ رہنا چاہیئے۔ اور دوسرے مضامین مذہبی تعلیم، اصول اخلاق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، سائنس، مقامی زبان، مصوری، موسیقی، انتظام، خانہ داری، اصول صحت، کھانا پکانا، ورزش جسمانی اور رسوئی کے کام ہوں۔ بہت سا وقت آدابِ مجلس کے سکھانے میں صرف کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ مہمانوں کی کیوں کر مدارات کرنی چاہیئے اور محفلوں میں کیا رکھ رکھاؤ اختیار کرنا چاہیئے۔ گفتگو کے لئے کون سے مضامین منتخب کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ اور اس درس کی تکمیل پانچ یا چھ برس میں یعنی تخمیناً چھ سے لے کر بارہ برس کی عمر تک کی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے دوسرا نصاب ہو۔ جس میں فرانسیسی، علم الاخلاق، علم النفس، فلسفہ، تاریخ، اصول صحت، نقاشی، علم قیافہ، موسیقی اور جسمانی قوتوں کے متعلق تعلیم ہو۔ ان مضامین میں سے انتخاب کر کے ایک درس تین سال کی تعلیم کے لئے تیار ہوسکتا ہے۔ مثلاً موسیقی، نقاشی، فرانسیسی، تاریخ اور جسمانی قوتوں کی تعلیم کا ایک اچھا درس ہوسکتا ہے۔ بقیہ مضامین کی تعلیم سولہ برس کی عمر کے بعد دو تین برس تک اور ہوسکتی ہے۔

مدرسہ اور دارالاقامۃ کی عمارتیں ایسی ترکیب سے بنائی اور آراستہ کی جائیں کہ وہ تمام ضروریات جو مذکورالصدر مضامین سے متعلق ہوں باحسن وجوہ پوری ہوسکتی ہوں اور لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا کر گھر کی زندگی کے ناقابل نہ بن جائیں اور اس آخری مقصد کے حصول کے لئے باری باری سے ان لڑکیوں سے وہاں کا انتظام خانہ داری کرایا جائے۔"

---

(۱) الناظر لکھنؤ (۲) نمبر ۳ بابت یکم ستمبر ۱۹۰۹ء، (صفحہ ۴۹)

''بچوں کے لباس''- از عطیہ بیگم

''بچوں کے کپڑے کبھی بہت تنگ نہ ہونے چاہیئے۔ بہت سے بچے محض اس وجہ سے روتے اور چیختے ہیں کہ ان کے بازو کسے ہوتے ہیں اور ان کا گلا بہت تنگ ہوتا ہے اور اس طرح کمر اور پیر بھی۔ ہمارے ہندوستان کی بیہودہ رسم ایک یہ بھی ہے کہ ہم بچوں کو بے شمار غیر ضروری زیور سے لاد دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ ریشمی زر کا کپڑا پہناتے ہیں۔ یہ عادت بالکل نقصان رساں ہے کیونکہ ان کے اعضاء جکڑے رہتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے نمو میں کمی واقع ہوتی ہے۔ مختلف اعضا اپنی اپنی جگہ پر آزادی سے ہل نہیں سکتے۔ ریشم کا استعمال بچوں کے واسطے بالکل بے کار ہے اور صحت کے لحاظ سے تو بالکل ہی مضر ہے خصوصاً رنگین اور پھول دار ریشم، کیونکہ وہ روزانہ نہ تو بدلا جا سکتا ہے اور نہ دھویا جا سکتا ہے۔ زری اور گوٹہ سے بچوں کے ملائم اور کمزور جلد کو تکلیف ہوتی ہے، کھرونچے لگ جاتی ہیں اور ان پر بدنما داغ پڑ جاتے ہیں اور بچہ ضدی ہو جاتا ہے۔ زیور اور رنگین ریشمی کپڑے یک قلم ترک کر دینا چاہیئے کیوں کہ اکثر رنگوں میں زہر شامل ہوتا ہے اور اس سے کسی نہ کسی حد تک جسم پر اثر پڑتا ہے۔ سب سے عمدہ کپڑا بچوں کے واسطے ململ اور تنزیب ہے۔ جس پر بجز ہلکے ہلکے سفید چکن کے کام کے کچھ کام نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ معمولی، سستی انگریزی نیل اور ململ کا استعمال کیا جائے۔ ہندوستان کی تنزیب خود ہی بہت نفیس اور قیمتی ہے کیونکہ معمولی یورپین اشیاء جو ہمیں عموماً ہندوستان میں ملتی ہیں وہ اتنی بھدی اور بدنما ہوتی ہیں کہ خود یورپین لوگ ان کے استعمال سے بھاگتے ہیں۔ ہم لوگوں کو عادت ہوگئی ہے کہ ہم بنی بنائی چیزیں بازار سے لینا پسند کرتے ہیں اور اس کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ خود ہمارے ملک میں کیا کیا پیدا ہوتا ہے۔

یورپ میں لوگ بچوں کے کپڑوں میں بے حد صرف کرتے ہیں۔ اور نفیس سا نفیس لباس بھی عمدہ ململ، نازک چکن اور اصلی لیس کا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی فراک میں دو یا تین سو روپے صرف کرنا کچھ بڑی بات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس قدر عمدہ کپڑا یا دستکاری ہمیں کبھی یہاں بازار میں نصیب نہیں ہو سکتی۔ میں دو چار خاتونوں کو جانتی ہوں جن کی نفاست مزاج یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ پیرس سے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے کلی سلائی فراک کی صورت میں منگاتی ہیں۔ ایسا طرز معاشرت بالکل ہی بیکار اور حماقت کا فعل ہوگا کیوں کہ جب تک پورا تتبع نہ ہو سکے اس قسم کے فعل کا ارادہ نہ کرنا چاہیئے۔ ایک ہندوستانی بچہ کو بازار کی تیار شدہ فراک میں کچھ اچھا نہیں دکھائی دے سکتا۔ عمدہ سے عمدہ یورپ کی بنی ہوئی چکن لکھنؤ کی

خوبصورت اور نفیس چکن سے کبھی مقابلہ نہیں کر سکتی، اس وجہ سے اودھ کی خاتونوں کو عمدہ چیز حاصل کرنے کے واسطے کہیں دور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں عمدہ قسم کے ململ اور تنزیب بآسانی مل سکتی ہے اور موسم سرما کے لئے کشمیری فلالین سے زیادہ ملائم اور نفیس فلالین کہاں ملے گی اور یہ بچوں کے واسطے ایک نہایت ضروری چیز ہے۔

بچوں کے کپڑے ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے اور لانبے قطع کرنا چاہیئے۔ اس سے بہت بچت ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی خاتون یہ جاننا چاہتی ہیں کہ یورپین وضع بچوں کے کپڑوں میں کیوں کر ترک کرنا چاہیئے تو مجھے "الناظر" کے ذریعہ سے بتلانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ ہماری ماؤں نے ہمیں کیونکر پہنایا تھا۔

"بچوں سے متعلق چند ہدایات"

جس کمرے میں بچہ رہتا یا سوتا ہو، وہاں سے روشنی اور ہوا کے نکالنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اگر کمرے میں دن کے وقت خوب اچھی روشنی اور ہوا کا اثر رہا ہے تو رات کو نیند بہت سے زیادہ تفریح دہ ہوگی۔ کبھی بچے کو اس کمرے میں اکیلا نہ رہنے دو، جہاں سے آگ تک ہاتھ پہنچ سکے۔ بچوں کے ہاتھ میں رنگین کھلونے نہ دینا چاہیئے کیونکہ بچے کا پہلا خیال ہر چیز کے چوسنے کی جانب رجوع ہوتا ہے اور رنگ میں زہر ہوتا ہے۔ رنگ روغنی ہونا چاہیئے تاکہ آسانی سے چوسنے اور چاٹنے کے وقت چھوٹ نہ سکے۔

کبھی دوا کی شیشی یا مرہم وغیرہ بچوں کے پاس نہ رہنے دو۔ کیونکہ پہلا خیال ان کا چکھنے کی طرف پیدا ہوتا ہے۔

بچوں سے تکرار نہ کرنا چاہیئے، ورنہ وہ جھگڑالو ہو جائیں گے۔ بچے کو کبھی روتے اور چیختے ہوئے سونے نہ دینا چاہیئے۔ پہلے اس کا سبب دریافت کرو، کیونکہ ایک تندرست بچے کے رونے وغیرہ کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی پھر اس کو دور کرنے کی کوشش کرو۔ کبھی کسی بچے کو مجبوراً کوئی چیز نہ کھلاؤ، اگر وہ خود نہیں خواہش مند ہے۔ معدے کو تھوڑا سا آرام فائدہ مند ہے۔

کبھی کسی بچے کو ہر وقت منہ نہ چلانے دو خواہ وہ بسکٹ وغیرہ کی قسم کی چیز ہی کیوں نہ کھاتا ہو۔ ہمیشہ کھانے کا وقت مقرر کرنا چاہیئے۔

کبھی بغیر جوش کیا ہوا پانی یا دودھ بچوں کو مت دو۔ جوش سے سب نقصانات رفع ہو جاتے ہیں۔

کبھی نوکدار پن یا بٹن یا بروچ بچوں کے کپڑوں پر مت لگاؤ۔ ایسی سخت چیزیں مضر اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

کبھی بچوں پر نوکروں کی طرح حکومت نہ کرو، نہ اسے خوشی کا ایک آلہ سمجھو اور نہ اسے کوئی مصیبت سمجھو۔ بلکہ ایک غیر عرفانی روح سمجھو۔ جس کو تم چاہو تو اچھا بنا سکتے ہو اور چاہو برا۔

بیمار کا کمرہ

گرمی کے موسم میں ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بیمار کا کمرہ تر و تازہ رہے۔ کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھنا چاہیئے اور بھیگا ہوا کپڑہ پردہ کی شکل میں پڑا رہنا چاہیئے۔ بھیگا ہوا کپڑا گرمی کو جذب کر لیتا ہے اور حدت کو بہت کم کر دیتا ہے اور اس کی ٹھنڈک سے گرمی بہت زیادہ قابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اس طریقہ پر عمل کرنے سے مریض کو بہت زیادہ تفریح ہوتی ہے۔

شہد

اصلی اور تازہ شہد ہمیشہ ساتھ رکھنا چاہیئے۔ یہ بہت عمدہ کار آمد دوا ہے۔ پھیپھڑے اور گلے کی بیماریوں کے لئے خصوصاً بہت مفید ہے اور مچھلی کے تیل کی بجائے بہت استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر بچے مٹھائی کے لئے خواہش مند ہیں تو ان کو شہد دو۔ وہ بہت آسانی سے ہضم ہو سکتا ہے۔ شہد ایک قسم کی کشید کی ہوئی غذا ہے۔ اس سے لساہٹ اور شیرینی کے اجزاء بہم پہنچتے ہیں جو جسم میں حرارت پہنچاتے اور قوت دیتے ہیں۔ شہد ایک قسم کی ملین ہے اور کسی قدر مسکن ہوتا ہے۔ اکثر نزلہ اور زکام میں مفید پڑتا ہے۔

---

(۳) نور جہاں امرتسر (۷) جلد اول نمبر ۲ بابت فروری ۱۹۲۶ء

مسلمانوں کو ایک پیام۔ عطیہ بیگم

"دور حاضرہ کا سب سے اہم، ضروری اور مہتم بالشان مسئلہ، مسئلہ تعلیم نسواں ہے۔ فیاضی چونکہ گھر سے شروع ہوتی ہے اس لئے میرا روئے سخن اس پیام میں صرف مسلمانوں کی طرف ہے جس کی غفلت اور خود غرضی نے اس سدا بہار گلدستہ کو وادی پر خار بنا دیا ہے۔ آج جبکہ ہندوستان کی ہر قوم معراج کمال پر پہنچ چکی ہے، وہ تین صدی پیچھے لٹک رہے ہیں۔

اسلام وہ قابل فخر مذہب ہے جس نے عورت کو اپنی آغوش میں لے کر اس کو وہ حیثیت اور مرتبہ دنیا میں عطا فرمایا جس کی نظیر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور گذشتہ میں اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی خواتین پیدا کیں جن کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ وہ ولی کامل ہوئیں، میدان کارزار کی جنرل ہوئیں، سلطنتوں کی ملکہ بنیں، مملکت نظم و نثر کی حکمران ہوئیں۔ ان کی تحریریں اور ان کے اشعار آج تک ان کے بعد ان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اور وہ حق رکھتی ہیں کہ ہم ان کے مبارک ناموں پر ان کی قابل قدر خدمات کے معاوضہ میں ان الفاظ سے فاتحہ کے پھول چڑھائیں۔

نہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کی زندہ ہو
تمہاری نیکیاں باقی تمہاری خوبیاں باقی

الختصر یہ وہ زمانہ تھا، مسلمان عورت زندگی کے ہر میدان میں تمام دنیا پر سبقت لے گئی تھی۔ زمانہ گذشتہ کی ترقی اور زمانہ کی پستی کے مقابلہ کا نتیجہ نا قابل اظہار ہے۔ ہندوستان مردوں کے درسوں، کالجوں، کانفرنسوں، جلسوں اور ادب سے لبریز ہے اور مردوں کی ہر اس ضرورت کو جس کا وقت مطالبہ کرتا ہے تکمیل ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ترازو کے ایک پلڑے میں ہو رہا ہے اور اس کا وزن اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ترازو کے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور اب بھی کوتاہ بینی، خود غرضی اور نفس پرست پالیسی اس طرح افق اسلام پر چھائی ہوئی ہے اور مسلمان اپنی نفسانیت اور خود پرستی میں اس قدر مستغرق ہیں کہ وہ اس شاہراہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جو مقدس اسلام نے منزل مقصود پر پہنچنے کے واسطے ان کو بتایا تھا۔

اسلام نے علی الاعلان کہا تھا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ مگر آج اس کے بالکل برخلاف اس کے سر پر بنا دی گئی ہے (یعنی بجائے قدموں میں سر رکھنے کے اس کی اولاد اس کے سر پر چڑھ رہی ہے) اور بجائے اس کے کہ وہ گھر کی ملکہ ہوتی اور تعلیم کا پہلا بیج بچہ کی طبیعت میں جبکہ دنیا میں اس کا ظہور ہوا ہے اس کے ہاتھ سے بویا جاتا، وہ اپنے تمام حقوق سے محروم کر دی گئی اور وہ پیدائشی حق جو فطرت انسان نے اس کو عطا کیا تھا ظلم وستم سے چھین لیا گیا اور وہ ایک پامال ہستی رہ گئی۔ ایسی ہستی جو اس قابل بھی نہ رہی کہ اپنی خدمات پیش کر سکتی۔ یا مرد کو کسی قسم کی مدد دے سکتی۔ اس طرح بد بخت عورت نہ صرف گھر ہی کے واسطے ناکارہ ہو گئی بلکہ نہ وہ مرد کے کام رہی، نہ وطن اور نہ خدا کی۔ ان حالات کو سامنے رکھنے کے بعد یہ عظیم الشان جلسے کس قدر مضحکہ خیز ہیں جو ہر سال کے اختتام پر ہندوستان میں منعقد ہوتے ہیں۔ مسلمان ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتے ہیں جب تک وہ سیدھے راستے پر نہ چلیں اور احکام اسلام کے روبرو سر تسلیم خم نہ کریں۔

ترسم نہ رسی کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

ایسے تیرہ و تاریک حالات میں وہ چند مقدس ہستیاں جن کے پہلو میں دل ہیں، جو ایثار کا مجسم نمونہ ہیں، شریعت اسلام کے پورے حامل ہیں (اور جن کے نام صرف انگلیوں پر گنے جاتے ہیں) خلوص دل کے ساتھ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں، اس لئے کہ ظلمت و جہالت کی زنجیروں کو توڑ کر وہ ہر ممکن کوشش مصیبت زدہ مخلوق یعنی مظلوم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں کر رہے ہیں۔ یہ مسلمان جو خود خوش حال نہیں نمائشی دنیا،

قابل دار جگہوں اور ملمع کے مجسموں سے علیحدہ خاموشی کے ساتھ الگ کونوں میں پڑے ہوئے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ سنہری شہرت اور دھوم دھڑ کے سے الگ ہیں۔ یتیم الوارث اور بد بخت مسلمان بچوں کو ان کی دماغی اور جسمانی نشو و نما میں پورے طور پر مدد دے رہے ہیں، ان کی پرورش کر رہے ہیں اور اپنے بچوں کی طرح ان کو کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مثال کے طور پر میں جناب مولانا راشد الخیری صاحب کا نام پیش کرتی ہوں۔ میں نے جس وقت ''تربیت گاہ بنات'' (Training School for Girls) کی بچیوں کو دیکھا تو بے ساختہ میرے دل سے دعا نکلی۔ مولانا صاحب نے یہ مدرسہ (تربیت گاہ بنات) تین برس سے جاری کیا ہے اور انہوں نے سرکاری گرانٹ لینے سے اس لئے انکار کر دیا ہے کہ وہ نصاب پر مشروط تھی۔ جب سے مولانا صاحب مذہبی اور معاشری تعلیم لڑکیوں کو دے رہے ہیں اور ہندوستان کے تمام حصوں سے مفلوک الحال لڑکیاں لے رہے ہیں، مجھ پر ایک عجیب حال کا اثر پیدا ہوا۔ میرا مقصد اس تحریر سے یہ نہیں ہے کہ میں مولانا صاحب کی تعریف کروں کیونکہ وہ اس کے محتاج نہیں اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہے۔ مگر میں اپنے دلی جذبات کا مسلمانوں کے سامنے اظہار ضروری سمجھتی ہوں جو مدرسہ کو دیکھکر میرے دل میں پیدا ہوئے اور دعا کرتی ہوں کہ معبود حقیقی اپنی برکتوں اور رحمتوں کا ان کی ذات پر، ان کے مدرسے پر، مدرسہ کی غریب بچیوں پر نزول کرے۔ میں یہاں کے متمول افراد کو دعوت دیتی ہوں اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ آئیں اور مولانا کی کوششوں کو دیکھیں۔ ان کی عمر پر غور کریں اور زندگی کے اس فلسفہ کو جو اسلام کی حقیقی خدمت ہے سمجھیں۔

میں اپنے اس پیام کو اپنی نیک اور مخلصانہ آرزوؤں کے ساتھ جو ان کی ذات اور اس بیگم کے واسطے ہیں جو گھر کی ملکہ اور مدرسہ کی کوششوں میں ان کے برابر شریک ہیں نیز استانیوں اور بچیوں پر ختم کرتی ہوں۔ خدا ان کو کامیاب کرے۔''

حواشی و تعلیقات

(۱) اقبال کے سوانح نگاروں نے اقبال اور عطیہ بیگم کے بارے میں مس سروجنی داس کا تذکرہ بھی مبہم انداز میں کیا ہے۔ ''اقبال'' (از عطیہ بیگم مترجم عبدالعزیز خالد صفحہ ۲۴) میں رقم ہوا ہے:-

''۲۹ رجون ۱۹۰۷ء کو لیڈی ایلیٹس (Lady Elliots) ایک سوسائٹی میزبان نے ایک پارٹی دی، جہاں اقبال کو دیکھکر مجھے (عطیہ بیگم کو) قدرے اچنبھا ہوا۔ میں اقبال سے باتیں کر رہی تھی کہ ''مس سروجنی داس'' بھاگم بھاگ اندر داخل ہوئیں۔ انتہائی قیمتی ''فوق البھڑک'' لباس پہنے بے تحاشا زیورات سے لدی پھندی

بے محابا بنی تھی "انسانیت" (مترجم نے "انسانیت" کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے "بلبل ہند" کے خلاف مصنف کے دل میں کس قدر بغض وعناد تھا) کے اس نمونے نے انگلستان تک میرے ساتھ سفر کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خلاصہ خوبی سمجھتی تھی۔ مجھے اور اس ہر اس شخص کو جو اس کے راستے میں آیا فرط جذبات سے بے دم، اس نے اقبال کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میں صرف تم سے ملنے کے لئے آئی ہوں"۔ اقبال نے یہ ستائش یہ کہکر لوٹا دی:۔

"یہ صدمہ انتہائی ناگہانی ہے کہ اگر میں اس کمرے سے زندہ باہر نکل سکوں تو مجھے حیرت ہوگی"

اقبال نے متذکرہ بالا خط میں میری رائے میں کسی اور "مس سروجنی داس" کا ذکر کیا ہوگا جو غیر واضح ہے۔ بعد میں بقول ماہرین اقبالیات مس سروجنی داس "مس نائیڈو" ہوگئی ہیں۔ اقبال نے بھی عطیہ بیگم کے خط مورخہ ۱۴؍دسمبر ۱۹۱۱ء میں مس نائیڈو داس کو "مس نائڈو" لکھا ہے۔ خط کے آخر میں عطیہ بیگم کو پھر لکھتے ہیں کہ "مسز نائیڈو صاحبہ" کی خدمت میں سلام کہیے۔"

میرے خیال میں اقبال کو "مس سروجنی داس" اور مس نائیڈو میں تسامح ہوا ہے۔ مس سروجنی داس کوئی اور خاتون تھیں جن کو مسز نائیڈو قرار دینا درست نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مس سروجنی (جو بعد میں بلبل ہند کہلائی گئیں) ۱۸۹۵ء میں یعنی اقبال سے دس سال پہلے لندن گئیں اور وہاں ۱۸۹۸ء تک رہی تھیں۔ وہ کنگس کالج لندن اور گرٹن میں تعلیم پاتی رہیں۔ ستمبر ۱۹۹۸ء میں وہ حیدر آباد دکن واپس آئیں اور اسی سال دسمبر میں ڈاکٹر ایم۔جی نائیڈو کے ساتھ جو ایڈنبرا یونیورسٹی کے ایم۔بی۔سی۔ایم تھے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ مسز سروجنی نائیڈو ہوگئیں۔

مسز سروجنی نائیڈو کی غیر معمولی قابلیتیں انگلستان میں بڑی حیرت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ اس کا اندازہ مسٹر اڈمنڈ گاس (جن کو سروجنی نائیڈو نے اپنی شاعری کی موجودہ روش پر ڈالا تھا اور جنہوں نے آپ کی نظموں کے دوسرے مجموعہ (Bird of Time) برڈ آف ٹائم کا دیباچہ لکھا وہ کہتے ہیں کہ:۔

"سروجنی چٹا پادھیائے جیسا کہ وہ اس وقت (۱۸۹۵ء۔۱۸۹۸ء) کہلاتی تھیں جب پہلے پہل لندن پہنچیں تو وہ ایک سولہ برس کا بچہ تھیں۔ انگریزی لڑکیوں سے وہ اسی قدر مختلف تھیں جس طرح ایک سوس کا پھول نازک پھنی سے۔ ان کی دماغی پختگی غضب کی تھی اور دنیا کی معلومات میں مغربی لڑکیوں سے بدرجہا افضل تھیں۔"

مسز سروجنی نائیڈو ۱۸۹۸ء تک پختہ مشق انگریزی شاعرہ ہو چکی تھیں۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر ناتھ چٹا پادھیائے تھا۔ وہ برہمن گام (مشرقی بنگال) کے چٹرجیوں کے مشہور برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے ۱۸۷۷ء میں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری

حاصل کی۔ لندن سے واپس آ کر انہوں نے نظام کالج کی بنیاد ڈالی۔ مسز نائیڈو کی کتاب ''تھرس ہولڈ'' یا کسی اور تصنیف سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ۱۹۰۷ء میں لندن میں تھیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد میں رہتی تھیں۔ جب ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں طغیانی آ گئی تو وہ سماجی کارکن کی حیثیت سے کافی شہرت پا چکی تھیں۔ شادی کے بعد وہ کانگریس کی رہنما بھی ہو چکی تھیں۔ ہمیشہ سیدھے سادے کپڑوں اور بغیر زیور پہنے رہتی تھیں۔ ان کی کئی پرانی تصویریں میرے پاس موجود ہیں۔ ایک تصویر پر مسز نائیڈو انتہائی سادگی میں نظر آتی ہیں۔ اس پر ان کے دستخط کے ساتھ ۱۹۰۰ء سال کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ تصویر سید خورشید کے مضمون ''مسز سروجنی نائیڈو'' کے عنوان سے ''ادیب'' الہ آباد بابت مارچ ۱۹۱۳ء میں چھپی تھی۔ ایک مضمون مسز نائیڈو کے واقف کار ''معرف'' کا مشہور رسالہ ''تمدن'' لکھنؤ جلد ۱۳ شمارہ ۴ بابت جولائی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ان کی اوائل زندگی بیان کی گئی ہے یعنی کہ وہ شادی کے بعد کانگریس کی رہنما بن چکی تھیں اور ان کا قیام حیدر آباد میں ہی رہتا تھا۔ ''زمانہ'' کانپور بابت دسمبر ۱۹۲۵ء کے قومی نمبر صفحہ ۲۷ میں منشی بشیشور منور لکھنوی کا ایک مضمون ''شریمتی سروجنی نائیڈو'' شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''۱۹۱۶ء کی لکھنؤ کانگریس میں مسز نائیڈو نے خدا پرستوں کی کانفرنس اور امین آباد لکھنؤ کے قومی جلسے میں اول دو تقریریں انگریزی اور اردو میں کیں۔ امین آباد والی تقریر اردو میں۔ میں ان کی تقریر سن کر دنگ رہا کہ ایک دکن اور بنگالی خاتون کس طرح ایک ایسے شہر میں اردو میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا سکتی ہے جو خاص اردو کا مرکز ہو اور جو بقول موصوف انیس، دبیر، آتش، ناسخ کا شہر ہے۔''

منور لکھنوی کے اس اقتباس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسز نائیڈو ایک پختہ کانگریسی لیڈر زمانہ دراز سے بن چکی تھیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایسی خاتون جو ہمیشہ سے سادگی کا پیکر بن چکی تھی شادی کے بعد عشق کیسے لڑا سکتی تھی۔ یہ کوئی اور مس سروجنی داس تھی جس کو لوگوں نے مسز نائیڈو لکھا۔ میری ماہرین اقبالیات سے گذارش ہے کہ وہ مسز نائیڈو کے بارے میں تحقیق کریں۔

(۲) نازلی رفیعہ بیگم۔ آپ عطیہ بیگم کی بڑی بہن اور ہز ہائنس نواب سید احمد خان والی جنجیرہ کی زوجہ تھیں۔ اگر چہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ نہ تھیں لیکن نہایت قابل تھیں۔ اردو فارسی سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ سخن فہم اور سخنوروں کی قدردان تھیں۔ اقبال نے نازلی بیگم کی فرمائش پر ذیل کے اشعار ۹/ جون ۱۹۰۸ء کو عطیہ بیگم کی معرفت لندن سے بھیجے تھے۔

اے کہ ترے آستانے پر جبیں گستر قمر   اور فیض آستاں بوسی سے گل بر سر قمر

روشنی لے کر تری موج غبار راہ سے | دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروان قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح | جس طرح گردوں پہ صدر محفل اختر قمر

شمع بزم اہل ملت را چراغ طور کن
یعنی ظلمت خانہ ما را سراپا نور کن

اس وقت میرے سامنے ''زمانہ'' کانپور جلد ۲۳ نمبر ۱۳۴ بابت فروری ۱۹۱۴ء (صفحہ ۱۲۱-۱۲۲) کا نادر و نایاب شمارہ ہے۔ اس میں ایک نادر الوجود کتاب ''سیر یورپ'' پر دیا نرائن نگم ایڈیٹر صاحب نے ذیل کا تبصرہ لکھا ہے:-

''ہندوستان کی روشن خیال خواتین میں ہز ہائنس نواب نازلی رقیہ سلطان نواب بیگم صاحبہ ریاست جنجیرہ خاص مرتبے کی خاتون ہیں جو علم و ہنر سے نہ صرف بہرہ ور ہیں بلکہ ان میں علمی دلچسپی بھی رکھتی ہیں۔ خصوصاً اردو زبان کی آپ ایک نادر مصنفہ ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی تھی اور وہاں کے تفصیلی حالات قلمبند کر کے وقتاً فوقتاً بطور خطوط اپنے اعزہ کے نام روانہ فرماتی رہی تھیں۔ یہ کتاب انہیں خطوط کا مجموعہ ہے جس کے آغاز میں چند سطور ہز ہائنس نے بطور تمہید درج فرمائی ہیں۔ ہم ان کا اقتباس ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

''اصل میں یہ وہ خطوط ہیں کہ جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیر یورپ کے حالات کے لکھے ہیں۔ اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی، صاف سیدھی عبارت ہے۔ وہاں کے حالات، طرز معاشرت، تدبیر المنازل، بعض امور سیاسیہ، تجارت، ہنروری، اقسام فنون کی کثرت، تہذیب، طریقۂ تعلیم دربار کے آداب جو میں جتنا سمجھ سکی اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی۔ نسبتاً جب یورپ اور ایشیا کو دیکھتی ہوں تو آپ اپنی نظر میں تھوڑی ہو جاتی ہوں۔ افسوس ہے کہ ایشیا ایسی ہو گئی ہے جیسے ہزار بارہ سو برس پہلے یورپ تھا۔ تعزُّ مَن تشاء و تذلّ مَن تشاء

اس زمانے والوں کے تو دلوں ہی میں یہ حسرت رہ جائے گی کہ ایشیا یورپ سے بڑھے نہیں تو برابر ہی ہو جائے۔ لیکن ہاں اگر ایشیا والے تعلیم نسواں کا انتظام کر سکیں تو سو دو سو برس میں سنبھل جائیں۔ کیا حسرت ہوتی ہے جب مسلمانوں کی سیل عظیم کی طرح پھیلنے والی ترقی اور طوفان نوح کی طرح عالمگیر عالمگیری کو اپنے وقت کے اہل اسلام کے تنزل اور بدحالی سے مقابلہ کرتی ہوں۔''

ان سطور سے ہز ہائنس کی قابلیت اور روشن خیالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم کرنا آسان ہے کہ اردو زبان پر آپ کو کس قدر قدرت حاصل ہے۔ زبان کی شستگی اور لطافت اظہر من الشمس

ہے اور یہ معلوم کر کے کہ آپ کی تعلیم و تربیت بمبئی کے ایسے شہر میں ہوئی ہے جہاں فی صدی ایک شخص اردو جاننے والا نہیں، آپ کی اردو دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ دراصل ہز ہائنس کی والدہ ماجدہ نہایت قابل خاتون تھیں اور اردو زبان میں خاص دستگاہ رکھتی تھیں۔ ان کی بعض اردو تصانیف پر ہم آگے چل کر ریویو کریں گے۔

یہ سفر نامہ نہایت اہتمام سے چھاپا گیا۔ خوبصورت ٹائٹل پیج کے علاوہ اس میں ۲۴ عکسی تصاویر بھی شامل ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی سب قابل تعریف ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نفس کتاب قابل ستائش ہے کہ جس سے نہایت بیش قیمت معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ کتاب اگرچہ خطوط کا مجموعہ ہے جیسا کہ ہز ہائنس نے اپنے دیباچے میں فرمایا ہے، لیکن دراصل یہ خطوط علی التواتر ارسال کئے گئے ہیں اور ایک روزنامچہ سا ہو گیا ہے۔ جس دقت نظری اور تفصیل کے ساتھ ہر خط لکھا گیا ہے وہ ہر خاتون کا کام نہیں۔ ہز ہائنس نے تمام جزوی و کلی امور اس طرح قلمبند کر دئے ہیں جس سے ناظرین کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جو دستکاری نئی نظر سے گذری ہے اس کا بھی مشرح مندرج ہے۔ مختلف مناظر کی تفصیلات بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ گویا گھر پر بیٹھے سیر یورپ ممکن ہے اور یہی تصنیف کی سب سے بڑی خوبی ہے جس پر کسی مصنف کو ناز ہو سکتا ہے۔

مصنف کے دوسرے درجے پر مرتب کی محنت ہوتی ہے، جس کی داد نہ دینا کوتاہ نظری ہے۔ جس طرح ہز ہائنس نواب بیگم صاحبہ جنجیرہ نے حالات یورپ کے قلمبند کرنے میں دقت نظری سے کام لیا ہے اسی طرح ان کی خواہر محترمہ زہرا بیگم فیضی صاحبہ نے اس کی ترتیب میں اپنی خداداد قابلیت صرف کی ہے، پاشاں خطوط کو ایک سلک میں منسلک کرنا اور واقعات کا سلسلہ قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔''

فارسی میں مثل ہے کہ ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' اور یہ زہرا بیگم فیضی پر صادق آتی ہے۔ یہ پورا خاندان علمی صلاحیتوں سے چھلک رہا تھا۔ ہز ہائنس نواب نازلی بیگم صاحبہ کی والدہ ماجدہ کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مرحومہ بھی صاحب تصانیف تھیں۔ انہوں نے ایک ناول شائع کیا تھا۔ اس کا نام ''فسانہ عشق حقیقی و پشیمانی عصیاں'' تھا۔ منشی دیا نرائن نگم نے اس کا ریویو زیر عنوان ''ناول نادر بیان'' لکھا جو ''زمانہ'' کانپور بابت مارچ ۱۹۱۴ء (صفحہ ۱۷۶) میں شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:-

''ہز ہائنس نواب بیگم صاحبہ جنجیرہ کی والدہ مرحومہ کا یہ ناول اگرچہ انگریزی ناول سے لیا گیا ہے تاہم بالکل ترجمہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اشخاص متعلقہ کے نام بھی بدلے ہوئے ہیں۔ نفس قصہ سچے حسن و عشق کی داستان اور ایک گناہ کبیرہ کا منظر ہے جو نہایت عبرتناک ہے۔ قصہ کی دلچسپی میں کلام نہیں جس سے علیا جناب سہیل صاحبہ کی لٹریری قابلیت نمایاں ہے۔ بیگم صاحبہ دیباچہ میں لکھتی ہیں:-

''اس کمترین بندۂ اللہ نے ایک قصہ دلپذیر برائے عبرت ناظرین وزہت شائقین لکھا ہے۔ اس امید سے کہ شاید اس کے پڑھنے سے حظ ملے اور دو گھڑی طبیعت بہلے۔ لیکن اگر کوئی خطا یا قصور یا بے ڈھنگا مضمون و عبارت ہو تو التجا ہے کہ نظر رحمت سے عفو فرمائیں۔ مجھے اس قدر اور عرض کرنا ضروری ہے کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ اس کی زبان میرے ملک (بمبئی) کی زبان ہے، اس لئے محاورات اور روزمروں میں غلطی کا احتمال نہیں، بلکہ یقین کرنا چاہیئے۔ یہ فسادِ عشق حقیقی و گناہ کبیرہ کے بیان میں ہے اس لئے اس کا نام ''فسانۂ عشق حقیقی و پشیمانی عصیاں'' رکھا ہے۔''

(۳) زہرا بیگم- عطیہ بیگم اور نازلی بیگم کی منجھلی بہن تھیں۔ وہ ۲۹ر ستمبر ۱۸۶۸ء کو بمبئی میں پیدا ہوئیں اور ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا۔ زہرا بیگم بھی اردو فارسی کا شوق رکھتی تھیں۔ زہرا بیگم اور شبلی نعمانی (م-۱۹۱۴ء) کے درمیان خط و کتابت بھی تھی۔ شبلی نے ایک عاشقانہ غزلیات کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ زہرا بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

''میرا چھوٹا سا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' ان کانٹوں کا نام ''دستۂ گل'' رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار نظم سے نکل گئے ہیں، اس لئے ان کا پردے میں رہنا مناسب ہے۔''

مولوی محمد امین زبیری صاحب خطوط شبلی میں لکھتے ہیں کہ مولانا حالیؔ نے شبلیؔ کے فارسی غزلوں کا یہ مجموعہ ''دستۂ گل'' دیکھکر کہا تھا:-

''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے ''سیرۃ النعمان''، ''الفاروق''، ''سوانح مولانا روم'' جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے۔ اس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔''

زہرا بیگم نے اپنی والدۂ گرامی کی کتاب ''آمین'' مرتب کر کے شائع کی۔ اس کتاب میں نہایت دلکش نظمیں ''آمین'' کے عنوان سے درج ہیں۔ کتاب پر ''زمانہ'' کانپور بابت مارچ ۱۹۱۴ء (صفحہ ۱۷۶) میں ایڈیٹر صاحب نے تبصرہ کیا۔ ''آمین'' کے متعلق زہرا بیگم صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:-

''یہ نظم بیاہ کے دوسرے روز فرقہ سلیمانی میں دولہا کی طرف سے حسب حوصلہ دعوت دی جاتی ہے۔ اس وقت زنانخانہ میں دعوتی بیبیاں جمع ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان زرین مسند پر ہرہفت آرائش مزین دولھن کو مسند نشین کرتے ہیں۔ بعد ہم آواز دلھن کی ہم عمر لڑکیاں ساتھ مل کر یہ آمین دلھن کی تعریف و مدح و ثنا میں گاتی ہیں کہ جس میں آمین کے لفظ کو اکثر حاضرین شریک ہو کر دوہراتے ہیں۔ اس کے ختم پر دلھن کو اعزا

رونمائی دیتے ہیں اور خشک میوے اور چاندی سونے کے بدلے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ بعد تمام دعوتیوں کو شربت پلایا جاتا ہے۔ پھولوں کے ہار تقسیم ہوتے ہیں اور دو بڑے بتاشہ بھی حصے میں دئے جاتے ہیں۔''

ذیل میں آمین کے بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں جن سے مصنفہ (والدۂ عطیہ بیگم) مرحومہ کی شاعرانہ قابلیت پر روشنی پڑے گی۔

کہوں توحید ربانی — کروں توصیف یزدانی

(از آمین اول) وہ ہے معبود سبحانی — بحق انبیاء آمین

دلہن معمور ہے دیکھو — بنی وہ حور ہے دیکھو

عجب پر نور ہے دیکھو — بحق مرتضیٰ آمین

خدایا فضل اپنا کر بحق مصطفیٰ آمین — رہے تیرا کرم ہم پر طفیل مرتضیٰ آمین

انیس رہے شادی گھرانے میں مزے میں لطف اٹھاتے ہیں — وہ دن آیا زمانے میں کہیں سب اقربا آمین

(از دوم) مبارک خانہ آبادی عروس گل کی ہے شادی — ملی بلبل کو آزادی ہے نغمے کی صدا آمین

ہے دولہا مہر سے اچھا دلھن ہے چاند کا ٹکڑا — ہوئے شمس و قمر یکجا بڑھے نور و ضیا آمین

ایک خاتون کی یہ اردو شاعری ہر طرح قابل فخر ہے۔ آپ کا دیوان بھی پریس میں جا چکا ہے۔ جو غزلیات و قصائد کا مجموعہ ہے۔ ہر سہ مندرجہ بالا کتابیں جناب زہرا بیگم فیضی صاحبہ چراغ باغ وارڈی روڈ بمبئی سے طلب کی جائیں۔''

(۴) سر اکبر حیدری۔ ''ادیب'' الہ آباد بابت جون ۱۹۱۳ء، ایڈیٹر حسیر عظیم آبادی تھے۔ اس شمارے میں سر اکبر حیدری پر ایک مضمون ''مسٹر اکبر حیدری'' کے عنوان سے موجود ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:-

''مسٹر اکبر حیدری ۱۸۶۹ء میں بمقام بمبئی پیدا ہوئے۔ آپ کا نام محمد اکبر نذر علی حیدری رکھا گیا۔ آپ کی والدہ بدرالدین طیب جی (م-۱۹۰۶ء) کی سگی بہن تھیں۔ بوہرہ خاندان کو جہاں تجارتی خصوصیات کا ورثہ ملا ہے اسی کے ساتھ ان میں اتقاء بھی بدرجہ اعلیٰ ہے۔ طہارت و نماز کی پابندی شدت سے تھی۔ داڑھی منڈانا اور تا کو پینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

اکبر حیدری کی شادی بدرالدین طیب جی مرحوم کی بھتیجی سے ہوئی۔ مسز حیدری نجم الدین طیب جی کی صاحبزادی تھیں جو نہایت عالم، علم دوست شخص تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے بیگم صاحبہ مسز حیدری کو سنہری تمغۂ قیصر ہند عطا کیا تھا۔

مسٹر حیدری تعلیم نسواں و سوشل ریفارم کے ہمیشہ زبردست حامی رہے۔ چنانچہ حیدر آباد میں

بھی صیغہ تعلیم نسواں کے آپ، آپ کی بیگم صاحبہ بڑے موید تھے اور آپ اس زمانے میں محبوبیہ گرلز اسکول کے سکریٹری بھی تھے۔ اس وقت آپ کے خاندان میں کئی سول جج، ڈاکٹر، آنزیبل اور ملک التجار تھے۔ والیان ریاست مثل ہز ہائنس صاحب جنجیرہ جی سی آئی کے ساتھ ان کے خاندان کے ازدواجی تعلقات تھے۔''

سر اکبر حیدری اور مسز حیدری علامہ اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ان کا احترام بیحد کرتے تھے۔ جب اقبال مارچ ۱۹۱۰ء میں پہلی بار حیدر آباد گئے تو حیدری صاحب نے انہیں تاریخی مقامات کی سیر کرائی تھی۔ اس موقعہ پر اقبال نے ''گورستان شاہی'' کے عنوان سے ۶۴ شعر کی ایک نظم لکھی جو مسٹر حیدری اور ان کی بیگم صاحب کے نام منسوب کی گئی۔ اقبال انہی کے مہمان تھے۔ (تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب کلام اقبال [نادر و نایاب رسالوں میں] مطبوعہ کلچرل اکادمی دیکھی جاسکتی ہے۔)

سر اکبر حیدری نے جنوری ۱۹۳۸ء میں اقبال کو ''یوم اقبال'' کے موقعہ پر توشہ خانہ نظام کی طرف سے جو صاحب صدر کے ماتحت تھا ایک ہزار روپے کا چک بطور تواضع بھیجا تھا۔ اقبال نے اس رقم کو زکاۃ سمجھکر اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اسے ٹھکرا کر یہ کہا۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز	دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر	حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش	کام درویش میں ہے تلخ ہے مانند نبات

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(۵) خطوط شبلی۔ یہ علامہ شبلی نعمانی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے زندگی کے آخری ایام میں عطیہ بیگم فیضی اور ان کی بڑی بہن زہرا بیگم فیضی کے نام تفریحاً لکھے تھے۔ خطوط شبلی پہلی مرتبہ مولوی محمد امین زبیری مارہروی نے ۱۹۲۶ء اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن چند اضافوں کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور سے شائع کیا تھا۔ اب دونوں ایڈیشن نادر ہو گئے ہیں۔ کتاب میں عطیہ بیگم کے ۵۵ اور ۲۷ خطوط زہرا بیگم فیضی کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۷ر فروری ۱۹۰۸ء اور آخری ۲۸ر مئی ۱۹۰۹ء کا ہے۔ ابتدا میں مولوی زبیری صاحب کا مختصر دیباچہ اور ڈاکٹر عبدالحق (سکریٹری انجمن ترقی اردو) کا طویل مقدمہ ہے۔

زبیری صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

''بعض لوگوں نے مولف سیرۃ النبیؐ کے ساتھ ان خطوط کی نسبت کو ناپسند کیا۔ بعض نے ان کی اشاعت کو عقیدت و نیاز مندی کے خلاف جانا جو راقم کو مولانا مرحوم کی ذات گرامی کے ساتھ ہے۔ بعض

نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ میں متعصبانہ جھلک دیکھی جو خود ان کے اپنے خیالات نے پیدا کر دی۔''
مولانا عبدالماجد دریابادی (شبلی نامہ ماہنامہ ''ادیب'' علی گڈھ ۱۹۶۰ء صفحہ ۹) لکھتے ہیں کہ:۔

''شبلی زاہد خشک نہ تھے۔ دنیا کی رنگینیوں سے بھی حدود کے اندر لطف لیتے تھے۔''

علامہ شبلی نے ان خطوط میں جذبات کا اظہار کیا ہے، ان کو انہوں نے مخفی نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے احباب کو بھی اپنی رنگین اور محبت آمیز تحریروں سے لطف اندوز کیا۔ بقول زبیری صاحب عطیہ بیگم اور زہرا بیگم نے خوشی کے ساتھ ان خطوط کی اشاعت کی اجازت دیدی اور علامہ شبلی خود ان جذبات و تعلقات میں کوئی بات ناقابل اشاعت نہ سمجھتے تھے۔ ان کے جواب میں ان بہنوں کے جو خطوط آتے تھے ان کو علامہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ اپنی بیٹی کو دکھاتے تھے، ان کے اقتباسات الہ آباد اور حیدرآباد بھیجتے تھے۔ ان بہنوں کے لئے خاص خاص موقعوں پر جو فارسی و اردو کی غزلیں اور قطعے کہتے تھے وہ خطوط میں دیکھنے کے بعد سنایا بھی کرتے تھے اور مجموعہ کلام فارسی میں بھی چھپوایا کرتے تھے۔ علامہ کے یہ خطوط بمبیٔ و جنجیرہ کے سفر، فارسی کی غزلیں ''معلوم عوام'' تھیں۔ غرضیکہ شبلی کا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن عطیہ بیگم کی توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔ ایک خط میں جذبات سے لبریز ہوکر عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں:۔

''اب تو تمہارے خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ احباب کو مزے لے لے کر سناتا ہوں اور لوگ سر دھنتے ہیں۔ پالیٹکس کے متعلق تمہارے پچھلے خط کے اقتباسات میں نے الہ آباد اور حیدرآباد بھیجے۔ ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہوتو تم کو پوجیں۔ وانا اوّل العابدین (اور میں پہلا پوجنے والا ہوں گا)

عطیہ بیگم ۱۹۰۸ء میں لندن اور پیرس کے لئے سوار ہوئی تھیں۔ شبلی نے ۱۹ اشعار کی درج ذیل ''وداعیہ نظم'' ۱۳/اپریل ۱۹۰۸ء کو لندن بھیجی۔

خداحافظ

اے کہ دل بر سفر نہاد ستی — زود ازیں منزل درازآئی
ہم بصد جاہ و احتشام روی — ہم بصد گونہ عز و نازآئی
می روی گرچہ با سر و ساماں — پیش ازیں ہم بہ برگ و سازآئی
بروی سوئے پیرس و لندن — ور رہ کعبہ و حجاز آئی
رسم و آئین شرع نہ گذاری — رہرو جادۂ نیاز آئی
نکتہ پیرائے علم و فن باشی — تا بہر پایہ سرفراز آئی
دوستان دیدہ براہت باشند — کہ تو ناگہ زود فراز آئی

بر سفر رفتت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی

و ز پس آمدن بہ اعظم گڈھ

از رہ لطف یکہ تاز آئی

ذیل میں شبلی کے کچھ خطوں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:۔

شبلی ۱۵ر جولائی ۱۹۰۹ء کو عطیہ بیگم کے نام لکھتے ہیں........

''عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں (لکھنؤ) سے بھیجوں۔ تم نے ایک لفظ خط میں لکھا کہ ''میں ہضم نہیں کر سکتی''۔ کیا یہی لفظ ہے اور کیا اس کے معنی تم نے تسلیم کر لیے ہیں۔ ایسا ہے تو سخت غلطی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو اس پر بے ساختہ ہنسی آ جائے گی۔''

۱۴ر اگست ۱۹۰۹ء کو عطیہ بیگم کے نام لکھتے ہیں........

''تم نے میرے سوالوں کا جواب نہیں لکھا۔ میری اور مسٹر اقبال کی تعریف میں خط کو پورا کر دیا۔''

۱۹ر اگست ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں........

''میں اگر بمبئی آؤں تو کیا تم دو تین دن کے لئے وہاں آ سکتی ہو یا مجھ ہی کو جنجیرہ میں حاضری دینی پڑے گی۔ تم اگر بمبئی آ کر مجھے جنجیرہ لے چلوگی تو میری عزت افزائی ہوگی۔''

عطیہ بیگم کی وجہ سے مولانا شبلی جنجیرہ کو ''بہشت بریں'' کہتے تھے۔ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو شبلی نے ''بمقام جنجیرہ'' کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم عطیہ بیگم کو بھیجی تھی۔ ملاحظہ ہو ؎

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی   خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی

جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصرِ معلی میں   اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے   یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی

جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو   کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی

کہاں یہ لطف، یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستان

عطیہ! تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

علامہ شبلی نے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ بیگم کو ''بمبئی'' کے عنوان سے یہ نظم بھیجی تھی ؎

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں   وہ جزیرہ کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا

لطف تھا ذوق سخن تھا صحبت احباب تھی   مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا

سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب   غیرت خلد بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا

غنچۂ گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز — عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر — خود بخود لبریز ہے ہر ساغر و پیمانہ تھا

اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا''

عطیہ بیگم نے قیام یورپ کے زمانے میں شبلی کو یورپ آنے کی دعوت دی تھی۔اس کے جواب میں شبلی مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۰۸ء کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

''یقین ہے اب نہ سہی، پھر سہی، یورپ کی ہمسفری بھی چنداں بعید نہیں۔ ممکن ہے ہمت پیدا ہو اور ساتھ چل سکوں۔''

مولانا شبلی ۲۱ر جون ۱۹۰۹ء (خطوط شبلی صفحہ ۴۴) کے خط میں عطیہ بیگم کی دلجوئی کے لئے لکھتے ہیں:۔

''عطیہ تم سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام معنون ڈیڈیکٹ کر سکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا، لیکن کب آئے گا، اس کا فیصلہ آج نہیں ہو سکتا۔''

یہ تو اوپر گذر چکا ہے کہ ''خطوط شبلی'' عرصۂ دراز سے ناپید ہے۔ کتاب کتب خانوں سے غائب کر دی گئی ہے۔ مجھے اس کے دونوں ایڈیشن دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی ہمیشہ سے ان خطوط کی اشاعت کے خلاف تھے۔ اگر کوئی (شبلی اور عطیہ بیگم) کے بارے میں استفسار کرتا تھا تو خاموشی سے ٹالتے تھے۔ اس کا انکشاف شبلی کے دوست مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر اخبار ''پیغام'' اور مصنف ''یاد ایام'' مولوی محمد امین زبیری کے خط مورخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۴۵ء میں کیا ہے۔ تفصیلات کے لئے نقوش لاہور مکاتیب نمبر جلد اول و دوم مطبوعہ ۱۹۵۷ ملاحظہ ہوں۔

(۶) الناظر لکھنؤ۔ یہ ماہنامہ خالص ادبی رسالہ تھا جو یکم جولائی ۱۹۰۹ء میں لکھنؤ سے جاری کیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کے دو ایڈیٹر صاحبان تھے۔ وصی الحسن علوی بی-اے اور ظفر الملک علوی۔ الناظر موخر الذکر کی ادارت میں پروان چڑھا اور خوب پھلا پھولا۔ پہلے شمارے سے ستمبر ۱۹۳۶ء تک میری نظر سے اکثر و بیشتر شمارے گذرے۔ سرورق پر سال اس طرح درج رہتا تھا۔

جامعیت جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

۷ ۲ ۳ ۱ ہجری مطابق ۱۹۰۹ء

الناظر کے ابتدائی پرچے مفید عام پریس اراوت نگر متصل ڈالی گنج لکھنؤ میں باہتمام محمد علی شائع ہوئے۔ جب الناظر کا اپنا پریس قائم ہوا تو پھر ''الناظر پریس'' واقع خیالی گنج لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔

الناظر کا آخری پرچہ جو میرے مطالعہ میں رہا وہ ستمبر ۱۹۳۶ء کا تھا۔ اس سے قبل کے شمارے یعنی اگست میں حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی نے مشہور زمانہ اودھ پنچ لکھنؤ کے ایڈیٹر علامہ چودھری شیخ ممتاز حسین عثمانی کے انتقال کی تاریخ ۲۱ شعر میں درج ہے۔ ذیل میں اس کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ہر علم میں تھا منزل تحقیق کا مالک — اے متبحر کہیں ہوتے ہیں جہاں میں

نازاں تھی ظرافت یہ پھڑک جاتی تھی فطرت — اک کیف تھا تیری نہیں میں تیری ہاں میں

تاریخ اب آشفتہ سنا دے بدل یاس

ممتاز حسین آج گئے قصر جہاں میں

۱۳۵۵ھ = ۱۹۳۶ء

ستمبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں ''آہ ممتاز حسین عثمانی'' پر ایک مضمون ہے۔ صفحہ ۵۳ میں لکھا ہے کہ:-

''اودھ پنچ زبان کا تو بادشاہ تھا ہی اور ہے ہی۔ سیاست میں بھی اول دن سے اس کی رائے کو مجتہدانہ رفعت حاصل رہی۔ سیاست خارزار میں ظرافت کی کلیاں بکھرتا ہوا جس خوبصورتی سے اودھ پنچ کا ایڈیٹر پاک وصاف نکل جاتا ہے وہ سچ ہے۔ وہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کا حصہ ہے۔''

الناظر کے پہلے شمارے میں ایڈیٹر صاحب نے لکھا تھا کہ علامہ شبلی خواجہ عزیز الدین کشمیری کے شاگرد تھے۔ اس کی تردید علامہ نے اپنے ۲ راگست والے خط میں جو الناظر بابت یکم ستمبر جلد ا شمارہ ۳ صفحہ ۱۵ میں یوں چھپا تھا:-

''معذرت'' جناب ایڈیٹر صاحب زادلطفہ!

آپ نے اپنے پرچے میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں۔ خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے۔''

جب اسرار خودی کی اشاعت اول (۱۹۱۵ء) کے بعد علامہ اقبال مخالفت کی گھنگھور گھٹاؤں میں گھر گئے تھے تو ایڈیٹر الناظر ظفر الملک علوی صاحب نے اقبال کے دفاع میں غالباً سب سے پہلا مضمون لکھا جو الناظر جلد ۱۴ شمارہ نمبر ۷، (صفحہ ۵۳-۵۶) بابت یکم جنوری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے چند جملے اقبال کی حمایت میں درج کرتے ہیں:-

''ڈاکٹر صاحب نے جس دردمندانہ دل کے تقاضہ سے قوم کو چونکانے کے لئے یہ خون جگر کھایا تھا حقیقت میں اس کے انتساب کے لئے بھی کسی ایسے ہی دردمند بزرگ ملت اور عظیم القدر شخصیت کی ضرورت تھی۔ قوم آنریبل سر سید علی امام کے نام نامی سے اس مثنوی کا معنون کرنا بالکل حق بجانب

ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بزرگ سید کی شان میں کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں۔

آشنائے معنی بیگانہ
جلوۂ شمع مرا پروانہ

ہم کو اس سے پیشتر فارسی زبان پر ڈاکٹر صاحب کی قادر الکلامی کا کوئی بین ثبوت نہیں ملا تھا۔ اس مثنوی کی برجستگی بیان و بے تکلفی زبان نے ثابت کر دیا کہ ان کو فارسی پر بھی اسی طرح اور اسی قدر قدرت حاصل ہے جس قدر کہ اردو پر۔''

اقبال کی رموز بیخودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تو الناظر لکھنؤ جلد ۱۸ شمارہ ۱ بابت یکم اپریل ۱۹۱۸ء میں ایڈیٹر صاحب نے کتاب پر درج ذیل مختصر سا تبصرہ کیا:۔

''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی مثنوی اسرار خودی دو سال ہوئے چھپی تھی۔ اور گو فارسی زبان کا مذاق کم ہو گیا ہے تاہم اسے پبلک سے خلعت قبول حاصل ہوا۔ رموز بیخودی اس کا دوسرا حصہ تیار ہوا ہے۔ احباب ملت اسلامیہ کے بہ منزلہ اسے ایک نسخہ کیمیا سمجھنا چاہیئے۔ زبان فارسی میں قلم ہندی کی روانی کا تماشا دیکھنا ہو، جذبات قومی و حسیات ملی کے بحر زخار میں تخیل کی طغیانی کا نظارہ کرنا ہو تو رموز بیخودی کا مطالعہ فرمائیے۔ اقبال کی شاعری کا تعارف کرانا اس طرح دشوار ہے۔ جس طرح شراب سے کسی کو آگاہ کرنا جسے شوق و ولولہ یا ہمت و حوصلہ آئے اور اپنے کام و دہن کو اس مئے ارغوانی سے لذت آشنا کرے۔''

الناظر جلد ۲۰ نمبر ۱۱۹ بابت مئی ۱۹۱۹ء (صفحہ ۹-۲۴) کے شمارے میں اسلم جیراجپوری کا تفصیلی مضمون اقبال کی حمایت میں بعنوان ''مثنوی اسرار خودی'' شائع ہوا تھا۔ اس کی مکمل تفصیل راقم حروف کی تازہ ترین تصنیف ''معرکۂ اسرار خودی'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا مناسب ہے کہ علامہ اقبال الناظر لکھنؤ کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

الناظر جلد ۳۳ شمارہ ۱، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء (صفحہ ۴۶) میں ''نظرے خوش گزرے'' کے زیر عنوان ایڈیٹر ظفر الملک صاحب نے ڈاکٹر اقبال کو مولانا شیخ غلام قادر تخلص گرامی کا شاگرد قرار دیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حفیظ جالندھری، محمد عبداللہ قریشی اور دوسرے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی۔ جب مخزن کا گرامی نمبر اگست ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تو اس میں بھی بعض لوگوں نے اقبال کو گرامی کا شاگرد ٹھہرایا تھا۔ گرامی کے انتقال سے قبل آگرہ سے ایک علمی ادبی رسالہ ''شمع'' کے نام سے جنوری ۱۹۲۵ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے دو ایڈیٹر صاحبان تھے۔ جناب حسن عابدی صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء اور پروفیسر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لاء مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اگست ۱۹۲۵ء کے شمارہ (صفحہ ۶۳) میں

جناب حسن عابدی کا مضمون ''مولانا گرامی'' پر شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اس میں ذیل کا جملہ بھی لکھا تھا:-

''سر محمد اقبال صاحب اقبال فارسی شاعری میں گرامی کے نہایت عزیز شاگرد ہیں۔''

جب ''شمع'' کا یہ شمارہ اقبال کی نظر سے گذرا تو انہوں نے گرامی کی شاگردی سے صریحاً انکار کیا۔ اقبال کی یہ تردید ''شمع'' آگرہ بابت ستمبر ۱۹۲۵ء (صفحہ ۲) میں ''اطلاع'' کے عنوان سے اس طرح شائع ہوئی تھی:-

''اگست کے شمع میں غلط اطلاع کی بنا پر مولانا گرامی کے حالات لکھا گیا تھا کہ محترمی علامہ سر محمد اقبال صاحب قبلہ ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ہم کو سر محمد اقبال صاحب نے جو تحریر اس کے بارے میں بھیجی ہے اس کا آخری جملہ درج کرتے ہیں:-

''مولوی گرامی میرے نہایت عزیز دوست ہیں اور میں ان کا ادب واحترام کرتا ہوں مگر تلمذ کا تعلق ان سے مجھے کبھی نہیں ہوا۔ شاگردی خواہ کسی کی ہو، کوئی عار کی بات نہیں۔ مگر جو بات خلاف واقع ہو اس کی تردید ضروری ہے۔ اسی واسطے میں نے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کی ہے۔''

اس کے بعد عابدی صاحب اسی صفحے پر لکھتے ہیں:-

''ہم کو اپنی غلطی پر افسوس ہے اور علامہ موصوف سے خواستگار معافی ہیں۔ ہم کو بہت زیادہ خوشی اس امر کی ہے کہ محترمی علامہ موصوف نے ہماری اس غلطی کا برا نہ مانا اور ان کی بزرگی کی یہ بھی ایک دلیل ہے۔''

جب الناظر کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے اداریہ میں ایڈیٹر صاحب نے تعلیم نسواں پر زور دیا تھا۔ یہ پرچہ جب زہرا بیگم فیضی کی نظر سے گذرا تو انہوں نے ''ایک مبارک تجویز'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو الناظر شمارہ ۲ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۹ء (صفحہ ۵۱) میں شائع ہوا تھا۔ محترمہ فرماتی ہیں:-

''پہلا پرچہ میری نظر سے گزرا۔ میں دیکھتی ہوں کہ نئے نئے رسالوں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ آئے دن اسی فکر اور اسی ذکر میں حامیان تعلیم نسواں کی زندگی گذر رہی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ خیال کچھ ایسا جڑ پکڑ گیا ہے کہ جوں جوں رسالوں کی تعداد بڑھے گی تعلیم پھیلتی جائے گی کیونکہ یہ کاغذ کے ٹکڑے ہر ایک چار دیواری میں بے روک پہنچ سکنے کے مجاز ہوں گے اور بی بیاں ان کو مطالعہ کر کے دنیا کی روشنی سے واقفیت حاصل کر لیں گی۔ لیکن ہائے رونا تو اس کا ہے کہ اتنی پڑھنے والیاں کہاں۔ اور جب ان میں پڑھنے کا مادہ نہ ہو تو وہ رسالوں سے کیسے مستفید ہو سکتی ہیں۔ اگر ہوں گی تو بھی وہی معدودے چند۔ عام طور سے کیا فائدہ ہوگا کچھ بھی نہیں۔ اس لئے میرا یہ خیال ہے کہ اس رسالے کا انتظام اس طرح پر ہونا چاہیئے کہ اس میں ایک حصہ خاص مستورات کی تعلیم کی غرض سے علیحدہ رکھا جائے ......''

الناظر کو جاری و ساری کرنے میں مولوی عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی اردو) نے ہمیشہ

ظفر الملک علوی صاحب کی قدمے درمے سخنے دل کھول کر امداد فرمائی۔ مولوی صاحب کے تعاون سے ہی الناظر بک ایجنسی اور ۱۹۱۲ء میں الناظر پریس قائم کیا گیا۔ بقول ایڈیٹر صاحب اگر مولوی صاحب مدد نہ کرتے تو الناظر ۱۹۱۶ء سے پہلے ہی دم توڑ دیتا۔ الناظر کے مالی معاونین کی ایک طویل فہرست ہے جس میں عطیہ فیضی بھی شامل ہیں۔

الناظر کے لکھنے والوں کی ایک طولانی فہرست نظر سے گزری۔ چند قابل ذکر نام یہ ہیں:-
مولوی عبدالحق، مسٹر عبدالماجد دریابادی، سید حسن برنی، مرزا ہادی رسوا، عزیز لکھنوی، سید ہاشمی فرید آبادی، سلطان حیدر جوش، مرزا سلطان احمد، منشی رشید احمد ارشد، سفیر کاکوروی، حکیم شمس الدین قادری، منشی احسان علی فصیح، بیگم صاحبہ مسٹر صفدر علی، عطیہ بیگم فیضی، زہرا بیگم فیضی، مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی، احمد علی شوق قدوائی، سید علی حیدر نظم طباطبائی، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، وحشت کلکتوی، قیصر بھوپالی، شیخ ممتاز حسین جونپوری، آرزو لکھنوی، آشفتہ لکھنوی، چودھری رحم علی الہاشمی۔

(۷) نور جہاں، امرتسر- یہ تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے محترمہ سعادت سلطان کی ادارت میں چھپتا تھا۔ ایڈیٹر صاحبہ زیر نظر شمارہ صفحہ ۴ میں لکھتی ہیں:-

''محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ''مسلمانوں کو ایک پیام'' دیا ہے۔ جس میں آپ نے حقوق نسوانی کی بحالی کی ایک پرزور اپیل کرتے ہوئے علامہ راشد الخیری صاحب دہلوی کی ''تربیت گاہ بنات'' کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چونکہ ''نور جہاں'' کا مقصد ہر مفید نسواں کی تحریک کی تائید وحمایت کرنا ہے اس لئے ہم مولانا ممدوح سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ نمائندہ رسالہ ''نور جہاں'' کو معاینۂ درسگاہ کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ ہم ''تربیت گاہ بنات'' کی امداد واعانت کی طرف ناظرین کو زیادہ وثوق کے ساتھ توجہ دلا سکیں۔''

پنڈت چاندنراین رینہ۔ چاؔند

اقبآل کا ایک شاگرد
(پنڈت چاند نرائن چاؔند)

(اقبالیات میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اقبال سے ایک آدھ بار ملاقی ہوئے۔ اور ان کا بھی نام لیا گیا جو ان کے خلاف دل میں گرد کدورت رکھتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ کسی نے پنڈت چاند نرائن رینہ چاؔند شاگرد اقبال کا نام تک نہیں لیا جب کہ لاہور میں ماہرین اقبالیات کی فوج ظفر موج موجود ہے۔ چاؔند کے والد پنڈت کنور نرائن رینہ لندن میں اقبال کے کلاس فیلو تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم کی حیثیت سے اقبال کے شاگرد بھی تھے۔ لندن سے کلام اقبال کو اپنے دوست کو بذریعہ ڈاک روانہ کرتے تھے۔ غرضیکہ چاند علامہ اقبال کے سراپا شاگرد تھے۔ یعنی ان کے والد اور دادا بھی علامہ کے شاگردوں میں تھے۔)

چاند نرائن، تخلص چاؔند، اردو کے مشہور شاعر، ادیب، محقق اور قانون دان رائے بہادر پنڈت شیو[1] نرائن تخلص شمیم کے پوتے اور مشہور زمانہ مقنن، اردو کے ادیب اور ممتاز ناقد پنڈت سرتیج بہادر سپرو[2] کے داماد تھے۔ چاؔند جالندھر میں اپنے والد پنڈت کنور نرائن رینہ کے گھر میں ۲۵ جون ۱۹۰۱ء کو طلوع ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انگریزی مدارس اور سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں حاصل کی۔ فلسفہ میں ایم-اے کیا۔ حصول تعلیم کے بعد مختلف عہدوں پر فائز ہو کر آئی، اے، ایس آفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بالآخر ۱۴ر جون ۱۹۸۰ء کو انتقال کیا۔

چاؔند کو سخن فہمی کا ذوق بچپن سے ہی پیدا ہوا تھا۔ اور گھر کے ماحول نے اسے جلا بخشی، رفتہ رفتہ طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ تیج بہادر، سپرو، جوش ملیح آبادی اور علامہ دتاتریہ کیفی کے سے بزرگوں نے ہمت افزائی کر کے ان کی شعر گوئی کو فروغ دیا۔

چاؔند نے دو شعری مجموعے ''کاروان سخن'' (۱۹۵۲ء) اور ''عرفان سخن'' (۱۹۸۰ء) یادگار چھوڑے ہیں۔ دونوں مجموعوں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کاروان سخن کے بارے میں شاعر

انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:-

''پنڈت چاند نرائن صاحب چاند پر میں کیا روشنی ڈالوں۔ ان کی ادبی درخشانی اظہر من الشمس ہے۔ یہ رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم کے پوتے ہیں جو اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور ذی علم بزرگ تھے۔ اس کے دوش بدوش چاند صاحب ہمارے محترم دوست سر تیج بہادر سپرو کے داماد ہیں۔ جس شخص کو ذاتی جوہر کے ساتھ ساتھ ان متذکرہ بالا شخصیتوں نے بھی وابستہ کر دیا ہے اس کو 'سیاہ چشمان کشمیری وترکان سمرقندی'' آہنی ذات پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ چاند صاحب کا دیوان جب طلوع کرے گا تو آنِ واحد میں شہرت و مقبولیت کی سرزمین پر چودھویں کی چاندنی کی طرح پھیل جائے گا اور ارباب نظر کی تحسین و داد کے ستاروں سے ان کا دامن جگمگا اٹھے گا۔''

جناب کیفی مرحوم کی رائے ہے کہ:-

''یہ مجموعہ جو پنڈت چاند نرائن چاند، ایم-اے، ڈپٹی کمشنر کرنال کا اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ نہایت قدر و امتیاز کے قابل ٹھہرتا ہے۔ جذبات کی عصمت، احساسات کی نزاکت، خیالات کی فراوانی، بیان کی سلاست اور زبان کی فصاحت اس کلام کے خاص اوصاف ہیں۔ چاند صاحب کم کہتے ہیں۔ مگر جو کہتے ہیں آنکھ سے دیکھ کر اور دل سے محسوس کر کے کہتے ہیں۔ ان کے کلام کی رنگینی میں دلپذیری ہے، جس سے جی نہیں بھرتا۔ ان کے بیان میں شیرینی ہے جو گلوسوزی کے بغیر روح کو فرحت بخشتی ہے۔''

چاند کی شاعری میں جدید اور قدیم رنگ کی آمیزش ہے۔ اگر 'عرفان سخن' کی نظمیں ترقی پسند تصورات کی نمایندگی کرتی ہیں تو غزلیں قدامت اور کلاسیکی طرز احساس کی، ان کے یہاں کلاسکیت کا ستھرا اور پاکیزہ رچاؤ ہے اور زمانے کا درد، وقت کی آہٹ کا احساس بھی۔ عصری زندگی اور زمانے کی رفتار پر آپ کی گہری نظر تھی۔ ہندوستان آزاد ہوا تو ہر طرف کشت و خون، فرقہ وارانہ فسادات، افلاس و بے روزگاری اور رشوت ستانی کا بول بالا رہا۔ وہ ایسے ماحول میں کیسے بیٹھ سکتے۔ چنانچہ ایک نظم ''وطن'' میں کہتے ہیں۔

آزاد ہم ہو کے بھی نہیں آزاد ہم ہوئے
آزاد ہم ہوئے بھی تو ناشاد ہم ہوئے
ہم کیا کہیں کہ کس طرح برباد ہم ہوئے
لیکن وطن سے مجھ کو محبت ضرور ہے

وطن کی پوری نظم میں چاند کی قادر الکلامی غالب آ چکی ہے۔ کلام کی روانی، شگفتگی اور آمد کے ساتھ ایسا لگتا ہے کہ جوش ملیح آبادی کی نظموں کی طرح خیالات کے ساتھ الفاظ بھی اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔

چاند کی غزلیں کلاسکی رچاؤ اور لمبی بحروں میں ہیں۔ ان کی شاعری نقطۂ اتصال کا مرتبہ بھی رکھتی ہے۔ جہاں ان کی نظمیں ایک طرف ترقی پسند خیالات کی عکاسی کرتی ہیں تو دوسری طرف ان کی غزلیں عہد ماضی کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں الفت کی حقیقت اور الفت کے افسانے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کی غزلوں میں ایک بات جو بار بار دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ اس دور میں ظلم کو راحت اور بے انصافی کو انصاف کہنے کے لئے شاعر مجبور ہوتا ہے۔ یہ گویا عصری منافقت کے خلاف احتجاج کی آواز ہے جو غزل کے آداب اور ایما کے ساتھ ابھری ہے۔ چاند بھی گرفتاری کو آزادی، سچ کو جھوٹ اور روشنی کو تاریکی کہنے پر مجبور ہیں۔ اس سب کے باوجود ان کی شاعری میں ذوق وشوق کی تلاش اور نیا بانکپن دیکھنے کو ملتا ہے۔

عشق بیگانۂ غیرت ہو تو وہ عشق ہی نہیں
وہ جنوں ہے جو جنوں دار و رسن تک پہونچے

چاند کی آخری غزل شعور کی پختگی، ضمیر کی پاکیزگی، طمانیت قلب اور فکر و احساس کی معراج ہے۔ فانی نے بھی کہا ہے۔

تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام
الٰہی مرے سحر کی بھی شام ہو جائے

اقبال کا یہ شعر قابل توجہ ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

چاند بھی اس شام زندگی کو صبح دوام زندگی سمجھتے ہیں۔ اس کا استقبال کرتے ہیں اور اس کے قریب آنے پر کس خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

کرے گی اجل تیری مشکل کشائی[۳]

تو خوش چاندؔ ہو وہ گھڑی آ رہی ہے

چاندؔ کے والد آنجہانی پنڈت کنور نرائن رینہ اور ان کے ایک ساتھی دیوان نرنجن پرساد کھوسلہ طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر اقبالؔ کے شاگرد تھے۔ دونوں کالج کے ہوسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور دونوں ہاکی الیون کے کھلاڑی تھے۔ دیوان صاحب نے کالج سے ایم-اے اور ایل ایل بی پاس کئے۔ کنور صاحب بیرسٹری کے لئے ۱۹۰۵ء میں لندن گئے اور لنکنز انّ میں داخلہ لیا۔ چند مہینوں کے بعد اقبالؔ بھی اسی انّ میں داخل ہو گئے۔ غرضیکہ قیام یورپ کے زمانے میں موصوف کو اقبالؔ کے کلاس فیلو ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔

رینہ صاحب اقبال کے مخلص عقیدت مندوں میں تھے۔ وہ لندن کی شعری نشستوں میں کلام اقبال سے محظوظ ہوتے تھے۔ اور اپنے ہندوستانی دوست دیوان صاحب کو وقتاً فوقتاً اشعار اقبالؔ ڈاک سے ارسال کرتے تھے۔ ۲۷ر جون ۱۹۰۷ء کے خط میں موصوف کو درج ذیل اشعار بھیجے تھے۔

عجیب چیز ہے یہ بادۂ محبت بھی — ہزار تلخ ہو پر بے مزا نہیں ہوتا

ہزاروں دوست ہیں پر اس طرح سے رہتا ہوں — جہاں سے جیسے کوئی آشنا نہیں ہوتا

عجیب چیز ہے مغرب کی زندگی جس سے — دماغ ہوتا ہے دل آشنا نہیں ہوتا

نماز پڑھتا ہوں اور بے نماز ہوں اقبالؔ

یہ قرض وہ ہے کہ مجھ سے ادا نہیں ہوتا

یہ اشعار اقبالؔ کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح رینہ صاحب نے ۱۳ر نومبر ۱۹۰۷ء کے خط میں دیوان صاحب کو درج ذیل اشعار ڈاک کے ذریعہ بھیجے تھے۔

آئے جو قران میں دو ستارے — کہنے لگا ایک دوسرے سے

یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب — انجام خرام ہو تو کیا خوب

تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو

ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو

لیکن یہ وصال کی تمنا — پیغام فراق تھی سراپا

گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثبات آشنائی
آئیں جہاں کا ہے جدائی[4]

الٰہی عقل خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
ملا محبت کا سوز مجھکو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے مثال شمع مزار ہے تو، تو تری کوئی انجمن نہیں ہے
یہاں کہاں ہم نفس میسر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخ کہن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیر مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے[5]

اسی زمانہ میں رینہ صاحب کے ایک دوست جناب کیول نے لندن سے دیوان صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

''کنور (نرائن رینہ) نے آخر استاد (اقبال) سے چند شعر کہلوا ہی لئے۔ نمونہ عرض ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو گماں ہے اس کو کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
ملے گا کیا تجھکو اے ستمگر ہمارے دل کا نظارہ کر کے کہیں خلش ہوگی آرزو کی، کہیں تمنا کا خار ہوگا[6]

کیول صاحب اقبال کے مداحوں میں تھے اور ان سے لندن اور لاہور میں گہرے مراسم تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزل کا دوسرا شعر (ملے گا.....خار ہوگا الخ) بانگ درا یا اور کسی کتاب میں نہیں ملتا اور یہ نئی دریافت ہے۔

۱۹۰۸ء میں اقبالؔ اور پنڈت کنور نرائن رینہ دونوں لندن سے لاہور واپس آ گئے۔ اقبالؔ نے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر رہنے کے بعد لاہور چیف کورٹ (جس کو ہائی کورٹ کا درجہ ۱۹۱۹ء میں ملا) میں وکالت کرنا شروع کی۔ کنور نرائن نے پہلے تو ضلع فیروز پور میں وکالت شروع کی اور پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کرتے رہے۔ اقبالؔ اور ان کے درمیان دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔

چاند نرائن چاندؔ کے والد (کنور نرائن رینہ) کے علاوہ اقبال اور چاندؔ کے دادا شیو نرائن

رینہ شمیم کے تعلقات بھی بڑے استوار تھے۔ دونوں مخزن لاہور میں لکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے متعارف بھی تھے۔ دونوں وکیل تھے اور ۱۹۰۸ء سے چیف کورٹ لاہور میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ دونوں عالم اور علم دوست ایک دوسرے سے نہایت احترام سے پیش آتے تھے اور دونوں بزرگوں کی دوستی تمام عمر قائم رہی۔ شمیم اقبال کے دوستوں (شیخ عبدالقادر، سردار جوگیندر سنگھ، سردار امراؤ سنگھ شیرگل، راجہ چرن سنگھ اور نواب ذوالفقار علی خان) کے بھی قریبی دوست تھے اور آپس میں خط وکتابت بھی تھی۔ شمیم کی ایک نادر و نایاب کتاب ''سفرنامہ شمیم'' مطبوعہ ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۱۸۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ان کی نظموں پر بھی اصلاح دیتے تھے۔ شمیم کا یہ جملہ قابل توجہ ہے:-

''میں گاہے گاہے نظم کی اصلاح ان (اقبالؔ) سے لیا کرتا ہوں۔''

چاندؔ اس طرح خاندانی طور پر اقبالؔ کے شاگردوں میں تھے۔ یعنی ان کے والد کنور نرائن (اقبالؔ کے لاہور کالج کے شاگرد) اور دادا شیونرائن شمیمؔ شاعری کے شاگرد۔ چاند اپنے اقبال کے تلمذ کے بارے میں ''کاروانِ سخن'' میں لکھتے ہیں:-

''میرے دل میں جو جذبات خوابیدہ تھے ان کو شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے مجموعہ کلام نے بیدار کیا۔ تقریباً تیس سال ہوئے ہیں اس ہمہ گیر شخصیت کی خدمت میں ایک نوخیز شاعر کی حیثیت سے پیش ہوا۔ مجھے ان تک پہنچنے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ میرے دادا پنڈت شیونرائن شمیمؔ اور میرے والد ان کے ہمعصر اور دوست تھے۔ علامہ نے میری غزلیات پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ چند اشعار کی اصلاح بھی کی۔ کجا ایک بلند پایہ کہنہ مشق شہرۂ آفاق شاعر اور کجا ایک طالب علم عروض وقواعد شاعری سے بے بہرہ۔ بایں ہمہ بعد اصلاح کلام فرمایا کہ:-

''شاعرانہ طبیعت استاد سے بے نیاز ہوتی ہے۔ سب سے بڑا استاد تجربہ ہے۔''

اور ساتھ ہی کلام کو جاری رکھنے کی تلقین کی۔

ان کی وفات سے ڈیڑھ ماہ پیشتر جب وہ علیل تھے میں مزاج پرسی کو گیا۔ باوجود علالت وہ مجھ سے اسی تپاک سے ملے۔ جو ان کی ذات کا خاصا تھا۔ مجھے تازہ کلام سنانے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں نے چند ایک شعر میں اپنی عقیدت اور علامہ کے اثر کا اس صورت میں اعتراف کیا۔

ساغرِ دل میرا جذبوں سے ترے لبریز ہے
جس میں مے تیری چھلکتی ہے میں وہ پیمانہ ہوں

جناب چاند کے تلمیذ اقبال کی تائید ڈاکٹر سر تیج بہادر سے بھی ہوتی ہے۔ اقبال نمبر اردو سہ ماہی مطبوعہ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے پیغام یا مضمون کے لئے جب ڈاکٹر عبدالحق ایڈیٹر اردو نے سپرو صاحب کو خط لکھا تو موصوف نے اور باتوں کے علاوہ اپنے پیغام میں یہ بھی لکھا تھا کہ:-

''جب میں تین ہفتے کے قریب ہوتے ہیں کہ حیدر آباد میں خدمت عالی میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت میں نے بر سبیل تذکرہ اقبال مرحوم کی صناعی کی تعریف کی تھی اور تمثیلاً یہ عرض کیا تھا کہ پچھلی فروری میں جب لاہور میں تھا اور ان سے ملنے کو گیا تھا میرے ساتھ میرے داماد پنڈت چاند نرائن رینہ جو پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور جن کو اقبال سے تلمذ کا فخر حاصل ہے گئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ ہوا چند اشعار اقبال صاحب کے متعلق لکھے اور مجھکو سنائے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے استاد کی موجودگی میں ان اشعار کو پڑھیں۔ چنانچہ انہوں نے مرحوم کو وہ اشعار سنائے اور انہوں نے بہت تعریف کی۔ لیکن ایک مصرعے میں کچھ اصلاح دی۔ چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ پنڈت چاند نرائن نے حسب ذیل لکھا تھا۔

ع - تیرے جذبوں نے دیا ہے میری فطرت کو فروغ

اقبال نے فوراً مصرعہ میں حسب ذیل اصلاح کی۔

ع - تیرے جذبوں نے کیا ہے میری فطرت کو بلند

میں نے عزیز موصوف کو لکھ کر وہ اشعار منگائے ہیں اور میں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔

انہوں نے چوتھے مصرعہ کو اب یوں تبدیل کر لیا ہے۔

ع - ساغر دل میرا جذبوں سے ترے لبریز ہے

مجھے آپ کے اقبال نمبر کا بڑا انتظار ہے.....................''

چاند کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ اقبال کے شاگرد ہونے کی سعادت نے ان کے خیالات میں چار چاند لگا دئے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی شاعری میں انقلابی اور اصلاحی رنگ بھی نکھر گیا اور پامال راستے سے گریز کر کے انہوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔ تاریخی صداقت، حقائق اور حکیمانہ شعور بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ ان کی منظومات سے ملتے جلتے عنوانات ملتے ہیں۔ مثلاً انقلاب، اجل، ابلیس، تخیل، نشاط غم، مرد فردا وغیرہ

چاند نے علامہ اقبال سے جو فیض حاصل کیا اس کا اعتراف انہوں نے واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔ انہیں واقعی شاگرد اقبال ہونے پر بڑا فخر و امتیاز حاصل تھا۔ استاد کے حضور ''اقبال''

کے عنوان سے ذیل کی نظمیں درج کی جاتی ہیں۔ پہلی نظم اردو سہ ماہی اقبال نمبر بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء (صفحہ ۴۸۷) میں شائع ہوئی تھی۔

(۱)

میں بھی اے اقبالؔ تیری شمع کا پروانہ ہوں ‏ ‏ تو سراپا سوز ہے میں سوز کا دیوانہ ہوں
تو نے بخشا ہے مری ظلمت فگن فطرت کا نور ‏ ‏ تو حقیقت کی ضیا باطل کا میں کاشانہ ہوں
میری کشت طبع ہے ممنون تیرے فیض کی ‏ ‏ گلستاں تو نے کیا جس کو میں وہ ویرانہ ہوں
ساغر دل میرا جذبوں سے ترے لبریز ہے ‏ ‏ جس سے مے تیری چھلکتی ہے میں وہ پیمانہ ہوں
گیسوئے تخیل ہے میرا ابھی بکھرا ہوا ‏ ‏ تو ہے شانہ اور میں منت پذیر شانہ ہوں

دل مگر اقبالؔ ہے گنجینۂ قاروں ترا
تو ہے لیلی سخن ہندوستاں مجنوں ترا

(۲)

ہے تلاش درد میں جو مبتلا، وہ درد ہوں ‏ ‏ آرزوئے ربط ملت ہے جسے وہ فرد ہوں
ہم نشیں ہے درد کا میرے مداوا کیف درد ‏ ‏ فکر درماں سے سوا ہوتا ہے جو وہ درد ہوں
گلستانِ آرزو سرسبز ہو کیوں کر مرا ‏ ‏ رشک صد بادِ خزاں جو ہو وہ آہ سرد ہوں

راہ وہی ہے چاند میری اور ہے منزل وہی
کارواں اقبالؔ کا ہے، میں کارواں کی گرد ہوں

(۳)

نے ترا مضراب ہے باقی، نہ تیرا ساز ہے ‏ ‏ گونجتی اب تک فضائے دہر میں آواز ہے
بعد تیرے آج بھی لٹتا ہے میخانہ ترا ‏ ‏ تو نہیں باقی مگر رقصاں ہے پیمانہ ترا
سیکڑوں دل ہیں ترے سوزِ سخن کے خوشہ چیں ‏ ‏ سیکڑوں دل ہیں کہ تو نے جن میں پھونکا ہے یقیں
حسن فطرت کو دوبالا کر گیا تیرا ہنر ‏ ‏ شق کرے گا قلب گیتی حشر تک تیرا اثر
گلستانِ شاعری کا وہ گل رعنا تھا تو ‏ ‏ ہے معطر جس کی بو سے یہ جہانِ کاخ وکو
شاعری کی مزرعۂ زرخیز کا حاصل ہے تو ‏ ‏ شاعرانِ نکتہ آرا کی نئی منزل ہے تو

تو نے بندوں کو دیا اقبالؔ پیغام خودی
زندگی کو بھی سکھائی تو نے رمز زندگی

(۴)

پیام زندگی تیرا، پیام جاودانی ہے
ہے محشر جس سے سکتہ میں، تری محشر بیانی ہے

زمین و آسماں محکوم ہیں تیرے تصور کے
میسر جو نہیں دریا کو وہ تیری روانی ہے

تیرے جذبات شمشیریں، سپر عقل رسا تیری
تجھے حاصل مصاف شاعری میں کامرانی ہے

گیا محفل سے اور محفل کو سونا کر دیا تو نے
مگر وردِ زبان انجمن تیری کہانی ہے

کچھ ایسے جانفزا نغمے سنا کر ہو گیا رخصت
کہ جن نغموں سے پیدا سوز و ساز جاودانی ہے

خودی کے فیض سے تو نے مکان لامکاں دیکھا
شناسائی رموز حق، کلیم طور ثانی ہے

ترے فکر فلک رس کو ہے اقلیم خودی حاصل
یہی وہ مملکت ہے جس پہ تیری حکمرانی ہے

کیا ہے سوز نو پیدا ترے ساز تخیل نے
نئی دنیا گھڑی ہے تیرے اعجاز تخیل نے

درج ذیل غزلیں بھی چاندؔ نے علامہ اقبال سے متاثر ہو کر لکھی تھیں۔ یہ غزلیں ''بہار گلشن کشمیر'' جلد اول مرتبہ پنڈت برجکشن کول بیخبر و پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق کشمیری مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۱۹۳۱ء میں موجود ہیں۔ ''چاند سوز و ساز کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آپ نے ایک دردمند طبیعت پائی۔ اور آپ کے کلام کی سادگی و سلاست اور جذبات قابل داد ہیں۔'' (شوق)

(۱)

مرے دل کا کبھی پورا کوئی ارماں نہ ہوا
مجھ پہ اے خوبی قسمت ترا احساں نہ ہوا

لذت درد محبت کا کہوں کیا عالم
یہ تو اچھا ہوا اس درد کا درماں نہ ہوا

قطرۂ بارش رحمت کو ترستا ہی رہا
میں وہ غنچہ ہوں کہ اب تک گل خنداں نہ ہوا

کشتی دل ہے عبث خوف تلاطم مجھ کو
بحر الفت ہی وہ کیا جس میں کہ طوفاں نہ ہوا

شوق پرواز ہی کو چاندؔ بھلایا دل سے
میں وہ قیدی ہوں جو منت کش زنداں نہ ہوا

(۲)

لذت اندوہ کا شیدا مرا دل ہو گیا
یعنی میں دنیا میں اب جینے کے قابل ہو گیا

کیا کہوں لذت جو بحر عشق کی موجوں میں ہے
رو دیا میں گر کبھی دیدار ساحل ہو گیا

لے چلا واپس مجھے منزل کا شوق انتظار — سعیِ پیہم سے اگر میں قربِ منزل ہو گیا
کیا کوئی کشتی نہیں باقی رہی طوفانِ موج — تو جو یوں آسودۂ دامانِ ساحل ہو گیا

راز الفت سے شناسا چاند مجھ کو کر دیا
دل مرا منت کشِ بزمِ عنادل ہو گیا

(۳)

میں ذرہ ہوں تجھ سے ملا چاہتا ہوں — الٰہی میں کیا ہوں، یہ کیا چاہتا ہوں
ہے دشتِ جنوں میرا پھر محوِ وحشت — میں دامن کو اپنے سیا چاہتا ہوں
نہیں ذوقِ ساحل مجھے بحرِ الفت — میں موجوں میں تیری رہا چاہتا ہوں
عجب سادگی ہے جو خود ہے مداوا — اسی درد کی میں دوا چاہتا ہوں
ترے فیض بخشی سے اے ابرِ رحمت — میں قطرہ سے دریا ہوا چاہتا ہوں
میں خوابیدہ موجوں کو دریائے الفت — پیامِ تلاطم دیا چاہتا ہوں

کرے چاند جو نارسائی کو رسوا
تمنا وہ پیدا کیا چاہتا ہوں

(۴)

منزلِ حق سے وہ باطل ہوں کہ کوسوں دور ہوں — ہوں تو میں ظلمت مگر محوِ تلاشِ نور ہوں
مانعِ دید آنکھ ہے اور دل کو سودا دید کا — تو کسی صورت سے آجا دل میں میں مجبور ہوں
بیخودی! ہمدم مری منت کشِ مینا نہیں — مست رکھتی ہے جسے الفت میں وہ مخمور ہوں
جلوہ فرما دل میں تو محرومِ تابِ دید میں — میں تجلی بھی ہوں موسیٰ بھی ہوں کوہِ طور ہوں

کیوں نہ روؤں ہم نشیں میں اپنی قیدِ زیست پر
چاند ہوں، محفلِ انجم سے کتنا دور ہوں

(۵)

برق میں بھی یہ اسی شوخ کا انداز نہ ہو — یہ کہیں محوِ تبسم وہ فسوں ساز نہ ہو
داستانِ دل پر درد نہ چھیڑے ظالم — ''اس طرح توڑ مرے دل کو کہ آواز نہ ہو''
زخمۂ دل کو نہیں تارِ نفس سے الفت — بے صدا کس طرح ہستی کا مری ساز نہ ہو
دل میں ہے آرزوئے موج مٹا کر دیکھوں — شوق پرواز کہیں مانعِ پرواز نہ ہو

کس طرح ان پہ کھلا راز دل مضطر چاند
بے نوائی ہی کہیں منکشف راز نہ ہو

میں قسمت مثال صبا چاہتا ہوں

مے بیخودی میں پیا چاہتا ہوں　　میں سوئے فلک اب اڑا چاہتا ہوں
خدا سے گزارش کیا چاہتا ہوں　　اے دل کی خواہش کیا چاہتا ہوں

میں قسمت مثال صبا چاہتا ہوں

صبا نے وہ جو بن کھلایا ہوا ہے　　تبسم سا ہر گل پہ آیا ہوا ہے
اور اس سیم تن کو رجھایا ہوا ہے　　ہر اک مرغ دل کو پھنسایا ہوا ہے

میں قسمت مثال صبا چاہتا ہوں

صبا ان کے گھر میں اڑی جا رہی ہے　　صبا اپنے انداز دکھلا رہی ہے
صبا ناز سے ان کو بہلا رہی ہے　　صبا کی ادا ان کو کیا بھا رہی ہے

میں قسمت مثال صبا چاہتا ہوں

نہ جانے صبا کیا سنانے لگی ہے　　ہنسی ان کے چہرے پہ آنے لگی ہے
وہ کس کس طرح سے رجھانے لگی ہے　　وہ کیوں اس قدر ان کو بھانے لگی ہے

میں قسمت مثال صبا چاہتا ہوں

نشاط و غم

نشاط

غم! بتا تو رہنے والا کون سی بستی کا ہے　　ہے کہاں تیرا نشیمن راز کیا ہستی کا ہے
میں تبسم بن کے انساں کے لبوں پر ہوں عیاں　　زندگی کے تیری لیکن اور ہی ہیں کچھ نشاں؟
مقصد ہستی جو ہے تیرا مجھے معلوم ہے؟　　راز کیا میری بھی ہستی کا تجھے معلوم ہے؟

قلب انساں کو تہ و بالا سدا رکھتا ہے تو
غم ہستی میں بتا پوشیدہ کیا رکھتا ہے تو

جواب غم

کوہ میں صحرا میں ہوں میں بحر میں طوفاں میں ہوں　　گل میں ہوں بلبل میں ہوں شبنم میں ہوں انساں میں ہوں

اوج میں پستی میں ہوں منزل میں ہوں غربت میں ہوں
آہ میں نالے میں ہوں شیون میں ہوں فرقت میں ہوں

بے خبر سنجیدگی سے تو، پہ سنجیدہ ہوں میں
واقف باد بہاری تو خزاں دیدہ ہوں میں

تیرا پرتو، میری ہستی کو فنا کرتا نہیں
پہلوئے انساں میں سو جاتا ہوں پر مرتا نہیں

وسعت دل سے اگر تھوڑا ابھی بڑھ جاتا ہوں میں
اشک بن کر چشم انساں سے نکل آتا ہوں میں

دل کو فردا کے لئے ہشیار کر دیتا ہوں میں
چشم انساں کو ذرا بیدار کر دیتا ہوں میں

سرمہ بن کر چشم انساں میں سما جاتا ہوں میں
عالم فانی کی اصلیت کو دکھلاتا ہوں میں

عارضی منظر دکھا کر دل کو خوش کرتا ہے تو
جو حقیقت آشنا باطل پہ کیوں مرتا ہے تو

حواشی

۱؎ شیونرائن شمیم- شمیم کے بزرگ کشمیر سے نکل کر پہلے ریاست جے پور میں آباد ہوئے۔ پھر آگرہ میں ۱۸۴۶ء کے قریب آپ کے دادا پنجاب آگئے۔ آپ کی پیدائش اکتوبر ۱۸۵۹ء میں بمقام لاہور ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم جامع مسجد شاہ پور میں ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان مشن اسکول جالندھر سے پاس کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں دو برس تک فرسٹ آرٹس میں پڑھا۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان پاس کرکے جالندھر میں پریکٹس شروع کر دی۔ وہیں سے اخبار ''شمیم ہند'' جاری کیا جو ڈیڑھ برس بعد لوگوں کی بدمذاقی کا شکار ہوگیا۔ باقی ساری عمر لاہور میں گذاری۔ سوشل معاملات میں خاصی دلچسپی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں کتاب ''کشمیری پنڈت'' لکھی جو اصلاح رسوم کے متعلق تھی۔ ''تحفۂ شمیم'' میں مختصر اصلاحی کہانیاں ہیں۔ بدھ اور اس کا مت (سوانح اور مذہبی تعلیم کے متعلق) چاند (ایک دلچسپ ناول) پلیڈنگ (قانونی) آپ کی چند تصانیف ہیں۔ آپ کے بلند پایہ مضامین مخزن لاہور، زمانہ کانپور میں میری نظر سے گذرے ہیں (نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم صفحہ ۹۴۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء) شمیم کا انتقال ۱۹۳۶ء میں لاہور میں ہوا۔

۲؎ ہندوستان کے مایہ ناز قانون داں ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو کشمیری الاصل تھے۔ وہ بجنور میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں الہ آباد جاکر ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی، جو اتنی چمکی کہ ۱۹۱۹ء میں وائسرائے نے انہیں اپنا مشیر قانون بنالیا۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ اقتدار ایک ہندوستانی کے لئے معراج سے کم نہ تھا۔ مگر اس عہدے پر وہ زیادہ دن تک نہ رہ سکے۔ بعض وجوہ کی بنا پر

ڈیڑھ سال کے بعد اسے ترک کر کے پھر الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ ان کی قانونی قابلیت مسلمہ تھی۔ انہوں نے بہت روپیہ کمایا مگر سب مہمان نوازی اور نیک کاموں پر صرف کر دیا۔ انہیں اردو سے بے پایاں محبت تھی۔ تاریخ ادب اردو، شاہکار انیسؔ وغیرہ کتابوں پر ان کے تبصرے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ''اردو، ہندی، ہندوستانی'' پر آزادانہ اظہار کیا جو اردو حلقوں میں پسندیدہ نظر سے دیکھا گیا۔ وہ نہایت شستہ اور پاکیزہ زبان بولتے تھے۔ شام کو روز مرہ ان کے یہاں شاعروں اور ادیبوں کا دربار لگتا تھا جس میں عموماً اردو الفاظ، محاورات اور شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان کی رائے اور سوجھ بوجھ ہمیشہ قابل احترام سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر سپرو سر محمد اقبال کے مداحوں میں تھے۔ ان سے کئی مرتبہ شرف ملاقات بھی حاصل ہو چکا تھا۔ ان کی بے وقت موت پر انہیں بڑا صدمہ ہوا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

''سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ دو بار پیشتر مرحوم سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ مرحوم دنیا کے عظیم الشان ترین شاعروں میں تھے۔ میں گذشتہ ۳۰ سال سے مرحوم کے شاعرانہ اور مفکرانہ کمالات کا معترف اور مداح ہوں۔ ہندوستان ایک بڑے شاعر اور یگانہ روزگار شخصیت سے محروم ہو گیا۔'' (نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم صفحہ ۹۴۲۔ یادگار اقبال مرتبہ سید محمد طفیل احمد بدر امروہوی۔ مطبوعہ آزاد بکڈپو لاہور ۱۹۴۵ء)

سر تیج بہادر سپرو کا انتقال ۲۱ر جنوری ۱۹۴۹ء کو ہوا اور اردو دنیا اس سچے عاشق سے محروم ہو گئی۔ سپرو نے ۱۹۰۴ء میں اردو کا ایک رسالہ ''کشمیر درپن'' بھی نکالا تھا۔ اس کے متعدد شمارے میرے مطالعہ میں رہ چکے ہیں۔ وہ اودھ پنچ لکھنؤ وغیرہ میں بھی لکھتے تھے۔ سپرو صاحب کی اردو دوستی کے بارے میں صفیؔ لکھنوی لکھتے ہیں۔

تری زباں کے جوہر شناس اے اردو
مسز سروجنی نائیڈو تھیں اور سر سپرو

یہ بات قابل فخر ہے کہ برٹش سرکار نے سر تیج بہادر سپرو کو پریوی کونسلر شپ کے اعزاز سے جنوری ۱۹۳۴ء میں ممتاز کیا تھا۔ اس سلسلے میں پنڈت رادھے کول (گلشن تخلص) کے زیر اہتمام الہ آباد میں سر سید سلیمان شاہ چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کی صدارت میں اردو کا ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ مشاعرے میں سر تیج بہادر سپرو رات بھر موجود رہے۔ اس کی تفصیلات کسی دوسرے وقت علیٰحدہ عنوان کے تحت بیان کی جائیں گی۔

؂ چاندؔ کی آخری غزل کے یہ شعر بھی قابل ذکر ہیں۔

سکوں کی توقع تھے جس سے وہ پیری
جوانی سے بڑھکر ستم ڈھا رہی ہے

کلی پھول بنتی ہے کیسے یہ جانا
کلی جب مرے دل کو مرجھا رہی ہے

۴ے کنور صاحب کے خط سے اس نظم کا سال تصنیف پہلی مرتبہ معلوم ہو سکا ہے۔ یعنی یہ ۱۹۰۷ء میں تصنیف کی گئی تھی۔ جبکہ یہ پہلی بار مخزن لاہور جلد ۱۷ نمبر ۵ صفحہ ۶۵ بابت اگست ۱۹۰۹ء میں ''دو ستارے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ بانگ درا حصہ سوم میں ''۱۹۰۸ء سے''.....دکھائی گئی ہے۔

۵ے بانگ درا میں ۶ شعر ہیں اور اس شعر کا اضافہ کیا گیا۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

۶ے یہ غزل اقبال نے کیمبرج سے مخزن کو بھیجی تھی اور یہ ''غزل'' کے عنوان سے مخزن جلد ۱۲ نمبر ۶ صفحہ ۷۱-۷۲ میں بابت مارچ ۱۹۰۷ء میں ۱۸ شعر میں پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ ''بانگ درا'' میں یہ ''مارچ ۱۹۰۷ء'' کے عنوان سے ۱۷ شعر میں شائع ہوئی۔ مخزن میں دسواں شعر زیادہ ہے۔

جنھوں نے میری زبان گویا کو محشرستاں صدا کا جانا
مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوت مزار ہوگا

کنور صاحب کے خط سے ذیل کے شعر کی مزید دریافت ہوئی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ غزل ۱۹ شعر پر مشتمل تھی اور یہ شعر اقبال کی کسی کتاب یا باقیات میں موجود نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ درج کیا جاتا ہے۔

ملے گا کیا تجھکو اے ستمگر ہمارے دل کا نظارہ کر کے
کہیں خلش ہوگی آرزو کی، کہیں تمنا کا خار ہوگا

۶ے کاروان سخن مطبوعہ ۱۹۵۲ء و عرفان سخن ۱۹۸۰ء

۷ے شیرازہ سری نگر جلد ۲۴ شمارہ ۴، ۵ بابت ۱۹۹۵ء

اقبال اور یادگار دربار ۱۹۱۱ء

""فلسفی، شاعر، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے، پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لاء لاہور""

جارج پنجم کے جشن تاجپوشی ۱۹۱۱ء کی تقریبات پر اردو شعراء نے قصیدے اور تہنیتی نظمیں لکھی تھیں۔ جو لوگ اس یادگار جشن میں دہلی دربار میں موجود تھے ان کے حالات زندگی دین محمد ایڈیٹر میونسپل گزٹ لاہور و مالک ""یادگار آفس"" نے ۱۹۱۶ء میں مرتب کر کے شائع کئے۔ کتاب کا نام ""یادگار دربار ۱۹۱۱ء حصہ دوم"" ہے۔ اس کی ضخامت ۸×۲۲ کے ۸۲۸ صفحات میں ہے۔ فی صفحہ میں سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ متعدد صفحوں میں ۳۲ سطریں ہیں۔ ص ۸۲۶ میں میر کرامت اللہ امرتسری تخلص میر نے ۱۵ شعروں میں تاریخ طبع کہی ہے۔

مرتب نے اس سے پہلے یادگار امپرس وکٹوریہ، یادگار سعدی اور یادگار جشن تاج امپریر ایڈورڈ کی کتابیں شائع کی تھیں۔ زیر نظر کتاب یادگار دربار جشن تاجپوشی جارج پانجم لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں محفوظ ہے۔ تاریخی اور ادبی اعتبار سے کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں زمانے کے راجاؤں، مہاراجوں، نوابوں، مشہور رئیسوں، امیروں، ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ تذکروں کے ساتھ ان لوگوں کی تصویریں بھی ہیں۔ ابتدا میں فہرست کے ۹ صفحے غائب ہیں اور آغاز بقیہ فہرست سے ہوتا ہے۔ ہر صفحے کے اوپر دائیں طرف کتاب کا نام موجود ہے۔ اس میں اقبال کا تذکرہ ص ۵۰۷ اور ۵۰۸ میں درج ہے۔ چونکہ یہ اقبال کی زندگی میں ۱۹۱۱ء میں مرتب کیا گیا تھا اس لئے اس میں اقبال کے بارے میں بعض نئی باتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اقبال نے پہلے مکتب میں رواج کے مطابق تعلیم پائی تھی۔ پھر اسکول میں داخلہ لیا اس سے ان کی تاریخ ولادت کے تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ موصوف ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے جو مرثیہ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر لکھا تھا وہ سرکاری خرچ سے شائع ہوا تھا۔ دربار تاجپوشی

۱۹۱۱ء کے موقعہ پر گورنر پنجاب نے جو شاہی میلہ قائم کیا تھا اس کے تحت بادشاہ کے حکم سے ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اقبال اس کے صدر تھے۔ اقبال نے ہی شاہی مشاعرے کی نظموں کا انتخاب کیا تھا اور موصوف نے برجموہن کیفی کی نظم کو بہترین قرار دیا تھا۔ اس بارے میں مرتب کتاب دین محمد صاحب کتاب کے صفحہ ۲۱۶ میں لکھتے ہیں کہ:-

''چونکہ ہم نے یادگار دربار ۱۹۰۳ء میں ہندوستان میں حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر جو قصائد جمع کئے تھے ان میں سے ایک قصیدہ جناب خاں صاحب چودھری خوشی محمد صاحب بی-اے ناظر گورنر کشمیر کی تصنیف سے درج کیا تھا جو ہماری نظر میں تمام قصائد سے افضل تھا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اب کے بھی کوئی اعلیٰ درجے کا قصیدہ درج کیا جائے۔ اس دفعہ ہمیں قصائد کے انتخاب کی زحمت خود گوارا نہیں کرنی پڑی بلکہ ہز آنر لوئی ڈین بہادر بالقابہ لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بمنظوری حضور ملک معظم دہلی میں دربار تاجپوشی کے موقعہ پر جو مشہور بادشاہی میلہ قرار دیا تھا اس کی کارکن کمیٹی نے ہمارے علم دوست ہز آنر کے ایما سے ہندوستان بھر کے شعرا کو اس مبارک موقعہ پر نظمیں لکھنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ اردو شعراء نے تمام ہندوستان سے قصائد و نظمیں بھیجیں۔ ان تمام نظموں اور قصائد میں سے ہمارے حضرت کیفی کا قصیدہ بہترین ثابت ہو کر اول قرار دیا گیا تھا۔''

ہم نے مناسب سمجھا کہ یادگار دربار ۱۹۱۱ء میں اقبال کا جو تذکرہ دیا گیا ہے اسے من و عن ذیل میں پیش کیا جائے تاکہ اقبال کے سوانح نگاروں کو اقبال کے حالات زندگی لکھنے میں اس سے کچھ مدد مل سکے۔ اقبال پر ہماری نظر سے جتنی گذری ہیں ان میں ان باتوں کا فقدان ہے جن کا اظہار زیر نظر کتاب میں کیا گیا ہے۔ حواشی مستند کتابوں سے مرتب کئے گئے ہیں۔ (اکبر حیدری)

ڈاکٹر صاحب ممدوح کشمیری پنڈتوں کے ایک پرانے خاندان سپرو[1] سے تعلق رکھتے ہیں جن کے خاندان کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ کوئی دو سو سال ہوتے ہیں کہ آپ کے آبا و اجداد بوجہ حسن عقیدت مسلمان ہو گئے اور پھر سیالکوٹ آکر اقامت گزین ہوئے۔ ولادت ۱۸۷۵ء[2]

تعلیمی امتیاز- چنانچہ حسب دستور پہلے مکاتب میں تعلیم پائی۔ پھر مدرسہ میں داخل ہو کر اپنی خاص ذہانت سے پرائمری سے لیکر انٹرنس تک ہمیشہ وظیفہ لے کر کامیاب ہوتے رہے۔ انٹرنس کرنے کے بعد جب آپ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ کی ایف-اے کلاس میں داخل ہوئے تو سید میر حسن جیسے عالم متبحر کی استادانہ شفقت، فیض و تربیت سے آپ کے جوہر طبعی نے نشو و نما پائی۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں

بی-اے کلاس میں داخل ہو کر اپنی فلسفیانہ طبیعت کے مطابق فلسفہ کا ہی مضمون لیا جس میں نہ صرف انگریزی وعربی میں کامیاب ہوئے بلکہ وظیفہ کے ساتھ دو طلائی تمغے بھی حاصل کئے۔ چنانچہ مسٹر آرنلڈ[۴] جیسے وظیفہ دان جب علی گڈھ سے گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت پروفیسر تشریف لائے تو وہ بھی ان کی فلسفہ دانی کے قائل ہو گئے۔ مسٹر آرنلڈ کی آپ کی نسبت یہ رائے تھی کہ

''اقبال جیسا فلسفی شاگرد اپنے استاد تک کو محقق بنا سکتا ہے''

چنانچہ آپ مسٹر آرنلڈ کے حلقۂ شاگردی سے نکل کر حصۂ دوستی میں آ گئے۔ پھر تا ایم-اے کے امتحان میں بھی اول رہ کر تمغہ حاصل کیا۔

شاعری- ابتدائے زمانۂ تعلیم میں تو آپ کی طبیعت میں شاعری کا کوئی جوہر نہیں کھلا مگر گورنمنٹ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں پہلے پہل آپ کی ایک نظم ہمالہ[۴] کے نام سے شہری مشاعرہ میں سنی گئی۔ جو نہایت اعلیٰ پائے کی تھی۔ چنانچہ اسی وقت بعض دوربین نگاہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اقبال ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہوگا۔ مولانا شبلی کی رائے تھی کہ اقبال حالیؔ و شبلیؔ کی قائم مقامی کرے گا۔ چنانچہ آپ حضرت داغؔ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ مگر آپ کے کلام میں درد، سوز و گداز، واقعیت اور صوفیانہ مذاق کے علاوہ زیادہ تر حضرت غالب[۵] مرحوم کا رنگ ہوتا ہے۔ قومی جلسوں میں آپ نے سب سے پہلے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر ''نالۂ یتیم[۶]'' نام ایک نظم پڑھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس پر انجمن کو روپیہ کا مینہ برسنے لگا۔ تب سے انجمن کے سالانہ جلسے کا آپ کی نظم ایک جزو غالب ہے۔ چنانچہ انجمن کے سب اجلاسوں میں سے آپ کی نظم پر بے حد ہجوم ہوتا ہے۔ اس وقت تک آپ کی مشہور نظموں میں چند کے نام درج ذیل ہیں۔

نالۂ یتیم، ہندوستاں[۷] ہمارا، نیا شوالہ[۸]، شکوہ[۹]، جواب شکوہ[۱۰]، شمع و[۱۱] شاعر وغیرہ۔ چنانچہ قومی ترانہ یعنی ''ہندوستاں ہمارا'' تو ہر مسلمان بچے کے نوک زبان ہے۔ آپ کی بہت سی نظمیں سرکاری کورسوں میں بھی داخل ہیں۔ ملکۂ معظمہ کے انتقال پر آپ نے جو نظم[۱۲] لکھی وہ سرکاری خرچ سے شائع ہوئی۔

پروفیسری- ایم-اے پاس کرنے کے بعد آپ اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ و سیاست مدن کے لکچرر مقرر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ و انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے اور اکثر طلباء کو مکان پر بھی تعلیم دیتے رہے۔ چنانچہ بحیثیت طالب علم آپ نہایت ذہین طالب علم اور بحیثیت معلم ایک شفیق اور بے تکلف دوست ثابت ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ نے سیاست مدن پر ''علم الاقتصاد[۱۳]'' نام ایک کتاب تصنیف فرمائی جو اپنے فن کی ایک بیش قیمت تصنیف ہے۔

مزید علمی تحقیقات کے لئے سفر یورپ - چونکہ آپ کی طبیعت میں ابتدا سے علمی ذوق وشوق تھا۔ اس لئے فلسفہ، قانون اور تحقیقات علم کے لئے سفر ولایت اختیار کیا۔ جہاں خاصی ناموری حاصل کی۔ چنانچہ کیمبرج نے آپ کو تحقیقات علمی و فلسفۂ اخلاق کے لئے ایک اعزازی ڈگری دی۔ پھر جرمن کی میونک یونیورسٹی نے بھی آپ کو "فلسفۂ ایران" کی انگریزی تصنیف پر جو یورپ میں بے حد مقبول ہوئی پی ایچ - ڈی کی ڈگری دی۔ جرمن سے واپسی پر آپ نے لندن کے اسکول آف پولیٹکل سائنس میں داخل ہو کر بڑے بڑے علماء سے استفادہ کیا اور بیرسٹری بھی پاس کر لی۔ چونکہ بفضل تعالیٰ آپ کو تحریر وتقریر میں یکساں ملکہ حاصل ہے اس لئے آپ نے قیام ولایت میں اسلام پر کئی لکچر دئے جو بے حد پسند کئے گئے۔ پھر تین ماہ تک مسٹر آرنلڈ کی قائم مقامی میں لندن یونیورسٹی کی عربک پروفیسری بھی کی۔ غرض کہ ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں بے شمار علمی اعزاز عربی، فارسی، سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں بھی حاصل کرنے کے بعد لاہور تشریف لائے[۱۵] جہاں بلحاظ مذہب وملت ان کے شیدائیوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔[۱۶]

اب آپ لاہور میں بیرسٹری کرتے ہیں اور اپنے علمی مذاق کی وجہ سے ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔ باوجود نئی روشنی کے آپ کو اہل اللہ سے خاص عقیدت ہے۔ اور آج کل مذہب کی تحقیقات میں مصروف ہیں۔ بالعموم شاعر، رؤساء کی ملاقات پر فخر کرتے ہیں لیکن ہندوستان کے امراء کو اقبال ایسے ممتاز شاعر کی ملاقات پر فخر ہے۔

دربار تاجپوشی ۱۹۱۱ء کے موقعہ پر ہز آنر سر لوئی ڈین بہادر نے جو شاہی میلہ قائم کیا تھا اس میں ایک مشاعرہ بھی تاجپوشی کی نظموں کا انتخاب کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کو اس مجلس مشاعرہ کا سرکاری طور پر پرزیڈنٹ بنایا گیا۔ اور آپ نے سب نظموں میں سے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی نظم کو اول قرار دیا جو اس کتاب میں کسی دوسری جگہ پر درج کی گئی ہے.........."

حواشی

۱ سب سے پہلے اقبالؔ کو کشمیری پنڈت خاندان سپرو سے وابستہ کرنے کے ذمہ دار محمد الدین فوق (متوفی ۱۹۴۵ء) ہیں۔ وہ کشمیر کی تاریخ نویسی میں دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی کتابوں میں غلط واقعات بیان کرنے کے عادی تھے۔ موصوف اقبال، شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن لاہور اور سر تیج بہادر سپرو کے دوستوں میں تھے۔

انہی کے ایما پر غالباً شیخ عبدالقادر نے اقبال پر سب سے پہلا مضمون لکھنؤ کے اردو رسالہ ''خدنگ نظر'' مئی ۱۹۰۲ء میں اقبال کے فوٹو کے ساتھ شائع کیا۔ شیخ صاحب نے مضمون میں اقبال کو کشمیری پنڈت سپرو خاندان کے افراد میں قرار دیا۔ ''خدنگ نظر'' کے ایڈیٹر مشہور و معروف صحافی، ادیب اور شاعر نوبت رائے نظر (متوفی ۱۹۲۳ء) تھے۔ اس کے بعد فوق صاحب نے اقبال پر خود ایک مضمون اپنے رسالہ ''کشمیری میگزین'' لاہور بابت اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ اس میں انہوں نے شیخ صاحب کی تائید میں اقبال کو کشمیری برہمن سپرو خاندان سے وابستہ کیا۔ پھر فوق نے مشاہیر کشمیر، نیرنگ خیال لاہور اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء اور تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے اقبال کو سپرو اور پنڈت تیج بہادر سپرو کو خوش کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کی۔ فوق کی ان غلط باتوں کو بعد میں نام نہاد ''ماہرین اقبالیات'' نے حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ پروفیسر آل احمد سرور اور جگن ناتھ آزاد اس کاروان دروغ گوئی کے ہراول دستوں میں ہیں۔ یہ لوگ ثبوت میں اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا عکس بھی پیش کرتے ہیں جس میں اقبال نے اپنے کو قوم کشمیری پنڈت خاندان سپرو لکھا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ اقبال لولی حاجی کی اولادوں میں تھے جو برہمن خاندان سپرو کو چھوڑ کر دو سو سال پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی کتاب میں یہ نہیں لکھا گیا ہے کہ لولی حاجی کشمیری برہمن سپرو تھے۔ ہمارے پیش نظر کشمیری صوفیوں کا تذکرہ ہے اس کا نام ''نورنامہ'' ہے اور اس کے مولف بابا نصیب الدین غازی ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۴۶ مطابق ۱۶۳۷ میں لکھی گئی تھی اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے کئی نسخے شعبۂ تحقیق واشاعت حکومت جموں وکشمیر (اقبال لائبریری کشمیر یونیورسٹی) میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں لولی حاجی کے بارے میں تفصیل سے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ:۔

''لولی حاجی اپاہج اور بدصورت تھے۔ چلنے پھرنے اور کھڑے ہونے سے معذور تھے۔ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔''

اس کا عکس ہم مضمون کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ یہی واقعات ایک اور غیر مطبوعہ کتاب ''تذکرہ اولیائے کشمیر'' ورق ۵۹ الف مولفہ مولوی خیر الزمان (کتب خانہ آصفیہ مخطوطہ نمبر ۱۲۳۹) میں ملتے ہیں۔ جو لوگ ان قدیم شہادتوں کو خاندان اقبال کے سلسلے میں تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ لغو گوئی میں یقین رکھتے ہیں۔ کاش یہ لوگ ٹھنڈے دل اور ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر خاندان اقبال پر تحقیق کرنے کی زحمت فرماتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وادی کشمیر کے ضلع پلوامہ میں سپر کے نام ایک گاؤں پرانے زمانے میں تھا۔ وہاں لولی حاجی رہتے تھے اور ریونیو ریکارڈ میں ان کے نام دو گاؤں اب تک درج ہیں۔ اس دروغ گوئی کی کوئی انتہا

نہیں ہے ہے۔ لولی حاجی پندرھویں صدی میں تھے اور اس زمانے میں ریونیو ریکارڈ کہاں تھا۔ مزید تفصیلات کے لئے راقم کے مضامین ذیل کے پرچوں میں ملاحظہ ہو

(۱) آفتاب سری نگر ۱۹ر اپریل ۱۹۸۰ء (۲) ہماری زبان ۱۵، ۲۲ر اگست ۱۹۸۰ء (۳) ہماری زبان ۸ر فروری ۱۹۸۸ء

۲۔ ماہرین اقبالیات نے اقبال کی تاریخ ولادت ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء قرار دی ہے۔ جو غلط اور بے بنیاد ہے راقم اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے نقوش لاہور اقبال نمبر ص ۲، ۳۱ میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اقبال ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس کی تائید ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے بھی ہوتی ہے۔ وہ نقوش لاہور کے محمد طفیل نمبر ص ۵۱۰ مطبوعہ ۱۹۸۷ء میں لکھتے ہیں کہ:۔

''اقبال کی ولادت پر برصغیر کے دو نامور محققوں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے مقالات زیادہ تر اہم ہیں۔ جن کے مطابق اقبال کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی...... تاریخ ولادت کے مسئلے پر یہ دونوں مضامین محاورے کی زبان میں پتھر کی لکیر ثابت ہوئے اور آج تک کسی سے ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ یہ بات نقوش کے لئے باعث افتخار و اعزاز ہے۔''

۳۔ آرنلڈ اسلامی دنیا میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا شمار علمائے تبحر میں ہوتا تھا۔ انہوں نے مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں اپنے کردار کی چھاپ ڈالی تھی۔ سرسید احمد خان ان کو بہت مانتے تھے، ان کی تحریروں سے مستفید ہوتے تھے اور ان کو اردو میں جامہ پہنانے کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ ''سرمور گزٹ'' نا ہن پنجاب سے نکلتا تھا۔ اس کے متعدد شمارے سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر منشی سراج الدین احمد تھے۔ اس میں آرنلڈ کا خوب چرچا ہوتا تھا۔ ۲۷ اپریل ۱۸۹۱ء (صفحہ ۱۰) میں سرسید احمد خان نے اشتہار دیا کہ آرنلڈ کے لکچر کا ترجمہ اردو میں شائع ہوا۔

اخبار وکیل امرتسر جلد ۹ نمبر ۷۳ ص ۷۰ مطبوعہ اگست ۱۹۰۳ء میں ذیل کی عبارت ملتی ہے:۔

''مسٹر آرنلڈ طلبائے مدرسۃ العلوم کو بورڈنگ سے نکال نکال کر شرکت نماز و جماعت کے لئے گھیراتے پھرا کرتے تھے۔ یعنی ان کو مسلمان بچوں کی نماز وغیرہ کی پابندی کا بڑا خیال رہتا تھا۔''

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے آرنلڈ کے لاہور سے لندن جانے کے موقعہ پر ایک طویل نظم ۵۶ شعر میں لکھی تھی جو ''مسٹر آرنلڈ کی رخصت ہندوستان سے'' کے عنوان سے علی گڈھ منتھلی جلد ۲ نمبر ۳ بابت مارچ ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

دوست اور پھر دوست بھی سچا عجب نعمت ہے یاں ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں

دوست اور بھائی ہیں دونوں قوت بازو مگر | جب کروگے وزن پلہ دوست کا ہوگا گراں
قصہ کوتہ ہم سے اب چھٹتا ہے پیارا آرنلڈ | فخر سے ہم جس کو کہتے تھے ہمارا آرنلڈ
آرنل کا مذہبی دنیا پہ جو احسان ہے | ہو نہیں سکتا ادا شکر اس کا قصہ مختصر
اب دعا یہ ہے کہ پردیسی مسافر خیر سے | برکتوں کے سایہ ہی سایہ میں سب جا پہنچیں گھر

آرنل مس آرنل مسٹر آرنل سب کے لئے
یہ سفر فتح و ظفر کا ہو وسیلہ سر بسر

اقبال نے غالباً حالی سے متاثر ہوکر ''نالہ فراق'' کے عنوان سے ۸ بندوں پر مشتمل ایک مسدس لکھا جو مخزن لاہور جلد ۷ نمبر ۲ صفحہ ۴۵ بابت مئی ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا۔ مسدس کے آغاز میں اقبال کا ایک نوٹ بھی درج ہے۔ اسے پروفیسر گیان چند جین صاحب نے بھی اپنی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال'' ص ۲۵۰ پچاس میں شائع کیا ہے۔ انہوں نے سرود رفتہ (غلام رسول مہر) اور رخت سفر (محمد انور حارث) کے حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس میں کچھ الفاظ کم اور کچھ کچھ بدل دیئے گئے ہیں۔ ہم اسے منسوخ شدہ تین بندوں کے ساتھ ذیل میں من و عن درج کرتے ہیں:-

''استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکینت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک روز زور تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لا کے کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے۔ جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں۔ اگر چہ ان کی رخصت کے موقع پر بہت سے الوداعی جلسے کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی۔ تاہم اس خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک درد آمیز اظہار تھا کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ آپ کی تشریف بری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہوگئی۔''

بند ۳ ہوگئی رخصت مسرت غم مرا ہمدم ہوا | دفتر صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا | دل مرا منت پذیر نالۂ پیہم ہوا

حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند

بند ۶ دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پرخوں مرا | صورت سیماب مضطر ہے دل محزوں مرا
درد فرقت سے ہے رنگیں نالۂ موزوں مرا | داغ حرماں ہے سراپا ہر گل مضموں مرا

آہ وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

بند۸ زندگی کا دامن انساں میں گویا خار ہے — آرزو کا دل کا سینے میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرے سے اُگتا خار ہے — خار فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے

زندگانی در جگر خار است و در پا سوزن است
تا نفس باقی است در پیراہن ما سوزن است

آرنلڈ کا انتقال ۹رجون ۱۹۳۰ء کو لندن میں ہوا۔ عبدالمجید سالک نے اس موقعہ پر انقلاب لاہور میں ایک مضمون بھی شائع کیا تھا۔

۴ ''مخزن'' لاہور شیخ عبدالقادر کی ادارت میں اپریل ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ اجراء ہوا تھا۔ اور پہلے ہی شمارے میں اقبال کی نظم ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شیخ عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس نظم کا ذکر پروفیسر جین صاحب نے بھی کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مخزن کے ابتدائی شمارے دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ اقبال نے بانگ درا میں اس کا نام ''ہمالہ'' رکھا۔ مخزن کے بعد ''کوہستان ہمالہ'' شیخ صاحب نے دوبارہ ''انتخاب مخزن'' جلد اول ص ۱۰۵ مطبع پرنٹنگ ورکس لاہور میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کی۔ وہ نوٹ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

''شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جو علوم مغربی و مشرقی دونوں میں صاحب کمال ہیں انگریزی خیالات کی شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعراء انگلستان ورڈس وتھ کے رنگ کو ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔''

ایڈیٹر مخزن کا یہ نوٹ اقبال کی شاعری کے لئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

۵ اقبال نے غالب سے متاثر ہو کر ان پر ایک نظم بھی لکھی تھی جو ''مرزا غالب'' کے عنوان سے مخزن لاہور بابت ستمبر ۱۹۰۱ء میں چھپی تھی۔ نظر ثانی کے وقت اقبال نے مخزن کا دوسرا بند خارج کیا اور اس کے بدلے ایک نیا بند لکھ دیا۔ پہلے اس نظم کے پانچ بند تھے۔ اب بانگ درا میں چھ بند ہیں۔ مخزن اور بانگ درا میں اس نظم میں بڑا اختلاف ہے۔ مخزن کے بعد یہ نظم ''ادیب'' الہ آباد بابت جولائی ۱۹۱۲ء ص ۴۸ میں دوبارہ چھپی تھی۔

۶ اقبال نے یہ معرکہ آرا نظم یعنی نالۂ یتیم انجمن حمایت اسلام لاہور میں ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۰۰ء کو پڑھی تھی۔ یہ انجمن کا پندرھواں سال تھا۔ انجمن کی داغ بیل ۱۸۸۵ء میں پڑھی تھی۔ اس کی کارروائیاں اخبار

چودھویں صدی راولپنڈی مطبوعہ ۱۸۹۵ء میں راقم کی نظر سے گذری ہیں۔ اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سراج احمد تھے۔ وہ ایک اور اخبار ''سرمور گزٹ ناہن'' کے بھی ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۹۳ء کے متعدد پرچے میری نظر سے سالار جنگ میوزیم میں گزرے ہیں۔ اقبال نے نالۂ یتیم مسدس میں ۳۵ بند میں لکھا تھا۔ معلوم نہیں کہ کن اسباب کی بنا پر انہوں نے بانگ درا میں اسے شامل کیوں نہیں کیا۔ نظم معرکے کی ہے۔ درد اور سوز اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جب یہ نظم انجمن کے اجلاس میں پڑھی گئی تو انجمن کے لئے کافی روپیہ جمع ہوا تھا۔

سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں کلام اقبال کا ایک ابتدائی مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ذیل کی نظمیں کتابی صورت میں الگ الگ چھپی ہیں اور یہ ایک ہی جلد میں مجلد ہیں۔ (۱) تصویر درد (۲) بلال (۳) فریاد امت (۴) اکبری اقبال (۵) طلوع اسلام (۶) نالۂ یتیم

نالۂ یتیم کے سرورق پر ذیل کی عبارت موجود ہے:-

''یعنی یہ وہ درد انگیز نظم جو ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے، پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لاء لاہور نے انجمن حمایت اسلام کے پندرھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی تھی۔ جسے مصنف موصوف کی اجازت سے شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے کریمی پریس لاہور میں باہتمام میرامیر بخش پرنٹر چھپوایا۔'' قیمت ۲ ر کل صفحات ۱۷

پروفیسر جین صاحب کی نظر سے یہ نسخہ نہیں گذرا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب ماہ و سال'' میں اگر اس کا حوالہ دیا ہوتا تو متن زیادہ اچھا اور متین ہوتا۔ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی تعریف یوں کی ہے۔

انجمن لاہور میں اک حامی اسلام ہے	آسماں پر جس کا پیان محبت نام ہے
جس کی ہر تدبیر تسکین دل ناکام ہے	جس کا نظارہ مراد چشم خاص و عام ہے

جمع ہیں عاشق مرے سب ہند اور پنجاب کے

تو وہاں جاکر مری امت کو یہ پیغام دے

ے ہندوستاں ہمارا- یہ اقبال کا قومی ترانہ ہے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں یہ الگ کتابچہ میں ص ۱۲ سے ص ۱۶ تک چھپا ہوا موجود ہے۔ اس کے پبلشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور تھے۔ سرورق پر ''مسلمانوں کا قومی گیت'' لکھا ہے۔ اقبال ۱۹۰۴ء کی گرمیوں میں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس کے پاس ایبٹ آباد گئے تھے۔ دوران قیام میں موصوف نے ۱۰ راگست ۱۹۰۴ء کو ایک خط کے ساتھ یہ نظم منشی دیا نرائن نگم کو ''زمانہ'' کانپور کی اشاعت کے لئے بھیجی

تھی (تفصیلات کے لئے راقم کا مضمون ''ہمارا دیس'' قومی آواز لکھنؤ مطبوعہ فروری ۱۹۸۸ء اور ''شاعر'' بمبئی کے اقبال نمبر ۴۶۵ میں ملاحظہ ہو۔ منشی صاحب نے اسے ''زمانہ'' بابت ستمبر ۱۹۰۴ء ص ۵۵ کے شمارہ میں ذیل کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا:۔

''ہندوستانی زبانوں میں اور خصوصاً اردو میں حب الوطنی اور جوش ملکی کے متعلق ایسی نظمیں شاذ و نادر ہی لکھی گئی ہوں گی جن میں اس ملک کے خصوصیات کے بیان کے ساتھ ساتھ انسان کے اعلیٰ ترین جذبۂ حب الوطنی کا لحاظ ہو۔ انگلستان میں ایسے گیت ہر خاص و عام کی زبان زد ہوتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کے دلوں پر ان کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ جنگ و جدل کے وقت اور امن و چین کے زمانے میں غرض ہمیشہ ان گیتوں کی بدولت ان کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت تازہ رہتی ہے۔ اور اس کی عظمت اور شان قائم رکھنے کا خیال جما رہتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مخدوم پروفیسر اقبال صاحب کی یہ نظم جو انہوں نے ہمارے پیارے دیس پر لکھی ہے ملک بھر میں ہر دلعزیز اور مفید ثابت نہ ہو۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹے بڑوں، خاص و عام ہر ایک کے مقبول ہونے کی مستحق ہے۔''

نظم کا تیسرا شعر ''زمانہ'' میں یوں چھپا تھا۔

پنجاب کیا دکن کیا بنگال بمبئی کیا　　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

حاشیے میں پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا گیا ہے۔ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' مقطع کے اس مصرعہ پر شرر لکھنوی نے ''دلگداز'' میں اعتراض کیا تھا

ع۔　معلوم ہے ہمیں کو درد نہاں ہمارا

اقبال نے اس اعتراض کو تسلیم کیا اور بعد میں مصرعہ یوں بدل دیا ''معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا'' زمانہ کے بعد یہ نظم ''مخزن'' جلد ۸ نمبر ا بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء ص ۴۹ میں اقبال کی نظر ثانی کے بعد ایڈیٹر کے ذیل کے نوٹ کے ساتھ چھپی تھی:۔

''جذبات دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہو بہو خیالات ظاہر کئے ہیں جو وطن سے دور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ میں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کئے ہیں۔''

یاد رہے کہ شیخ عبدالقادر نے ان خیالات کا اظہار لندن سے کیا تھا۔ موصوف اس زمانے میں وہاں بیرسٹری کر رہے تھے۔ مخزن میں ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ یہ پوری نظم صفحہ ۴۹ میں چھپی تھی۔ پروفیسر جین صاحب صفحہ ۵۵ کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مخزن کے صفحہ ۵۰ پر اس سے متعلق کوئی نوٹ رہا ہوگا۔

اقبال کی اس نظم کی تقلید میں بہت سے لوگوں نے طبع آزمائی کی تھی۔ مگر وہ بات کہاں جو اقبال کی نظم کا طرۂ امتیاز ہے۔ فرخ امرتسری نے ''زمانہ'' کانپور جلد ے نمبر ۵ صفحہ ۳۴۱ میں ''ہندوستاں ہمارا''

۸ شعر میں شائع کی تھی۔ چند شعر یہ ہیں۔

نام وطن ہے ہر دم ورد زباں ہمارا　　ہے نقش لوح دل پر ہندوستاں ہمارا
ہے گلشن جہاں میں ہندوستاں ہمارا　　یا رب رہے سلامت یہ آشیاں ہمارا
گزرے ہیں دن خزاں کے آمد بہار کی ہے　　رشک ارم بنے گا یہ گلستاں ہمارا

سید امجد علی اشہری (م-۱۹۱۰ء) کے اردو کے با کمال شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ وہ زمانہ، مخزن اور خدنگ نظر وغیرہ میں لکھتے تھے۔ اشہری نے ''مخزن'' بابت مارچ ۱۹۰۶ء، جلد ۱۰ نمبر ۶ (صفحہ ۵۸) میں ایک طویل نظم ''لوازم شاعری'' کے عنوان سے شائع کی۔ اس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

روش قبول جو اقبال نے یہاں کی ہے　　ہوئے ہیں ناطقہ پرداز جوں فصیح ظفر

حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ انہوں نے خواتین کا لغت بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ موصوف نے بھی اقبال کے تتبع میں ''ہندوستاں'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جو زمانہ کانپور جلد ۷ نمبر ۵ بابت نومبر ۱۹۰۶ء (صفحہ ۳۳۲) میں چھپی تھی۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

یہ ملک تھا جہاں میں افسانہ خواں ہمارا　　ہوتا نہ تھا بتاؤ چرچا کہاں ہمارا
کیا چیز ہے جہاں کی پیدا نہیں جو اس میں　　دنیا کا ہے خلاصہ ہندوستاں ہمارا
سونے کی کانیں اس میں قسمت جگا رہی ہیں　　لیکن سلا رہا ہے خواب گراں ہمارا

تاجور نجیب آبادی مشہور صحافی اور شاعر تھے۔ ان کی ادارت میں کئی معیاری رسالے شائع ہوتے تھے۔ جن میں ''شاہکار'' لاہور اور ''مخزن'' لاہور قابل ذکر ہیں۔ موصوف متعدد رسائل میں لکھتے بھی تھے۔ مخزن لاہور بابت دسمبر ۱۹۱۸ء (صفحہ ۵۶) میں ۸ شعر میں ان کی ایک نظم بعنوان ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' چھپی ہے۔ چونکہ نظم عمدہ اور اچھی ہے اور اقبال کے تتبع میں لکھی گئی ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

ہندوستان بھر کی قومی زبان ہم ہیں　　نیند آئے جس کو سن کر وہ داستان ہم ہیں
ہاتھوں میں ہے ہمارے ہندوستاں کی قسمت　　ہندوستان والو! ہندوستان ہم ہیں
بادل کی طرح ہر سو چھائے ہوئے ہیں اس پر　　بھارت کی سرزمیں پر اک آسمان ہم ہیں
ہم سے وطن کو عزت ہم ہیں تو ہے وطن بھی　　پیارے وطن کے جسم خاکی میں جان ہم ہیں
سارے جہاں کے جلوے سینوں میں ہیں ہمارے　　کیا دیکھتے ہو! ہم کو سارا جہان ہم ہیں
پیکر میں ہے ہمارے روح ٹگور و اکبر　　اس گلشن وطن کے اب باغبان ہم ہیں

لیں گے کبھی فلک سے جور فلک کے بدلے　　اک آسماں کے حق میں سات آسمان ہم ہیں

سرشار ہین وطن کی الفت مین تاجور بھی

حب وطن مین ان کے دل کی زبان ہم ہیں

۸۔ یہ نظم سب سے پہلے مخزن جلد ۹ نمبر ۶ صفحہ ۵۰ بابت مارچ ۱۹۰۵ء میں ۱۸ اشعر میں چھپی تھی۔ نظر ثانی کے بعد اقبال نے اس سے ۱۰ اشعر حذف کئے اور ایک شعر کا مزید اضافہ کیا۔ اب بانگ درا میں ۹ شعر ہیں نظم حب الوطنی کے جوش سے لبریز ہے۔ اس لئے منسوخ شدہ اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) کچھ فکر پھوٹ کر کے مالی ہے تو چمن کا　　بوٹوں کو پھوٹ ڈالا اس بس بھری ہوا میں

(۲) پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو　　اس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں

(۳) سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو　　اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مرادیں

(۴) زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو　　یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں

(۵) پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا　　ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں

(۶) آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اس سے پانی　　اس دیوتا کے آگے اک نہر سی لگا دیں

(۷) ہندوستاں لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے　　بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

(۸) مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو　　آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

(۹) اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو　　دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

(۱۰) ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا

رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

۹۔ شکوہ۔ ڈاکٹر اقبال کی یہ معرکہ آرا نظم ''شکوہ'' کے عنوان سے مسدس میں ۳۱ بند پر مشتمل ہے۔ یہ سب سے پہلے مخزن لاہور جلد ۲۲ نمبر ۳ صفحہ ۶۰ تا ۶۶ اور ''ادیب'' حیدرآباد صفحہ ۹ تا ۱۴ بابت جون ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ''ادیب'' حیدرآباد کے ایڈیٹر ظفر یار خان تھے۔ اس کے چند شمارے جناب محمد اکبرالدین صدیقی حیدرآبادی کے کتب خانے میں راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ مخزن میں نظم سے پہلے ایڈیٹر کا ذیل کا نوٹ بھی درج ہے۔ یہ نوٹ نایاب ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی یہ نظم بھی مثل اس قطعہ کے جو مخزن بابت مئی میں طبع ہوا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے خریدنے کے لئے لوگوں نے بڑھ بڑھ کر بولیاں دیں اور بالآخر انجمن کا مال قرار پائی اور کئی صاحبوں نے اسی وقت اس کی نقلیں اشاعت کے لئے لیں۔

یہ نظم گو انجمن کے جلسے کی رپورٹ کے ہمراہ شائع ہونے والی ہے اور پنجاب ریویو کی ایک تازہ اشاعت میں بھی چھپ گئی ہے۔ تاہم کلام اقبال کی خوبی اور نظم کی چستی متقاضی ہیں کہ باوجود اور جگہ شائع ہونے کے اسے ہدیہ ناظرین مخزن کیا جائے۔ خصوصاً اس لئے کہ ناظرین مخزن کی ایک کثیر تعداد ایسی ہوگی جسے اور رسالوں تک دسترس نہیں۔''

شکوہ کے بند نمبر ۶ کا دوسرا مصرعہ مخزن میں یوں چھپا ہے۔

ع۔ ''دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں''ادیب۔کیساؤں

مخزن، بند نمبر ۱۳ مصرعہ چہارم ''ترے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے'' بانگ درا۔سینوں

مخزن، بند ۲۵ مصرعہ اول ''پھر پتنگوں کو مذاق تپش اندوزی دے''

بانگ درا ''اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے''

ایڈیٹر مخزن نے اپنے نوٹ میں جس ''قطعہ'' کا ذکر کیا اور جو مئی میں طبع ہوا اس کے بارے میں اکثر لوگ بے خبر ہیں۔ اقبال کا یہ قطعہ مخزن جلد ۲۲ نمبر ۲ صفحہ ۵۷-۵۸ بابت مئی ۱۹۱۱ء میں ۱۶ شعر میں شائع ہوا تھا۔ ابتداء میں ایڈیٹر کا نوٹ ان الفاظ میں درج ہے:-

''ذیل میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم-اے پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لا، کا وہ قطعہ درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے لاہور کی انجمن کے سالانہ جلسہ میں پڑھا تھا اور جس پر انہیں بے حد داد ملی۔ اب یہ قطعہ انہوں نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اشاعت کے لئے ہمیں عنایت کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانے میں بوجوہات اس قدر کم ہو گئے ہیں کہ ان کا کلام جس مقدور میں بھی حاصل ہو مغتنم ہے۔''

نظر ثانی کے بعد اقبال نے اسے بانگ درا میں ۱۲ شعر میں بعنوان ''نصیحت'' بعض ترمیموں کے ساتھ شائع کیا۔ مخزن کا مطلع یوں ہے۔

کل ملا مجھ سے اقبال تو پوچھا میں نے عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز

بانگ درا میں پہلا مصرعہ یوں۔ ع۔ ''میں نے اقبال سے از راہ نصیحت یہ کہا''

مخزن کے زاید اشعار جو بانگ درا سے محذوف ہو گئے ہیں۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۴) کبھی ایراں کے لئے ہو جو دعا کا جلسہ عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

(۱۴) سن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

(۱۵) مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

(۱۶) ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

شکوہ اردو کے مشہور صاحب طرز نثر نگار خواجہ حسن نظامی ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی نے علامہ

سیماب اکبر آبادی کے مسدس ''فریاد'' کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ ''العصر'' لکھنؤ جلد ۲ نمبر ۱، ۲ بابت جولائی ۱۹۱۳ء صفحہ ۵۴ میں تبصرے کے طور پر ذیل کی عبارت درج ہے:-

''**شکوہ فریاد**- مندرجہ عنوان نام سے کارپردازان رسالہ نظام المشائخ نے ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم شکوہ کو مختصر تقطیع کی کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور اسی کے ساتھ حضرت سیماب صدیقی اکبر آبادی کا مسدس موسومہ ''فریاد'' بھی شامل کر دیا ہے۔ شکوہ حضرت اقبال کی مقبول عام و مشہور انام کلام میں نمایاں درجہ رکھتا ہے اور سے پیشتر وہ اخباروں اور رسالوں میں نکل چکا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہ ہوگا۔ البتہ حضرت سیماب کے نتائج وافکار تازہ چیز ہیں۔ شکوہ و فریاد کا مابہ الامتیاز ایک تو یہی ہے کہ ''شکوہ'' جہاں اس مصرعے کی تفسیر کا کام دیتا ہے۔

ع- ''شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھکو''

وہاں ''فریاد'' دربار رسالت میں کی گئی جس کا انداز اور لب ولہجہ کہہ رہا ہے کہ اس جوش سے مستفید ہو کر اظہار خیالات کیا گیا ہے جو ایک زمانے میں جنگ ترکی و اٹلی کے سب مسلمانوں میں عام ہو رہا تھا۔ مضامین کے اندر بھی اس لڑائی کا جابجا حوالہ دیا گیا ہے۔ دو ایک بند نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں

باش اے کشمکش غم کہ سنا جاتا ہوں ۔۔۔ میں تیری کاہش پیہم سے گھلا جاتا ہوں
تا در سید لولاک لما جاتا ہوں ۔۔۔ لے کے دربار رسالت میں گلا جاتا ہوں
شنوا بھی نہ سنے ناشنوا بھی نہ سنے
مری فریاد کے لفظوں کو خدا بھی نہ سنے

داد منظور نہیں قابل بے داد ہوں میں ۔۔۔ خوگر درد ہوں منت کش جلاد ہوں میں
دوسروں کے لئے دلگیر ہوں ناشاد ہوں میں ۔۔۔ اک بڑی ذات سے آمادہ فریاد ہوں میں
وہ جسے درد محبت کی دوا کہتے ہیں
ہاں! خدا تو نہیں محبوب خدا کہتے ہیں

علامہ سیماب نے بھی یہ نظم اقبال سے متاثر ہو کر موزون کی ہے۔ نظام المشائخ کے علاوہ یہ مسدس رسالہ صوفی (پنجاب) میں بھی ۳۰ بند میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سیماب نے بھی اسے نعتوں کے مجموعہ میں شائع کیا تھا۔

۱۰۔ جواب شکوہ- جناب محمد عبداللہ قریشی باقیات اقبال صفحہ ۳۲۶ طبع ثالث میں لکھتے ہیں کہ:-

''یہ نظم ۱۹۱۴ء میں جنگ بلقان کے دوران موچی دروازہ کے باغ میں ایک عام جلسے میں سنائی گئی۔''

غالباً یہاں کاتب کو سہو ہو گیا ہے۔ دراصل یہ نظم ۳۰ر نومبر ۱۹۱۲ء کو جلسۂ امداد مجروحین بلقان منعقدہ موچی دروازہ لاہور میں پڑھی گئی تھی۔ پوری نظم سدرشن کے تذکرہ شعراء موسومہ ''گلدستہ سخن'' ۱۹۲۱ء میں چھپی تھی۔ ہمارے پیش نظر وہی نسخہ ہے جس کا مخفف ''گلدستہ'' ہے۔ نظر ثانی کرنے کے بعد اقبال نے اس کے چار بند خارج کئے اور بانگ درا میں ۳۶ بند میں اسے چھاپا۔ مخزن میں پہلے بند کا پانچواں اور چھٹا مصرعہ اس طرح تھے۔

اڑ کے آواز مری تا بہ فلک جا پہنچی ۔۔۔ یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جا پہنچی

بانگ درا میں یہ شعر یوں بدل دیا گیا۔

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا ۔۔۔ آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

گلدستہ کا ذیل کا بند بانگ درا سے خارج کیا گیا۔

جب مے درد سے ہو خلقت شاعر مدہوش ۔۔۔ آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش

کشور دل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش ۔۔۔ چرخ سے سوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش

قید دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا

گلدستہ میں دوسرے بند کا شعر یہ ہے۔

اشک بے تاب ہے لبریز ہے پیمانہ ترا ۔۔۔ آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا

بانگ درا۔

جو کچھ سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا ۔۔۔ مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

گلدستہ کا یہ بند بانگ درا سے خارج کر دیا گیا ہے۔

جس طرح احمد مختار ہے نبیوں میں امام ۔۔۔ اس کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

کیا تمہارا بھی نبیؐ ہے وہی آقائے انام ۔۔۔ تم مسلماں ہو تمہارا بھی وہی ہے اسلام

اس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اس خم میں نہیں

بانگ درا بند نمبر ۷

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں ۔۔۔ امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں ۔۔۔ تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں

بادۂ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

یہ گلدستہ میں نواں بند ہے۔ اس میں شعر یوں ہے۔

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے — قوم دنیا میں یہی احمدؐ بے میم کی ہے

اس شعر کے بدلے ذیل کے بند کا آخری شعر لکھا گیا ہے۔ پہلے چار مصرعے بانگ درا سے خارج کئے گئے ہیں۔ یہ گلدستہ میں بند نمبر ۱۰ کے تحت درج ہیں۔

کشور ہند میں کلیۂ ناکام کا بت — عربستاں میں شفاخانۂ اسلام کا بت
اور لندن میں عبادت کدۂ عام کا بت — لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

بادۂ آشام نئے، بادہ نیا خم بھی نئے
یعنی کعبہ بھی نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

گلدستہ بند ۲۶۔

علم ظاہر بھی بڑھا زائر لندن بھی ہوئے — مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے — صفت طائر گم کردہ نشیمن بھی ہوئے

حال ان کا ہے مہ نو اور زبوں کرتی ہے
شب مہ سائے کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

گلدستہ بند ۲۳۔

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے — بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوق پرواز میں مہجور نشیمن بھی ہوئے — بے عمل تھے ہی جواں، دین سے بدظن بھی ہوئے

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

بانگ درا بند ۲۴۔

قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے — شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے نہ رہے — یہ ضروری ہے حجاب رخ لیلا نہ رہے

گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

گلدستہ بند نمبر ۲۷ میں اس بند کی ٹیپ یوں ہے۔

شوق تحریر مضامیں میں کھلی جاتی ہے　　بیٹھ کر پردے میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

بانگ درا بند نمبر ۲۶۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی　　گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

گلدستہ میں یہ ۲۹واں بند ہے اور اس طرح ہے۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

یعنی ہونے کو ہے کانٹوں سے بیاباں خالی　　گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی

ساحل بحر پہ رنگ فلک عنابی ہے

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

بانگ درا بند نمبر ۳۱ ع۔ ''چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت میری'' میں پانچواں اور چھٹا مصرعہ یوں ہے۔

فرصت وقت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے　　نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

گلدستہ میں شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہے ع۔ ختم کاہے کو ہوا کام ابھی باقی ہے

ذیل کے دو بند بانگ درا سے خارج کئے گئے ہیں۔

وسعت کون و مکاں ساز ہے مضراب ہے یہ　　دہر مسجد ہے سراپا خم محراب ہے یہ

جام گردوں میں عیاں مثل مے ناب ہے یہ　　روح خورشید خوں رنگ مہتاب ہے یہ

صوت ہے نغمۂ کن میں تو اسی نام سے ہے

زندگی زندہ اسی نور کے اتمام سے ہے

انجم اس کے فلک کے ہیں زمیں اس کی ہے　　کیا یہ اغیار کی دنیا ہے؟ نہیں اس کی ہے

سجدے مسجود ہوں جس کے وہ جبیں اس کی ہے　　وہ ہمارا ہے امیں قوم امیں اس کی ہے

طوف احمدؐ کے امینوں کا فلک کرتے ہیں

یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا ملک کرتے ہیں

بانگ درا کا آخری بند یہ ہے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تیری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلماں ہو تقدیر ہے تدبیر تیری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب یہ نظم شائع ہوئی تو گویا کہرام مچ گیا۔ ہر طرف سے اس کی تقلید میں لوگوں نے نظمیں لکھیں۔ راقم الحروف کی نظر سے کئی نظمیں مختلف رسالوں میں گزریں۔ مخزن جلد ۲۴ نمبر ۳ بابت دسمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۶۵ میں اقبال کے جواب شکوہ کی حمایت میں ۲۲ بند میں ایک مسدس سید فضل رب ڈپٹی مجسٹریٹ درجہ اول بہرائچ کا بعنوان ''جواب شکوہ ڈاکٹر اقبال اور حضرت ذوالجلال'' شائع ہوا۔ اس زمانے میں مخزن کے ایڈیٹر پروفیسر غلام محمد طور ایم۔اے فورمن کرسچن کالج لاہور تھے۔ ذیل میں چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ کہاں تاب کہ میں شکوۂ اقبال سنوں
ضبط کر جاؤں اگر گریۂ اطفال سنوں
دیکھتا خوب ہوں اسلام کا کیا حال سنوں
یہ نہ معلوم اگر مجھکو تو احوال سنوں

وہ مسلمان ہی اب ہیں نہ وہ اسلام رہا
ہاں بس اسلام کا باقی فقط اک نام رہا

جب مسلماں لڑتے مرتے ہیں خود ہی باہم
شیعہ سنی کا کیا کرتے ہیں ہر دم ماتم
ظلم اک دوسرے پر کرتے ہیں کیسا ہے ستم
کچھ برادر کے نہیں غم برادر کو الم

روس کے دام میں پھنس جائے نہ پھر کیوں ایراں
کیوں نہ ترکی سے لڑیں جوش میں اہل بلقاں

شکوہ اقبال کا ہے داد کے قابل بے شک
اہل اسلام ہے فریاد کے قابل بے شک
نام اللہ بھی یاد کے قابل بے شک
حالت امت کی ہے امداد کے قابل بے شک

ہے مگر شرط کہ پابند شریعت ہو جائے
دل سے وہ راہرو کوئے طریقت ہو جائے

ابوالکلام آزاد نے صاحبزادہ مصطفیٰ خان تخلص شر مرحوم سکریٹری رامپور کی نظم بعنوان ''جواب شکوہ کا اقبال'' اپنے ماموراخبار ''الہلال'' بابت ۲۶ فروری ۱۹۱۳ء (صفحہ ۱۳۲) میں ۲۱ بند میں شائع کی۔ ذیل میں چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

شان رحمت کی ادا! میری شکایت دیکھو　　آگئی کام مصیبت کی حکایت دیکھو
مجھ سے ناچیز پر اس درجہ عنایت دیکھو　　ہم سخن بندے سے معبود کی قسمت دیکھو
ایسی رحمت کے فدا شان کرم کے صدقے
طرز شفقت کے فدا شان کرم کے صدقے

پیرو فخر عرب دل سے اگر ہم ہوتے　　کیوں پریشاں صفت گرد سفر ہم ہوتے
سرمہ دیدۂ ارباب نظر ہم ہوتے　　خسرو کشور اقبال و ظفر ہم ہوتے
امت احمد ذی شان ہیں فقط کہنے کو
کفر آئین ہیں مسلمان ہیں فقط کہنے کو

قوم اسلام میں توحید کی دولت نہ رہی　　بادہ آشامیٔ خانۂ ہمت نہ رہی
دل کے آئینے میں تصویر صداقت نہ رہی　　وہ محبت وہ مروت وہ حمیت نہ رہی
وہ نمازی ہیں نہ وہ شوق جبیں سائی ہے
ضعف اسلام کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے

آج اگر حال زبوں ہے تو الم بے جا ہے　　قلب اقبال ہوا ہے تو اچنبھا کیا ہے
دیکھئے باغ اجڑتا ہے کبھی پھلتا ہے　　تنگ دل میں تو کریں صبر یہی اچھا ہے
جب بہار آتی ہے کلیوں کی چٹک آتی ہے
کب ہمیشہ خلش تنگ دلی رہتی ہے

ایک اور مسدس ''شکوہ و جواب شکوہ'' کے عنوان سے یار محمد بیگ یار کا ۹ بند میں مخزن جلد ۲۵ نمبر ۳ صفحہ ۶۷ تا ۶۹ بابت جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دو بند یہ ہیں۔

دل بیتاب کہ تھا کثرت غم سے ناچار　　اس نے چاہا کہ کہے یار سے کچھ حالت زار
چشم ظاہر کے لئے پردہ کیا اک تیار　　شکوہ کے رنگ میں تھی حسن طلب کی تکرار
غیر کو حکم ملا ہائے تسلی کے لئے
کیسی تسکین وہ اور الٹا گلہ لے بیٹھے

باخدا شکوۂ اقبال سے کچھ کام تو لے　　بے کسی میں علم قوت اسلام تو لے
قسمتوں سے اثر گردش ایام تو لے　　ید قدرت میں لئے عشق کا اک جام تو لے
پھر وہی راز و نیاز جبل طور تو ہو
دل ذرا کار جہاں کے لئے مسرور تو ہو

آخری بند یہ ہے ۔

پھر وہی بات ہو پیدا ترے دیوانوں میں شان ہو پھر وہی اسلام کے ویرانوں میں
بھر دے پھر کوٹ کے رانائیاں نادانوں میں اب بھی وہ دل ہے ترے حسن کے پروانوں میں
یار ہو مذہب اسلام ہو اور نام ترا
کعبۂ دہر میں گونجے وہی پیغام ترا

ایک مسدس ''شکوۂ اسلام'' کے عنوان سے فیروز حکیم فیروزالدین احمد طغرائی (م-۱۹۳۱ء) نے لکھا تھا۔ اس میں سولہ بند ہیں۔ پہلا بند یہ ہے ۔

لب کشائی صفت بانگ جرس ہوتی ہے ہوش غافل کو بھی آئے یہ ہوس ہوتی ہے
دزد ہو نفس تو تلقین عسس ہوتی ہے دوں خیالی کف افسوس مگر ہوتی ہے
جی بھر آیا ہے بہت شکوۂ بیداد کروں
چھوڑ دے چھوڑ دے اے ضبط کہ فریاد کروں

مسلمانوں کے کردار میں کیسی منافقت پیدا ہوگئی کہ اس کی وجہ سے نظام عالم بگڑتا چلا جارہا ہے۔ اس لئے شاعر کی تمنا ہے کہ مسلمان صحیح معنی میں مسلمان ہو جائیں۔ سچے مسلمانوں کی چند خصوصیات اس بند میں بیان کی گئی ہیں ۔

عامل و عادل و فیاض ہے سچا مسلم کوئی دکھلائے کہاں ہے کوئی ایسا مسلم
امر اسلام سے منکر ہے تو کیسا مسلم مسلم بے عمل الحق کہ ہے اک نامسلم
نامسلمانوں پہ آئی جو مصیبت آئی
سخت باطل ہے کہ اسلام پہ آفت آئی

پیرزادہ مولوی عبدالعزیز تخلص عزیز امرتسری نے ۳۱ بندوں کا ایک مسدس ''عذر شکوہ'' کے عنوان سے لکھا۔ اس میں بتایا گیا کہ اقبال کا شکوہ بے جا ہے۔ مسلمان اپنی سیہ کاریوں اور بد باطنیوں کی وجہ سے تائید ایزدی کے اہل نہیں رہے اور جب رحمت کے سزاوار ہی نہیں تو ''شکوہ'' کس منہ سے؟ نظم اچھی اور موثر ہے۔ یہ نظم انجمن خدام الصوفیہ منعقدہ علی پور سیدان کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ نظم کا پہلا اور آخری بند درج کئے جاتے ہیں ۔

تا بہ کے غمکدۂ درد کا مے نوش رہوں سر پہ ہو کوہ الم اور سبکدوش رہوں
حیف گر پنجۂ وحشت کا خطاپوش رہوں ہے سزاوار کہ محو طلب ہوش رہوں

وادی طور میں تکلیف سخن ہے مجھکو
میں کلیم ارنی سنج ہوں ظن ہے مجھکو

بچنے والے اگر آہنگ خطا سے دل ہوں — سربسر مجتنب اشواق و ہوا سے دل ہوں
اے عزیز! آج اگر پاک ریا سے دل ہوں — بخدا ہم نفس صبح ضیاء سے دل ہوں

ورنہ یہ آہ و فغاں زمزمہ سازی ہے مری
قلب سازی کی طرح قلب گدازی ہے مری

محب الحق حافظ نے ۱۹۲۸ء میں علامہ اقبال کے شکوہ کا جواب (جواب شکوہ) طبع کرایا۔ اس کے بارے میں حافظ لکھتے ہیں ''حضرت اقبال نے شکوہ تو کیا اور خدا سے کیا مگر یہ شکوۂ ظلم نہ تھا۔ شکوۂ محبت تھا۔ اس لئے بارگاہ قدس میں یہ شکوہ نہ سنا گیا۔ اس کا جواب جو بہ وکالت میرے عنایت ہوا وہ شائع کیا جاتا ہے۔ تاکہ سننے والے بھی سنیں اور اپنا ایمان تازہ کریں۔ قرآن مجید کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اس کو جواب شکوہ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ خدائی تبلیغ بھی ہے۔''

جواب شکوہ پر سید قمقام جعفری مرحوم نے بھی ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔

۱۱ شمع و شاعر- اس نظم کا آخری حصہ ''پیغام سروش'' کے عنوان سے مخزن جلد ۲۳ نمبر ۲ صفحہ ۵۳ بابت مئی ۱۹۱۲ء میں غلام محمد طور ایم-اے ایڈیٹر مخزن کے ذیل کے نوٹ سے چھپا تھا۔ یہ نوٹ بڑا اہم ہے اور اس کا حوالہ آج تک کسی نے نہیں دیا ہے:-

''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے بیرسٹر ایٹ لاء نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پچھلے سالانہ جلسے میں جو دلپذیر نظم ''شمع اور شاعر'' کے عنوان سے پڑھی تھی اس کے آخر میں تین بند جن کا عنوان خود ہمارے معجز بیان شاعر نے ''پیغام سروش'' قائم کیا تھا ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار آبدار میں ڈاکٹر موصوف نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے جس امید افزا مستقبل کا اندازہ لگایا ہے وہ بافہم اور دور بیں مسلمانوں کے لئے فردوس نظر سے کم نہیں۔''

''شمع اور شاعر'' کا سال تصنیف ۱۹۱۱ء ہے۔ بانگ درا میں اس کے ساتھ فروری ۱۹۱۲ء لکھا ہے۔

نظم مخزن کے علاوہ ''تمدن'' دہلی میں اپریل ۱۹۱۲ء تا جون ۱۹۱۲ء میں چھپی تھی۔ مطلع یہ ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

مخزن کا چوتھا شعر۔

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں بھی کبھی — قیس تو صحرا بھی تو لیلیٰ بھی تو محمل بھی تو

بانگ درا میں مصرعہ ثانی یوں ہے ع- قیس تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو

مخزن کا ۲۲واں شعر ۔

ہر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی	پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیان وجود

بانگ درا مصرعۂ اول ع- پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام وجود

۱۲ ملکۂ معظمہ یعنی ملکۂ وکٹوریہ کا انتقال ۲۲ر جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوا۔ اس دن عید تھی۔ پروفیسر گیان چند جین کے بقول غلام رسول مہر کا قیاس ہے کہ تقریب کا جلسہ ۲۳ یا ۲۴ جنوری کو منعقد کیا گیا تھا۔ یہ مرثیہ ''اشک خون'' کے عنوان سے مطبع خادم التعلیم لاہور اور مطبع مفید عام لاہور سے شائع ہوا۔ اقبال نے اسے بانگ درا میں شامل نہیں کیا۔ مرثیہ کے چند شعر یہ ہیں ۔

اے ہند! تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا	اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی گئی
اے ہند! جو فضیلت نسواں میں اک دلیل	تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی گئی
ہو سوگوار آج خواتین ہند تم	جو داستاں تمہارے شبینوں کی تھی گئی
خونابہ بار آج ہو اے چشم سلطنت	واقف جو تیرے سارے قرینوں کی تھی گئی
اے سال قرن نو! یہ ستم تو نے کیا کیا	عزت ذرا جو تیرے مہینوں کی تھی گئی

ہو موت میں حیات ممات اس کا نام ہے

صدقے ہو جس پہ خضر وفات اس کا نام ہے

۱۳ سیاست مدن پر یہ اقبال کی بہترین کتاب ہے۔ غالباً سال تصنیف ۱۹۰۴ء ہے۔ مخزن لاہور جلد ۷ نمبر ۱ بابت اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۱ تا ۸ میں اس کا ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ ابتدا میں ایڈیٹر کا یہ نوٹ چھپا تھا:-

شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے حال میں ایک کتاب ٹکسٹ بک کمیٹی کے ایما سے ''علم الاقتصاد'' پر لکھی ہے جس کا انگریزی نام ''پولیٹکل اکانومی'' ہے۔ اور جسے عموماً علم ''سیاست مدن'' کہتے ہیں۔ بلا مبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی کم چرچا ہے۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہایت ہی ضرورت ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخ صاحب کی شہرت اور اس کی ذاتی خوبی مقبولیت کو اس کے استقبال کے لیے اڑا کر لائے گی اور علاوہ تمام قدر دانی کے خاص جماعتیں اسے خریدیں گی۔ ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے پسند کیا اور ایک سو جلدیں خریدنا منظور فرمایا ہے۔ ہم قابل مصنف کی اجازت سے اس کا ایک دلچسپ حصہ نقل کرتے ہیں۔ کتاب زیر طبع ہے۔''

جب کتاب شائع ہوئی تو اس پر مخزن کے علاوہ ''زمانہ'' کانپور میں بھی تفصیل کے ساتھ تبصرے شائع کیے گئے۔ منشی دیا نرائن نگم نے ''زمانہ'' بابت مئی ۱۹۰۵ء میں اس پر گراں قدر تبصرہ شائع کیا۔

۱۴۔ اقبال لاہور سے ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو سفر یورپ کے لئے بمبئی میل میں سوار ہو کر دہلی پہنچے تھے۔ اسٹیشن پر خواجہ حسن نظامی اور منشی نذیر محمد بی۔اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدراس نے استقبال کیا۔ اقبال کے ہمراہ ان کے دوست غلام بھیک نیرنگ اور مخزن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر شیخ محمد اکرام بھی دہلی آئے تھے۔ یہ سب لوگ خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ گئے جہاں اقبال نے ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جو بعد میں نیرنگ کے نوٹ کے ساتھ مخزن جلد ۱۰ نمبر ا صفحہ ۴۹ تا ۵۲ بابت اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ درگاہ سے اقبال اور ان کے دوست مرزا غالب کے مقبرے پر گئے۔ یہاں اقبال نے جوش محویت میں مرزا غالب کی لوح مزار کو بوسہ دیا۔ ان موقعہ پر اقبال نے ولایت نامی قوال سے غالب کی یہ غزل بھی سماعت کی تھی ۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی ۔۔۔ دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

اقبال پی ایچ۔ڈی وغیرہ کرنے کے بعد اور لاہور آنے سے قبل لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہوئے تھے۔ یہ اطلاع اودھ اخبار بابت ۱۴ دسمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۲۷ - ۲۸ میں اس طرح درج ہے ۔

''شیخ محمد اقبال ایم۔اے کی نسبت لاہور میں ایک تار برقی سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کیمبرج نے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کا درجہ عطا کیا اور اور یونیورسٹی لندن میں مسٹر آرنلڈ کے مقام پر عربی کا قائمقام پروفیسر ہو گیا''

۱۶۔ اقبال سفر یورپ کے بعد ۲۶ رجولائی ۱۹۰۸ء کو دہلی پہنچے۔ ان کی آمد پر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ان کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعہ پر نیرنگ نے ایک نظم ''ترانۂ مسرت'' کے عنوان سے پڑھی جو مخزن جلد ۱۵ نمبر ۵ بابت ۱۹۰۸ء صفحہ ۶۲ - ۶۳ میں ذیل کے نوٹ کے ساتھ درج ہے:-

''اقبال کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہل دل اور اہل سخن کے لئے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک شخص ہے جس کے دم سے اردو زبان کی اعلیٰ اصلی اور سچی شاعری کی تمام امیدیں وابستہ ہیں۔ انکے واپس تشریف لانے سے اہل علم، ارباب ذوق اور اصحاب سخن میں ایک خاص مسرت پھیلی ہوئی ہے۔ راقم عرصہ دراز سے دنیا کے دھندوں میں اس قدر گرفتار ہے کہ مشغل سخن سے قطعی محروم ہے۔ مگر اقبال کی آمد کی خوشی نے انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجہ ذیل چند سطریں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶ رجولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ مقام دہلی میں ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جس میں اقبال کی شمع کمال کے چند پروانے جمع تھے اور جہاں دن

پھر اقبال کی آمد کی خوشی میں یہ مہمان نوازی حضرت خواجہ سید حسن نظامی صاحب دام فیضہ مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی بزم اصحاب منعقد رہی۔ اس بزم کے حاضرین میں سے خواجہ صاحب موصوف شیخ عبدالقادر بی-اے بیرسٹرایٹ لا، شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ ایڈیٹر "مخزن" مولوی عبدالرشید صاحب الخیری، سید جالب دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔" (نیرنگ)

ترانہ مسرت میں ۱۲ شعر ہیں۔ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے — خوشیاں منائیں مل کر اہل وطن وطن میں

ہے آمد مسرت اقبال تیری آمد — خوشیاں ہیں اہل دل میں عیدیں ہیں اہل فن میں

سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھکو سب نے — غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں

پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے — پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

حامد حسن قادری اردو کے مشہور نثر نگار، تاریخ گو تھے۔ شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔ انہوں نے بھی اقبال کی آمد پر ایک نظم "اقبال کا خیر مقدم" کے عنوان سے مخزن ۱۹۰۸ء، جلد ۱۵ نمبر ۱ میں شائع کی۔ چند شعر یہ ہیں۔

ہو مبارک حضرت اقبال آنا ہند میں — ہو مبارک آپ کو تشریف لانا ہند میں

آئے ہو کر علم کی دولت سے مالا مال تم — بن گئے اقبال سے اب ڈاکٹر اقبال تم

ہو کے کامل فلسفہ کے علم میں آئے ہو تم — خوبیاں حکمت کی کیا کیا دل میں بھر لائے ہو تم

اب یہ مرضی پر تمہاری ہے کہ بیرسٹر بنو — یا کسی کالج میں جاکر تم پروفیسر بنو

پنڈت تلوک چند محروم نے بھی اس موقعہ پر "سلام و پیام" کے عنوان سے ایک نظم ۲۹ شعر میں کہی تھی جو مخزن جلد ۱۶ نمبر ۱ بابت نومبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ چند شعر یہ ہیں۔

آنا ترا مبارک ہو یورپ سے آنے والے — احباب منتظر کو صورت دکھانے والے

آنا ترا مبارک اعزاز پانے والے — ہندوستاں کی عظمت عزت بڑھانے والے

آنا ترا مبارک باصد ہزار شوکت — ملک سخن میں اپنا سکہ بٹھانے والے

اک بار پھر سنا دے ہندوستاں ہمارا — اپنی زباں میں کہدے راز نہاں ہمارا

اقبال دیکھ اتنا کوئی نہیں سمجھتا — مٹنے کو ہے جہاں سے نام و نشاں ہمارا

یورپ کی واپسی کے بعد اقبال ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ "وکیل" امرتسر اردو صحافت نگاری میں مشہور و معروف تھا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ غلام محمد تھے اور یہ ہفتہ میں ۳ بار چھپتا تھا۔ جناب

جالب دہلوی، ابوالکلام آزاد اور آغا شاعر قزلباش کے سے لوگوں نے اس کی ادارت میں کام کیا۔
مورخہ ۱۲رجنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۴ کی اشاعت میں یہ خبر درج ہے:-

''بزم اردو کا ایک غیر معمولی جلسہ مولوی غلام قادر (گرامی) شاعر حضور نظام کے اعزاز میں ۹رجنوری ۱۹۱۰ء کو بصدارت شیخ عبدالقادر بی-اے بیرسٹرایٹ لاء انجمن ہال لاہور میں ہونے والا ہے اور علاوہ دیگر مضامین نظم ونثر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم-اے، پی ایچ-ڈی بیرسٹرایٹ لاء بھی ایک تقریر فرمانے والے تھے۔''

علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۹رمارچ ۱۹۱۰ء صفحہ ۲ کی اطلاع یہ ہے:-

''شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لاء، ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء اور مسٹر عبدالعزیز پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔''

۱۷ کیفی۔تخلص نام پنڈت برجموہن وتاتریہ۔دہلی کے ایک معزز کشمیری پنڈت خاندان سے تھے۔ابتدا میں کنور دلجیت سنگھ کے پرائیوٹ سکریٹری ہونے کے عرصہ سے جالندھر میں مقیم تھے۔ریاست جموں و کشمیر میں بھی آپ محکمہ خزانہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر وابستہ تھے۔آپ ہمیشہ اعلیٰ ترین شعراء و مصنفین میں شمار کئے جاتے تھے۔نظم ونثر دونوں اصناف میں ید طولیٰ حاصل تھا۔آپ کے کلام نیچرل یا نئی طرز تغزل میں ایک خوشگوار چاشنی پائی جاتی ہے۔اور آپ کو جملہ اصناف سخن میں دستگاہ حاصل تھی۔کیفی مخزن اور زمانہ میں مستقل طور پر لکھتے تھے۔ان کا ایک مضمون ''اردو اور دیسی زبان'' کے نام سے ص ۳۴ میں مخزن جلد ۸ نمبر ۵ بابت فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔اس میں لکھتے ہیں کہ

''چودھری خوشی محمد ناظر، محرم علی چشتی، دیوان رام جس، شیخ عبدالقادر اور پروفیسر اقبال....... نے اردو کے پائے کو بلندی اور اس کے نثر اور نظم کے میدان کو وسعت بخشی۔''

آپ کا کلام صاف و پاک ہے۔اور دل میں ذرا بھی تعصب نہیں تھا۔آپ نے اردو شاعری اور نثر نگاری میں کئی کتابیں شائع کیں۔ان میں منشورات کیفی اور کیفیہ مشہور ہیں۔فارسی کے عالم اجل تھے اسی لئے علامہ کہلاتے تھے۔افسوس اور صد افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ اردو اساتذہ اور اکادمیوں نے ان کی ادبی خدمات کو فراموش کیا۔

علامہ اقبال ایرانی ادباء اور
آیت اللہ خامنہ ای کی نظر میں

علامہ اقبال ہزار دل و جان سے ایران اور وہاں کے علماء اور شعراء کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ کے ایک شاگرد اور لاہور کے طالب علم مسمی محمد اکبر منیر ایران میں مقیم تھے۔ موصوف ان سے اپنے بارے میں ایرانی علماء اور شعراء کے تاثرات جاننا چاہتے تھے۔ یہ اقبال ہی تھے جو ایران سے منیر کے فارسی اشعار کو سید سلیمان ندوی کے ''معارف'' میں تصحیح کر کے چھپواتے تھے۔ (معارف اعظم گڈھ-مارچ ۱۹۲۴ء)

علامہ نے پروفیسر شیخ محمد اقبال (م-۱۹۴۸ء) پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے ہاتھ ایک خط اور چند کتابیں (اسرار و رموز اور زبور عجم) ایران کے عہد حاضر کے ایک بہت بڑے عالم جید، لغت نویس اور زباندان پروفیسر سعید نفیسی کو بھجوائی تھیں۔ پروفیسر موصوف نے اقبال کا خوب مطالعہ کیا تھا اور انہوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ سات سو سال سے کسی کو جرأت و ہمت نہ ہوئی کہ مولانا روم کی مثنوی کی طرز پر مثنوی تالیف کرے۔ اقبال نے نہ صرف یہ ہمت کی بلکہ اس نہایت مشکل کام میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔ نفیسی نے مثنوی اقبال کو مثنوی عصر حاضرہ سے تعبیر کیا تھا۔

اقبال کے ایرانی معاصرین میں نفیسی نے ہی کلام اقبال پر سب سے زیادہ مقالے لکھے تھے۔

اس کے بعد علامہ نے ایک اور خط اور پیام مشرق کا نسخہ نفیسی کو ارسال کیے تھے۔ علامہ کے دونوں خطوط کے ترجمہ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی نے اپنی کتاب (اقبال ایرانیوں کی نظر میں صفحہ ۱۰۶) میں اس طرح درج کیے ہیں:-

آیت اللہ السید علی خامنہ

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب مدظلہ

(۱) ۲۶ راگست ۱۹۳۲ء
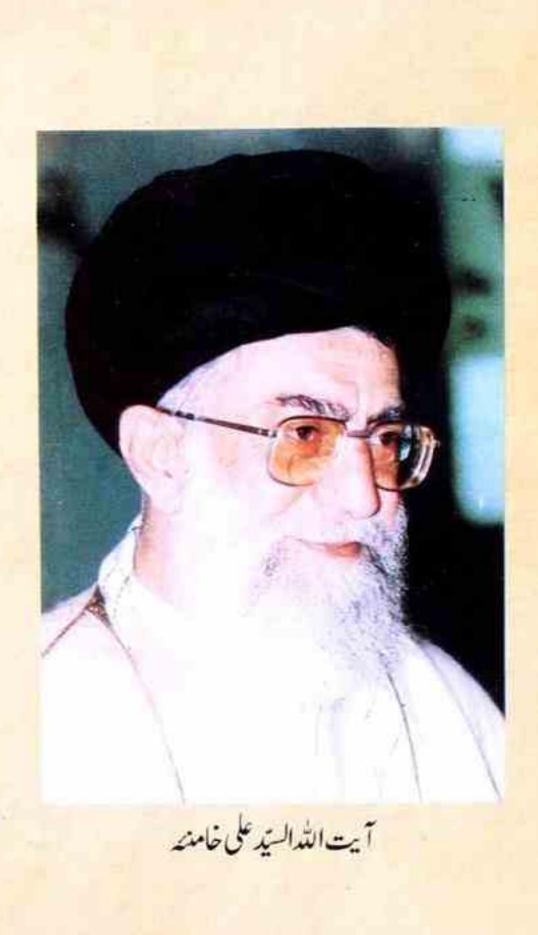
مخدوم مکرم دانشمند

آپ نے جو خط پرفیسر محمد اقبال کے ہاتھ بھجوایا تھا وصول ہوا۔ کئی سالوں سے آپ کے ایران کو دیکھنے کی آرزو دل میں رکھتا ہوں اور اپنی زندگی کا واحد حاصل شعر فارسی کو سمجھتا ہوں اور یہ امر کہ آپ ایسے نامور عالم (جو ایران کے ذوق ادبی کے معیار کی حیثیت رکھتا ہو) نے میرا کلام پسند فرمایا ہے۔ نیاز مند کے لئے فخر اور ہمت افزائی کا باعث ہے۔ میرا خیال ہے کہ سوائے زبور عجم کے میری اور کوئی کتاب آپ کی خدمت میں نہیں پہنچی۔ اس لئے پیام مشرق اسی ہفتہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔''

(۲) ۴رنومبر ۱۹۳۲ء

مخدوم مکرم دانشمند

آپ کا دوسرا خط جو نیاز مند کی عزت افزائی اور افتخار کے لئے آپ نے لکھا ہے کوئی سات آٹھ روز پہلے ملا۔ یہ سن کر کہ زبور عجم کی طرح پیام مشرق بھی آپ جیسے دانشمند نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور فارسی اشعار کو سراہا ہے میرے لئے سربلندی کا موجب ہے۔ جس طرح فضلاء وادباء ایران کو مجھ سے ملاقات کی خواہش ہے، اسی طرح یہ نیاز مند بھی ان سے ملنے اور ایران کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ میری کمزوری اور علالت اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔ کچھ عرصہ بعد افغانستان کا سفر درپیش ہے اور میری آرزو ہے کہ کسی دن اپنی آنکھوں سے ایران کو دیکھوں اور دوسری خواہش جو میں خدا سے چاہتا ہوں آپ ایسے شفیق اور مہربان دوست کی ملاقات ہے۔''

ذیل میں ایران کے چند ممتاز شعراء کے تاثرات اقبال کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

محمد تقی بہار ملک الشعراء نے ۱۹۴۲ء میں ایرانی و ہند کلچرل ایسوسی ایشن کے افتتاح کے موقعہ پر اپنے منظوم مقالے میں غیر مبہم لفظوں میں کہہ دیا کہ سخن سرائی کی تمام اعلیٰ قدریں اقبال کے کلام میں جمع ہیں اور عصر حاضر کو عصر اقبال کہنا مناسب ہوگا۔ بہار کا یہ شعر اقبال کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے۔

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت

در حدے کز صد ہزاران برگذشت

(۲) بہار نے اپنے خطبے میں اقبال کے طرز میں اشعار بھی کہے۔

شمۂ از حال و استقبال تو   ایں نہ من گویم کہ گفت اقبال تو

زندگی جہد است و استحقاق نیست | جز بہ علم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر | ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
غافل از اندیشۂ اغیار شو | قوت خوابیدۂ بیدار شو

مرحوم بہار نے (استاد نفیسی کی طرح) اس بات کا اقرار کیا ہے کہ یہ شاعرانہ پیغمبری عصر حاضر میں اقبال ہی کے حصے میں آئی ہے۔ اقبال کو خراج تحسین بھی پیش کیا اور اس کی پیروی میں چند شعر بھی لکھے۔ انہوں نے اقبال کو اہل ایران کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس کا فردوسی طوسی احیاء کنندہ ملت ایران سے تشابہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اقبال کا کلام نو سو سالہ ادبی اور اسلامی جدو جہد کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔

بہار کے بعد ایران کے سب سے مقتدر شاعر صادق سرمدؔ نے اقبال کو اپنا ہیرو بنالیا اور ہنر برائے ہنر کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے بار بار ان حقائق حیات کو دہرایا جو اقبال نے بیان کئے ہیں اور خود بھی اقبال کے نظریات کی پیروی میں نظمیں لکھیں۔ سرمدؔ پر اقبال کے مذہبی رجحانات کا گہرا اثر ہے۔ ایک قصیدے میں کہتا ہے۔

اقبال کہ پیغمبر پیغمبر حق بود | در حضرت حق صاحب انعام بزرگ است
اقبال بزرگ است کہ در عالم توحید | از بت شکنی دشمن اصنام بزرگ است

حبیب اللہ آموزگار سابق وزیر فرہنگ و مولف آموزگار لکھتے ہیں:-

"یہ فیض عرفانی جو ایک طویل مدت کے انتظار کے بعد مجھے نصیب ہوا محمد اقبال کی پاک اور درخشاں روح کا اثر ہے۔ جس نے اس برصغیر کی خاک سے طلوع ہو کر ایرانیوں کے دل و دماغ پر روشنی ڈالی۔ اقبال کے کلام پر جو اس نے فارسی میں شیریں زبان میں کہا ہے دنیا بھر کے فارسی زباندانوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

گلچین معانی کی ایک رباعی جو اقبال کے تتبع میں کہی گئی ہے۔ پیش ہے۔

تا چند زخویشتن جدائی کردن | درکار وجود ست رائی کردن
ز اقبال شنو کہ گفت خود را بشناس | کز راہ خودی تواں خدائی کردن

غرضیکہ ادبیات ایران کے نامور اساتذہ جیسے کاظم رجوی، فخر الدین حجازی، محمد محیط طباطبائی، علی اکبر دہخدا، حسین خطمی، رشید فرزانہ پور، رکن الدین ہمایوں فرخ، سید حسین نقی زادہ،

احمد سروش وغیرہ نے کلام اقبال کو شاندار الفاظ میں سراہا ہے۔ مجتبیٰ مینوی کہتے ہیں کہ:-

''اقبال شاعر قادر و حکیم، بلند فکرے بود۔ وقوت کلام و نفوذ سخن آخر بہ حدے بود کہ بے آنکہ ادعائے رسالت کردہ باشد''

فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر مولانا گرامی نے کیا خوب کہا ہے۔

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال　　　پیغمبری کرد، پیمبر نتواں گفت

اس پر پروفیسر آربری نے یہ اضافہ کیا کہ ''میلٹون (Milton) واقبال اگرچہ شاعر بودند ولے بہ مقام پیغمبری رسیدہ اند'' (جریدہ ہنر ومردم صفحہ ۹۶ مطبوعہ تہران)

سید سکندر رعنا فارسی کے ایک جید عالم اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ''نیرنگ خیال'' لاہور (صفحہ ۵۹) بابت اکتوبر ۱۹۲۶ء میں اقبال کے دوست حکیم شجاع احمد کے خط کے ساتھ سید سکندر آغا افصح الفصحا کی طویل نظم ''مدینۃ الشعراء'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ رعنا نے اس میں علامہ اقبال کو فارسی کے عظیم الشان شعراء رودکی، عنصری، منوچہری، انوری، سنائی، نظامی، فردوسی، عطار، خاقانی، سعدی، کمال، حافظ، امیر خسرو، سلمان، فغانی، فیضی، صائب، کلیم، غنی کشمیری اور غالب کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔

بخوف طوالت نظم کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

یکے بہ فضل و کمال و جلال چوں اقبال　　　کہ چشم چرخ چو او نادیدہ در ادوار

دلش ہزاراں و دریا درون قطرہ نہاں　　　چنانکہ طبعش ابریست ابر گوہر بار

میرے پیش نظر ''نیرنگ خیال'' لاہور بابت جولائی ۱۹۲۸ء کا شمارہ ہے۔ اس میں (صفحہ ۸ تا ۲۶) علامہ اقبال کے افکار پر ایران کے عالم متبحر پروفیسر سید محمد علی کا گراں قدر مقالہ بہ عنوان ''اقبال و شعر فارسی'' شائع ہوا۔ موصوف کا تقرر بحیثیت پروفیسر شعبۂ فارسی نظام کالج حیدرآباد میں ہوا تھا۔ مضمون کا ترجمہ مشہور ادیب جناب سید تمکین کاظمی ایم، آر، اے، ایس رکن شعبۂ جامعہ معارف نے اردو میں کیا ہے۔ موصوف تمہید میں لکھتے ہیں:-

''آقائے محترم سید محمد علی (داعی الاسلام) پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن نے شعرائے ہند سے سخندان ایران کو واقف کرانے اور ہندوستان میں فارسی کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنے کے لئے ایران کی ایک ادبی اور علمی انجمن جامعہ معارف کی ایک شاخ حیدرآباد میں بھی قائم کی ہے جس کا نام معارف ہے۔

حیدرآباد کے اعلیٰ فارسی دان حضرات اس کے رکن ہیں اور ہر مہینہ ایک لکچر ہوا کرتا ہے۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں آقائے محترم نے علامہ سر اقبال کی فارسی شاعری پر ایک لکچر دیا ہے جس کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔''

ایک اہل زبان فاضل اور ادیب کی رائے محترم علامہ کے متعلق کیا ہے؟ آپ خود دیکھ لیجئے۔ خوش قسمت ہے ہندوستان کہ اقبال جیسی ہستی نے اس سرزمین پر جنم لیا۔ مادر ہند کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔ چونکہ مضمون نایاب ہے اس لئے ذیل میں ہم اس کے ابتدائی اقتباسات درج کرتے ہیں:-

''ہماری علمی انجمن (شعبۂ جامعۂ معارف) فارسی ایران اور ہندوستان کے درمیان واسطۂ ادبی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے قدیم اور جدید ادیبوں کو ایک دوسرے سے واقف کرائے۔ گو تمام دنیا کی فارسی کا مرکز ایران ہے مگر ایشیا میں بہت سے ادیب فارسی نظم و نثر میں درافشانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ مرکز (ایران) ان سے باخبر رہے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں ادیبوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے جو فارسی میں شاعری کرتی ہے۔ جامعہ کا فرض ہے کہ ان کا تعارف کرائے۔

چنانچہ مشہور فلاسفر ڈاکٹر سر محمد اقبال اقبال نہ صرف اردو سے اپنے ہموطنوں کے کانوں کو متلذذ کر رہے ہیں۔ بلکہ تمام ایشیا میں اپنے فارسی نغموں کی دھوم بھی مچا رکھی ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے مدت تک اردو میں شاعری کر کے اس میں مضامین جدیدہ، فلسفہ وحب وطن وحب ملت کا احساس پیدا کرنا چاہا مگر یہ چادر اتنی وسیع نہ تھی کہ اس میں بے تکلفی سے پاؤں پھیلائے جاتے۔ فقط زبان فارسی ہی ایسی زبان تھی جس میں وہ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے تھے۔ اس لئے چند سال سے اپنے افکار عالیہ کو فارسی قالب میں ڈھالنا شروع کیا اور اب ''طوطی شکر شکن یا بلبل شیراز'' کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔

اقبال کوئی ایسے ''عادی'' شاعر نہیں ہیں، جو فرضی عشق کی بنا پر گل و بلبل، شمع و پروانہ، قمر و سرو کے مضامین باندھتے پھریں۔ جس سے سامع کو صرف ایک لذت استماعی ہو۔

بلکہ وہ ایک ''قائد نطاق دارائے نصب العین ہیں''''بلبل اقبال شاہین کرۂ مریخ'' کو شکار کرتا ہے۔ ان کی بوئے گلشن ناہید تک پہنچتی۔ ان کی شمع بزم تمدن عالم کو روشن کرتی اور ان کی قمری سروبستان کے عوض فراز طوبیٰ پر متجسس معرفت میں کوکو کہتی ہے۔

اقبال چاہتے ہیں کہ انسانی حالت سدھرتی جائے وہ بڑھتا جائے۔ ترقیات کے مادہ کے علاوہ تجلیات روحانیہ کی طاب بھی ہے۔ اقبال یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان جو روئے زمین پر منتشر ہیں ایک دل ایک جہت ہو جائیں اور عملی، عقلی، روحی ترقی کے میدان میں اغیار کا ساتھ دیں۔ اقبال کا مقصد تو

تمام مسلمانوں سے ہے مگروہ خصوصیت سے علماء وحکماء کے طبقے کومخاطب کرتے ہیں جن کے ہاتھوں میں ملت کی قیادت ہے اسی لئے وہ فارسی میں شعر کہتے ہیں تاکہ نامحرم کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں اور نااہل دماغ کج فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ چنانچہ ''اسرارخودی'' میں فرماتے ہیں۔

نکتہ ہاں چوں تیغ فولاد است تیز
گر نمی فہمی ز پیش ما گریز

اقبال دورحاضرہ کے بہترین علماء اور تربیت یافتوں میں سے ہیں۔ علوم قدیمہ وجدیدہ سے تفحص حاصل کرکے گنج دانش سے گوہر شاہوار چن کر بازار شاعری میں لاکر رکھا ہے۔ وہ جو قیمت چاہتے ہیں یہ ہے کہ ''مغز بیدار اور دل دردمند ملے''۔ زبور عجم میں فرماتے ہیں۔

یا رب درون سینہ دل باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ بانفس دیگراں نہ زیست — یک آہ خانہ زاد مثال سحر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ — جولاں گہ بہ وادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریف یم بیکراں مرا — با اضطراب موج سکون گہر بدہ
شاہین من بہ صید نبگاں گذاشتی — ہمت بلند و چنگل ازیں تیزتر بدہ
رفتم کہ طائران حرم را کنم شکار — تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

خاکم بہ نور نغمۂ داؤد بر فروز
ہر ذرۂ مرا بپر و بال شر بدہ

ہندوستان کے تمام اساتذہ میں ایک ایک خاص رنگ موجود تھا جو ان کے کلام کی خصوصیت رہا ہے۔ اسی طرح اقبال کا رنگ غالبؔ مرحوم کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ غالبؔ نصف صدی قبل اردو اور فارسی کا استاد مانا جاتا تھا۔ اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالبؔ کے بعد چشم ہندوستان اقبال کی وجہ سے پرنور ہے۔ کسی قدیم استاد نے اساتذہ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو اس طرح ختم کیا ہے۔

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید — بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالبؔ مرحوم نے اس پر اس شعر کا اضافہ کیا ہے۔

ز جامی و عرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالبؔ بہ غالبؔ رسید

اب میں اس پران دوشعروں کا اضافہ کرتا ہوں۔

چو غالبؔ ز ہندوستان رخت بست — بجائے وے اقبال دانا نشست
یقیں داں سخن دانی باستاں — بماند بہ ہندوستاں جاوداں

انقلاب ایران کے بعد ایرانی علماء، کلام اقبال کا گہری فکر و نظر سے مطالعہ کرنے لگے۔ پروفیسر آقائے علی شریعتی نے افکار اقبال کو اپنے فلسفیانہ انداز فکر سے اجاگر کیا۔ شہید مرتضیٰ مطہری نے اقبال کی تصانیف خاص کر اقبال کے خطبات یعنی احیائے فکر اسلامی THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM پر مسلسل کئی تقریروں سے مختلف گوشوں پر نظر ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ علامہ اقبال نے اس موضوع پر کہا ہے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے یا تنقید سے ماورا ہے۔ لیکن اس اہم اور دقیق موضوع پر جس مفکرانہ اور فلسفیانہ انداز سے انہوں نے بحث کی ہے بہت مکمل اور یقیناً قابل صد تحسین و آفرین ہے۔ میں آج اپنی بیشتر گفتگو کا حصہ انہی خطبات کی نذر کروں گا۔ اور اگر چہ یہ بحث بہت وسیع ہے جسے میں توفیق ایزدی سے غالباً کچھ نشستوں میں مکمل کر سکوں گا لیکن اس پہلی نشست میں اس بحث کے صرف منتخب نکات پر ہی کچھ کہہ سکوں۔

اقبال یورپ سے تعلیم یافتہ اور صف اول کے یورپ شناس تھے، جنہوں نے نہ صرف جدید علوم سے پورا پورا استفادہ کیا تھا بلکہ یورپی دنیا کو ایک مفکر دانشمند اور اہل بصیرت فلسفی کی نظر سے دیکھا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے کسی گوشے میں خانہ نشین ہو کر دور سے یورپ کا تخمینی یا تصوراتی مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ نہایت قریب سے کھلی آنکھوں اور تحقیقی ذہن سے اس کا تفصیلی مشاہدہ کر کے وہاں کی تہذیب و معاشرت کا تجزیہ کیا تھا۔

اقبال خود بھی جدید علوم کے دلدادہ تھے اور نوجوانان ملت اسلامیہ کے لئے بھی ان کی تعلیم کے پر جوش حامی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو جدید علوم کے حصول کی ترغیب دی اور کبھی ان کی طرف سے اس بارے میں کراہت اور تنفر کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اور باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم یورپ میں حاصل کی اور نہ صرف مغربی تہذیب و معاشرت سے پوری پوری شناسائی حاصل کی بلکہ علوم جدیدہ کی افادیت کے بھی وہ بہت زیادہ معترف تھے لیکن اپنی گفتگو اور منظوم کلام میں یورپی وضاحت سے خبردار کرتے ہیں کہ یورپی تمدن یعنی یورپی طرز زندگی نے مجموعی طور پر جو کچھ انسان کو فکری، عملی یا اخلاقی طور پر دیا ہے، جو آداب تمدن اسے سکھائے ہیں نہ صرف یہ کہ ان میں کوئی خوبی موجود نہیں بلکہ وہ عالم انسانیت اور خود اقوام یورپ کے لئے بھی خطرناک اور مضر ہیں۔ مغربی علوم کے اس عظیم مغرب شناس طالب علم کے کلام کا مجموعی موضوع بھی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ علامہ موصوف کے کلام سے جو کچھ اس بارے میں حاصل کر سکا ہوں آپ کے سامنے پیش کروں تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ یہ عظیم شخص جو یورپی علوم کا اس قدر معتقد اور دلدادہ ہے یورپی تمدن سے اسے کتنی نفرت اور کراہت ہے اور اقوام مشرق اور بالخصوص

مسلمانوں کو ان سے بچنے اور دور رہنے کے لئے اسے کتنی تاکید کی ہے۔''

(حق و باطل از علامہ مرتضیٰ مطہری صفحہ ۹۲-۹۴ مترجم حسین بخاری مرحوم مطبوعہ عباس بک ایجنسی لکھنؤ)

حالیہ برسوں میں ایران میں علامہ اقبال پر بین الاقوامی سیمناروں اور ادبی اجتماعوں میں کلام اقبال کے مختلف گوشوں پر فلسفیانہ نظر ڈالی گئی۔ اقبال کے فرزند بلند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک بین الاقوامی سیمنار کا تذکرہ اپنی خودنوشت حیات ''اپنا گریباں چاک'' (صفحہ ۱۹۳) میں کیا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

''مارچ ۱۹۸۶ء میں تہران یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الاقوامی اقبال کانگریس میں شرکت کی خاطر مجھے ایران مدعو کیا گیا۔ ایران عراق جنگ جاری تھی اور امام خمینی بقید حیات تھے۔ کانگریس کا افتتاح امام خامنہ ای نے کیا۔ انہوں نے علامہ اقبال پر اپنی زبانی تقریر میں تقریباً دو گھنٹے لئے اور سیکڑوں اشعار کے حوالے دئے۔ کانگریس کے شرکا نے مجھے ان کے شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری سونپی اور میں نے فارسی میں لکھی ہوئی تقریر پڑھی ان کی اقبال شناسی پر انہیں خوب داد دی۔''

ہم نے آیت اللہ حضرت السید علی خامنہ ای مدظلہ کی وہ تقریر دریافت کی جو ''علامہ اقبال روح اسلامی کے مظہر'' کے عنوان سے سالہا سال پہلے 'ندائے اسلام'' جلد ۶ شمارہ ۲، ۳ میں چھپ چکی تھی۔ مضمون ختم ہو چکا تھا کہ اس تقریر کا خوبصورت اور جاذب نظر پاکستانی ایڈیشن مطبوعہ اقبال اکادمی بھی نظر سے گزرا۔ چونکہ مضمون پر مغز اور بصیرت افروز ہے اس لئے شامل کتاب کیا گیا تاکہ اقبالیات میں محفوظ رہ سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں صادقانہ طور پر عرض کر رہا ہوں کہ آج جب اقبال عزیز کی قدردانی اور یہ جلسہ دیکھ رہا ہوں میری زندگی کے پر جوش ترین ایام میں سے ایک ہے۔ وہ چمکتی ہوئی چنگاری جو گھٹن کے ماحول کے تاریک و سیاہ ایام میں ان کی یاد، انکے شعر، انکی نصیحت اور سبق کے ذریعہ دل سے ناامیدی کو دور کرتی تھی اور ہماری نگاہوں کے سامنے ایک روشن مستقبل کا خاکہ کھینچتی تھی، آج ایک روشن مشعل ہے جو خوش قسمتی کے ساتھ ہماری قوم کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر رہی ہے۔

افسوس کہ ہمارے عوام جو اقبال کے پہلے عالمی مخاطب تھے بہت دیر سے اقبال سے روشناس ہوئے۔ ہمارے ملک کی خاص صورتحال اور خاص طور پر اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے محبوب ملک یعنی ایران میں سامراج کی منحوس پالیسیوں کا تسلط اس بات کا سبب بنا کہ اقبال ہرگز بھی ایران نہ آئیں۔

فارسی کے اس عظیم شاعر نے جس نے اپنے زیادہ تر اشعار کو اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی میں کہا ہے۔ کبھی بھی اپنی محبوب و مطلوب فضا ''ایران'' میں قدم نہیں رکھا اور نہ صرف یہ کہ وہ ایران نہیں آئے بلکہ انہی سیاستوں نے جن کا اقبال مدتوں تک مقابلہ کرتے رہے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ اقبال کا نظریہ، اقبال کی راہ اور اقبال کا دیا ہوا سبق ایرانی عوام کے کانوں تک پہنچے جو سننے کے لیے سب سے زیادہ آمادہ لوگ تھے۔ اس سوال کا جواب کہ اقبال ایران کیوں نہیں آئے میرے پاس ہے:

اس وقت جب اقبال کے افتخار اور شہرت کے عروج کا زمانہ تھا اور برصغیر کے مختلف حصوں اور دنیا کے معروف یونیورسٹیوں میں ان کو ایک عظیم مفکر فلسفی، دانشور، انسان شناس اور ماہر عمرانیات کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہمارے ملک میں ایسی سیاستیں حکم فرماں تھیں کہ اقبال کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ لہٰذا ان کو ایران آنے کی دعوت نہیں دی گئی اور ان کے ایران آنے کے امکانات فراہم نہیں ہوئے اور ان کی کتابیں سالہا سال تک ایران میں شائع نہیں ہوئیں۔ انہی ایام میں جب اس ملک میں ایرانی اور مسلمان انسان کی شخصیت کو نابود کرنے کے لیے غیر ملکیوں کے ادب و ثقافت اور کلام کا ایک تباہ کن سیلاب ہر طرف سے جاری تھا۔ عام محفلوں اور عوام کے سامنے اقبال کی کوئی نظم یا ان کی کوئی تصنیف پیش نہیں کی گئی۔

آج اقبال کی آرزو یعنی ''اسلامی جمہوریت'' نے ہمارے ملک میں جامہ پہن لیا ہے۔ اقبال لوگوں کی انسانی اور اسلامی شخصیت کے فقدان سے غمگین رہتے تھے اور اسلامی معاشروں کی معنوی ذلت اور ناامیدی کو سب سے بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مشرقی انسان اور خصوصاً مسلمان کی ذات اور وجود سے اس بے مصرف گھاس کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششیں کیں۔ اگر آج زندہ ہوتے تو ایک ایسی قوم کو دیکھ سکتے تھے جو اپنے پیروں پر کھڑی ہے اور اپنے قابل قدر اسلامی سرمائے سے سیراب ہو کر اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسے کے ساتھ نیز دلفریب مغربی زیوروں اور مغرب کے اقداری نظام سے بے اعتنا طاقتورانہ طور سے زندگی گزار رہی ہے۔ مقصد آفریں ہے اور ان اہداف و مقاصد کی راہ پر گامزن ہو کر عاشقانہ طور پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور اپنے آپ کو قومیت، نیشنلزم اور وطن پرستی کی چار دیواری میں قید نہیں کرتی۔ اقبال کی سب سے بڑی آرزو جو انکے تمام قابل قدر کلام اور تصنیفات میں نظر آتی ہے یہی تھی کہ وہ یہاں پر ایسی قوم کو دیکھیں۔ اور میں مسرور ہوں کہ ہم الحمدللہ اقبال کی آرزو کو اپنے ماحول میں جامہ عمل پہنے ہوئے دیکھتے ہیں، اور اس وقت ہمیں یہ موقعہ ملا (خواہ: رادیر سے) کہ عصر حاضر کی اس عظیم مفکر شخصیت اور اس عظیم الشان مصلح اور مجاہد اور

انتھک انقلابی کو روشناس کرانے کی کوشش کریں اور ان کو اپنی قوم سے روشناس کرائیں۔

میں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ اس جلسے میں میری شرکت سرکاری آداب ورسوم سے دور ہوتی تاکہ اول یہ کہ اس عظیم اور محبوب یاد سے بیشتر محظوظ ہوسکتا اور دوئم یہ کہ مجھے اس کا موقع اور امکان حاصل ہوتا کہ اقبال کے سلسلے میں اپنے جذبات کے ایک حصے کو اس جلسے میں شریک ہونے والوں کے سامنے پیش کرتا۔ اس وقت بھی میں بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں یہاں پر مخلصانہ طور پر اس شخص کی حیثیت سے جو سالہا سال سے اقبال کا مرید رہا ہے اور جس نے اپنے ذہن میں اقبال کے ساتھ زندگی گزاری ہے، بات کروں تاکہ اس عظیم اجتماع میں اپنے اوپر ان کے عظیم احسان اور اپنے ملک کے عزیز لوگوں کے ذہن پر ان کے اثرات کے حق کو کسی حد تک ادا کرسکوں۔

اقبال تاریخ اسلام کی ان نمایاں اور اتنی گہری اور اعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدنظر نہیں رکھا جاسکتا۔ اور ان کے اس پہلو اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبال ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے حق نہیں ادا کیا۔ اقبال بلاشک ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اقبال کے اردو کلام کے بارے میں اردو زبان وادب کے ماہرین کہتے ہیں: بہترین ہے۔ شاید یہ تعریف اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو کیونکہ اردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اردو کلام نے بیسوی صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) گہرا اثر ڈالا ہے اور ان کو اس جدوجہد میں جو اس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے۔ خود اقبال بھی مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں:

باغباں زور کلامم آزمود   مصرعی کارید و شمشیری درود

اور میرا استنباط یہ ہے کہ وہ یہاں پر اپنے اردو کلام کے بارے میں کہتے ہیں جو اس وقت برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے جانا پہچانا تھا۔

اقبال کا فارسی کلام بھی میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیات کا مالک ہو۔

اقبال فارسی بات چیت اور محاورے سے ناواقف تھے اور اپنے گھر میں اور اپنے دوستوں سے اردو یا انگریزی میں بات کرتے تھے۔ اقبال کو فارسی مضمون نگاری اور فارسی نثر سے واقفیت نہیں تھی اور

اقبال کی فارسی نثر وہی تعبیرات ہیں جو انھوں نے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کی ابتداء میں تحریر کی ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان کا سمجھنا فارسی بولنے والوں کے لیے مشکل ہے۔ اقبال نے ایام طفلی اور جوانی میں کسی بھی مدرسے میں فارسی نہیں پڑھی تھی اور اپنے والد کے گھر میں اردو بولتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے فارسی کا انتخاب صرف اس لیے کیا کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ انکے افکار اور مضامین اردو کے سانچے میں نہیں سماتے تھے اور اس طرح انھوں نے فارسی سے انسیت حاصل کی۔ انھوں نے سعدؔی و حافظؔ کے دیوان اور مثنوی مولانا اور سبک ہندی کے شعراء مثلاً عرفؔی، نظیرؔی اور غالب دہلوی نیز دیگر شعراء کے کلام کو پڑھ کر فارسی سیکھی۔ اگر چہ فارسی ماحول میں نہیں رہے تھے اور انھوں نے فارسی کی پرورش گاہ میں ہرگز بھی زندگی نہیں گزاری تھی اور فارسی بولنے والوں سے مصاحبت نہیں کی تھی لیکن انھوں نے ظریف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین ذہنی مضامین کو اپنی طویل (اور بعض نہایت اعلیٰ) نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کے اشعار کو دیکھیں جو ایرانی نہیں تھے لیکن انھوں نے فارسی میں کلام کہا ہے اور انکا اقبال کے کلام سے موازنہ کریں تو آپ کے لیے اقبال کی عظمت واضح ہو جائے گی۔

اقبال کے بعض مضامین جن کو انھوں نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے ایسے ہیں کہ اگر انسان چاہے کہ نثر میں بیان کرے تو نہیں کر سکتا اور ہمیں ایک مدت تک زحمت اٹھانی پڑے گی کہ ایک شعر کو جس کو انھوں نے آسانی کے ساتھ بیان کر دیا ہے، فارسی نثر میں جو ہماری اپنی زبان بھی ہے، بیان کریں۔

میں جناب ڈاکٹر مجتبوی کا ان اشعار کے لیے جو انھوں نے پڑھے ممنون ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اقبال کے کلام کو زندہ کیجئے۔ کیونکہ اقبال کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ انکا کلام ہے اور اقبال کو کوئی بھی بیان متعارف نہیں کرا سکتا۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے بعض اشعار اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اقبال نے مختلف طرزوں مثلاً طرز ہندی، طرز عراقی اور حتیٰ طرز خراسانی میں شعر کہے ہیں اور ان تمام طرزوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ انھوں نے مختلف شعری قالبوں یعنی مثنوی، غزل، قطعہ، دو بیتی اور رباعی کا استعمال کیا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اچھے شعر کہے ہیں اور اعلیٰ مضامین کو باندھا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا کلام ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے۔ اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس شخص کو فارسی بولنا اور فارسی لکھنا نہیں آتا ہے اور فارسی زبان والے گھرانے میں پیدا نہیں ہوا اور فارسی کے مرکز میں بھی زندگی نہیں گزاری۔ یہ استعداد ہے۔ لہٰذا اقبال کی ایک شاعر کے عنوان سے تعریف کرنا یقیناً انکو چھوٹا کرنا ہے۔

اقبال ایک عظیم مصلح اور حریت پسند ہیں اور اگرچہ حریت پسندی اور سماجی اصلاح میں اقبال کا رتبہ بہت اہم ہے لیکن اقبال کو صرف سماجی مصلح نہیں پکارا جاسکتا ہے کیونکہ اسی برصغیر میں اقبال کے ہمعصروں میں کچھ ہندو اور مسلمان لوگ ہندوستان کے سماجی مصلح مانے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کو ہم پہچانتے ہیں اور ان کی تصنیفات موجود ہیں اور ان کی جدوجہدوں کا علم ہے۔

خود مسلمان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مرحوم قائد اعظم (محمد علی جناح) جیسی نمایاں شخصیتیں اور دیگر شخصیتیں موجود تھیں جن کی زندگی کے ایام بھی اقبال کی حیات کی مانند تھے۔ اور وہ لوگ ایک ہی نسل اور ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ اور حریت پسندوں اور مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن اقبال ان سب سے بڑے ہیں اور اقبال کے کام کی عظمت کا ان میں سے کسی سے بھی موازنہ نہیں کیا جاسکتا یعنی زیادہ سے زیادہ اہمیت اور قدر جو ہم مولانا ابوالکلام کے لیے قائل ہیں جو ایک نمایاں شخصیت رکھتے ہیں اور حقیقتاً ان کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے، یا مولانا شوکت علی کے سلسلے میں ہم جس اہمیت کے قائل ہیں یہ ہے کہ یہ لوگ انتھک مسلمان مجاہد تھے جنھوں نے اپنے ملک سے برطانیہ کو نکالنے کے لیے برسہابرس کوشش کی اور اس سلسلے میں بہت زیادہ جدوجہد کی۔ لیکن اقبال کا مسئلہ صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی دنیا اور مشرق کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اقبال کی تیز نگاہیں کس طرح اس تمام دنیا کی طرف متوجہ ہیں جو ظلم وستم کا شکار ہے۔ اور ان کی توجہ اسلامی دنیا کے تمام گوشوں کی جانب ہے۔ اقبال کے لیے مسئلہ صرف مسئلہ ہند نہیں ہے لہٰذا اگر اقبال کو ایک اجتماعی مصلح بھی پکاریں تو حقیقت میں — ہم اقبال کی پوری شخصیت کو بیان نہیں کرتے اور مجھے وہی لفظ اور عبارت نہیں ملتی جس سے ہم اقبال کی تعریف کرسکیں۔

لہٰذا آپ دیکھیے کہ یہ شخصیت، یہ عظمت اور اس عظیم انسان کی ذات اور اس کے ذہن میں معانی کی یہ گہرائیاں کہاں اور ہمارے لوگوں کو انکے سلسلے میں واقفیت کہاں اور حق تو یہ ہے کہ ہم اقبال کی شناخت کے مسئلے سے دور ہیں۔

بہرحال یہ سیمنار ان بہترین کاموں میں سے ہے جو انجام پایا لیکن اس پر بھی اکتفا نہیں کرنا چاہیے اور میں ثقافت اور اعلیٰ تعلیمات کے محترم وزیر اور یونیورسٹی سے منسلک بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملک میں اقبال کے نام پر فاؤنڈیشنوں کے قیام اور یونیورسٹیوں، ہالوں اور ثقافتی اداروں کے ناموں کو اقبال کے نام پر رکھنے کی فکر میں رہیں۔ جس طرح کہ اس غزل میں جو جناب ڈاکٹر مجتبوی نے پڑھی اور آپ نے سنی۔ اقبال ایرانی عوام سے اپنے لگاؤ کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
اے جوانان عجم جان من و جان شما

اور آخر میں کہتے ہیں

می رسد مردی کہ زنجیر غلامان بشکند　　　دیده ام از روزن دیوار زندان شما

اور یہ میری اس بات کی تائید ہے جو اقبال کے ایران نہ آنے کی وجہ کے بیان میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

وہ اس جگہ کو زندان سمجھتے ہیں اور قیدیوں سے مخاطب ہو کر بولتے ہیں۔ اقبال کے دیوان میں بہت سی مثالیں ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان سے ناامید ہو چکے ہیں (کم از کم اپنے زمانے کے ہندوستان سے) اور ایران کی جانب متوجہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مشعل کو جس کو انہوں نے جلا رکھا ہے، ایران میں مزید شعلہ ور کریں اور انہیں اس بات کی امید ہے کہ یہاں پر کوئی معجزہ رونما ہو۔ یہ اقبال کا ہم پر حق ہے اور ہمیں چاہیئے کہ اس حق کا احترام کریں۔

اب رہی بات اقبال کی شخصیت کی تو اگر ہم اقبال کی شناخت کرنا چاہیں اور اقبال کے پیغام کی عظمت کو جاننا چاہیں تو ہمیں خواہ نخواہ اقبال کے دور کے برصغیر کو اور اس دور کو پہچاننا پڑے گا جو اقبال کے دور پر ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس شناخت کے بغیر نہ تو اقبال کے پیغام کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی سازو نوائے اقبال اور ان کے سوز دروں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال کے دور میں برصغیر اپنے سخت ترین ایام سے گذر رہا تھا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یعنی مسلمانوں کے انقلاب کی انگریزوں کے ذریعہ سرکوبی کے بیس سال بعد۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت اور برصغیر میں اسلام کی حکم فرمائی پر زبردست وار کیا۔ ہندوستان میں عظیم بغاوت رونما ہوئی اور شاید یہ بغاوت تقریباً دو تین سال تک جاری رہی۔ اس کا عروج ۱۸۵۷ء کے اواسط میں تھا انگریزوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اس وار کو جو تقریباً ستر اسی سال سے ہندوستان میں اسلام کے پیکر پر کر رہے تھے، اچانک فیصلہ کن طور پر اور اپنے خیال میں وہاں سے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا۔ یعنی اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کو جو اپنی کمزوری کے دن گزار رہی تھی ختم کر دیا۔ برصغیر ہند میں سامراج کی راہ کی واحد رکاوٹ وہی مسلمانوں کی حکومت تھی جس کو انھوں نے طویل عرصے سے ادھر ادھر سے کمزور بنا دیا تھا۔ اس کے بہادر سرداروں اور عظیم شخصیتوں کو ختم کر دیا تھا تا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی گہری جڑوں کو کمزور بنائیں اس کے بعد یک بارگی اس تناور اور قدیمی درخت کو جس کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں اور جس کا محافظ بھی نہیں رہا تھا اور اکیلا رہ گیا تھا

کاٹ کر ختم کر دیا۔ اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا جزو جانا۔

۱۸۵۷ء ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل کامیابی کا سال تھا۔ اور اس کے بعد کہ انگریزوں نے ہندوستان کا باضابطہ طور پر برطانیہ سے الحاق کر لیا اور اپنے ملک کا نام سلطنت برطانیہ و ہند رکھ لیا، ہندوستان کے کالونی ہونے کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ہندوستان برطانیہ کے صوبوں میں سے ایک صوبہ بن گیا۔ لہٰذا اپنے مستقبل کی فکر میں پڑ گئے تا کہ اس ملک میں ہر قسم کی بغاوت اور قومی یا مذہبی عظمت کے اجارے کے امکانات کو ختم کر دیں۔ اس کا راستہ یہی تھا کہ مسلمانوں کا مکمل طور پر قلع قمع کریں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں ان سے مقابلہ کرنے والے مسلمان ہیں اور انھوں نے اس کا تجربہ کیا تھا۔

مسلمانوں نے انیسویں صدی کی ابتداء بلکہ اس سے پہلے بھی ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اٹھارویں صدی کے آخری حصے میں ٹیپو سلطان انگریزوں کے ہاتھوں قتل یا شہید ہوئے لیکن عوام، علماء اور مسلمان قبائل نے انیسویں صدی کے ابتداء سے انگریزوں اور ہندوستان کے ان پٹھوؤں سے جو اس وقت سکھ تھے جنگ لڑی اور اس بات سے انگریز بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں میں سے ان لوگوں نے جو ہندوستانی مسائل سے واقف تھے کہا تھا کہ ہندوستان میں ہمارے دشمن مسلمان ہیں اور ہمیں ان کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ لہٰذا انگریزوں کے کامیابی کے سال یعنی ۱۸۵۷ء سے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے ایک نہایت ظالمانہ اور سنگدلانہ پروگرام شروع ہو گیا جس کا ذکر ہر جگہ آیا ہے اور یہاں پر اس کا ذکر طوالت کا سبب بنے گا۔ وہ لوگ جو مزید معلومات کے خواہاں ہیں اس سلسلے میں لکھی گئی متعدد کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مالی اور ثقافتی لحاظ سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا تھا اور سماجی شعبوں میں انکی بہت تحقیر کی جاتی تھی۔ انگریز اعلان کرتے تھے کہ وہ لوگ جو چاہتے ہیں ملازمت حاصل کریں انکو مسلمان نہیں ہونا چاہیئے۔ جب ایک معمولی سی تن خواہ پر کچھ لوگوں کو ملازم رکھتے تھے اس وقت مسلمانوں کو ملازم رکھنے سے دریغ کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں مسجدوں اور اسلامی مدرسوں کو چلانے والے تمام موقوفات کو جو بہت زیادہ تھے، اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہندو تاجروں کو ورغلایا کہ مسلمانوں کو بھاری بھاری قرضیں دیں تا کہ دیئے جانے والے قرضے کے بدلے انکی جائدادوں کو لے لیں اور انکے زمین سے تعلق اور صاحب خانہ ہونے کے احساس کو بالکل ختم کر دیں۔ سالہا سال تک یہ کام جاری رہا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ انکے اچھے سلوک کا حصہ اور اس سے بدتر یہ تھا کہ انکو بے دریغ قتل کرتے تھے اور بے دریغ جیل میں ڈالتے تھے۔ تمام ان لوگوں کی جن پر انگریزوں کے خلاف اقدامات کرنے کا ذرا سا بھی شک ہوتا سخت سرکوبی کرتے تھے اور ان کو نابود کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ

سالہا سال تک جاری رہا۔ ان سخت تکلیف دہ حالات کو دس بیس سال گذر جانے کے بعد، کہ جس کی مثال اور حقیقت کسی بھی اسلامی ملک میں مجھے نظر نہیں آئی۔ اگر چہ ممکن ہے کہ ہو لیکن میں نے دنیا کے ان ممالک کے مختلف علاقوں میں جہاں سامراج موجود رہا ہے مثلاً الجزائر اور افریقی ممالک ہیں جہاں بھی نظر ڈالی ہے مجھے نہیں یاد کہ مسلمانوں پر اتنا دباؤ دیکھا ہو جتنا کہ ہندوستان میں ڈالا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے چارہ جوئی کی فکر کی اور انگریزوں سے مقابلہ کا سلسلہ مسلمانوں میں ختم نہیں ہوا تھا۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہندوستان کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمان انگریزوں کے مقابلے میں نمایاں ترین اور اصلی ترین عامل تھے اور واقعاً ناشکری ہوگی اگر ہندوستان اپنے اوپر مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کردے کیونکہ وہاں پر وجود میں آنے والے عظیم انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کی وجہ بننے والی جد وجہد میں مسلمان اپنی حریت پسندی کی خاطر کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے برسوں میں جب ہر جگہ خاموشی تھی مجاہد مسلمان عناصر مختلف جگہوں پر اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیکن ان میں دو قسم کی تحریکیں تھیں یا تو ثقافتی سیاسی تھی یا صرف ثقافتی تحریکیں تھیں۔ مسلمانوں کی یہ دو تحریکیں چارہ جوئی کے لیے جاری تھیں۔ ان دونوں تحریکوں میں سے ایک تحریک علماء کی تحریک تھی اور دوسری سرسید احمد خاں کی تحریک اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں۔ یہاں پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں لیکن مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ علماء کی تحریک انگریزوں سے مقابلے اور ان سے تعلقات ختم کرنے اور ان کے اسکولوں میں شریک نہ ہونے اور انگریزوں سے کسی قسم کی مدد نہ لینے کی طرفدار تھی اور سرسید احمد خاں کی تحریک اس کے برخلاف انگریزوں سے مصالحت کرنے ان کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے، انگریزوں سے مسکرا کر پیش آنے اور ان سے سمجھوتہ کرنے کی حامی تھی۔ یہ دو تحریکیں ایک دوسرے کے مد مقابل تھیں۔ اور افسوس کہ آخر کار دونوں تحریکیں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ پہلی تحریک جو علماء کی تحریک تھی اور جس کی قیادت ایسے بڑے علماء کے ہاتھوں میں تھی جو تاریخ ہند کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔ یہ مقابلہ کرتے تھے اور ان کی جدوجہد درست تھی لیکن ان ابتدائی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے تھے جو ہندوستان میں اسلامی معاشرے کو جدید ترقیات کے حصول میں مدد کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے مدرسوں میں انگریزی زبان کو ہرگز بھی داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور شاید اس وقت ان کو اس کا حق پہنچتا تھا کہ ایسا سوچیں کیونکہ انگریزی زبان کو فارسی زبان کا جو مسلمانوں کی محبوب زبان اور صدیوں تک برصغیر میں سرکاری زبان تھی، جانشین بنا دیا تھا۔ اور یہ لوگ انگریزی زبان کو حملہ آور کی زبان سمجھتے تھے۔ لیکن بہرحال انگریزی کا نہ سیکھنا اور اور نئی ثقافت کی جانب جو آخر کار لوگوں

کی زندگی کے شعبوں میں داخل ہو رہی تھی توجہ نہ دینا اس بات کا سبب بنا کہ امت اسلامی اور ملت مسلمان ثقافت معلومات عصری قوتوں اور عصری علوم میں جو تمام معاشروں کے لیے (جو جدید بننے کی جانب بڑھ رہے تھے) موثر اور مفید ہیں پیچھے رہ جائے، مسلمان کو ان علوم سے دور رکھتے تھے لیکن سید احمد خاں کی تحریک زیادہ خطرناک تھی اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر سید احمد خان کے بارے میں اپنے قطع فیصلے کو بیان کروں۔ ممکن ہے کہ موجود بھائیوں میں سے بعض اس بات کے قائل نہ ہوں۔ سید احمد خاں نے یقینی طور پر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں کوئی کام نہیں کیا اور میرا عقیدہ ہے کہ اقبال کی تحریک ہندوستان میں اس کام کے خلاف فریاد تھی جس کا پرچم سرسید احمد خاں نے اٹھایا تھا۔ سید احمد نے انگریزوں سے مصالحت کو بنیاد بنائی اور انکا بہانا یہ تھا کہ آخر کار ہمیں مسلمان نسل کو جدید ثقافت میں داخل کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہم ان کو ہمیشہ کے لیے جدید تہذیب سے ناواقف اور دور نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا انگریزوں سے مصالحت کرنی چاہیے تا کہ ہم پر سختی نہ کریں اور ہماری عورتیں بچے اور مرد انگریزوں سے دشمنی کی خاطر اسقدر تکلیف نہ اٹھائیں۔

وہ سادہ لوحی کے ساتھ خیال کرتے تھے کہ انگریزوں سے تواضع، مصالحت اور اظہار عقیدت کے ذریعہ ان تجربہ کار خبیث سیاستدانوں کی توجہ کو مبذول کرا سکتے ہیں اور ان کی ایذا رسانیوں کو کم کر سکتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سید احمد خاں اور ان کے قریبی لوگ نیز وہ روشن خیال لوگ جو انکے اردگرد تھے انگریزوں کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ لیکن مسلمانوں کو ہندوستان سے آزاد ہونے یعنی ۱۹۴۷ء تک انگریزوں سے ہمیشہ ہی نقصان پہنچا اور انگریزوں نے اس نوے سال کی مدت میں (۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی آزادی کے سال ۱۹۴۷ء تک) مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر سکے کیا۔ لہٰذا انگریزوں کو رام کرنے کے لیے سید احمد خاں کا حیلہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا سبب بنا اور اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا جو اقبال کی شناخت اور اقبال کے پیغام کے مضمون کو سمجھنے میں موثر ہے اور وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں، مسلمان روشن خیالوں اور ان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو سماجی میدان میں داخل ہوتے تھے آگاہی، علم و معرفت، حصول علم اور عہدہ اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اسلامی تشخص کو ہرگز بھی اہمیت نہیں حاصل تھی اور تدریجی طور پر ہندوستان کے عظیم مسلمان معاشرے میں جو دنیا کے عظیم ترین مسلمان معاشروں میں سے تھا (اور اس وقت بھی کوئی ملک ایسا نہیں جس کے مسلمانوں کی تعداد اس زمانے کے برصغیر کے مسلمانوں کے برابر ہو) ــــــــ وہ اسلامی تشخص کا احساس نہیں رکھتے تھے اور اپنے لیے اسلامی شخصیت کے قائل نہ تھے۔ اور بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں مستقبل کے لیے کوئی

امید ہی نہیں تھی۔ چونکہ انھوں نے بہت تکلیفیں برداشت کی تھیں اور انکی تحقیر کی گئی تھی۔ تمام حادثات اور واقعات انکی ناامیدی، تلخ کامی اور بدفرجامی کی نشاندہی کرتے تھے اور اب حقارت ہندوستانی مسلمان کی ذات کا جز بن گئی تھی اور ذلت و ناتوانی کا احساس ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کے اجزاء میں شمار ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں جب اقبال احتمالاً ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں یورپ سے جدید تہذیب سے جھولی بھر کے لوٹے تھے، اس وقت اقبال کے ہم عصر روشن خیال اور ہم نوا (خود ان کے قول کے مطابق) مغربی تہذیب پر نظریں جمائے ہوئے تھے ان شخصیتوں کی مانند جن کی طرف جناب مجتبوی نے میرے حوالے سے اشارہ کیا ہے، ایران میں تھیں اپنا اعتبار اس چیز میں دیکھتی تھیں کہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب سے کچھ زیادہ ملائیں اور مغربی اقتدار کے نظام کو اپنے عمل، اپنی روش، لباس بات چیت، اور حتی اپنے افکار اور نظریات میں زیادہ جلوہ گر کریں۔ اس برطانوی حکومتی مشینری کی غلامی جو اس وقت ہندوستان پر طاقت کے ساتھ حکومت کر رہی تھی، مسلمانوں کے لیے فخر تھی اور ہندو جو مسلمانوں سے چند سال پہلے اسی تہذیب اور انہی آداب و رسومات میں داخل ہو گئے تھے اور جنھوں نے انگریزوں سے میل جول کو بہت پہلے ہی اختیار کر لیا تھا اور اسی وجہ سے صنعت، ثقافت اور انتظامی امور میں کچھ پہلے شامل ہو گئے تھے، ان کا اعتبار تھا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے بھی ذلت اور زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ سکھ بھی اگر چہ بہت چھوٹی اقلیت رکھتے تھے مسلمانوں پر ظلم کرتے تھے اور وہ قابل فخر چیزیں جو ہندوؤں کو اپنشدوں اور اپنے تاریخی اور تہذیبی ماضی سے حاصل تھیں سکھوں کی زندگی میں نہیں تھیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک نیا قائم ہونے والا مذہب ہے جس میں اسلام اور ہندوازم نیز دوسری چیزوں کی آمیزش ہے، یہ سکھ بھی مسلمانوں کی تحقیر کرتے تھے اور انکی توہین کرتے تھے۔ یہ تھی اقبال کے زمانے میں برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشرے کی صورتحال۔ اسی لاہور کی یونیورسٹی میں جہاں پر اقبال نے تعلیم حاصل کی اور بی۔ اے کیا۔ ہم امید بخش اسلامی افکار کے ظہور کی کوئی علامت نہیں دیکھتے وہاں پر سب سے بڑی اسلامی کتاب سر تھامس آرنولڈ کی کتاب ہے (الدعوۃ الی الاسلام نامی کتاب) جو عربی زبان میں ہے اور حال ہی میں اس کا فارسی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ یہ سر تھامس آرنولڈ کے اس دور کے کاموں میں سے ہے جب وہ لاہور کی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ البتہ یہ کتاب ایک اچھی کتاب ہے اور میں اس کو مسترد نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی جہاد کو تدریجی طور پر ایک دوسرے درجے کی چیز بتائیں۔ لہٰذا اس کتاب کا آئیڈیا یہ ہے کہ اسلام، دعوت سے پھیلا ہے، نہ کہ تلوار سے اور یہ

ایک اچھی بات ہے لیکن وہ اس خیال میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسلامی جہاد اس کتاب میں تقریباً دوسرے درجے کی ایک چیز اور ایک بے فائدہ اور شاید زائد چیز نظر آتی ہے۔

اس کتاب کے اسلامی کام کا ماحصل یہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ صاحبان اور خواتین جنھوں نے سر تھامس آرنولڈ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جانتے ہیں کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسلام کا زبردست حامی سمجھا گیا ہے اور وہ اقبال کے استاد ہیں اور اقبال انکے شاگردوں میں شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ میں یہیں پر اس بات کا ذکر کردوں کہ اس عظیم انسان کی ہوشیاری سے علامہ اقبال باوجود اس سے کہ سر تھامس آرنولڈ سے سخت محبت کرتے تھے ان کے کاموں میں سیاسی افکار سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

اس بات کو جناب جاوید اقبال نے اپنے والد کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ اس کی ایک جلد فارسی میں ترجمہ ہوچکی ہے اور میں نے دیکھا ہے۔ اقبال اپنے دوست سید نذیر نیازی کو جو سر تھامس آرنولڈ کو ایک اسلام شناس جانتے ہیں، خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کونسی اسلام شناسی؟ تم ان کی کتاب ''الدعوۃ الی الاسلام'' کی بات کرتے ہو؟ وہ حکومت برطانیہ کے لیے کام کرتے ہیں اور بعد میں اقبال اپنے اس دوست سے کہتے ہیں: جب میں برطانیہ میں تھا تو آرنولڈ نے مجھ سے کہا کہ ایڈورڈ براؤن کی تاریخ ادبیات کا ترجمہ کروں اور میں نے یہ کام نہیں کرنا چاہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ کتاب سیاسی مقاصد سے آمیختہ ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ ایڈورڈ براؤن کی کتاب کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے اور ہمارے ادیبوں کا نظریہ، ایڈورڈ براؤن کے دوستوں اور ان لوگوں کو جو ایڈورڈ براؤن کی دوستی پر فخر کرتے تھے دیکھنا چاہئے کہ ان کا نظریہ کیا ہے؟ اور میں اس وقت ان شخصیتوں کا نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ بہر حال ادبی اور ثقافتی شخصیتیں ہیں، لیکن سادہ دل، ناآگاہ اور ان سیاسی مقاصد سے بے خبر ہیں لیکن اقبال وہ ہوشیار مرد اور ''المومن کیس'' کی مانند خبیث استعماری سیاست کی ریشہ دوانیوں کو تھامس آرنولڈ اور ایڈورڈ براؤن کے کاموں میں پہچانتے ہیں دیکھتے ہیں اور یہ بات اقبال کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس زمانے میں برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ حکومت برطانیہ، حکومت برطانیہ کے اصلی ایجنٹ اور دوسرے درجے کے ایجنٹ (یا اہمیت کے لحاظ سے زیادہ اعلیٰ درجہ نہ رکھنے والے) زیادہ تر ہندو تھے اور ہندوستان کی جدوجہد جس کی مشعل کو ابتدا میں مسلمانوں نے روشن کیا کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں چلی گئی اور وہ بھی متعصب کانگریس پارٹی کے۔ انڈین کانگریس نے جس نے آخر کار جدوجہد کے میدان میں عظیم کارنامے بھی انجام دیئے، لیکن ان برسوں میں اس پر اسلام سے مخالفت کا تعصب، ہندوؤں کی جانب جھکاؤ اور مسلمانوں کی مخالفت کا تعصب حکم فرما تھا اور مسلمانوں میں

روشن خیال لوگ مغرب پرست اور مغربی نظام کے والہ وشیدا تھے اور عام معمولی لوگ شرمناک غربت اور سخت تکلیف دہ زندگی کے شکار تھے اور اپنی معمولی روٹی کو بھی مشکل سے حاصل کرتے تھے۔اس کے علاوہ اس ماحول اور فضا میں کھوئے ہوئے تھے جس کو انگریز زیادہ سے زیادہ مغربیت کی جانب لے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے اس زمانے کے مسلمان علماء ان ابتدائی شکستوں کے بعد زیادہ تر الگ تھلگ اور حریت پسندی اور تحرک کے ناقابل فہم افکار اور جلوؤں میں کھوئے ہوئے تھے (سوائے ان علماء کے جو آگے آگے تھے مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور ہندوستان کے دیگر نمایاں حیثیت رکھنے والے علماء) عام مسلمان عوام اس قسم کی سخت تکلیف دہ حالت میں زندگی گذار رہے تھے، اسلام سیاسی علیحدگی اور اقتصادی غربت میں تھا اور مسلمان عوام ہندوستانی معاشرے میں ایک ایسے طفیلی اور زائد رکن کی حیثیت رکھتے تھے کہ اس تاریک رات میں جس میں ان کا کوئی بھی ستارہ نہ تھا، اقبالؒ نے خودی کی مشعل روشن کی۔ البتہ ہندوستان کی یہ حالت جو میں نے بیان کی صرف ہندوستان کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ایسی ہی حالت تھی، یہی وجہ تھی کہ اقبال نے ساری دنیا کی فکر کی۔ البتہ اس زمانے کے لاہور اور بدبخت برصغیر میں اقبال کی روزمرہ کی زندگی نے ان کے لیے ہر چیز کو قابل لمس بنا دیا تھا۔ یہ ایسی حالت میں تھا کہ اقبال نے ترکی، ایران اور مثلاً حجاز کا سفر نہیں کیا تھا اور بہت سی دوسری جگہوں کو قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اپنے ملک کی صورتحال کو قریب سے دیکھ رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ثقافتی، انقلابی اور سیاسی انقلاب برپا کیا۔ پہلا کام جو اقبال کے لیے انجام دینا ضروری تھا یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے کو اسلامی تشخص، اسلامی من اور اسلامی شخصیت بلکہ اس کے انسانی شخصیت کی جانب متوجہ کریں اور کہیں کہ تو ہے تو کیوں اس قدر غرق ہے؟ کیوں اس قدر مجذوب ہے؟ تو نے کیوں اپنے آپ کو اس قدر کھو دیا ہے؟ اپنے آپ کو پہچان۔

یہ اقبال کا پہلا مشن ہے۔ آخر وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتے تھے؟ کیا دسیوں کروڑ کی ایک قوم سے جو سالہا سال تک سامراج کے کوڑوں کے سخت دباؤ میں تھی اور جہاں تک ممکن تھا اس کی ناک کو رگڑا گیا اور اس سے سمجھنے، جاننے اور امید رکھنے کے امکانات کو چھین لیا گیا تھا۔ یکبارگی کہا جا سکتا ہے کہ تو ہے اور وہ بھی ہونے کا احساس کرلے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ بہت دشوار کام ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی شخص بھی اقبال کی حد تک اور جس طرح کہ اقبال نے بیان کیا ہے اس بات کو اتنی خوبی کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا تھا۔

اقبال نے ایک فلسفہ کی بنیاد رکھی: خودی کا فلسفہ ہمارے ذہن کے مدنظر فلسفوں کی قسم کا نہیں۔ خودی کا ایک سماجی اور انسانی مفہوم ہے جو فلسفیانہ تعبیرات کے لباس میں اور ایک فلسفیانہ بیان کے لحن میں

بیان ہوا ہے۔ اقبال کو اپنی نظم، اپنی غزل اور اپنی مثنوی میں خودی پر ایک اصول اور ایک مفہوم کی حیثیت سے زور دینے کے لیے اس چیز کی ہے کہ اس خودی کو فلسفیانہ طور پر بیان کریں۔ اقبال کے مدنظر مفہوم میں خودی کا مطلب شخصیت کا احساس، شخصیت کا سمجھنا، خودنگری، خوداندیشی اور خود کا ادراک ہے۔ البتہ وہ اس بات کو ایک فلسفیانہ بیان اور فلسفیانہ مفہوم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ میں بہت سارے نوٹ لایا ہوں تا کہ اگر ممکن ہوا تو ان میں سے بعض کو پڑھوں۔ اگر چہ یہ جلسہ طویل ہو گیا ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ تحمل سے کام لیں۔

میرے خیال میں خودی کا مسئلہ اقبال کے ذہن میں پہلے ایک انقلابی فکر کی شکل میں آتا ہے۔ اور بعد میں وہ اس فکر کو فلسفیانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور خودی وہی چیز ہے جس کی ہندوستان میں ضرورت تھی اور مجموعی نقطۂ نگاہ سے اسلامی دنیا میں اس کی ضرورت تھی یعنی ملل اسلامی اگر چہ اسلامی نظام کی حامل تھیں لیکن انہوں نے اس چیز کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اور مکمل طور پر فریب کھا کر اقدار کے ایک غیر ملکی نظام کے والہ وشیدا اور معتقد ہو گئے تھے اور ضروری تھا کہ وہ اپنی جانب لوٹیں یعنی اسلامی اقدار کے نظام کی جانب لوٹیں یہ وہی مفہوم ہے جس کے لیے اقبال کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے سماجی مفہوم کا ایسی شکل میں بیان کرنا کہ ذہنوں میں جاگزیں ہو سکے، فلسفیانہ بیان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس مفہوم کو فلسفیانہ بیان کی شکل دیتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں ان عبارتوں کو پڑھوں جو میں نے نوٹ کی ہیں۔

اقبال کے ذہن میں ''خودی'' کا خیال ابتدا میں ایک سماجی اور انقلابی فکر کی شکل میں آیا اور تدریجاً اقوام مشرق (خصوصاً مسلمانوں) میں شخصیت کے انحطاط و زوال اور مصیبت کی عظمت کا مشاہدہ اور ان کے علل واسباب اور علاج کی شناخت نے اس فکر کو ان کے وجود میں مستحکم اور ناقابل خلل بنا دیا اور اس کے بعد ان کو اس فکر کو پیش کرنے کے طریقے کی جستجو میں ایک فلسفیانہ اور ذہنی بنیاد ملی۔ یہ بنیا دخودی کے مفہوم کا تصور ہے عام شکل میں (اس چیز کی مانند جس کو ہمارے فلسفی وجود کے مفہوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یعنی ایک عام مفہوم جو سب میں ہے اور اس کو فلسفیانہ طور پر بیان کیا جا سکتا ہے) البتہ وجود ''خودی'' سے مختلف چیز ہے اور خودی کا مطلب وجود بتانا (میں نے دیکھا ہے کہ اقبال کے اشعار پر حاشیہ لکھنے والوں میں سے بعض نے لکھا ہے) میرے خیال میں ایک بڑی غلطی ہے اور وہ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت جس کو اقبال رموز بے خودی میں کئی بار تکرار کرتے ہیں، ملا صدرا اور دیگر فلسفیوں کے وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے نظریے سے مختلف ہے۔ یہ کچھ اور چیز ہے اور مجموعی طور پر اقبال کے مدنظر مفاہیم سو فیصد انسانی اور اجتماعی مفاہیم ہیں (البتہ میں جو عرض کر رہا ہوں اجتماعی، اس کا مطلب

فرد کے بارے میں بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ خودی کی بنیاد فرد میں مستحکم ہوتی ہے لیکن خود فرد میں خودی کی خودیت اور فرد میں خودی کی شخصیت کا استحکام بھی اسلام کے اجتماعی مفاہیم میں سے ایک ہے اور جب تک خودی کی وہ شخصیت مستحکم نہ ہو، حقیقی اور مستحکم شکل میں اجتماع اور معاشرہ وجود میں نہیں آتا۔)

بہر حال خودی کے معنی وجود سے مختلف ہیں۔ وہ اول خودی کے مفہوم کی عمومیت کے بارے میں عرفاء کی زبان میں اور عرفاء کی مانند تعبیرات میں گفتگو کرتے ہیں: عالم ہستی کی جلوہ گری خودی کے اثرات میں سے ہے۔ میئیات کے عالم میں سے ہر ایک خودی کے مفہوم کے ایک جلوے کی نشاندہی کرتی ہے (البتہ ان چیزوں کو اقبال نے اکثر نظموں کے عنوانات میں ذکر کیا ہے جس کو میں نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بعض تعبیرات ایسی ہیں جن کو خود انہوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور ان کا کلام ان تعبیرات سے بہت بہتر ہے) افکار کا سرچشمہ بھی خودی کے مختلف جلوں میں خود آگہی ہے۔ ہر مخلوق میں خودی کا اثبات اس کے علاوہ کا بھی اثبات ہے۔ (جب کسی انسان میں خودی کا اثبات ہوتا ہے۔ یہ خود بخود دوسری چیز کا بھی اثبات ہے۔ لہذا خودی موجود ہے اور ایک دوسری چیز بھی۔ لہذا اس کے علاوہ کا بھی اثبات ہے) لہذا گویا کہ ساری دنیا خودی میں شامل ہے اور ممکن ہے۔ خودی دشمنی کا بھی سبب بنتی ہے اور درحقیقت خودی اپنی ضد سے برسر پیکار ہوتی ہے۔ یہ کشمکش دنیا میں دائمی پیکار کو جنم دیتی ہے۔ خودی زیادہ صالح کے انتخاب اور زیادہ شائستہ کی بقاء کی عامل بھی ہے اور اکثر ایک والاتر و برتر خود کے لیے ہزاروں خود فدا ہو جاتے ہیں۔ خودی کا مفہوم ایک مشکوک مفہوم ہے اس میں قوت اور ضعف ہے خودی کی قوت اور ضعف دنیا کی ہر مخلوق میں اس مخلوق کے استحکام کے اندازے کا تعین کرتی ہے۔ اس طرح وہ قطرہ، مے، جام، ساقی، کوہ، صحرا، موج، دریا، نور، چشم، سبزہ، شمع خاموش، شمع گدازان، نگین، زمین، ماہ، خورشید اور درخت کو مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں خودی کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطرے میں خودی کی ایک خاص مقدار ہے۔ نہر میں ایک مقدار اور اس نگینے میں جس پر نقوش کھودے جاسکتے ہیں ایک خاص مقدار اور اس پتھر میں جس پر کوئی کھدائی نہیں کی جاسکتی خودی کی ایک خاص مقدار موجود ہے۔ یہ ایک مشکوک مفہوم ہے جو قابل شک ہے اور انسانی افراد اور اشیائے عالم میں مختلف مقدار میں موجود ہے۔ وہ بعد میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

چوں خودی آرد بہم نیروی زیست — می گشاید قلزمی از جوی زیست

(بعد میں وہ آرزو مند ہونے اور مدعا رکھنے کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں اور یہ بالکل وہی چیز ہے جو اس زمانے کی اسلامی دنیا میں نہیں تھی یعنی مسلمانوں کو کسی چیز کا دعویٰ نہیں تھا، ان کی کوئی بڑی آرزو

نہیں تھی اوران کی آرزوئیں زندگی کی معمولی اور حقیر آرزوئیں تھیں)

وہ کہتے ہیں کہ ایک انسان کی زندگی کا دارومدار مدعا رکھنے اور آرزو رکھنے پر ہے ایک شخص کی خودی یہ ہے کہ وہ آرزومند ہو اور اس آرزو کی جستجو میں بڑھے (اور مجھے یہ جملہ یاد آ گیا: انما الحیوۃ عقیدۃ و جهاد) وہ اسی مضمون اور اسی مفہوم کو بہت وسیع اور گہرے نیز لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کسی چیز کا چاہنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ہی مدعا ہے ورنہ زندگی موت میں تبدیل ہو جائے گی۔ آرزو، جان جہاں اور صدف فطرت کا گوہر ہے وہ دل جو آرزو پیدا نہ کر سکے پرشکستہ اور بے پرواز ہے اور یہ وہ آرزو ہے جو خودی کو استحکام عطا کرتی ہے اور طوفانی سمندر کی مانند موجوں کو جنم دیتی ہے لذت دیدار ہے جو دیدار دوست کو صورت عطا کرتی ہے، شوخیٔ رفتار ہے جو کبک کو پاؤں عطا کرتی ہے، نوا کی سعی و کوشش ہے جو بلبل کو منقار عطا کرتی ہے، بانسری نواز کے ہاتھ اور ہونٹوں میں بانسری ہے جو زندگی پاتی ہے ورنہ نیستاں میں کوئی چیز بھی عملی طور پر نہیں تھی علم و تمدن، نظم و آداب اور رسومات نیز اصول بھی ان آرزوؤں سے وجود میں آئے ہیں جن کے لیے کوشش کی گئی ہے اور وہ بعد میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم　　از شعاع آرزو تابندہ ایم

(مدعا سازی، آرزو سازی اور ہدف سازی)

یا ایک اور شعر میں اسی موضوع کے بارے میں کہتے ہیں:

گرم خون انسان ز داغ آرزو　　آتش این خاک از چراغ آرزو

اور بعد میں انسانی معاشرے، انسان اور خودی کے استحکام کے لیے عشق و محبت کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، محبت کے بغیر فرد اور معاشرے میں خودی کو استحکام نہیں حاصل ہوتا اور ضروری ہے کہ ملت مسلمان اور وہ انسان جو چاہتے ہیں اپنی خودی کو مضبوط بنائیں، محبت اور عشق رکھتے ہوں اور ان کا دل اس آگ میں پگھلے۔ اس کے بعد دلچسپ ہے کہ خودی ملت اسلامیہ کے عشق کے لیے ایک نقطہ پاتے ہیں اور وہ پیغمبر اکرم محمد مصطفیٰؐ کا عشق۔ یہی وجہ ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ بیدار اور ہوشیار شخص اسلامی دنیا کے اتحاد اور اسلامی دنیا کو تحرک میں لانے کے مسئلے کو کس قدر اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است　　زیر خاک ما شرار زندگی است

از محبت می شود پایندہ تر　　زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

از محبت اشتعال جوہرش　　ارتقائے ممکنات مضمرش

فطرت او آتش اندوزد ز عشق　　عالم افروزی بیاموزد ز عشق

در جہان ہم صلح و ہم پیکار عشق	آب حیوان، تیغ جوہردار عشق
عاشقی آرموز و محبوبی طلب	چشم نوحی، قلب ایوبی عشق
کیمیا پیدا کن از مشت گلے	بوسہ زن بر آستان کاملے

اس کے بعد کہتے ہیں: اب وہ معشوق ومحبوب جس سے مسلمان کو لگاؤ رکھنا چاہیے اور جس کا عاشق ہونا چاہیے، کون سی ہستی ہے؟

ہست معشوقی نہان اندر دلت	چشم اگر داری بیا بنمائیمت
عاشقان او ز خوبان خوب تر	خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشق او توانا می شود	خاک، ہمدوش ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد	آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دل مسلم مقام مصطفیؐ است	آبروی ما ز نام مصطفیؐ است
طور موجے از غبار خانہ اش	کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنون خواب راحتش	تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستان سرا خلوت گزید	قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم	تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں کچھ تشریح کرتے ہیں اور ان کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں۔ البتہ اقبال کے پورے دیوان میں اور ان کے سارے کلام میں انسان پیغمبرؐ سے عشق کو دیکھتا ہے اور صرف اسی جگہ کے لیے مخصوص نہیں ہے اور اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ ایک کتاب جس کو پاکستان کے ہم عصر محقق نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے اور اس متین وموثر کتاب کا نام ''اقبال درراہ مولوی'' ہے۔ یہ کتاب مجھے اپنے حالیہ دورے میں ملی اور میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، میں نے دیکھا کہ اس میں لکھا ہے: جب بھی کوئی نظم یا شعر جس میں پیغمبرؐ کا نام ہوتا اور اقبال کو سنایا جاتا تو اقبال کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے اور درحقیقت وہ خود پیغمبر اکرمؐ کے عاشق تھے۔

حقیقت میں اقبال نے ایک اچھے نکتے پر انگلی رکھی ہے۔ دنیائے اسلام پیمبرؐ سے زیادہ محبوب اور مقبول عام کونسی ہستی تلاش کرسکتی ہے؟ اور یہ چیز دنیائے اسلام کی تمام محبتوں کو مرکزیت عطا کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ گفتگو کے بعد حاتم طائی کی بیٹی کی کہانی کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک جنگ میں حاتم طائی کی بیٹی قید میں لے لی گئی اور اسے پیغمبرؐ کی خدمت میں لائے۔ پیغمبرؐ نے جب اس قیدی لڑکی کے سر یا بدن

کوعریاں دیکھا تو پیغمبرؐ نے اس بڑے اور اچھے خاندان کی لڑکی کی عریانیت کو پسند نہیں کیا اور اپنی عبا اٹھا کر اس لڑکی پر ڈال دی تاکہ وہ سرنگوں اور شرمسار نہ ہو اور اس کے بعد کہتے ہیں:

ما از آن خاتون طی عریان تریم پیش اقوام جہان بی چادریم
روز محشر اعتبار ماست او در جہان ہم پردہ دار ماست او
ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم چون نگہ، نور دو چشمیم و یکیم
از حجاز و مصر و ایرانیم ما شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحاستیم در جہان مثل می و میناستیم
چون گل صد برگ ما را بو یکی است اوست جان این نظام و او یکی است

وہ ''اسرار خودی'' میں کوشش کرتے ہیں کہ احساس خودی یعنی انسانی تشخص کے احساس کو مسلمان فرد اور معاشرے میں زندہ کریں۔ اسرار خودی کا ایک اور باب یہ ہے کہ خودی سوال سے کمزور پڑ جاتی ہے یعنی جب ایک فرد یا ایک قوم نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس فرد یا قوم کی خودی کمزور ہو جاتی ہے اور اپنے استحکام کو کھو بیٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ اور پر مغز بحثیں اور بھی ہیں۔ خودی کے بعد بے خودی کا فلسفہ ہے یعنی جب ہم ''خود'' اور ایک انسان کی شخصیت کی تقویت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے اردگرد دیوار کھڑی کرلیں۔ اور خود زندگی گذاریں بلکہ ان تمام خود کو چاہئے کہ ایک معاشرے کے مجموعے میں بے خود ہو جائیں یعنی فرد کو معاشرے سے ارتباط حاصل کرنا چاہیے۔ یہ رموز بے خودی ہے اور رموز بے خودی نامی کتاب اقبال کی دوسری کتاب ہے اور ''اسرار خودی'' کے بعد لکھی اور شائع کی گئی ہے۔ خود اسلامی نظام کے بارے میں اقبال کے خیال کی نشاندہی کرتی ہے اور ایک اسلامی نظام کے قیام کے لیے اقبال کے افکار ہر جگہ موجود ہیں لیکن رموز بے خودی میں ہر جگہ سے زیادہ نظر آتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ مسائل جن کا ذکر رموز بیخودی میں ہے اہم اور دلچسپ موضوعات ہیں اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ان پر توجہ ضروری ہے۔

آج جب ہم اقبال کے افکار رموز بے خودی کے مضامین دیکھتے ہیں تو بالکل انہی علوم و معارف کو دیکھتے ہیں جو ہمارے اسلامی معاشرے پر حکم فرما ہیں۔ اسلام کی ترویج میں امت توحیدی کی ذمہ داری اقبال کے پر جوش ترین نظریات میں سے ایک ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں اور امت اسلامیہ کو جنہیں اسلام کی ترویج کرنی چاہیئے چین سے نہیں بیٹھنا چاہیئے تاکہ اس کام کو انجام دے سکیں۔ مناسب ہوگا کہ اس سلسلے میں ان کے چند اشعار جو بہت دلچسپ ہیں، پڑھ کر سناؤں۔

وہ کہتے ہیں: اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دنیا کے لیے اسلامی امت کا وجود میں آنا ایک آسان کام نہیں تھا اور دنیا بہت تکلیفیں اٹھانے اور تاریخ بہت سے تجربات کرنے کے بعد امت توحیدی پا سکی ہے اور توحیدی نظریے اور اسلامی فکر کی حامل ایک امت وجود میں آ سکی ہے۔

این کہن پیکر کہ عالم نام اوست | ز امتزاج امہات اندام اوست
صد نیستان کاشت تا یک نالہ رست | صد چمن خون کرد تا یک لالہ رست
نقشہا آورد و افکند و شکست | تا بہ لوح زندگی نقش تو بست
نالہ ہا در کشت جان کاریدہ است | تا نوائے یک اذان بالیدہ است
مدتے پیکار با احرار داشت | با خداوندان باطل کار داشت
تخم ایمان آخر اندر گل نشاند | با زبانت کلمۂ ی توحید خواند
نقطۂ ادوار عالم لا الہ | انتہائے کار عالم لا الہ
چرخ را از زور او گردندگی | مہر را تابندگی رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تاب او | موج در دریا تپید از تاب او
شعلہ در رگہائے تاک از سوز او | خاک مینا تابناک از سوز او
نغمہ ہایش خفتہ در ساز وجود | جویدت اے زخمہ در ساز وجود
صد نوا داری چو خون در تن روان | خیز و مضرابے بہ تارا او رسان
زان کہ در تکبیر راز بود تست | حفظ و نشر لا الہ مقصود تست
تا نخیزد بانگ حق از عالمے | گر مسلمانی نیاسائی دمے
می ندانی آیہ ام الکتاب | امت عادل ترا آمد خطاب
آب و تاب چہرۂ ایام تو | در جہان شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجان را صلائے عام دہ | از علوم امیئے پیغام دہ
امیئے پاک از ھوا گفتار او | شرح رمز "ما غویٰ" گفتار او
از قبائے لالہ ہائے این چمن | پاک شست آلودگیہائے کہن

اس کے بعد جب وہ اسلامی نظریے کی آفاقیت کو بیان کرتے ہیں، کہ البتہ ان کی کتاب میں شاید سو بار سے زیادہ اسلام اور مسلمان کی آفاقیت اور اس کے عالمی وطن کا ذکر آیا ہے۔ تو یہاں پر بھی کہتے ہیں: اے امت توحید پرچم تیرے ہاتھ میں ہے، تجھے حرکت کرنی چاہیئے اور دنیا تک پہنچانا چاہئے۔

بعد میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دلفریب جدید بت جسے فرنگیوں نے پیدا کیا ہے، اس جدید بت کو توڑ دے اور خود ہی بتاتے ہیں کہ جدید بت کیا ہے؟

اے کہ میداری کتابش در بغل — تیز تر نہ پا بہ میدان عمل
فکر انسان بت پرستے، بت گرے — ہر زمان در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداختہ است — تازہ تر، پروردگارے ساختہ است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او، رنگ است و ہم ملک ونسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند — پیش پائے ایں بت نارجمند
اے کہ خوردستی زمینائے خلیل — گرمی خونت ز صہبائے خلیل
بر سر این باطل حق پیرہن — تیغ لا موجود الا ھو بزن
جلوہ در تاریکی ایام کن — آنچہ بر تو کامل آمد، عام کن

یہ ہے اسلام کی نشر و اشاعت اور قومیت اور وطن وغیرہ کی سرحدوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ۔ رموز بیخودی میں ایک مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں فرد کے اجتماع سے متصل ہونے اور فرد کے اجتماع میں حل اور جذب ہو جانے کی ضرورت ہے۔

وہ نبوت کو امت کی تشکیل کی اصل بنیاد جانتے ہیں اور کہتے ہیں ایسا نہیں کہ جب افراد ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ایک قوم یا ملت وجود میں آجاتی ہے بلکہ ایک فکر کی ضرورت ہے جو ملیت یا قومیت کے تانے بانے کو یکجا کرے اور بہترین اور بنیادی ترین فکر نبوت کی فکر ہے۔ جس کو خدا کے پیغمبروں نے آکر پیش کیا۔ ملت کی تشکیل کی بنیادوں کو وجود میں لانے کے لیے یہ بہترین چیز ہے کیونکہ یہ اجتماع کو فکر عطا کرتی ہے ایمان عطا کرتی ہے۔ اور اتحاد عطا کرتی ہے۔ نیز تربیت و کمال بخشتی ہے۔

ایک اور مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں خداوندان تخت ومحراب کی بندگی کی نفی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اشعار کا ایک حصہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ بھی سن لیں۔

بود انسان در جہان انسان پرست — ناکس و نابود مند و زیردست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت — باج برکشت خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضوان فروش — بہر این صید زبون دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دون شده — نغمہ ہا اندرونئے او خون شده

تا امینی حق بہ حق داران سپرد — بندگان را مسند خاقان سپرد

یہ اشعار رسول اکرمؐ کی رسالت کی تشکیل انسانوں کے مابین مساوات قائم کرنے اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اور اخوت اسلامی کے بارے میں ہیں۔ خود انہوں نے جس طرح موضوعات اور عنوانات کا ذکر کیا ہے، بہت زیادہ ہیں، اور چونکہ میری گفتگو تفصیلی ہوگئی ہے، مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کروں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ درحقیقت کون سے حصے کا انتخاب کروں اور اس کے بارے میں گفتگو کروں کیونکہ انہوں نے اس قدر زیادہ دلچسپ اور اچھے موضوعات پر گفتگو کی ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو فوقیت دی جائے اور بیان کیا جائے اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے، ہمارے ملک میں علامہ اقبال کے کلام کے شائع کرنے کے سوا یہ کام کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ یہ کام ایسا ہے جسے یہاں بھی، پاکستان اور افغانستان میں بھی ہونا چاہیئے نیز ہر اس جگہ پر جہاں لوگ فارسی سمجھتے ہیں یا ممکن ہے سمجھ سکیں۔ اقبال کے کلام کو جس میں فارسی کا کلام بہترین ہے شائع ہونا چاہئے۔ البتہ جیسا کہ آپ کو علم ہے اقبال کے پندرہ ہزار شعروں میں سے نو ہزار فارسی میں ہیں اور ان کا اردو کلام فارسی سے بہت کم ہے۔ ان کے بہترین اشعار اور کم از کم معنی کے لحاظ سے ان کا اہم ترین کلام وہی ہے جو انہوں نے فارسی میں کہا ہے۔ ان کی کلیات جو شاید بیس سال قبل یہاں پر شائع ہوئی اس پر مزید کام اور محنت کی ضرورت ہے۔

میں جب سے اقبال کے کلام سے آشنا ہوں، دیکھتا تھا کہ اس کلام کی شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ کافی وضاحت نہیں ہے اور مجھے اس بات سے دکھ ہوتا تھا۔ یعنی حقیقت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام انجام پائے اور کچھ لوگ حتیٰ ان لوگوں کے لیے جن کی زبان فارسی ہے علامہ اقبال کے مدنظر مضامین اور مفاہیم کی تشریح کریں۔

آج اقبال کے بہت سے پیغامات ہم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض اس دنیا کے لیے ہیں جو ابھی تک ہمارے راستے پر نہیں آئی ہے اور اس پیغام کو جس کو ہم سمجھ گئے ہیں اس نے نہیں سمجھا ہے۔

اقبال کے ''خودی''۔ کے پیغام کو ہماری قوم نے میدان عمل میں اور حقیقت کی دنیا میں عملی جامہ پہنایا لہٰذا ہماری قوم کے لیے ضرورت نہیں کہ اسے ''خودی'' کا مشورہ دیا جائے۔ ہم ایرانی عوام آج مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، اپنی ثقافت اور اپنی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس تمدن پر جس کو اپنی آئیڈیالوجی اور فکر کی بنیاد پر استوار کر سکتے ہیں۔ البتہ ماضی میں مادی زندگی اور

زندگی گذارنے کے لحاظ سے ہماری تربیت دوسروں کے سہارے پر کی گئی، لیکن ہم تدریجی طور پر اپنے خیموں سے ان غیر ملکی رسیوں کو بھی کاٹ پھینکیں گے اور اپنی ہی رسیوں کا استعمال کریں گے اور ہمیں امید ہے کہ اس کام میں کامیاب ہوں گے۔

مسلمان اقوام کو اس ''خودی'' کو سمجھنے کی ضرورت ہے خاص طور پر مسلمان شخصیتوں کو خواہ وہ سیاسی شخصیتیں ہوں یا ثقافتی شخصیتیں۔ انہیں ضرورت ہے کہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور جان لیں کہ اسلام اپنی ذات میں اور اپنی اصلیت انسانی معاشروں کو چلانے کی اعلیٰ ترین بنیادوں کا حامل ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسری ثقافتوں کے لیے دروازہ بند کردیں اور ان کو اپنی طرف جذب نہ کریں۔ جی ہاں ہمیں جذب کرنا چاہیے۔ لیکن ایک زندہ جسم کی مانند جو ضروری عناصر کو اپنے لیے جذب کرتا ہے نہ کہ اس بیہوش اور مردہ جسم کی مانند جس میں جو چاہتے ہیں داخل کردیتے ہیں۔

ہم میں جذب کرنے کی توانائی ہے اور دوسری ثقافتوں اور دوسری افکار سے خواہ غیر ملکی ہوں اس چیز کو جو ہم سے تناسب رکھتی ہو، تعلق رکھتی ہو اور ہمارے لیے مفید ہو اخذ کرتے ہیں اور جذب کرتے ہیں لیکن جس طرح کہ اقبال بار بار کہتے ہیں علم وفکر کو مغرب سے سیکھا جاسکتا ہے لیکن سوز زندگی کو نہیں۔

خرد آموختم از درسِ حکیمان فرنگ　　　سوز اندوختم از صحبت صاحب نظران

ایسی کوئی چیز (یعنی سوز زندگی) مغرب کی تعلیم اور مغربی مدنیت کے تمدن میں نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو اقبال نے سب سے پہلے ایک علمبردار کی شکل میں محسوس اور اعلان کیا ہے۔ مغربی تمدن اور مادی مدنیت (مادی شہری زندگی) انسان کے لیے ضروری روح اور معنی سے خالی ہے۔ لہٰذا ہم مغربی ثقافت سے اس چیز کو لیتے ہیں جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے عوام میں خودی اور اسلامی شخصیت کا احساس کمال کی حد تک موجود ہے اور ہماری نہ شرقی نہ غربی و لا شرقية ولا غربية کی پالیسی بالکل وہی چیز ہے جس کی بات اقبال کرتے تھے۔ ہمارے پیغمبرؐ اور قرآن سے عشق اور قرآن سیکھنے کے لیے ہماری نصیحت اور یہ بات کہ انقلابوں اور مقاصد کی بنیاد اسلامی اور قرآنی ہونی چاہیئے بالکل وہی چیز ہے جس کا مشورہ اقبال دیتے تھے لیکن اس وقت ان باتوں کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

ان دنوں اقبال کی زبان اور اقبال کے پیغام کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اقبال کی کتابیں اور نظمیں اس شکایت سے بھری ہوئی ہیں کہ میری بات کو نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے اور نگاہیں

دوسری جگہوں اور مغرب کی جانب ہیں۔ شاید اسی رموز بیخودی کے مقدمے میں وہ یہ شکایت کرتے ہیں اور امت اسلام کو مخاطب کر کے اور بقول خود ان کے پیشکش بہ حضور ملت اسلامیہ کہتے ہیں:

اے ترا حق خاتم اقوام کرد	بر تو ہر آغاز را انجام کرد
اے مثال انبیا پاکان تو	ہم گر دلہا جگر چاکان تو
اے نظر بر حسن ترسا زادۂ	اے ز راہ کعبہ دور افتادۂ
اے فلک مشت غبار کوئے تو	"اے تماشاہ گاہ عالم روئے تو"
ہمچو موج، آتش تہ پا می روی	"تو کجا بہر تماشا می روی"
رمز سوز آموز از پروانۂ	در شرر تعمیر کن کاشانۂ
طرح عشق انداز اندر جان خویش	تازہ کن با مصطفیؐ پیام خویش
خاطرم از صحبت ترسا گرفت	تا نقاب روئے تو بالا گرفت
ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت	داستان گیسو و رخسار گفت
بر در ساقی جبین فرسود او	قصۂ مُغ زادگان پیمود او
من شہید تیغ ابروئے توام	خاکم و آسودۂ کوئے توام
از ستایش گستری بالاترم	پیش ہر دیوے فرو ناید سرم

یعنی اے امت اسلام! میں جواس عاشقانہ طور پر تیری مدح سرائی کر رہا ہوں، اس لیے نہیں کہ میں مداح ہوں:

از سخن آئینہ سازم کردہ اند	از سکندر بی نیازم کردہ اند
بار احساں برنتاب از گردنم	در گلستاں غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثل خنجر در جہان	آب خود می گیرم از سنگ گراں

یہاں پر وہ اپنی بے نیازی کی بات کرتے ہیں اور اس وقت اقبال اس بے نیازی کے ساتھ کہ وہ دنیا کے سامنے سر نہیں جھکاتے امت اسلامیہ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر التماس کرتے ہیں کہ آ اپنے کو پہچان، آ اپنے آپ کی جانب لوٹ اور آ قرآن کی بات سن:

بردرت جانم نیاز آوردہ است	ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است
ز آسماں آبگون یم می چکد	بر دل گرمم دمادم می چکد
من ز جو باریکتر می سازمش	تا بصحن گلشنت اندازمش

اگر ہم آخر تک ان بحثوں اور اشعار کو پڑھنا چاہیں تو بحث کی شکل ہی بدل جائے گی اور کافی

زیادہ وقت لگے گا۔ اور یہ تو ہمارے اس عزیز اور پیارے اقبال کی شخصیت کا ایک خلاصہ ہے جو بلاشک مشرق کے بلند اقبال ستارہ ہیں اور بے جا نہ ہوگا اگر ہم اقبال کو اس لفظ کے حقیقی معنی میں مشرق کا بلند ستارہ پکاریں۔ بہرحال ہمیں امید ہے کہ ہم اقبال کا حق ادا کرسکیں اور گذشتہ چالیس پچاس برس کے دوران اقبال کی شناخت میں اپنی قوم کی تاخیر کا ازالہ کرسکیں۔

اقبال کی وفات گویا ۱۳۱۸ ہجری شمسی مطابق ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور میرے خیال میں اس وقت سے اب تک یعنی اقبال کی وفات کے بعد سے آج تک کا جو ایک طویل عرصہ ہے۔ اگرچہ اقبال کے نام سے سیمینار ہوئے، کتابیں لکھی گئیں اور تقریریں ہوئیں لیکن سب بیگانہ وار اور دور سے تھیں اور ہماری قوم اقبال کی حقیقت اقبال کی روح اور اقبال کے عشق سے بے خبر رہی ہے اور اس عیب کی انشاء اللہ تلافی ہونی چاہیئے اور وہ لوگ جو اس کام سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً شعراء، مقررین، مصنفین، جرائد اور متعلقہ سرکاری ادارے مثلاً وزارت، ثقافت و اعلیٰ تعلیم، وزارت تعلیم و تربیت اور وزارت ارشاد اسلامی، ہر ایک انشاء اللہ اپنی اپنی باری سے کوشش کریں کہ اقبال کو اس طرح جیسا کہ وہ ہیں، زندہ کریں اور ان کے کلام کو کورس کی کتابوں اور دیگر کتابوں میں شامل کریں اور پیش کریں۔ ان کی کتابوں اور اشعار کو الگ الگ شائع کریں، اسرار خودی کو علیحدہ، رموز بیخودی الگ، گلشن راز جدید علیحدہ، جاوید نامہ کو الگ اور اس قسم کے کام جو کسی حد تک پاکستان میں ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان کے عوام ان تعبیرات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ وہاں پر فارسی پہلے کی طرح رائج نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ خلیج بھی پاٹ دی جائے گی، ہمارے پاکستانی بھائی جو یہاں پر موجود ہیں اور اسی طرح برصغیر ہندوستان کے تمام ادیب اپنا فرض جانیں کہ فارسی زبان کے سلسلے میں خیانت آمیز سیاست کا مقابلہ کریں اور فارسی زبان کو جو عظیم اسلامی ثقافت کا ذریعہ ہے اور اسلامی ثقافت کا بڑا حصہ فارسی زبان میں اور فارسی زبان پر منحصر ہے۔ برصغیر ہندوستان میں جہاں پر مسلمان اصلی عنصر ہیں رواج دیں اور ہمارے خیال میں خاص طور پر پاکستان میں یہ کام تیزی کے ساتھ ہونا چاہیئے اور خود ہمارے ملک میں بھی مختلف اشاعتیں جو انجام نہیں پائی ہیں انجام پائی جائیں۔ اور فنکار حضرات اقبال کے کام پر فنکاری دکھائیں، پڑھنے والے ان شعروں کو پڑھیں، ان پر دھنیں تیار کریں اور انشاء اللہ ان کو رواج دے کر ہمارے جوان اور بوڑھے عوام کی زبان اور دل میں لائیں۔

ہمیں امید ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے گا کہ ہم اپنے تئیں امت اسلامیہ پر اقبال کے عظیم حق کو ادا کرسکیں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

تکمیلی پیغام

جناب ڈاکٹر مجتبوی صاحب

صدر، اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے والی کمیٹی اگر چہ آج کی تقریر میں علامہ محمد اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر صرف مختصر روشنی ڈالی گئی اور قرن حاضر کی اس عظیم اسلامی شخصیت کے بارے میں زیادہ تر باتیں نہیں کہی گئیں لیکن دو نکتوں کا بیان جس کا ذکر نہ کرنا درحقیقت اقبال پر ظلم ہوگا، ضروری سمجھتا ہوں:

پہلا نکتہ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ہے جو یقینی طور پر اقبال کی زندگی اور شخصیت کے نمایاں ترین نکات میں سے ہے۔ حقیقتاً یہ کہنا ضروری ہے کہ پاکستان کے بانیوں اور ان میں سرفہرست قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اقبال کی اس جاودانی نصیحت پر جو وہ مسلمان انسان کو مخاطب کر کے کرتے ہیں:

تو شمشیری ز کام خود برون آ	بروں آ از نیام خود برون آ
شب خود روشن از یقیں کن	ید بیضا برون از آستیں کن

عمل کیا اور اپنی انتھک کوششوں اور جدو جہد کے ذریعہ اس فکر کو جس کو علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہونے والی مسلم لیگ کی کانفرنس میں پیش کیا تھا، سترہ سال بعد جامہ عمل پہنایا۔

پاکستان کا قیام جو ہندوستانی مسلمانوں کی شخصیت کے تحفظ اور احیاء کا واحد ذریعہ تھا، یقیناً اقبال کے عظیم فخریہ کاموں میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کے سلسلے میں جواہر لعل نہرو سے قائداعظم کی بحثوں میں جو دلیلیں نظر آتی ہیں اور جن کی بنیاد ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خودمختار قوم بننا ہے، یقیناً رموز بیخودی اور اقبال کے دوسرے کلام میں موجود اقبال کے نظریات پر مبنی ہے لہٰذا جیسا کہ خود پاکستانی بھائیوں نے کہا ہے اور اس بات کی تکرار کی ہے بلاشک اقبال پاکستان کے معمار اور پاکستان کا منصوبہ بنانے والے اور برصغیر میں مسلمانوں کو ایک خودمختار قوم کی شکل دینے والے ہیں۔

دوسرا نکتہ جو ہمارے ملک میں مسلمان اور عبادت گذار عوام کے لیے یقیناً دلنشیں اور لذت بخش ہے اقبال کی ذاتی خصوصیات کے بارے میں ہے۔ ہمارے عوام کے لیے یہ جاننا دلچسپ ہے کہ اقبال جنہوں نے مغربی ثقافت اور تمدن کو اچھی طرح پہچانا اور اپنی عمر کے ایک اہم حصے کو مغربی افکار کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیا، اپنی ذاتی رفتار اور طرز زندگی میں زاہدوں اور عابدوں میں سے ایک تھے اور وہ میل جول ان کے اسلامی اعمال اور آداب نیز ان کی ذاتی زندگی پر ہرگز بھی اثر انداز نہیں ہوا۔

وہ ایک عبادت گذار، قرآن سے مانوس، اہل تہجد اور ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرنے والے

تھے اور حتی یورپ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی انہوں نے اس روش کو ہرگز بھی نہیں ترک کیا۔ قرآن پر ان کا اعتقاد اس حد تک زیادہ تھا کہ ان کے فرزند جاوید اقبال کے بقول قرآن کی آیتوں کو درخت کے پتوں پر لکھ کر بیماروں کو شفایابی کے لیے دیا کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ، بیت اللہ اور حتیٰ حجاز سے جو وحی کا مرکز تھا عشق کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں ان کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ عمر کے آخری ایام میں چاہتے تھے کہ اپنی سب کتابوں کو فروخت کر کے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں خریدیں۔ وہ عارفانہ سوز و گداز رکھنے والے، تہجد کی نماز پڑھنے والے، زندگی میں پارسائی اور قناعت سے کام لینے والے نیز اسی قسم کی دوسری نمایاں خصوصیات کے حامل تھے۔

یہ وہ دو نکتے تھے جن کو میں اپنی تقریر کے تکملے کے طور پر اپنے ہم وطنوں کی اطلاع کے لیے عرض کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

سید علی خامنہ ای
صدر اسلامی جمہوریہ ایران

مصنف کی چند دیگر مطبوعات

(۱) میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر ۱۹۶۵ء
(۲) تحقیقی جائزے ۱۹۶۸ء
(۳) تحقیق و انتقاد ۱۹۶۹ء
(۴) مطالعہ ڈاکٹر زور حیدر آبادی ۱۹۷۰ء
(۵) منظومات میاں دیگر ۱۹۷۱ء
(۶) دیوان نامی ۱۹۷۲ء
(۷) میر ضمیر تحقیقی مطالعہ ۱۹۷۲ء
(۸) تحقیقی نوادر ۱۹۷۳ء
(۹) دیوان میر نسخۂ محمود آباد ۱۹۷۴ء
(۱۰) شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر ۱۹۷۶ء
(۱۱) مقالات حیدری ۱۹۷۷ء
(۱۲) مراثی دبیر، مطبوعہ اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۹ء
(۱۳) دیوان میر نسخۂ نقوش لاہور ۱۹۸۰ء
(۱۴) باقیات انیس ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۸۱ء
(۱۵) باقیات انیس لاہور ایڈیشن ۱۹۸۱ء
(۱۶) تذکرۂ شعرائے ہندی (بخط میر حسن) ۱۹۱۸ء
(۱۷) تذکرۂ شعرائے ہندی (بخط مصحفی ندوہ) ۱۹۱۸
(۱۸) بہارستان شاہی نسخۂ لندن ۱۰۱۳ھ
یعنی تاریخ کشمیر ۱۹۸۲ء
(۱۹) تحقیقات حیدری ۱۹۸۴ء
(۲۰) مثنوی سحر البیان (تحقیقی ایڈیشن) ۱۹۸۷ء

(۲۱) تذکرۂ گردیزی (نسخۂ ندوہ ۱۱۷۴ھ)
مطبوعہ اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۴ء
(۲۲) باقیات دبیر ۱۹۹۴ء
(۲۳) تذکرۂ قدیم شاعرات اردو
مطبوعہ کلچرل اکادمی سری نگر ۱۹۹۶ء
(۲۴) دیوان ترقی نقوش لاہور ۱۹۹۷ء
(۲۵) قدیم اخبارات (ڈیڑھ سو سال پرانے)
مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۸ء
(۲۶) اقبال کی صحت زباں ۱۹۹۸ء
(۲۷) مراثی خلیق (خلیق کے غیر مطبوعہ مرثیے)
مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی ۲۰۰۲ء
(۲۸) اقبال اور علامہ زنجانی ۲۰۰۲ء
(۲۹) نوادر غالب۔ ادارۂ یادگار غالب کراچی ۲۰۰۲ء
(۳۰) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے
مطبوعہ ادارۂ یادگار غالب کراچی ۲۰۰۲ء
(۳۱) معرکۂ اسرار خودی ۲۰۰۵ء
ادارۂ یادگار غالب کراچی
(۳۲) اقبال نادر معلومات ۲۰۰۶ء
(۳۳) اقبالیات کے نئے گوشے ۲۰۰۶ء
(۳۴) اقبال اور علامہ شیخ زنجانی طبع ثانی ۲۰۰۶ء
(۳۵) اقبالیات (زمانہ کانپور کے حوالے سے) زیر طبع